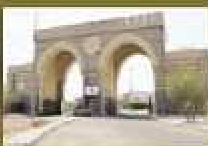
عصری اداروں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں کام کرنے والوں کے لیے ایک جامع کتاب




عصری علوم

شرعی حیثیت و فضیلت
مسلمان ماہرین فنون، واقعات و کارنامے



مفتی محمد ابوبکر جابر قاسمی　　مفتی رفیع الدین حنیف قاسمی

ناشر
دار الدعوۃ والارشاد حیدرآباد

عصری اداروں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں کام کرنے والوں کے لئے ایک جامع کتاب



عصری علوم

شرعی حیثیت و فضیلت
مسلمان ماہرین فنون، واقعات و کارنامے



مفتی محمد ابوبکر جابر قاسمی

مفتی رفیع الدین حنیف قاسمی

ناشر

دار الدعوۃ والارشاد حیدرآباد

عصری علوم

شرعی حیثیت و فضیلت

مسلمان ماہرین فنون، واقعات و کارنامے

مفتی محمد ابوبکر جابر قاسمی

مفتی رفیع الدین حنیف قاسمی

کتاب کا تعارف

اس بات کی شدید ضرورت تھی کہ علماء، محققین وائمہ مفسرین کی تحقیقات کے حوالہ سے قرآن وحدیث میں ذکر کئے علم کے حقیقی مصداق کو واضح کیا جائے، اس سلسلہ میں ہونے والے مغالطوں کا ازالہ کیا جائے، اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے مفتی ابوبکر جابر قاسمی ومفتی رفیع الدین حنیف قاسمی کو کہ علمی اور تحقیقی کاموں کا حوصلہ رکھنے والے ان نوجوان فضلا نے اس طرف توجہ فرمائی اور کتاب وسنت کے نصوص اور ائمہ تفسیر وحدیث کی تشریحات کے حوالہ سے مسئلہ کو بے غبار کردیا، قریب ۵۶۰ صفحات پر مشتمل زیرنظر کتاب میں اس تعلق سے جو کچھ مواد اکٹھا کیا گیا ہے، اس مسئلہ سے متعلق کسی قسم کی تشنگی نہیں رہتی، کتاب میں مسلمان سائنس دانوں کی علمی خدمات پر خوب روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ موجودہ دور میں یورپ جس سائنس وٹیکنالوجی پر ناز کرتا ہے، اس کے اصل بانی ہمارے اسلاف ہیں، دورِ حاضر میں سائنسی ترقی اور بے دینی کو لازم وملزوم سمجھ لیا گیا ہے اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ دین کے تقاضوں کی پاسداری کرتے ہوئے عصری علوم میں ترقی ممکن نہیں، فاضل مؤلفین نے اس مفروضہ کو بھی غلط ثابت کیا ہے، دونوں نوجوان فضلاء تصنیف وتالیف کے میدان میں نووارد نہیں ہیں، اس سے قبل بھی ان حضرات کی کئی ایک وقیع علمی کتابیں اشاعت پذیر ہوکر علمی حلقوں سے خراج تحسین حاصل کرچکی ہیں، امید ہے کہ ان کی اس کتاب کو بھی قبولِ عام حاصل ہوگا، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ جواں سال مفتیان کرام کے علم میں مزید برکت عطاء فرمائے اوران کے علمی کاموں کا سلسلہ اسی طرح جاری وساری رہے۔

مقدمہ کتاب: ازمولانا سید احمد ومیض ندوی، استاذ حدیث وادب دار العلوم حیدرآباد

+91 9704172672

عصری اداروں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں کام کرنے والوں کے لئے ایک جامع کتاب

عصری علوم

شرعی حیثیت وفضیلت

مسلمان ماہرین فنون، واقعات وکارنامے

عصری علوم کی فضیلت اور اس کی واقعی شرعی حیثیت، علم کا حقیقی مصداق، دوسری زبانوں کے سیکھنے کی اہمیت وضرورت، عصری فنون میں غیروں سے مشابہت سے احتراز، حکم اقراء کا پیغام، مسلمان ماہرین فنون کے واقعات وکارناموں کا ایمان افروز تذکرہ

مفتی محمد ابوبکر جابر قاسمی

مفتی رفیع الدین حنیف قاسمی

ناشر

دار الدعوۃ والارشاد، حیدر آباد

پہلا ایڈیشن: ۱۴۳۶ھ = ۲۰۱۵ء

نام کتاب : عصری علوم، شرعی حیثیت وفضیلت
مسلمان ماہرین فنون، واقعات وکارنامے

مصنّفین : مفتی محمد ابوبکر جابر قاسمی، 09885052592
مفتی رفیع الدین حنیف قاسمی، فون: 09550081116

صفحات : 576

کمپوزنگ : حافظ محمد حسام الدین حنیف، فون: 07386561390

تصحیح وسیٹنگ : مفتی محمد عبداللہ سلیمان مظاہری
قبا گرافکس، حیدر آباد، 097041 72672

ناشر : دار الدعوۃ والارشاد، حیدر آباد

ملنے کے پتے

- مدرسہ خیر المدارس، بورابنڈہ، حیدر آباد، فون: 23836868 - 040
- دکن ٹریڈرس، پانی کی ٹانکی، مغلپورہ، حیدر آباد، فون: 66710230 - 040
- فضل بک ڈپو، جامع مسجد ملے پلی، حیدر آباد، فون: 9440039231 - 40 91+
- ہندوستان پیپر ایمپوریم، مچھلی کمان، حیدر آباد، فون: 66714341 - 040
- ہُدیٰ بک ڈسٹری بیوٹرس، پرانی حویلی، حیدر آباد، فون: 24514892 - 040
- مکتبہ کلیمیہ، یوسفین ویڈنگ مال، نامپلی، حیدر آباد

فہرست مضامین

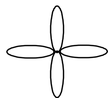
اسلام اور سائنس

عصری تعلیم اسلامی نقطۂ نظر

مسلمان سائنسدانوں کے خصوصیات وامتیازات

مسلمان اطباء اور ان کے کارنامے

مسلم سائنسدانوں کے کارنامے



کلماتِ تحسین

حضرت الاستاذ جامع المنقول والمعقول مفتی عبداللہ صاحب مظاہری دامت برکاتہم
بانی ومہتمم جامعہ مظہر سعادت ہانسوٹ، ضلع بھروچ، گجرات

Estd. 1405 A.H. / 1985 A.D. Regd. No. B-914

DARUL ULOOM
HANSOT

جامعۃ مظہر السعادۃ ہانسوٹ
JAMIAH MAZHAR-E-SA'ADAT
HANSOT-GUJARAT

از: مفتی عبد اللہ المظاہری
۲۲/جمادی الاولیٰ/۱۴۳۵ھ
۲۴/مارچ/۲۰۱۴ء

محترمی مفتی ابوبکر ومفتی رفیع الدین صاحبان زید مجدکما!
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!
بعد تسلیمات! امید ہے کہ مزاج گرامی بعافیت ہوگا!
قال اللہ تعالیٰ کنتم خیر امۃ اخرجت للناس ۔ امت مسلمہ خیر امت ہے جو لوگوں کیلئے برپا کی گئی ہے ۔ اس امت کا امتیاز یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اس شان کو ہر میدان ومجالہ میں قائم رکھا ہے ...

...

۲۰۴ کا اندازہ اس سے پندرھویں صدی میں ۔ تصحیح کرلی جائے ۔ والسلام
اللہ تعالیٰ کتاب کو مقبولیت عطا فرمائے ۔ مرتبین کو جزائے خیر عطا فرمائے ۔ آمین

عبد (مفتی) عبد اللہ المظاہری
۲۲/جمادی الاولیٰ/۱۴۳۵ھ ۲۴ مارچ ۲۰۱۴ء

At & Po Hansot, Dist. Bharuch, PIN : 393 030 Gujarat (India) Tel : +91-2646-262 050 / 262 031
Fax : +91-2646-262927 E-mail : muftipatel@yahoo.com Website : saadathansot.com

محترمی مفتی ابوبکر ومفتی رفیع الدین صاحبان زید مجدکما

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعد تسلیمات! امید ہے کہ مزاج گرامی بعافیت ہوگا! قال اللہ تعالیٰ ''کُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ''(۱)۔ امت مسلمہ خیر امت ہے جو لوگوں کے لئے برپا کی گئی ہے۔ اس امت کا امتیاز یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی اس شان کو ہر میدان ومجال میں قائم رکھا ہے، عدل وقضاء ہو کہ فلسفہ وحکمت ہو، فن طب، علاج ومعالجہ ہو، سائنس وٹیکنالوجی ہو، فن تعمیر، ہندسہ وفن ریاضی ہو، تاریخ کے اوراق میں مسلمان ہی رہبر وقائد وسالار نظر آتے ہیں۔ قیادت وسیادت میں آگے مسلمان ہی رہے ہیں۔ دیگر امتیں مسلمانوں کی خوشہ چیں اور رہین منت رہی ہیں۔ اس یاد ماضی کو یادِ رفتگاں کی شکل میں اس کتاب میں پیش کیا گیا ...... ''وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرَىٰ تَنفَعُ الْمُؤْمِنِينَ''(۲) (نصیحت کیجئے، نصیحت کرنا مومنین کے لئے نفع بخش ہوتا ہے)، بقولِ علامہ اقبال:

تھے وہ آباء تمہارے ہی مگر تم کیا ہو
ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا ہو

اسلام کسی بھی علم کے حصول کا مخالف نہیں ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ''الحكمة ضالة المؤمن حيث وجدها فهو أحق بها''(۳) بس اسلام حدود وقیود متعین کرتا ہے، جو ضروری ہے۔

''عصری علوم -شرعی حیثیت وفضیلت، مسلمان ماہرین فنون واقعات وکارنامے'' یہ کتاب نوجوانانِ اسلام کے لئے عبرت وسبق بھی ہے، فخر وشکر بھی ہے اور بننے بنانے کا نسخہ بھی ہے، احساسِ عمل پیدا ہوجائے، غیرت وحمیت کے ساتھ نوجوانانِ اسلام اپنا مستقبل روشن کرنے کے لئے کمر کس لیں تو کام بنے۔

(۱) سورۃ آل عمران:۱۱۰ (۲) الذاریات:۵۵
(۳) مسلم، باب النهي عن نشد الضالة في المسجد، حديث:۵۶۸

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں

اللہ تعالیٰ کتاب کو مقبولیت عطا فرمائے۔ مرتبین کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین۔

۲۲؍جمادی الاٰولیٰ؍۱۴۳۵ھ، پیر (مفتی) عبداللہ المظاہری

مقدمہ

حضرت مولانا سید احمد ومیض ندوی صاحب دامت برکاتہم
استاذِ حدیث دارالعلوم حیدرآباد

دورِ حاضر میں عصری تعلیم کی ضرورت وافادیت سے کس کو انکار ہوسکتا ہے، صنعت وحرفت اور اقتصاد ومعیشت میں ترقی عصری تعلیم کے بغیر ممکن نہیں، نیز مختلف عصری میدانوں میں باصلاحیت افراد کی فراہمی بھی اس کے بغیر ممکن نہیں، موجودہ سائنس وٹکنالوجی کی حیرت انگیز ترقی کے دور میں عصری تعلیم سے دوری نے مسلمانوں کو ہر شعبۂ زندگی میں غیروں کا دست نگر بنا کر رکھ دیا ہے، ملتِ اسلامیہ کو قابل اور باصلاحیت ڈاکٹروں کی ضرورت ہے اور قانون کے ماہر وکلاء کی بھی، تعلیمی میدان میں کام کرنے کے لئے مسلمان ماہرین تعلیم درکار ہیں اور مختلف علوم وفنون میں پیشہ وارانہ صلاحیت کے حامل عظیم اسکالر بھی، امتِ مسلمہ اپنی ہمہ جہت ترقی کے لئے ماہرین معاشیات کی بھی محتاج ہے اور سائنس وٹیکنالوجی پر عبور رکھنے والے افراد کی بھی، الغرض امتِ مسلمہ کے لئے عصری علوم کی ضرورت ایک مسلم حقیقت ہے، جس سے انکار نہیں اور علماء امت نے مسلمانوں کو عصری علوم کی تحصیل سے بھی منع نہیں کیا اور نہ انہیں شجرِ ممنوعہ قرار دیا؛ البتہ عصری علوم کے ساتھ آنے والے الحاد و بے دینی اور مخلوط نظامِ تعلیم کے اثراتِ بد سے ضرور آگاہ کیا ہے۔

گذشتہ نصف صدی کے عرصہ میں امتِ مسلمہ میں عصری تعلیم کے تعلق سے جو غیر معمولی شعور بیدار ہوا ہے، اس سے انکار ممکن نہیں؛ لیکن اس کے ساتھ عصری تعلیم

اور مغربی ثقافت کے تعلق سے مرعوبانہ ذہنیت میں بھی اضافہ ہوا ہے، عصری علوم سے مرعوبیت کے جہاں اور اثرات مرتب ہوتے ہیں وہیں ایک اثر یہ ہوا کہ قرآن وحدیث میں جہاں کہیں علم اور اہل علم کی فضیلت وارد ہوئی ہے، عصری تعلیم کو اس کا مصداق قرار دیا جانے لگا اور تمام آیتوں کو جو خدا کی معرفت تک پہنچانے والے حقیقی علم کی اہمیت کو اجاگر کرتی ہیں عصری علوم پر منطبق کیا جانے لگا، اسکولوں اور عصری تعلیم گاہوں کے پروگراموں میں فضیلتِ علم پر دلالت کرنے والی آیتیں دھڑلے سے پڑھی جانے لگیں اور اس بے باکی سے ان کا استعمال ہونے لگا گو یا وہ آیات اس کے خاطر نازل ہوئی ہیں، قرآن وحدیث عصری علوم کے مخالف نہیں ہیں؛ لیکن آیاتِ قرآنیہ اور احادیث نبویہ کی من مانی تشریح یا انہیں ان کے حد درجہ مرعوب اس قسم کی من مانی تشریحات پر اصرار کی حد تک زور دیتا ہے، یہ طبقہ جب علماء کرام سے تبادلہ خیال کرتا ہے تو یہ تأثر دینے کی کوشش کرتا ہے کہ علماء نے عصری تعلیم کی اہمیت کو اجاگر کرنے والی آیات کا مطلب سرے سے سمجھا ہی نہیں، اس طبقہ کے افراد اپنے مدعا کو ثابت کرنے کے لئے بالعموم آیاتِ قرانیہ کو ان کے سیاق وسباق سے کاٹ کر پیش کرتے ہیں مثلاً خواندگی تعلیم کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ قرآن کی سب سے پہلی وحی کا آغاز ''اقرأ'' سے ہوا؛ لیکن آیت کے آگے ٹکڑے "بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ" کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے، جس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ مطلق علم قابل ستائش نہیں؛ بلکہ وہ علم لائق حوصلہ افزائی ہے جو رب کے نام کے ساتھ مربوط ہو، قرآن وحدیث میں علم نافع کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے، نبی رحمت ﷺ کی منجملہ دعاؤں میں ایک دعا یوں ہے "اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْئَلُكَ عِلْمًا نَّافِعًا"(۱) اے اللہ! میں آپ سے علم نافع مانگتا ہوں، آپ نے "غیر نافع" علم سے پناہ مانگی ہے، چنانچہ آپ ﷺ پوری دعا یوں فرماتے "إِنِّيْ أَعُوْذُبِكَ مِنْ عِلْمٍ لَّا يَنْفَعُ"(۲)

(۱) سنن ابن ماجة: باب ما يقال بعد التسليم، حدیث: ۹۲۵، علامہ ہیثمی فرماتے ہیں: اس کو طبرانی نے اوسط میں روایت کیا ہے اور اس کی سند حسن درجے کی ہے۔

(۲) سنن ابن ماجة: باب الانتفاع بالعلم والعمل به، حدیث: ۲۵۰، اس کو طبرانی نے روایت کیا ہے اور اس میں یونس بن خباب ضعیف ہیں۔

میں ایسے علم سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں جو نفع نہ پہنچاتا ہو، انسانیت کے لئے حقیقی معنی میں وہی علم نافع ہوسکتا ہے جس کے ساتھ رب کا نام جڑا ہوا ہو، ورنہ نرا علم جو وحی الٰہی کی روشنی سے محروم ہو انسانیت کے لئے تباہی کے سوا کچھ نہیں، مغربی ممالک نے وحی الٰہی کی روشنی سے محروم ہو کر انسانیت کی تباہی کے سوا کچھ نہیں کیا، مغربی ممالک نے وحی الٰہی سے بے نیاز ہو کر علم میں ترقی کی تو آخر ان کے علوم نے پوری انسانیت کے لئے ایسے تباہ کن ہتھیاروں کی سوغات پیش کردی جو لمحوں میں ساری دنیا کو تہس نہس کر کے رکھ دیتے ہیں، قرآن مجید ان اصحابِ علم کی دھجیاں بکھیرتا ہے جن کے علم کا مقصد محض چند روزہ دنیوی زندگی ہو، ارشاد ربّانی ہے:

"فَأَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰى عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ إِلَّا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ۝ ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ"(۱)

''آپ ان پر توجہ نہ دیں جو ہماری یاد سے منہ پھیرتے ہیں اور بس دنیوی زندگی کی چاہت میں لگے ہوئے ہیں، یہی ان کے علم کی رسائی ہے''

جو علم انسان کو صرف چند روزہ دنیا میں جینے کے اسباب کی رہنمائی کرتا ہے، قرآن اسے ظاہری علم سے تعبیر کرتا ہے، ارشاد ہے: "وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا"(۲) لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں، یہ بس دنیوی زندگی کے ظاہری پہلو کو جانتے ہیں، قرآن حقیقی اہل علم ان لوگوں کو قرار دیتا ہے جن کا دل خشیتِ الٰہی سے معمور ہوتے ہیں، ارشاد ہے: "إِنَّمَا يَخْشَى اللهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ"(۳) اللہ سے اس کے بندوں میں سے اہل علم ہی ڈرتے ہیں، یہ آیت واضح طور پر دلالت کرتی ہے کہ اسلام کا مطلوب علم وہ ہے جو انسان کے قلب میں خشیتِ الٰہی اور خوفِ خداوندی پیدا کردے، قرآنی نقطۂ نظر سے علم کی بنیاد اور اس کا محور اللہ رب العزت کی ذات ہے، چنانچہ قرآن صاف اعلان کرتا ہے "فَاعْلَمْ أَنَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ"(۴) اس علم کو دل میں

(۱) النجم: ۲۹-۳۰ (۲) الروم: ۶-۷
(۳) الفاطر: ۲۸ (۴) محمد: ۱۹

بٹھالو کہ اللہ کے علاوہ کوئی لائق عبادت نہیں۔

اس بات کی شدید ضرورت تھی کہ علماء، محققین وائمہ مفسرین کی تحقیقات کے حوالہ سے قرآن وحدیث میں ذکر کئے علم کے حقیقی مصداق کو واضح کیا جائے، اس سلسلہ میں ہونے والے مغالطوں کا ازالہ کیا جائے، اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے مفتی ابوبکر جابر قاسمی ومفتی رفیع الدین حنیف قاسمی کو کہ علمی اور تحقیقی کاموں کا حوصلہ رکھنے والے ان

نوجوان فضلا نے اس طرف توجہ فرمائی اور کتاب وسنت کے نصوص اور ائمہ تفسیر وحدیث کی تشریحات کے حوالہ سے مسئلہ کو بے غبار کر دیا، قریب ۵۲۵ صفحات پر مشتمل زیر نظر کتاب میں اس تعلق سے جو کچھ مواد اکٹھا کیا گیا ہے، اس مسئلہ سے متعلق کسی قسم کی تشنگی نہیں رہتی، کتاب میں مسلمان سائنس دانوں کی علمی خدمات پر خوب روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ موجودہ دور میں یورپ جس سائنس وٹیکنالوجی پر ناز کرتا ہے، اس کے اصل بانی ہمارے اسلاف ہیں، دورِ حاضر میں سائنسی ترقی اور بے دینی کو لازم وملزوم سمجھ لیا گیا ہے اور یہ تأثر دینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ دین کے تقاضوں کی پاسداری کرتے ہوئے عصری علوم میں ترقی ممکن نہیں، فاضل مؤلفین نے اس مفروضہ کو بھی غلط ثابت کیا ہے، دونوں نوجوان فضلاء تصنیف وتالیف کے میدان میں نو وارد نہیں ہیں، اس سے قبل بھی ان حضرات کی کئی ایک وقیع علمی کتابیں اشاعت پذیر ہو کر علمی حلقوں سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں، امید ہے کہ ان کی اس کتاب کو بھی قبولِ عام حاصل ہوگا، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ جواں سال مفتیان کرام کے علم میں مزید برکت عطاء فرمائے اور ان کے علمی کاموں کا سلسلہ اسی طرح جاری وساری رہے۔ آمین یَا رَبَّ الْعَالَمِیْنَ۔

۲۹/ربیع الاول/۱۴۳۵ھ

۳/۱/۲۰۱۴ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم



موجودہ زمانہ میں امتِ مسلمہ کی اٹھانوے فیصد نسل کالجوں اور اسکولوں میں زیرِ تعلیم ہے؛ ظاہر ہے کہ ہمیں اپنے اسکول قائم کرنا چاہئے اور کر رہے ہیں؛ لیکن یہ کام بہت زیادہ حساس اور نزاکت کا حامل ہے، ایک طرف یہ تقاضا ہوتا ہے کہ عصری تعلیم معیاری ہو، دوسری طرف تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ حدودِ شریعت کی پامالی نہ ہو اور مغربی نظامِ تعلیم اور اسلام مخالف عقائد ونظریات کے جراثیم منتقل نہ ہونے پائیں، یہی وجہ ہے کہ اسکولی میدان میں بہت کم لوگ ہیں جو اس سلسلہ میں کامیاب ہیں، یہ معنوی تحریف ہوتی جا رہی ہے کہ علمِ الٰہی، علمِ قرآن وحدیث کے معانی کو عصری فنون پر چسپاں کیا جا رہا ہے اور خود عصری علوم سے متعلق شرعی فضائل، فقہی مقام بتلانے والا مواد اوجھل ہوتا جا رہا ہے، اسکول وکالجس کے منتظمین اور بعض جگہوں پر اس کے سرپرست علماء کرام کو یاد دہانی کی ضرورت ہے کہ نصاب ونظام میں کہاں کہاں احکامِ شریعت کو ذبح کیا جا رہا ہے، ایسے طریقۂ کار اور حل کو تلاش کر لیا جائے جس سے معیار تعلیم بھی باقی رہے اور اوامر الٰہی بھی نہ ٹوٹیں، اس سلسلہ میں جو تجربات عالمی سطح پر ہوئے ہیں اس سے انہیں آگہی ہو، ورنہ دیکھا گیا کہ ہر آدمی اپنے اسکول کو ازسرِ نو تختۂ مشق بنا رہا ہے۔

۱۔ نظام اسلامی کے ساتھ نصاب کو بدل دیا جائے اور دین ودنیا کے علم کی تعریف ختم کر دی جائے ''وحدت علم'' اولین دور کی طرح عالم اور وکیل، عالم اور ڈاکٹر، عالم اور سرکاری ملازم پیدا کئے جائیں۔

۲۔ نصاب تعلیم تو مروجہ ہو یا اس کو بتدریج اسلامی مزاج کے ساتھ تدوین کیا جائے؛

لیکن خالص عصری فنون سائنس، انگلش، جغرافیہ، ریاضی کے ساتھ دینیات کی تعلیم بھی نصاب کالازمی حصہ بنایا جائے، البتہ ماحول نہایت دینی ہو۔

۳۔ کالجوں اور یونیورسیٹیوں میں پڑھنے والے بچوں کے لئے دینی اقامت گاہوں کو قائم کیا جائے، ایسے ہاسٹل تعمیر کئے جائیں یا کرایہ پر لئے جائیں، جہاں کوئی مربّی عالم دین ان طلبہ کا نگران ہو۔

مسلمانوں کی ترقی کا اصل راز ایمان وعمل ہے؛ لیکن ماڈی فنون سے انہوں نے صرفِ نظر نہیں کیا، اس کے بعد ایمانی صفات بھی مضمحل ہوگئے، پھر سائنس وٹکنالوجی کی طرف سے توجہ ہٹ گئی، مغرب نے سیاست وتعلیم، معاشیات وتمدن پر بالادستی حاصل کرلی، یہ انقلاب خیر سے شر کی طرف تھا، اس سے انکار نہیں کہ ان کی ترقیات حیران کن، محیّر العقول ہیں، مسلمان سائنسدان، اطباء، قاضی جتنے خداترس، انسانیّت نواز، بااخلاق تھے، اتنے ہی مغربی اقوام خُدا ناترس، معدہ پرست، خودغرض ہیں، آج ہمارے نوجوان کو یہ مسلم اطبّاء، قاضیوں کی صفات اور بلند کردار کو جاننے کے ساتھ موجودہ مغربی نظریات کی ہراعتبار سے تباہ کن ہونا سمجھنا ضروری ہے، ان ہی سب عناوین پر بڑی عرق ریزی سے مواد جمع کیا گیا ہے۔

۲۰۰۴ء میں باقاعدہ طور پر دعوت وتبلیغ سے وابستگی ہوئی اور اکابر کے حکم سے آبائی ضلع نظام آباد چھوڑ کر حیدرآباد کا قیام طئے ہوا، تبلیغ وتعلیم کے پلیٹ فارم سے اور کبھی دینیات کے عنوان پر عصری طلباء میں خطاب کے مواقع آتے رہے، اس بات کا بہت احساس ہوا کہ قرآن وسنت اور اکابر کے معتدل نقطہ نظر کو اہتمام سے پیش کیا جانا چاہئے، عصری فنون کو دینی یعنی قرآن وحدیث یا فرض عین والے مقصد کا درجہ رکھنے والے عصری علوم کی ترجیح اور عصری فنون کی شرعی حیثیت اور اس کے فضائل کا مواد پیش کردیا جائے، بالخصوص ان روایتوں کو ذکر کیا جائے جس کی وجہ سے ایک ڈاکٹر، ایک وکیل اور سرکاری

ملازم عبادت ودعوت کے ساتھ اوراس کا دھیان رکھے تو اس کے وہ سارے کام عبادت بن جائیں۔

اور پھر اکابرین امت کے ملفوظات کو بھی شامل کیا جائے جو طلباء کے جوش وولولہ کو بڑھاتے ہوں، ساتھ ہی ایسے قصے جو ہمارے طلبہ میں جذبہ تحقیق، انسانیت نوازی، امانت ودیانت کا اعلی کردار پیدا کرتے ہوں، ہزاروں صفحات سے انتخاب کر کے نقل کردیئے گئے ہیں۔

ریاضی، فلکیات، طب اور دیگر عصری فنون سے اور انگریزی زبان سے نہ مجھے اچھی طرح واقفیت ہے اور نہ میرے شریک تصنیف کو، اس عنوان پر ہمارا کام تقریباً نقل بازی کا رہا؛ البتہ ان فنون کے مدرسین سے نظر ثانی کروائی گئی، بہت دل چاہتا تھا کہ ڈاکٹر حمیداللہ حیدرآباد، ڈاکٹر عبدالحی عارفی، حکیم اختر صاحب اور دعوت وتبلیغ کے میدان میں غیر معمولی حصہ لینے والے بے شمار ڈاکٹرس وانجینئرس کا تذکرہ کیا جاتا، ان کے ایمان افروز واقعات لکھے جاتے؛ لیکن کتاب ضخیم ہوجاتی اور مزید وقت لگ جاتا؛ اس لئے یہ کام چھوڑ دیا گیا، بعض مضامین کا تکرار ضرور ہے اور ایک ہی مضمون کو مختلف پیرائے میں الگ الگ جگہوں پر ذکر کیا گیا ہے، صرف اس لئے تاکہ اپنی طرف سے کوئی بات نہ ہو؛ بلکہ جو نقل کیا جائے اکابر کی تحریروں کی روشنی میں ہی رہے۔

اس درمیان میں الحمد متقدمین ومتاخرین کی تحریروں کی ورق گردانی کا بہت موقع ملا، عصر حاضر کے معروف مفکرین کی تحریروں وتقریروں سے بھی کافی استفادہ کیا گیا، ان حضرات کی فہرست تو لمبی ہے؛ لیکن حضرت مولانا خلیل الرحمن سجاد نعمانی دامت برکاتہم کی تقریروں سے بہت زیادہ تحریک پیدا ہوتی رہی۔

احقر کو خوشی ہے کہ حضرت الاستاذ جامع المنقول والمعقول مفتی عبداللہ صاحب مظاہری دامت برکاتہم بانی ومہتمم جامعہ مظہر سعادت ہانسوٹ، ضلع بھروچ، گجرات کی

ہمت افزائی شامل حال رہی اور حضرت مولانا احمد ومیض صاحب استاذ حدیث دار العلوم حیدرآباد نے بھی اپنی بابرکت تقریظ عنایت فرمائی اور ہماری ہمت وقوت کا سامان فرمایا۔

میرے مسلسل اسفار، تدریسی مصروفیات کے ساتھ یہ کام انجام ہرگز نہیں پاتا اگر مفتی رفیع الدین حنیف قاسمی صاحب کی یکسوئی اور بےلوث تعاون، ہزاروں صفحات سے مواد کی ترتیب، عرق ریزی کے ساتھ تخریج وتحقیق کا کام نہیں ہوتا، **جزاہ اللہ أحسن الجزاء**۔

اور میرے رفیق درس وتدریس مولانا مدثر حسین رضوان صاحب قاسمی باریک بینی اور اپنائیت کے ساتھ تصحیح فرمائی۔ اللہ جلّ جلالہ اپنے فضل سے قبول فرمائے۔

ابوبکر جابر قاسمی

۸؍جمادی الاولی ۱۴۳۵ھ   استاذ مدرسہ خیر المدارس، بورابنڈہ، حیدرآباد

۷؍مارچ ۲۰۱۴ء


اسلام اور سائنس

سائنس وسیلہ، اسلام مقصود

جب یہ معلوم ہوا کہ یہی مادی تصرفات جن سے احتیاج اور ذلتِ نفس کا ثمر پیدا ہوتا ہے، سائنس کا موضوع عمل ہیں اور یہی روحانی تصرفات یعنی صدقہ اور ایثار جس سے استغناء عزتِ نفس کا نتیجہ ظاہر ہوتا ہے، اسلام کا موضوع عمل ہیں تو یہ نتیجہ نکل آیا کہ سائنس تو انجام کار انسان کو ذلتِ نفس اور ہلاکت کی طرف لے جاتی ہے اور اسلام عزت اور فلاح دارین کی طرف بڑھاتا ہے، بہر حال یہ عناصر اربعہ اور اس سے بنا یہ محض ایک ڈھانچہ جس کی زندگی روح کے بدولت ہے، روح اسے زندہ رکھ رہی ہے، علوم و کمالات اسکے ذریعہ ظاہر کرتی ہے، اس لئے جسم حقیقت میں فاعل نہیں، بلکہ محض قابل ہے اور اصل نہیں بلکہ وسیلہ ہے، اور اس جسم کو مقصود کا درجہ دیا جاتا ہے، تو یہ فی الحقیقت بغیر روح کے ایک لاشہ محض ہے، جس کا انجام سڑنے اور گلنے کے سوا کچھ بھی نہیں، جب کہ سائنس کا موضوع محض یہ جسمانیت اور مادی چیزیں ہیں اس لئے سائنس کے تمام کرشمے بھی وسائل سے زیادہ قیمت نہیں رکھتے، جب کہ اسلام اصل موضوع اور روحانی افعال ہیں، اس سے پتہ چلا کہ جیسے بدن روح کے لئے وسیلہ عمل ہے، ایسے ہی سائنس اصولی طور پر اسلامی کارناموں کے لئے ایک وسیلہ اور ذریعہ، جس کی زندگی اور اسلامی اخلاق وافکار اور اسلامی اقوال وافعال ہوں گے، اگر یہ روح اصل ڈھانچہ میں ہے تو یہ پوری سائنس اور اس کی تشکیل بے فائدہ ہوگی، جب یہ ثابت ہوا کہ سائنس محض وسیلہ ہے تو وسیلہ کو مقصود کی ضرورت کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، اور اسی قدر استعمال کیا جاتا ہے جس حد تک وہ مقصود کے لئے معین ومددگار رہوں۔

اس لئے یہ بات معلوم ہوئی کہ مقصود اصلی یعنی دین سے جدا رہ کر سائنس میں انہماک کرنا یہ عقل مندی کا کام نہیں، بلکہ اسے وسیلہ کی حد تک اور ضرورت کی مقدار میں

استعمال کیا جائے۔

اس لئے دنیا کے سائنس عناصر اربعہ کے تصرفات کو اسی حد تک حاصل کرنے کی اجازت زبان نبوی سے دی گئی ہے جس حد تک مذہبی مقاصد میں ان کی ضرورت ہو ارشاد نبوی ہے۔

اِعْمَلْ لِدُنْيَاكَ بِمِقْدَارِ بَقَائِكَ فِيْهَا، وَاعْمَلْ لِلْاٰخِرَةِ بِمِقْدَارِ بَقَائِكَ فِيْهَا

’’دنیا کے لئے اتنا کرو جتنا دنیا میں رہنا ہے اور آخرت کے لئے اتنا کرو جتنا وہاں رہنا ہے۔

علامہ اقبالؔ نے اس سائنس اور اس کی حقیقت کو یوں بیان کیا ہے:

یورپ میں بہت روشنئ علم وہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
رعنائی تعمیر میں ، رونق میں ، صفا میں
گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات
ظاہر میں تجارت ہے ، حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگ مفاجات
یہ علم ، یہ حکمت ، یہ تدبر ، یہ حکومت
پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیم مساوات
بے کاری وعریانی وے خواری وافلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کی فتوحات
وہ قوم کہ فیضان سماوی سے ہو محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برق وبخارات

دنیا مقصود اصلی نہیں، مقصود کے حصول کا ذریعہ ہے

یہ دنیا اور اس دنیا کی ساری جدوجہد بس ایک وسیلۂ آخرت سے زیادہ حیثیت

نہیں رکھتے، اسی کو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ: "إِنَّ الدُّنْيَا خُلِقَتْ لَكُمْ وَأَنْتُمْ خُلِقْتُمْ لِلآخِرَةِ"(۱) بلاشبہ دنیا تمہارے لئے بنائی گئی ہے اور تم آخرت کے لئے پیدا کئے گئے ہو۔

اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دنیا تمہاری آخرت کے لئے بنائی گئی ہے، یعنی وسیلۂ آخرت ہے، مقصودِ زندگی نہیں، مقصودِ زندگی تو قرآن کے بیان کے مطابق "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ"(۲) میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف عبادت کے لئے پیدا کیا ہے"

یعنی انسان اور جنات کو دنیا اور دنیا داری کی خاطر پیدا نہیں کیا، یہی کلمۂ حصر کا مفہوم ہوسکتا ہے اور جب دنیا غایتِ تخلیق نہیں تو لامحالہ پوری دنیا کا وسیلۂ عبادت ہونا ثابت ہوتا ہے، اور ایک جگہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "اَللّٰهُمَّ أَعِنِّيْ عَلَى دِيْنِيْ بِالدُّنْيَا وَعَلَى آخِرَتِيْ بِالتَّقْوٰى"(۳) اے اللہ! میرے دین کو دنیا کے ذریعہ مدد دے اور میری آخرت کو پرہیزگاری سے"۔

بہر حال ان نصوص سے دنیا وسیلۂ دین ثابت ہوتی ہے اور عقلی اصول ہے کہ وسائل صرف تکمیلِ مقاصد کے لئے بقدرِ ضرورت اختیار کئے جاتے ہیں، اگر وہ ضرورت سے بڑھ جائیں یا ضدِ مقصود کے لئے وسیلہ ثابت ہونے لگیں یا مقصد فوت ہوکر محض وسائل ہی وسائل رہ جائیں گویا تخم تو گل جائے اور جڑ میں پانی ہی پانی رہ جائے جو تخم کے نشوونما کا محض ایک وسیلہ تھا تو شرعاً ہی نہیں عقلاً بھی مذموم سمجھا گیا۔ گویا یہ تمام سامانِ دنیا بدن کی پرورش اور بقاء کا ذریعہ ہے اور بدن روح کے لئے مرکب اور سواری ہے جس پر سوار ہوکر وہ راہِ حق اور آخرت کی منزلیں طئے کرتی ہے؛ اس لئے ضروری ہوا کہ انسان روح کے اُس گھوڑے یعنی بدن کے لئے گھاس دانہ فراہم کرے؛ تاکہ وہ سفر کرکرنے کے قابل ہو، پس سفر سے مقصود منزل ہوتی ہے نہ کہ گھوڑا یا گھاس دانہ، اس صورت میں اگر مقصد سفر ہی

(۱) الدر المنثور:۸/۱۶۹، دار الفکر، بیروت (۲) الذاریات:۵۶
(۳) کشف الخفاء:۱/۱۸۵، دار الکتب العلمیۃ، بیروت"

سامنے نہ ہو تو سواری اور گھاس دانہ ہی کی ضرورت باقی نہیں رہتی؛ لیکن جس صورت میں مقصد سامنے ہو تو تحصیلِ مقصد کی حد تک سواری کا بندوبست کرنا ناگزیر ہوتا ہے، مگر وہ وسیلہ ہی رہتی ہے مقصد نہیں بن جاتی۔

بہر حال سماوات وارض کے عجائبات کی طرف متوجہ کرنے اور ان میں غور وفکر کا امر کرنے کا مقصد قرآنی ہدایات کی روشنی میں معرفتِ خالق، معرفت توحید، ذات وصفات اور معرفتِ توحید افعال سے نفسِ انسانی کی تکمیل اور اُسے فضائل علم واخلاق سے آراستہ اور مہذب بنانا ہے، ریل وتار، فون والاسلکی، موٹر اور جہاز وغیرہ کے کارخانے کھلوانا نہیں، کیوں کہ یہ سب کچھ بننا نہ قرآن پر موقوف ہے نہ ختم نبوت کی لائی ہوئی معرفت وبصیرت پر، البتہ بطور وسیلۂ عبادت ان مادی اشیاء اور تمدنی صنائع سے کلیۃ الگ کردیا جانا بھی مقصود نہیں؛ بلکہ بضرورت عبادت اور بضرورت نفاذِ خلافت ان وسائل کی تحصیل بھی ضروری قرار دی گئی ہے، تاکہ معاش کی طرف سے مطمئن ہوکر ایک انسان معاد کی فکر کرسکے اور قانونِ الٰہی کو قوت سے دنیا میں پھیلانے اور رواج دینے سے کوئی چیز مانع نہ بن سکے۔

اس بات کے واضح ہوجانے کے بعد یہ جرأت نہ ہونی چاہئے کہ مقاصد عبودیت کو چھوڑ کر صرف ان فانی وسائل میں کھو جانے اور انہیں ہی مقصد زندگی ٹھہرا لینے کو خلافتِ الٰہی کہا جائے، کوئی بھی سنجیدہ عقل اسے تسلیم نہیں کرسکتی کہ جس خلافتِ الٰہی کے برپا کرنے کے لئے ہزارہا انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے، لاکھوں حواری اور صحابہ رضی اللہ عنہم، انبیاء علیہم السلام پیدا کئے گئے اور کروڑوں نائبانِ انبیاء اور صلحاء ظاہر ہوئے اس خلافت کے معنی لوہے، پیتل، لکڑی اور پتھر وغیرہ کے مختلف معاشی سامان ڈھالنے اور ان سامانوں سے اسبابِ عیش ونشاط یا اسباب تباہی وہلاکت افراط کے ساتھ مہیا کرکے دنیا میں فساد مچانے کے ہیں، اگر یہی خلافت الٰہی تھی تو معاذ اللہ فرعون مصر، کسرائے فارس، قیصر روم، خاقان چین، راجائے ہند، نیز دوسرے اور بڑے بڑے عیش پسند یا جنگ جو سرمایہ دار؛ بلکہ تمام دشمنانِ انبیاء علیہم السلام جیسے قارون اور ہامان، نمرود اور شداد، ابوجہل اور ابولہب وغیرہ سب

سے بڑے خلفائے الٰہی ہوتے، یا پھر بڑے بڑے صناع لوہار، بڑھئی، صراف اور سنار وغیرہ خلفائے الٰہی ثابت ہوں گے اور جب کہ ان فنون اور فن کاروں کے وجود کے لئے قرآن اور نبوت ہی کی ضرورت نہ تھی تو دوسرے لفظوں میں اس خلافت کے لئے بھی نہ نبوت کی ضرورت رہتی ہے نہ قرآن کی؛ بلکہ اس خلافت کے حق میں نبوت حارج نکلتی ہے۔

قرآن کا مقصدِ اصلی خلافت:

قرآن کا مقصدِ اصلی انسان کو اس حد کمال پر پہنچا کر اس کی انسانیت کی تکمیل کرنا ہے اور جب کہ کمال کا حقیقی سرچشمہ ذاتِ خداوندی کے سوا دوسرا نہیں ہوسکتا جس کے اوصاف وافعال سے اسی کے فرمان کے مطابق مشابہت پیدا کر کے ان کمالات کو بقدر استعداد وقابلیت اپنانا ہی انسانیت کی تکمیل ہے، خلیفہ اصل کا قائم مقام ہوتا ہے، اس لئے خدا برتر وبالا کا خلیفہ وہی ہوسکتا ہے جو خدائی اوصاف وکمالات کا پرتو ہو، اگر اللہ عزوجل کے لامحدود کمالات جن کے اجتماع سے آدمی کو خلیفۂ الٰہی قرار پاتا ہے، اصولی نقطۂ نظر سے تین نوعوں میں منحصر نظر آتے ہیں: (۱) کمالات علم وادراک (۲) کمالات وصف واخلاق (۳) کمالاتِ صنعت وافعال؛ چنانچہ کتاب وسنت میں جس قدر بھی اسماء وصفات اسم یا فعل کی صورت میں ذکر فرمائے ہیں وہ سب ان ہی تین انواعِ کمالات کی نشان دہی کرتے ہیں یا وہ علمی اسماء ہیں جن سے اللہ کے علمی کمالات کی نشان دہی کرتے ہیں اور علمی اسماء یہ ہیں، علیم، خبیر، سمیع، بصیر، مدرک، واجد وغیرہ، یا وہ اخلاقی اسماء ہیں جن سے اس کے جوہری اخلاق اور پاکیزہ ولطیف قوائے باطن پر روشنی پڑتی ہے جیسے صبور، شکور، رؤف، غفور، رحیم، کریم، عفو، حلیم، وغیرہ یا افعالی اور صناعی اسماء ہیں جن سے اس کے صنعتی کمالات پر روشنی پڑتی ہے جیسے: خالق، باری، بدیع، مصور، مبدئ، معید، محیی، ممیت، نافع وضار وغیرہ بقیہ اسماء اس کے متعلقات ہیں۔

انبیائے علیہم السلام کی بعثت کا مقصد

انبیاء علیہم السلام جو کہ روئے زمین پر اللہ عزوجل کے اوّلین خلفاء میں سے ہیں، ان کی بعثت کی غرض وغایت بھی ان ہی تین کمالات ''علم وخلق وصنع'' سے بنی آدم علیہ السلام کو

آشنا بنانا اور عملی طور پر اس راہ پر چلانا ہے؛ تاکہ انسان خلیفۂ الٰہی بن کر اپنے منیب کی منشاء کے مطابق ان ہی تین کمالات کی روشنی میں اس کائنات کا انتظام کرے اور مالکِ کائنات کی مرضی پر خود چل کر اس کی رعایا کو چلائے۔

اس لئے سردار انبیاء علیہ السلام نے اپنی بعثت کی غرض وغایت ان ہی تین کمالات کی ترویج واشاعت ظاہر فرمائی، چنانچہ علمی کمالات کی ترویج کا فرضِ بعثت ہونا تو ان الفاظ میں ظاہر فرمایا کہ: ''إِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا'' (۱)

اخلاقی کمالات کی ترویج کا غرضِ بعثت ہونا ان الفاظ میں ظاہر فرمایا: ''بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الأَخْلَاقِ'' (۲) میں بھیجا ہی اس لئے گیا ہوں کہ اعلیٰ ترین اخلاق کی تکمیل کردوں۔

عملی اور صنعتی کمالات کے غرضِ بعثت ہونے کے اعلان کے لئے شریعت غراء کی ترویج کو غرض بعثت ظاہر فرمایا جو ہر نوع کی حکمت عملی یعنی تہذیبی، منزلی، مدنی، تمدنی، اقتصادی، سیاسی اور صنعتی وغیرہ افعال کے فطری اصول پر مشتمل ہے اور جس کے مجموعہ کا نام شریعت ہے:

''بُعِثْتُ بِالْحَنَفِيَّةِ السَّمْحَةِ'' (۳)

''میں بھیجا گیا ہوں سیدھی، سہل روشن اور رعایتوں پر مشتمل شریعت دے کر''

---

(۱) ابن ماجۃ: باب فضل العلمائ، حدیث: ۲۲۹، بوصیری مصباح الزجاجۃ میں فرماتے ہیں: اس کی سند میں بکر، داؤد، عبدالرحمن وغیرہ ضعیف ہیں۔

(۲) مجمع الزوائد: باب فی حسن خلقه وحيائه وحسن معاشرته، حدیث: ۱۴۱۸۸، علامہ ہیثمی فرماتے ہیں: اس کو احمد نے روایت کیا ہے اس کے رجال صحیح کے رجال ہیں،، بزار کے الفاظ ہیں: ''لأتمم مكارم الأخلاق'' اس کے رجال بھی اسی طرح ہیں سوائے رزق اللہ الکلوذانی کے جو ثقہ ہیں۔

(۳) المعجم الکبیر: صدی بن العجلان، حدیث: ۷۷۱۵، علامہ ہیثمی فرماتے ہیں: اس کو طبرانی نے روایت کیا ہے، اس میں عفیر بن معدان ضعیف ہیں۔

اے تہی از ذوق وشوق وسوز ودرد
می شناسی عصر ما با ما چہ کرد
عصر ما ، مارا زما بیگانہ کرد
از جمال مصطفےٰ بیگانہ کرد

جب اللہ عزوجل نے حضرت آدم علیہ السلام کو خلافتِ ارضی سے نواز کر زمین پر بھیجنے کا ارادہ کیا تو پہلے انہیں ''علم الأسماء '' سے نوازا "وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا" (۱) اس طرح دنیا میں آنے والے پہلے انسان کو اللہ عزوجل نے ان اشیاء کے ناموں کے ساتھ ان کی خصوصیات کا علم عطا فرما کر بھیجا جن کی تمدنی زندگی میں ضرورت پڑتی ہے، اسی طرح قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سی چیزوں کی ایجاد پہلی مرتبہ حضراتِ انبیاء علیہم السلام ہی کے ذریعہ ہوئی، چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام کو زرہ گری کی صنعت سکھائی گئی، حضرت نوح علیہ السلام کو کشتی بنانا سکھایا گیا "وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا" (۲) حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے تانبہ کا چشمہ بہایا گیا، ان کے زیرِ نگرانی شیاطین وجنات بڑے بڑے مکانات اور دیگر چیزیں بنایا کرتے "يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ" (۳) حتی کہ امامِ حدیث شمس الدین الذہبی "الطب النبوی" میں روایت نقل کی ہے انسانی زندگی کے لئے جتنی اہم اور ضروری صنعتیں ہیں مثلاً: مکان بنانا، کپڑا بننا، درخت اور پودے لگانا، کھانے کی چیزیں تیار کرنا، حمل ونقل کے لئے پہیوں کی گاڑی بنا کر چلانا وغیرہ، سب اللہ عزوجل بذریعہ وحی اپنے نبی کو سکھلائی تھی۔ (۴)

غور کرنے کی بات ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے قوم کو صنعت کاری کی دعوت نہیں دی، حضرت داؤد علیہ السلام وسلیمان علیہ السلام نے ان فنون کی دعوت کو مقصد نہیں بنایا، پورا قرآن شاہد ہے کہ انہوں نے ایک خدا کی بندگی اور آخرت اور نبیوں کی اطاعت پر انہیں ابھارا۔

(۱) البقرۃ:۳۱ (۲) ہود:۳۷
(۳) السبأ:۱۳ (۴) معارف القرآن:۷/۲۶۲

تحقیق کائنات وسیلۂ معرفت نہ کہ مقصد زندگی

جن تین کمالاتِ ربانی سے انسان کو مزین کرنے کے لئے انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے، جن کی تکمیل پر انسان خدا کا نائب اور خلیفہ بن کر دنیا کی زمام اور حکومت اپنے ہاتھ میں لے سکتا ہے، ان تین کمالات ربانی میں سے ایک علم وادراک ہے، یہ ایک ایسا ربانی اور الٰہی وصف ہے کہ وہ وسائل اور وسائط کا محتاج نہیں، وہ کسی کا نہیں؛ بلکہ خود اپنا ہے، وہ استدلالی نہیں؛ بلکہ ذاتی ہے کہ ماضی ومستقبل اور شاہد اور غائب سب اس کے سامنے بطورِ علم ضروری کے خود بخود حاضر ہیں، اسے حصول علم کے لئے استدلال کی حاجت نہیں کہ وہ قیاسات سے معلومات کے اندازے لگائے؛ کیوں کہ یہ جہل کی علامت ہے اور وہ جہل سے بری وبالا ہے، اسے ظن وتخمین سے نتائج تک پہنچنے کی ضرورت نہیں؛ کیوں کہ یہ لاعلمی کا عیب ہے اور وہ ہر عیب سے منزہ اور مقدس ہے، اسے کتابوں سے پڑھ کر اور استاذوں سے سیکھ کر معلومات حاصل کرنے کی ضرورت نہیں؛ کیوں کہ یہ ذات کا کمالات سے خالی ہونا اور تکمیل کو چاہنا ہے جو سراسر محتاجگی ہے اور وہ اس محتاجگی سے بری ہے، غرض اللہ عزوجل کے علم کے دائرہ میں پہلی چیز وہاں اسبابِ علم سے غنائے مطلق ہے؛ اسی لئے علم کے مبادی ہوں یا نتائج، ہیئت ہو یا حقیقت، صورت ہو یا ماہیت سب وہاں بیک دم حاضر ہیں، نہ اس کے اول میں محتاجگی ہے اور نہ اخیر میں، نہ ظاہر میں نہ باطن میں "هُوَ الْاَوَّلُ لَيْسَ قَبْلَهٗ شَيْءٌ وَهُوَ الْاٰخِرُ لَيْسَ بَعْدَهٗ شَيْءٌ وَهُوَ الظَّاهِرُ لَيْسَ فَوْقَهٗ شَيْءٌ وَهُوَ الْبَاطِنُ لَيْسَ دُوْنَهٗ شَيْءٌ" اس لئے علم الٰہی کی بنیاد استغناء ہے، چنانچہ علم کے دائرہ میں اللہ عزوجل کے حقیقی خلفاء وہی ہو سکتے ہیں جن کے علم کی شان یہ غنائے کامل ہو کہ وہ یا تو بلا کسب ومحنت اور بلا واسطۂ کتاب واستاد نیز بلا ریاضت ومجاہدہ، وہبی اور الہامی طور پر براہِ راست اللہ سے اس کا علم پائیں جس کا نام علم لدنی ہے، جو انبیاء علیہم السلام کی شان ہے، اگر وہ علم کسب ومحنت کے ذریعے حاصل بھی ہو تو انبیاء علیہم السلام ہی کے تعلیم کردہ اصول وضوابط کی اور انہیں کے پیش کردہ اسوہ کے مطابق ہو، اگرچہ یہ علم ابتداءً کسبی اور حصولی ہی کہلائے گا مگر آخر کار علم الٰہی سے ایک نسبت پیدا کر

کے وہبی بن جائے اور خود ہی قلب سے علم کا سوتا پھوٹ نکلے گا اور اس میں وہی استغناء کی شان آئے گی کہ پھر اس میں رسمی وسائط کی احتیاج وضرورت باقی رہے اور نہ کتاب واستاذ اور دوسرے وسائل کی۔

یہی صورت اخلاقِ ربانی کی بھی ہے کہ ان کا منتہا بھی یہی غنائے کامل ہے، جو اس اخلاق کی بنیاد ہے، اور ہر حسن خلق کی روح آخر میں غناء اور عدم احتیاج نکلتی ہے جیسا کہ ہر خلق بد کی روح اور انجام کار محتاجگی اور غیر کی غلامی اور اسیری نکلتی ہے۔

مثلاً تواضع کے معنی ہیں کہ ہم رسمی جاہ اور خودی سے کنارہ کش اور بے نیاز ہیں، سخاوت وقناعت کے معنی ہیں کہ ہم مال ومنال کی محبت وطلب سے آزاد اور بے پرواہ ہیں، صبر کے معنی ہیں کہ ہمیں فوت شدہ کا غم نہیں یعنی ہمیں اس کی احتیاج نہیں، شکر کے معنی ہیں کہ ہم اس نعمت سے اٹکے ہوئے نہیں؛ بلکہ نعمت دینے والے سے وابستہ ہیں جو بے نیازی کا سرچشمہ ہے، شجاعت کے معنی ہی جان سے بے نیازی اور استغناء کے ہیں، حیاء کے معنی حق کی خاطر نفس کی مرغوبات ومحبوبات سے بے پرواہ ہوجانے کے ہیں، ایثار کے معنی ہیں کہ دوسرے کے نفع کی خاطر اپنے منافع سے دست بردار ہوجائیں، حلم کے معنی ہی انتقام سے بے نیازی اور جذباتِ انتقام سے بالاتر ہونے کے ہیں۔

اس کے بالمقابل تواضع کے مقابل تعلّٰی ہے جس کے معنی ہیں غیر پر اپنی برتری ثابت کرنا جس میں سراسر غیر کا احتیاج ہے، سخاوت کے مقابلے میں بخل کا مطلب ہے کہ مالی محتاجگی کے ہیں نہ کہ اس سے غنی اور بے نیاز ہونے کے، بے صبری اور جزع وفزع کے معنی فوت شدہ سے اٹکاؤ اور اس کے غم میں گھل جانے کے ہیں، یہی محتاجگی ہے، شجاعت کے مقابل بزدلی کے معنی ہیں کہ سامنے والے کی طاقت سے مرعوب ہوکر اس کا محتاج ہو جانا ہے، ناشکری کا مطلب ہے منعم حقیقی سے کٹ کر اپنے نفس کے اسیر اور غلام ہوجانے کے جو سراپا بندۂ احتیاج ہے، حرص کے معنی ہیں دولت اور اسباب عیش وعشرت کے احتیاج کے ہیں۔

بس اخلاق کے سلسلے میں اللہ کا نائب وہی ہوسکتا ہے جو ان اخلاق حسنہ سے

متصف ہوکر غیر کی احتیاج اور ضرورت سے بے نیاز ہوجائے، بے نیازی اور بے احتیاجی اس کی ہر حرکت وسکون سے ظاہر ہو، پھر کیوں کر دنیا کے برق وبخار، آب وآتش یا خاک وباد کا محتاج ہوکر انسان خلیفۃ اللہ فی الأرض بن سکتا ہے۔

اسی طرح یہی نوعیت خدا کی صفت صناعی اور فعالی کی ہے کہ وہاں بھی احتیاج کا کوئی شائبہ تک نہیں، یعنی اللہ کا کوئی فعل اور نہ کوئی صنعت وسائل کی محتاج ہے، نہ اسباب کے تابع ہے، وہ خود ہی مسبب الاسباب ہے اور خود وسائل کو بناتا ہے، نہ اس کے لئے مادہ درکار ہے اور نہ مدت، خود اسی کی باطنی قوت ایک فعل کو ذہنی وجود دے کر اسے بیک دم خارج میں نمایاں کرتی ہے، جس کے لئے اسباب ومسببات کی کوئی احتیاج نہیں، بلکہ صرف ''کُنۡ فَیَکُوۡنُ'' کی لامحدود طاقت کافی ہے۔

اس لئے خدا کا نائب اور اس کا خلیفہ بھی وہی ہوسکتا ہے جس کے اندر ظاہری وسائل سے استغناء پیدا ہوجائے، اپنے صنع وعمل میں کسی غیر اللہ کا محتاج نہ رہے، خواہ وہ بے شعور وسائل ہوں یا باشعور اشخاص واعیان عناصر وموالید ہوں یا فلکیات وارضیات، یہ تمام اشیاء نہ اس کی صنعت میں حارج ہوسکیں، وہ چاہے تو پرواز کے وسائل کے محض خدا کی طاقت کے بھروسہ اور اپنی قوت یقین سے آسمانوں تک پرواز کرسکے، اور چاہے تو بلاوسائل رصدگاہ اپنے اثرات فلکیات تک پہنچادے، وہ چاہے تو بلا وسیلہ لاسلکی اور فون وانٹرنیٹ کے اپنی آواز مشرق سے مغرب تک پہنچادے۔

اسی اعتماد علی اللہ اور استغناء وبے نیازی کی طاقت تھی جس کی بناء پر غزوۂ بدر میں ملائکہ مسوّمین ہزاروں کی تعداد میں آئے، تاکہ ان قلیل التعداد مسلمانوں کے دلوں میں جماؤ اور استقلال پیدا کریں، اسی کے تحت حضور ﷺ نے اعداء اللہ پر مٹھی بھر کنکریاں پھینک ماریں جو انہیں تیر وتفنگ ہوکر لگیں، تمام عرب مرتدین کے مقابلے صرف تنہا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا قتال کے لئے کھڑے ہونا، اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا ساٹھ ہزار رومیوں کو صرف ساٹھ مسلمان صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ شکست دینا یہ اسی قوت کی بنا پر تھا۔

ہاں اگر قوت یقین عین الیقین کے درجہ کا نہ ہو اور غناء وتوکل کا مادہ راسخہ قلب میں

جا گزیں نہ ہو تو بھی حق الیقین کے تحت غناء وتوکل کی بشاشت دل میں ہو، دل میں انشراح ہو، علم واخلاق اور صناعات ظاہرہ سے بے نیاز نہ ہو؛ لیکن اعتقاداً ان اسباب ووسائل کی اہمیت ووقعت دل میں نہ ہو، اسباب کے اختیار کرنے کے وقت دل میں یہ خیال ہو کہ یہ اسباب ہمارے ضعیف نفوس کو سہارا دینے کے لئے ہیں، خلافتِ الٰہی کے معنیٰ علم وعمل اور صنعت وافعال میں مادی اسباب سے بالکل منقطع ہونے کے نہیں ہیں، جیسا کہ خود حق تعالیٰ شانہ نے باوجود اس غنائے مطلق کے اسباب بھی پیدا کئے، اور اپنی قوتوں کو عادۃً ان ہی کی ضمن میں پیدا فرمایا، اس لئے اسبابِ جنگ کے سلسلہ میں ہتھیار، اسباب وصنائع کے سلسلہ میں اوزار اور اسبابِ معاش کے سلسلہ میں کاروبار، اپنی اپنی جگہ رہیں گے؛ مگر دل میں ان وسائل کی اہمیت اور محتاجگی نہ ہوگی اور نہ عملاً ان وسائل کے اختیار کرنے میں مبالغہ سے کام لیا جائے گا۔

یہ معلوم ہونا چاہئے کہ پہلے کے لوگ بھی طاقت کی حقیقت وسائل سے بے نیازی کو سمجھتے تھے، وسائل کی محتاجگی کو نہیں، چنانچہ لوگ حسی مادوں کے بجائے زیادہ تر نفسانی اور معنوی قوتوں کی تسخیر کو کمال سمجھتے تھے اور زیادہ تر طلسمات، نجومیات، فلکیات اور خود نفسِ انسانی کی اندرونی طاقتوں پر ان کی توجہ مرکوز رہی ہے۔ ریاضیات مجاہدات کے ذریعہ نفس کی قوت کو مجتمع کیا اور اس سے بلا وسائل کام لیا، لیکن اسلام نے ان تمام طاقتوں کو جس میں مسمریزم، شعبدہ بازی، سحر وغیرہ شامل ہیں جس میں ظاہری اسباب کچھ نہیں ہوتے مگر مد مقابل زیر ہوجاتا ہے مخلوقاتی طاقتیں قرار دے کر ارضیات، فلکیات، نفسیات یعنی تمام سفلیات اور علویات سے آگے بڑھ کر الٰہیات کی لامحدود طاقتوں سے روشناس کرایا۔

بہر حال جو قوتیں رات ودن لوہے، لکڑی، اینٹ، پتھر اور عام مادی وسائل کی محتاجگی اور غلامی میں نہ صرف بسر ہی کر رہی ہیں، بلکہ ان مادیات کی بندشوں نے ان کے خیال تک کو اپنا اسیر اور قیدی بنا لیا ہے، جس سے وہ روحانیت سے بیگانہ اور منقطع ہیں، نہ وہ غناء وتوکل سے عقیدتاً سرفراز ہیں نہ حالاً، تو انہیں خلافتِ الٰہی سے کیا تعلق؟ کیوں کہ خلافتِ الٰہی کا استحقاق ہی ان اشیاء سے استغناء پر ہے۔

تحقیق کائنات کو مقصد زندگی بنانے کے نقصانات:

قرآن یہ کتابِ ہدایت ہے، اسے تقوی وطہارت، اخلاق وروحانیت، زہد وعبادت، خشوع وانابت، اتباعِ سنت واقتضائے آثارِ سلف اور خلافتِ الٰہی کے نقطۂ نظر سے دیکھنے کے بجائے عنصری بنیادوں، فلسفہ وسائنس، معاشیات، اقتصادیات، عمرانیات وسیاسیات، تعیش وتفریح اور رسمی جاہ واقتدار یعنی ملوکیت وسلطنت اور موجودہ دنیا کے خالص مادی افکار ونظریات کے نقطۂ نظر سے دیکھنا کہ اس کی ہر آیت سے خالص مادیت کا ایک سیلاب اُمڈتا ہوا نظر آئے یہ بالکل زیب نہیں دیتا۔ اگر قرآن کو بجائے کتابِ ہدایت کے مادی کھود کرید اور اس کے عناصرِ اربعہ دخان وبخار، گیس وبرق، ریل وتار، طیارہ وسیارہ اور فون ولاسلکی وغیرہ پھر ان وسائلِ نقل وحمل اور اسبابِ علم وخبر کے وسیلہ سے ایک طرف اسباب زینت وتعیش کی توسیع سے دنیا میں ہوسنا کی، عیاشی، حرص وآزادی، بد اخلاقی وسیاہ کاری اور ہمہ اقسام فسق وفجور کی وسعت وکثرت، دوسری طرف اسبابِ تباہی وہلاکت اور مہلک آلاتِ حرب وضرب، گن اور بم، ایٹم اور گیس وبارود اور تیزاب وغیرہ کی تیاری سے استبدادی طور پر اقوام عالم پر زور آزمائی، غلام سازی، قتل وغارت گری، اعلانیہ جور وجفا اور عالمی امن وسکون کی بربادی کی بہتات اور پھر یہ سب کچھ بنام امن وصلاح، یعنی کھلی عیاری ومکاری، ڈپلومیسی، نفاق اور باہمی بے اعتمادی کی وسعت یہ سائنس کے نتیجے میں قرآن کا مقصود ٹھہرایا ہے؛ حالانکہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد اس جور وظلم کو مٹانا، ایمانداری اور شرافت کا سبق دینا تھا۔

یہ جدید سائنس کی دین جس کی تباہ کاریاں اور اس کے نقصانات عیاں اور بیاں ہیں بقول حکیم مشرق:

یہ عیش فراواں یہ حکومت ، یہ تجارت
دل سینۂ بے نور میں محروم تسلی
تاریک ہے افرنگ مشینوں کے دھویں سے
یہ وادیٔ ایمن نہیں شایان تجلی

اور ایک جگہ فرمایا:

حیاتِ تازہ اپنے ساتھ لائی لذتیں کیا کیا
رقابت ، خود فروشی ، ناشکیبائی ، ہوس نا کی

اگر قرآن کریم کو سائنس اور ہمہ جہت ترقی ، مادہ وعنصر پر محنت اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مہلکات کا ذریعہ قرار دیا جائے جیسا کہ کتاب اللہ کو کائنات ارضی وسماوی پر غور وفکر اور اس غور وفکر کے ذریعے مختلف قسم کے نتائج اخذ کرنے کی کتاب بعض لوگ قرار دیتے ہیں، اگر قرآن کا مقصود یہی ہو تو اس کا خطرناک نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اسلام کا قرن اول اور صحابہ مقبولین کا طبقہ معاذ اللہ سب سے زیادہ ضعیف الایمان قلیل العلم اور محروم العمل قرار پائے گا ، جس نے منشائے قرآنی کے مطابق جیسا کہ بعض لوگوں کا زعم ہے نہ ایک مشین بنائی ، نہ ایک انجن ہی ایجاد کیا ، نہ دخان و بخار سے چلائیں ، نہ خوبصورت چھری کانٹے ڈھالے ، نہ کریم اور پاؤڈر تیار کئے ، نہ چہروں کو گلگوں بنانے کے لئے غازے اور لوشن بنائے ، نہ آرائشی سامانوں کی تخلیق کی ، نہ ہواؤں میں اڑتے پھرے ، نہ پانیوں میں بہتے دکھائی دیئے ، نہ کسی نے مہلک آلات ایجاد کر کے لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کا منٹوں میں صفایا کیا ، نہ استعماری اغراض کے ماتحت دنیا میں جبر واستبداد اور ظلم وستم پھیلایا ، نہ سائنٹیفک آلات کی طاقت کے بل بوتہ پر قوموں کی غلام سازی کی ، نہ اپنی استعماری اغراض کی خاطر زیردستوں کے کچلے ہوئے جذبات کے ساتھ کھیلنے کی کوشش کی اور نہ ہی دنیا کا سرمایہ سمیٹ کر آلاتِ لہو ولعب ، باجے گاجے ، سینما وتھیٹر ، فواحش ومنکرات کے مناظر ، بے حیائی اور نہ بے حجابی کے عریاں نقشے دنیا میں رائج کر کے اپنی تجارت کو فروغ دیا۔

اگر قرآن کو سائنسی علوم کا جو یا قرار دیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جس قدر یہ سائنٹفک ترقیات بڑھتی گئیں گویا علوم قرآنی ترقی کرتا گیا ، فہمِ انسانی تیز تر ہوتا ہو گیا اور عمل بالقرآن کا ذوق بڑھتا گیا ، گویا نبوت کے قرن سے بعید ہونا ہی امت کے حق میں رحمت ثابت ہوا کہ سمجھ اور فہم صحیح ہو گئے ۔ اور لوگ ایمانداری کا مفہوم صحیح صحیح سمجھنے لگے ، معاذ اللہ قرن اول بلحاظ علم وعمل کے معاذ اللہ شر القرون ثابت ہو گیا ، حالانکہ حضور ﷺ

کی زبان خدائی دعوی یہ تھا کہ:

"خَيْرُكُمْ قَرْنِيْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ، ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ "(۱)

"زمانوں میں سب سے بہتر میرا زمانہ ہے ، پھر وہ لوگ جو خیر القرون والوں سے متصل ہوں اور پھر جو ان لوگوں سے متصل ہوں"

اگر قرآن کو علمی قرآن اور سائنس اور کائناتی ریسرچ کو عملی قرآن قرار دیا جاتا ہے اور قرآن کو کائناتی کھوج وتحقیق کا ذریعہ بنایا جاتا ہے تو اس اصول پر تمام انبیاء علیہم السلام پر بھی حرف آتا ہے؛ کیوں کہ ان کے دور میں مادی اور تمدنی ترقیات تو کیا ہوتیں برپا شدہ ترقیات بھی فناء کے گھاٹ اتار دی گئیں ، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کلدانیوں کی تمدنی ترقیات پر پانی پھیر دیا ، جو بعض حیثیات سے آج کی تمدنی ترقیات سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر تھیں اور لوگوں کو پھر سے اسی سادہ تمدن کی دعوت دی جس میں تکلفات اور افراطِ عیش کا وجود نہ تھا۔

موسی علیہ السلام نے فرعون اور فرعونیوں کا وہ ملکی اور شہری کرّ وفر ختم کر کے چھوڑا جس پر فرعون "أَلَيْسَ لِي مُلْكُ مِصْرَ وَهَٰذِهِ الْأَنْهَارُ تَجْرِي مِن تَحْتِي"(۲) کہہ کر فخر کیا کرتا اور انہیں اسی بے تکلف سادہ تمدن پر لانے کی کوشش فرمائی۔

حضرت خاتم الانبیاء ﷺ نے اپنے دور کے دو عظیم الشان مادی تمدنوں یعنی رومی اور ایرانی کر وفر اور عمرانی عجائبات کو مٹا دینے کا اعلان فرمایا اور ان کے مٹ جانے کی پیشن گوئی فرمائی اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عین منشائے نبوی کے مطابق اپنی فتوحات سے ان تکلف آمیز تمدنوں اور ان سرپرست حکومتوں کو تہہ وبالا کر ڈالا ، اور وہ سادہ تمدن قائم کیا جو مقاصد عبودیت کے لئے حارج اور رکاوٹ نہ ہو ، کسری کے وہائٹ ہاؤز کے بے نظیر سامانوں ، مافوق العادت سیم وزر کے ظروف وتاج اور اعلیٰ اعلیٰ نمونوں کے انمول قالینوں وغیرہ کو دیکھ کر جو بسلسلۂ مالِ غنیمت مسجدِ نبوی میں لائے گئے تھے ،

(۱) بخاری: باب فضائل أصحاب النبی ﷺ، حدیث: ۳۴۵۰
(۲) الزخرف: ۵۱

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ رو پڑے اور فرمایا کہ یہی سامانِ تعیش ہے جس کی بدولت فارسی قوم آج مسلمانوں کی مفتوح بنی۔

بہرحال عیش ونشاط کے وافر سامان ہوں یا قوت وشوکت کے مضبوط دلائل، اسبابِ رزم ہوں یا وسائلِ بزم، دربار سے متعلق کروفر ہو یا بازار سے متعلق سیم وزر، جو آج کی نہیں ہمیشہ کی دنیا پرست اقوام کا سرمایۂ غرور رہا ہے، جو اقوام عالم کی اصل تباہی کا سبب بنا ہے، قرآن اسی تمدن اور اسی سامان عیش اور وسائل کو اختیار کرنے کا کیوں کر حکم دے سکتا ہے؟

چنانچہ قرآن کریم نے جگہ جگہ سابقہ اقوام کی تباہی کی مثالیں پیش کی ہیں کہ وہ وقتی عیش ولذت میں پڑ کر، تعیش کی افزائش کے لئے دماغی کاوشوں سے اختراعات وایجادات میں غرق ہوکر بڑی بڑی جابر قومیں آن کی آن میں کس طرح برباد کردی گئیں کہ آج ان کا کوئی نام ونشان بتلانے والا نہیں ہے، قوم نوح طوفان کے تھپیڑوں سے، قوم عاد آندھیوں کے جھکڑوں سے، قوم ثمود ہولناک گرج اور غیبی چنگھاڑ سے، قوم شعیب آسمان کی آتش باری سے، قوم لوط فضا کی سنگباری اور بستیوں کے الٹ دیئے جانے سے، قوم ابراہیم سلبِ نعمت وملک سے، قوم فرعون قلزم کی موجوں سے، اسطرح بے نشان کردیئے گئے کہ نہ ان پر آسمان رویا اور نہ زمین۔

مصریوں کی سائنٹفک ترقیات، بے نظیر باغات، خوشنما آبشار، سرسبز کھیتیاں، دلفریب سینیریاں، اسبابِ عیش ونشاط، فرعونی دماغ کے مجوزہ سربفلک منارے جن کی مدد سے وہ آسمان کے دروازوں سے قریب ہوکر موسیٰ علیہ السلام کے خدا سے مقابلہ کا حوصلہ کررہا تھا، ان کے لئے کچھ بھی کارآمد ثابت نہ ہوئے اور یہی ساری سائنٹیفک ترقیات فرعون اور فرعونیوں کے حق میں موجبِ ہلاکت وتباہی بنیں، بالآخر نام اور کام اگر باقی رہا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا۔

عاد وثمود کو ان کی سائنسی ترقیات اور فن کاریوں کی بے مثال تعمیر وترقی قوم عاد کو فن انجنیئر ی کے تحت نادرِ روزگار تعمیرات سربفلک بلڈنگیں اور قوم ثمود کو پہاڑوں سے تراشی ہوئی قلعہ بند عمارتیں اور منزل درمنزل تعمیریں اس عذابِ الٰہی سے نہ بچاسکیں جو نمائشی

بہاروں میں غرق ہوجانے کے سبب ان پر آیا، اسی لئے قرآن نے ان کے خالص مادیت کے شاہکاروں اور اخلاق وروحانیت سے ہٹے ہوئے کارناموں کو مقصودِ زندگی قرار دے لینے کو نفرت وحقارت سے یاد کیا ہے۔ یہ سارے مادی مشاغل ان کی نجات یا سراہنے کا ذریعہ نہیں بنے؛ بلکہ ان مادی مشاغل میں لگ کر ان اقوام نے فرائض عبودیت کو ترک کردیئے، اور انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کو ٹھکرادیا تو قہر خداوندی نے انہیں نیست ونابود کرکے دنیا کو عبرت دلائی۔

جو مغربی فلسفہ کو قرآنی آیات پر منطبق کرنا چاہتے ہیں انہیں کے متعلق علامہ اقبال نے کہا تھا:

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کردے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں

مقصودِ اصلی معرفت رب، خدمتِ انسانیت

بہرحال مسلمان کے لئے ان مادی سامان کے حصول کے لئے ترقی کے میدان میں گھس جانا اس کی مدح اور تعریف کا معیار نہیں؛ کیونکہ مادیات کی دنیا میں گھس جانا ایمان داری وغیر ایمانداری اور اسلام وکفر کا معیار نہیں بن سکتا، مسلمان کے لئے معیار مدح وذم تو صرف علم واخلاق، تصرف روحانی اور اعلائے کلمۃ اللہ ہے، مادی تصرفات کو بقدرِ ضرورت اس کے لئے رکھے گئے ہیں، وہ فی نفسہ مقصود ومعیار نہیں۔

خلافت فی الارض کا مقصود تلوار اٹھانا نہیں، بلکہ قانونِ حق کو نافذ العمل بنانا ہے، پہلے اپنے اوپر، پھر ماحول اور اس کے پس وپیش، اگر کسی قوم نے تلوار اٹھائے بغیر قرآن کو اپنے اور اپنے ماحول پر نافذ کیا تو وہ بلاشبہ آقا ہے ورنہ قطعی طور پر غلام ہے، خواہ نفس کا غلام ہو یا غیر کا، پیغمبر ﷺ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم مکہ کی تیرہ سالہ زندگی میں بھی آقا تھے، جب کہ تلوار ہاتھ میں نہ تھی اور مدینہ کی دس سالہ زندگی میں بھی ویسے ہی آقا تھے جب کہ

وسائلِ شوکت ان کے ہاتھ میں تھے، کتنے ہی انبیاء علیہم السلام کو جہاد وسیاست سرے سے دیئے ہی نہیں گئے، لیکن اوامر اللہ کی تنفیذ میں خلیفہ فی الارض تھے۔

یہی دونوں حالتیں امت پر گذری ہیں، امت کے بعضے طبقے مکہ کی زندگی میں آ گئے جس کا حاصل محض پٹ لینا اور صبر کرنا نہیں؛ بلکہ مار کھا کر اعلائے کلمۃ اللہ کرنا اور ترویج کلام اللہ کو برابر انجام دینا ہے جس کو قرآن کریم نے جہادِ کبیر کہا ہے، اور بعض مدینہ کی زندگی میں آ گئے، جس کا حاصل قوت سے استیصالِ فتنہ کر کے اشاعتِ دین کی راہیں ہموار کرنا اور شعائر اللہ کو اونچا بنانا ہے؛ تا کہ دینِ حق ہمہ گیر اور غالب ہو جائے، جس کو جہادِ صغیر کہا گیا ہے۔ دونوں کا مقصود وہی اعلائے کلمۃ اللہ، تبلیغ کلام اللہ اور تربیت خلق اللہ نکلتا ہے، پس "وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم" جیسی آیاتِ کریمہ سے تیر وتفنگ جمع کر لینا، یا تکوین کائنات کی آیات سے بے محل استنباط کر کے صنعتی، تجارتی اور عسکری کاروبار پھیلانا فی نفسہ خواہ کتنا ہی ضروری ہو؛ مگر خود حریت وآقائی نہیں، آقائی قرآن کو نافذ العمل بنانا ہے، جس کے لئے یہ قوت کی تیاری محض ایک وسیلہ اور ذریعہ سے زائد نہیں جیسے وضو قرآن کی رو سے فرض وواجب سہی مگر ہے بہر حال محض نماز کی کنجی، بلکہ وہ نماز ہی کی وجہ سے ضروری ہے، فی نفسہ نہیں۔

پس اگر ایک قوم نے شوکت حاصل کر لی؛ لیکن اس کی شوکت دین کے حدود وشعائر قائم کرنے سے غافل یا عاجز رہی تو اسے حریت وآقائی کے دعوی یا تصور کا کوئی حق نہیں، وہ بدستور غلام ہے، دوسروں کی ہو یا اپنے نفس کی، زیادہ سے زیادہ دوسرے غلاموں اور اس میں فرق یہ ہوگا کہ ایک بے تلوار کے غلام ہوں گے اور ایک باتلوار؛ لیکن فی نفسِ غلامی میں کوئی فرق نہیں ہوگا، بلکہ تلوار سمیت غلامی زیادہ ننگ وعار ثابت ہوگی۔

بہر حال جو لوگ قرآن کی آیاتِ تکوین کی رو سے مادی وسائل زندگی اور مادہ کی توڑ پھوڑ یا ترکیب وتحلیل سے کچھ اسباب تعیش اور کچھ اسبابِ ہلاکت ایجاد کرتے رہنے اور بالفاظِ دیگر ان سے تاجرانہ طریق پر منتفع ہوتے رہنے ہی کو مقصد حیات اور اسلام کی اصل ترقی باور کرتے ہیں اور پھر ان پر قابو پا لینے اور ان کے ذریعہ کچھ رسمی جاہ واقتدار حاصل کر لینے ہی

کا نام خلافت اور ایمانداری بتلاتے ہیں؛ حالاں کہ ان کا یہ دعوی غلط ہے:

(۱) آیاتِ تکوین کی رو سے صحیفۂ کائنات کا مطالعہ ضروری ہے؛ لیکن معرفتِ صانع کے لئے نہ کہ محض معرفتِ مصنوعات اور مادہ کی توڑ پھوڑ کے لئے۔

(۲) مادی اقتدار ضروری ہے؛ لیکن قانونِ فطرت کو نافذ العمل بنانے اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے نہ کہ استبداد وتعیش کے لئے۔

(۳) استخلاف فی الارض ضروری ہے؛ لیکن مادی حوائج سے غنی بن کر کامل بننے اور بنانے کے لئے، نہ کہ وفورِ اسباب سے اپنی محتاجگی کو بڑھانے اور دنیا کی نقالی کرنے کے لئے۔

(۴) مدنیت اور تمدنی اکتشافات بقدر ضرورت ضروری ہیں؛ لیکن تعاونِ باہمی میں ازدیاد کے لئے؛ نہ کہ مادیت میں غلو اور رفاء فی العیش ہو جانے کے لئے۔

(۵) تسخیر کائنات ضروری ہے؛ لیکن روحانی تصرفات کی مشق بہم پہنچانے اور صورتوں کے راستہ سے حقائق تک پہنچنے کے لئے، نہ کہ مادی تصرفات میں محصور اور محدود رہ کر صورت پرستوں اور مختلف الاشکال ڈیزائنوں میں غرق ہو جانے کے لئے۔

(۶) اللہ کے دشمنوں کو خوف زدہ کرنے کے لئے امکانی تیاری (اعداد مستطاع) ضروری ہے؛ لیکن دشمن کی نقالی یا اس کی طرح عدد اور عُدد پر کلیۃ اعتماد کے ساتھ نہیں؛ بلکہ فی الجملہ ان اشیاء کی رعایت رکھ کر، قوت قلب، حوصلہ یقین اور حکیمانہ تدابیر کی ضرورت کے ساتھ۔

(۷) اور بالآخر یہ تمام امور، تمدن، سیاست، امارت، تسخیر، تکوین وغیرہ ضروری ہیں، مگر رضائے الٰہی اور قربِ حق کے لئے، نہ کہ رضائے نفس اور رضائے غیر کے لئے۔

(۸) اور خلاصہ یہ ہے جب کہ ان تمام دینی مقاصد کی تحصیل بغیر اتباع نبوی کے ناممکن ہے، جو حقیقتاً عملی قرآن ہے، تو بطور تفننِ طبع کے اگر تعدد قرآن کا نظریہ موزوں ہے تو ''تین قرآن'' کے عنوان کے ساتھ تا کہ کتاب اللہ علمی قرآن ہو، کائنات اللہ برہانی اور تمثیلی قرآن ہو اور رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس عملی

قرآن ہو، نہ کہ ''دو قرآن'' کے نظریہ کے ساتھ، جس سے تمثیلی قرآن تو سرے سے حذف ہوجائے اور عملی قرآن باقی بھی رہے، تو تلبیس کے ساتھ اور غیر واقعی ہو کر، یعنی بجائے ذاتِ نبوی کے کائنات آجائے جس سے کوئی اسوہ اور عملی نمونہ اخذ نہیں کیا جاسکتا۔(۱)

سائنسی علوم اور علومِ الٰہی کی حقیقت میں فرق:

وحی اور انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کے علاوہ اور کوئی ایسا ذریعہ علم نہیں جس کے ذریعہ انسان حقیقت کا ادارک کر سکے، حقیقت کی معرفت ایمان اور دائمی شریعت پر عمل کئے بغیر کسی اور ذریعہ سے ممکن ہی نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ تمام روایتی اور مذہبی تہذیبوں میں علم کا منبع اور ذریعہ خارجی ہوتا ہے اور یقین کا فائدہ دیتا ہے، وحی اور انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات سے حاصل شدہ علم صرف مرئی اور طبعی دینا (physical world) تک محدود نہیں ہوتا؛ بلکہ غیر مرئی دنیا (یعنی موت، برزخ، آخرت) کا بھی علم فراہم کرتا ہے، اس علم سے انسان کو اس بات کا علم بھی ہوجاتا ہے کہ انسان کون ہے، کہاں سے آیا ہے؟ مرنے کے بعد کہاں جائے گا؟ اس کا خالق کون ہے؟ اس کا مقصد زندگی کیا ہے؟، اس علم سے انسان الٰہیات، ایمانیات، اعتقادیات، مابعد الطبعیات اور مادی دنیا سے ماوراء کائنات کا علم بھی حاصل کرتا ہے اس علم کا مقصد خدا کی تلاش، قربت، معرفت اور جستجو ہے، جب کہ اس کے مقابل سائنسی تصورِ علم اس سے بالکل منفرد ہے، سائنسی تصور علم میں یقین علم کی موت ہے، اس کا منبع انسان ہے، لہٰذا وحی کے ذریعہ حاصل کیا جانے والا علم صحیح معنوں میں علم کہلانے کا مستحق ہے؛ کیونکہ اس علم کی بنیاد انسان سے باہر ہے، یعنی خدا کی طرف سے ہے، سائنسی علوم تصورِ علم میں جس علم (knowledge) پر یقین ہو وہ سائنسی وفلسفے کی دنیا میں علم ہی نہیں کہلاتا؛ علم کی بنیاد پر علم کا آغاز اور علم کا انجام شک ہے، شک سے ماوراء علم بلا شک وشبہ دائرہ علم سے خارج ہے، جدید سائنس (modern science) درحقیقت وحی کے علم الرغم اور بغاوت پر مبنی علم کا نام ہے: جو یہ کہتا ہے

(۱) یہ سارا مضمون قاری محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم کی کتاب ''ایک قرآن'' اور سائنس اور اسلام'' کا خلاصہ ہے۔

انسان ہی مرکز کائنات (Centre of he universe) ہے، معبود اور فاعل خود مختار ہے، خالق خیر وشر ہے، علم کی تشکیل وحی کے بغیر خالصتاً عقل کی بنیادوں پر کی جاسکتی ہے، عقل کو بنیاد بنا کر ایک ایسے علم کی تعمیر کی جاسکتی ہے جو نہ صرف آفاقی ہوگا؛ بلکہ ہر قسم کی ایمانیات، نظریات ومعروضات سے پاک ہوگا؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام دعوے جھوٹے ہیں، مغرب کا اہم ترین فلسفی (Hume) اصول استقراء (Induction) کی منطقی اور تجرباتی توجیہہ کو ناممکن تصور کرتا ہے کہ سائنس کو عقلی طور پر واضح نہیں کیا جاسکتا ہے۔(۱)

سائنس اور مذہب کی تعلیمات میں فرق

مذہب کی تعلیمات وحی پر مبنی ہوتی ہیں؛ جب کہ سائنس صرف عقل اور حواس ظاہرہ پر، حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی جو عقل ودانش ہوتی ہے، اس کی بہ نسبت سائنسدانوں کے علم وعقل پر حقیقی معنی میں علم وعقل کے الفاظ کا اطلاق نہیں ہوگا۔

مذہب کی بنیاد انبیاء کرام علیہم السلام پر موقوف ہوتی ہے اور انبیاء کرام علیہم السلام کا علم قطعی اور ان کے تمام نظریات وتحقیقات محکم اور یقینی ہیں اور فلاسفہ اور اہل سائنس کا علم مشکوک اور ان کی بہت سی نظریات وتحقیقات محکم اور یقینی ہیں اور فلاسفہ اور اہل سائنس کا علم مشکوک اور ان کی بہت سی تحقیقات ظنی اور تخمینی ہیں؛ کیوں کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کا تعلق علم کے حقیقی سرچشمہ رب کائنات سے ہے، جس کا علم ساری کائنات کو محیط اور جس کے علم میں بھول چوک کا کوئی امکان ہی نہیں، قرآن کریم میں ہے کہ "لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى"، دوسری جگہ ہے "أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ"(۲)

بخلاف سائنسدانوں کے کہ ان کے علم کا تعلق یا تو ان کے افکار سے ہے یا تجربوں سے یا مشاہدات سے جن میں کسی ایک کو بھول چوک اور غلطی سے ماوراء نہیں قرار دیا جاسکتا ہے، حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اور سائنس دانوں کے مابین ایک

(۱) ذاکر نائک، ایک تجزیہ، ایک تحقیق: ۷۷، سمیع الحق، مکتبہ عمر فاروق، شاہ فیصل کالونی، کراچی
(۲) الملک: ۱۴

اور فرق یہ بھی ہے کہ ہر آنے والا سائنس دان اپنے پیش رو کی تغلیط ومخالفت کو اپنی زندگی کا ایک اہم کارنامہ سمجھتا ہے؛ چنانچہ مشہور فلسفی عالم لطفی جمعہ کے بقول ارسطو طالیس نے اپنے ماقبل الٰہیین کی پوری پوری تردید کی یہاں تک کہ ان سب سے برأت حاصل کرلی۔

اور حضرات انبیاء علیہم السلام کی شان یہ ہے کہ ہر آنے والا پیغمبر اپنے سابق پیغمبر کی کھلے دل سے تصدیق وتائید کرتا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بات نقل کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"وَإِذْ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُم مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِن بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ" (۱)

"اور جب عیسیٰ ابن مریم نے فرمایا کہ: اے بنی اسرائیل میں تمہارے پاس اللہ کا بھیجا ہوا ہوں کہ مجھ سے پہلے تورات ہے، میں اس کی تصدیق کرنے والا ہوں، اور میرے بعد جو ایک رسول آنے والے ہیں جن کا نام احمد ہوگا ان کی بشارت دینے والا ہوں"

یہی فرق انبیاء کرام علیہم السلام کے دیئے ہوئے علم اور ان کے دیئے ہوئے نظریات وافکار کی غیر مشکوک اور تخمینی ہونے پر ایک بین دلیل ہے، ورنہ ایک سائنسدان دوسرے کی کس طرح تردید ومخالفت کرسکتا ہے؟ اور ظاہر ہے کہ جب تغلیط وتردید کررہا ہے تو ضرور ایک نہ ایک غلطی پر ہوگا۔(۲)

کیا سائنسی تحقیقات پر قرآن فہمی موقوف ہے؟

بعض لوگ جدید سائنس سے مرعوب ہوکر یہ راگ الاپ رہے ہیں کہ قرآن میں اتنی آیات کا تعلق سائنس سے ہے، قرآن کی کوئی آیت بھی جدید سائنس سے نہیں ٹکراتی ،تو سوال یہ ہے کہ ان سائنسی تحقیقات پر قرآن کا سمجھنا موقوف ہے اور چاند، مریخ اور زہرہ پر کمندیں پھینکنے کی مساعی قرآن کریم کے تقاضے کو پورا کرتا ہے: اس کو سمجھنے کے لئے

(۱) الصف:۶۰ (۲) حوالہ سابق:۱۲۸

حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب کا یہ اقتباس جو آیت قرآنیہ "تَبَارَكَ الَّذِي جَعَلَ فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا" کے ذیل میں مذکور ہے:

"حقائق کونیہ اور قرآن: - یہاں ایک بات اصولی طور پر سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآن کریم کوئی فلسفہ یا ہیئت کی کتاب نہیں جس کا موضوع بحث حقائق کائنات یا آسمانوں اور ستاروں کی ہیئت وحرکات وغیرہ کا بیان ہو مگر اس کے ساتھ ہی وہ آسمان وزمین اور ان کے درمیان کی کائنات کا ذکر بار بار کرتا ہے ان میں غور وفکر کی طرف دعوت بھی دیتا ہے۔قرآن کریم کی ان تمام آیات میں غور کرنے سے واضح طور پر یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ قرآن عزیز ان حقائق کونیہ کے متعلق انسان کو صرف وہ چیزیں بتلانا چاہتی ہے جن کا تعلق اس کے عقیدے اور نظریئے کی درستی سے ہو یا اس کے دینی اور دنیوی منافع ان سے متعلق ہوں۔مثلاً قرآن کریم نے آسمان وزمین اور ستاروں، سیاروں کا اور ان کی حرکات اور حرکات سے پیدا ہونے والے آثار کا ذکر بار بار ایک تو اس مقصد سے کیا ہے کہ انسان ان کی عجیب وغریب صنعت اور مافوق العادت آثار کو دیکھ کر یہ یقین کرے کہ یہ چیزیں خود بخود پیدا نہیں ہوگئیں ان کو پیدا کرنے والا کوئی سب سے بڑا حکیم سب سے بڑا علیم اور سب سے بڑا صاحب قدرت وقوت ہے اور اس یقین کے لئے ہرگز اس کی ضرورت نہیں کہ آسمانوں کی اور فضائی مخلوقات اور ستاروں ، سیاروں کے مادے کی حقیقت اور ان کی اصلی ہیئت وصورت اور ان کے پورے نظام کی پوری کیفیت اس کو معلوم ہو بلکہ اس کے لئے صرف اتنا ہی کافی ہے جس کو ہر شخص مشاہدہ سے دیکھتا اور سمجھتا ہے کہ شمس وقمر اور دوسرے ستاروں کے کبھی سامنے آنے اور کبھی غائب ہوجانے سے نیز چاند کے گھٹنے بڑھنے سے اور رات دن کے انقلاب سے پھر مختلف موسموں اور مختلف خطوں

میں دن رات کے گھٹنے بڑھنے کے عجیب وغریب نظام سے جس میں ہزاروں سال سے کبھی ایک منٹ ایک سیکنڈ کا فرق نہیں آتا، ان سب امور سے ایک ادنی عقل وبصیرت رکھنے اولا انسان یہ یقین کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ سب کچھ حکیمانہ نظام یوں ہی خود بخود نہیں چل رہا، کوئی اس کو بنانے چلانے والا اور باقی رکھنے والا ہے اور اتنا سمجھنے کے لئے انسان کو نہ کسی فلسفی تحقیق اور آلات رصدیہ وغیرہ کی حاجت پڑتی ہے نہ قرآن نے اس کی طرف دعوت دی۔ قرآن کی دعوت صرف اسی حد تک ان چیزوں میں غور وفکر کی ہے جو عام مشاہدے اور تجربے سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رسول کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آلات رصدیہ بنانے یا مہیا کرنے اور اجرام مساویہ کی ہئیتیں دریافت کرنے کا مطلقا کوئی اہتمام نہیں فرمایا۔ اگر ان آیات کونیہ میں تدبر اور غور وفکر کا یہ مطلب ہوتا کہ ان کے حقائق اور ہیئات اور ان کی حرکات کا فلسفہ معلوم کیا جائے تو یہ ناممکن تھا کہ رسول اللہ ﷺ اس کا اہتمام نہ فرماتے، خصوصا جبکہ ان فنون کا رواج اور تعلیم وتعلم کا سلسلہ دنیا میں اس وقت موجود بھی تھا۔ مصر، شام، ہند، چین وغیرہ میں ان فنون کے جاننے والے اور ان پر کام کرنے والے موجود تھے۔ حضرت مسیح علیہ السلام سے پانچ سو سال پہلے فیثا غورس کا اور اس کے کچھ بعد بطلیموس کا نظریہ دنیا میں شائع اور رائج ہو چکا تھا اور اس زمانے کے حالات کے مناسب آلات رصدیہ وغیرہ ایجاد بھی ہو چکے تھے، مگر جس ذات قدسی پر یہ آیات نازل ہوئیں اور جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ننے بلا واسطہ آپ سے ان کو پڑھا انہوں نے بھی اس طرف التفات تک نہیں فرمایا۔ اس سے قطعی طور پر معلوم ہوا کہ ان آیات کونیہ میں تدبر اور غور وفکر کا وہ منشا ہرگز نہ تھا جو آج کل کے بعض تجدد پسند علما نے یورپ اور اس کی تحقیقات سے متاثر

ہو کر اختیار کی ہے کہ خلائی سفر، چاند اور مریخ وزہرہ پر کمندیں پھینکنے کی مساعی قرآن کریم کے تقاضے کو پورا کرنا ہے۔

بس صحیح بات یہ ہے کہ قرآن کریم نہ ان فلسفی اور سائنسی تحقیقات قدیمہ یا جدیدہ کی طرف لوگوں کو دعوت دیتا ہے نہ ان سے بحث کرتا ہے اور نہ ان کی مخالفت کرتا ہے۔ قرآن کریم کا حکیمانہ اصول واسلوب کائنات ومخلوقات سے متعلقہ تمام فنون کے بارے میں یہی ہے کہ وہ ہر فن کی چیزوں سے صرف اسی قدر لیتا اور بیان کرتا ہے جس قدر انسان کی دینی یا دنیوی ضرورت سے متعلق ہے اور جس کو انسان آسانی سے حاصل بھی کر سکتا ہے اور جس کے حصول پر تخمینا اس کو اطمینان بھی ہو سکتا ہے فلسفیانہ دور از کار بحثوں سے اور ایسی تحقیقات سے جو عام انسانوں کے قابو سے باہر ہیں اور جن کو کچھ حاصل کر لینے کے بعد بھی قطعی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ہی صحیح ہیں بلکہ حیرانی اور شکوک بڑھتے ہیں، ایسی بحثوں میں انسان کو نہیں الجھاتا۔ کیونکہ قرآن کی نظر میں انسان کی منزل مقصود ان تمام زمینی اور آسمانی کائنات ومخلوقات سے آگے اپنے خلّاق کی مرضیات پر چل کر جنت کی دائمی نعمتوں اور راحتوں کو حاصل کرنا ہے۔ حقائق کائنات کی بحث نہ اس کے لئے ضروری ہے اور نہ اس پر پورا عبور انسان کے بس میں ہے۔ ہر زمانے کے فلاسفروں اور ماہرین فلکیات کے نظریات میں شدید اختلافات اور روزمرہ کے نئے انکشافات اس کی واضح دلیل ہیں کہ کسی نظریہ اور تحقیق کو یقینی اور آخری نہیں کہا جا سکتا۔ انسانی ضرورت سے متعلقہ تمام فنون، فلکیات، کائنات فضا، ابرِ باراں، خلا، طبقات الارض، پھر زمین پر پیدا ہونے والی مخلوقات، جمادات، نباتات، حیوانات سے اور عام انسان اور انسانی علوم وفنون، تجارت، زراعت صنعت وغیرہ ان سب میں سے قرآن حکیم صرف ان کی روح

اور مشاہداتی حصہ کو اس قدر لیتا ہے جس سے انسان کی دینی یا دنیوی ضرورت متعلق ہے، دوراز کار تحقیقات کی دلدل میں انسان کو نہیں پھنساتا؛ البتہ کہیں کہیں کسی خاص مسئلے کی طرف اشارہ یا صراحت پائی جاتی ہے۔

اس تمام تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ کائنات افلاک وفضا اور کائنات اراضی میں غور وفکر اس حیثیت سے کہ انہیں پیدا کرنے والے کے وجود اور توحید اور اس کی بے مثال علم وقدرت پر استدلال کیا جا سکے عین مقصود قرآنی ہے اور قرآن جا بجا اس کی دعوت دے رہا ہے اور اس حیثیت سے کہ ان چیزوں سے انسان کے معاشی مسائل کا تعلق ہے وہ بھی ضرورت کی حد تک منشا قرآنی ہے اور قرآن اس کی طرف بھی دعوت دیتا ہے مگر اس فرق کے ساتھ کہ معاش اور معاشی ضروریات کو اصل مقصد قرار دیکر اس میں انہماک نہ کرے؛ بلکہ اس موجودہ زندگی کو اصلی زندگی کی طرف ایک سفر کا درجہ قرار دے کر اس کے مطابق اس میں مشغول ہو اور تیسری حیثیت چونکہ انسانی ضرورت سے زائد بھی ہے اور اس کا حصول بھی مشکل ہے اس میں عمر عزیز صرف کرنے سے گریز کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہاں سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ موجودہ سائنس کی جدید ترقیات وتحقیقات کو عین منشا قرآنی سمجھنا بھی غلط ہے جیسا کہ بعض تجدد پسند علما نے لکھا ہے اور قرآن کو ان کا مخالف کہنا بھی غلط ہے جیسا کہ بعض قدامت پسند علماء نے کہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن نہ ان چیزوں کے بیان کے لئے آیا ہے نہ یہ اس کا موضوع بحث ہے نہ انسان کے لئے ان کا حاصل کرنا آسان ہے نہ انسانی ضروریات سے اس کا کوئی تعلق ہے۔ قرآن ان معاملات میں ساکت ہے۔ تجربات ومشاہدات سے کوئی چیز ثابت ہو جائے تو اس کو قرآن کے منافی کہنا بھی صحیح نہیں۔ چاند کے

اوپر پہنچنا، رہنا بسنا اور وہاں کی معدنیات وغیرہ سے نفع اٹھانا وغیرہ سب اس میں داخل ہیں ان میں سے کوئی چیز مشاہد اور تجربہ سے ثابت ہو جائے تو اس کے انکار کی کوئی وجہ نہیں اور جب تک ثابت نہ ہو خوامخواہ اس کے تصورات باندھنا اور اس میں عمر عزیز کے اوقات صرف کرنا بھی کوئی دانشمندی نہیں۔ **واللہ سبحانہ وتعالی اعلم**"(۱)

جدید اور قدیم سائنس کا فرق

جدید اور قدیم سائنس کے تقابلی مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ سترہویں صدی تک سائنس نے کامل الحاد کا رنگ اختیار نہیں کیا تھا، کوپرنیکس، کیپلر، گیگلو، نیوٹن اور سائنس کے دوسرے علمبرداروں میں سے کوئی بھی خدا کا منکر نہ تھا، مگر یہ کائنات کے اسرار کی جستجو میں الٰہی نظریہ سے قطع نظر کر کے ان قوتوں کو تلاش کرنا چاہتے تھے، جو اس نظام کو چلا رہی ہیں، لیکن اس نظریہ نے جدید وقت میں ایک بے خدا سائنس تیار کرنے میں مرکزی کردار ادا کیا؛ کیونکہ سائنس کے نزدیک انسان کا کائناتی تسلط ہی اصل حقیقت اور مقصد انسانی ہے۔

(۱) قدیم سائنس میں فطرت کا مطالعہ برائے مطالعہ ہوتا تھا، جب کہ جدید سائنس میں تسخیر فطرت کے لئے ہوتا ہے۔

(۲) قدیم سائنس معاشرے کے لئے ایک خادم کی حیثیت سے کام کرتی تھی جب کہ جدید سائنس حاکمانہ تسلط قائم کرتی ہے۔

(۳) قدیم سائنس کا وجود حقیقت کے تصور سے نکلتا تھا، وہ جو حقیقت مطلق اور حقیقتِ ازلی ہے جیسے باری تعالی، اس کے برعکس جدید سائنس کا تصور حقیقت مطلقہ "خدا" سے انکار پر مبنی ہے۔

(۴) قدیم سائنس میں زندگی کا ایک مقصد اور نصب العین ہوا کرتا تھا، جب کہ جدید سائنس نے مادی ترقی کو فروغ دے کر انسان کو ہر گناہ میں مبتلا کر دیا، زندگی کا مقصد، لہو ولعب اور پر تعیش زندگی گذارنا قرار دیا، جس کے لئے ایجادات کا

---

(۱) معارف القرآن: ۶/ ۴۸۹، ۴۹۰

سیل رواں چل رہا ہے۔

(۵) جدید سائنس کا تعلق سرمایہ داری سے ہے، اگر جدید سے سرمایہ داری کو الگ کر دیا جائے تو جدید سائنس کی بنیادیں ہی متزلزل ہو جائیں گی، جدید سائنس اور سرمایہ داری لازم وملزوم ہیں۔(۱)

سائنس اور مفروضات

قیاس وگمان، مفروضات، اندازوں کے ذریعے سائنس کا سفر آگے بڑھتا ہے، کوئی سائنسداں سائنسی نتائج کو قطعی اور حتمی تسلیم نہیں کرتا، سائنسداں کہتے ہیں کہ ہم ایک وقت میں سب کچھ نہیں جان سکتے، ہم ایک وقت میں مادہ کا مقام جان سکتے ہیں یا اس کی رفتار، اسی طرح تمام سائنسی نظریات تجربات کے بعد قائم نہیں کرتے، بہت سے سائنسی نظریات قیاس وگمان، وجدان اور اندازے پر قائم کئے جاتے ہیں، جیسا کہ (yulawa) نے مختلف ذرات کے بارے میں پیشن گوئی کی تھی جو پوری ہوئی، مشاہدات اور تجربات ہونے کے بعد کوئی یہ صلاحیت نہیں رکھتا کہ وہ یہ ثابت کرے کہ یہ ٹھیک ہے، یا غلط۔

اس بحث سے یہ بات معلوم ہوئی کہ بڑے بڑے سائنسی نظریئے پہلے صرف مفروضات کی سطح پر ہوتے ہیں، تجربات اور مشاہدات کے نتائج کی بنیاد پر اخذ نہیں کئے جاتے، جیسے آئن اسٹائن کا نظریہ اضافیت ۱۹۱۳ء میں منظر عام پر آیا تھا اور اس کی تصدیق وتائید ۱۹۱۹ء میں ہوئی تھی، مفروضات، قیاس، وجدان اور گمان سے بڑے بڑے نظریئے وجود میں آتے ہیں، اور بعد میں تصدیق وتوثیق ہوتی ہے، لہٰذا سائنس کو حقیقی علم کیسے کہا جا سکتا ہے؟(۲)

جدید سائنس کے نقصانات

جدید فلسفہ اور جدید سائنس جس کی بنیاد ہی مذہبی قیود کی آزادی پر رکھی گئی ہے،

(۱) ذاکر نائک، ایک تجزیہ، ایک تحقیق،:۷۷، سمیع الحق، مکتبہ عمر فاروق، شاہ فیصل کالونی، کراچی
(۲) ذاکر نائک، ایک تجزیہ، ایک تحقیق،:۹۹، سمیع الحق، مکتبہ عمر فاروق، شاہ فیصل کالونی، کراچی

ایک مدت سے بڑی آزادی کے ساتھ پھلنے پھولنے کے بعد اپنے ثمرات وبرکات دنیا کو دے رہی ہے، آیئے اس چلتی پھرتی دینا کا ایک سرسری جائزہ لے لیں۔

سائنس کی نت نئی ایجادات اور انکشافات انسان کا فائدہ کم اور نقصان کا زیادہ موجب بن سکتی ہیں، ہاتھ سے کام کرنے کے بجائے اگر انسان مشین سے کام کرنے لگے، جانوروں پر سفر کرنے کے بجائے اگر ریل، موٹر اور بحری وہوائی جہازوں پر میں دوڑنے لگے، ڈاک چوکیوں کے بجائے آج موبائیل فون، ٹیلیفون اور انٹرنیٹ پر خبر رسانی ہونے لگی تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انسان پہلے سے زیادہ خوش حال ہو گیا، ان چیزوں سے اس کی جس قدر خوشحالی بڑھ سکتی ہے، آج جنگی سامان، راکٹ، ایٹم اور ہائیڈروجن بم اور ایسے ایسے آتشیں سامان جنگ وجود میں آچکے ہیں کہ اب اگر انسان چاہے تو چند گھنٹوں میں اپنے مسکن یعنی کرہ ارضی کو مخلوق سمیت عدم کی راہ دکھا سکتا ہے، پھر تمدن کے نئے نئے مسائل اور نئے نئے حالات سامنے آنے کی وجہ سے مختلف قسم کے نئے علوم، نئے قوانین حیات، نئے ضوابط سیاست وجہانبانی، نئے اصولِ تجارت اور نئے اندازِ کاروبار بھی ایجاد ہو گئے ہیں، ان تمام نئے اسباب ووسائل اور نئی ایجادات ومصنوعات کی اتنی افراط وبہتات کی حالت میں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ خود حضرت انسان اب کس حال میں ہے؟ اس مشینی دور میں کیا ایسا تو نہیں ہے کہ خود انسان بھی کمانے، کھانے اور اڑانے کی ایک مشین ہی بن کر رہ گیا ہے، ہر وہ انسان جس کے چہرے پر دو آنکھیں، سینے میں دل اور سر میں دماغ موجود ہے، وہ دیکھ سکتا ہے، سمجھ سکتا ہے کہ مصنوعات اور سامان آرام وآسائش کی کثرت کی بدولت آج انسان کا یہ حال ہے کہ وہ ختم نہ ہونے والی نفسانی خواہشات اور سفلی جذبات کا غلام بن کر قلبی سکون اور روحانی طمانینت کو کھو بیٹھا ہے، پہلے ادوار میں جب کہ طرز زندگی اور فیشن ایک عرصہ کے بعد بدلا کرتے تھے، اب نئے نئے سامان مہیا ہونے کی وجہ سے ہر لحظہ بدلتے رہتے ہیں۔

انہیں سائنسی ایجادات کی وجہ سے انسان آج اصلی دودھ، گھی اور انڈوں سے محروم ہے، البتہ ملٹی نیشنل کمپنیوں کے گھی، دودھ، پنیر اور دہی دستیاب ہیں، جس کے

بارے میں ہم نہیں جانتے کہ اس میں خالص حصہ کتنا ہے؟ اور ملاوٹ کتنی؟

تاریخ انسانی میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ لوگوں کو نیند نہ آئی ہو، سونے کے لئے گھر سے باہر سونے کی دکانوں میں جانا پڑا ہو، یورپ میں لوگوں کو نیند نہیں آتی؛ لہٰذا ان کی خدمت کے لئے ملٹی نیشنل کمپنیوں نے سونے کی دکانیں کھول رکھی ہیں، جہاں پیسے دے کر سوجایئے، وہ کونسی تہذیب ہے؟ اس کا کیا نظام اور اقدار لی؟ کہ لوگ اپنے گھر کے بستروں کے بجائے بازار میں سونا چاہتے ہیں۔

سائنس وٹکنالوجی کی بدولت بے پردگی، عریانی، سینما اور تھیٹر کی زندگی اور محرک اشیاء، شراب وغیرہ کے استعمال سے انسان کے شہوانی جذبات حد اعتدال سے زیادہ برانگیختہ ہونے لگے، جس کے نتیجے میں صحت اور اعتدال مزاج سے ہاتھ دھونا پڑا، پھر طرح طرح کی بیماریاں اور پھر ہسپتالوں اور علاج ومعالجوں کی جکڑ نے انسانی زندگی کو مفلوج بنا رکھا ہے، کسی بالا وبرتر طاقت کے سامنے جوابدہی کے احساس کے فقدان کی وجہ سے ہر معاملہ اور زندگی کے ہر موڑ پر افراط وتفریط کی راہ اختیار کر لی گئی ہے، یہ بات ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ جس وقت خواہشات وجذبات کا سمندر موجزن ہو، اسباب مہیا ہوں، کوئی روکنے والا نہ ہو، تو ایک عقل منداور زیرک سے زیرک انسان کس حد تک جا پہنچتا ہے؛ چنانچہ یورپی ممالک میں مرد وزن کے آزادانہ اختلاط اور ساتھ ساتھ تعدد ازدواج پر پابندی کی وجہ سے ایک طرف تو نکاحوں اور طلاقوں کی بھرمار ہے، خاندانی نظام تباہ ہوکر رہ گیا ہے، کیا ایسی تہذیب جو جدید سائنس زیر سایہ پنپ رہی ہے، اس کو ترقی کا نام دینا کہاں تک موزوں ہوسکتا ہے؟

ماحولیاتی تباہی اور سائنس وٹیکنالوجی

سائنس اور ٹیکنالوجی نے جہاں نت نئی ایجادات عطاء کی ہیں اور صنعتی سرگرمیوں نے بے پناہ ترقی کر کے انسان کو اس کی ضروریات مہیا کی ہیں، وہاں ان ایجادات نے انسان کو نفسیاتی امراض میں مبتلا کیا ہے اور بہت سے تباہ کن نقصانات بھی پہنچائے ہیں، صنعتی ترقی زمین کے درجہ حرارت میں تیز رفتار اضافہ کا سبب بن رہی ہے، جو محض چند

دہائیوں میں دنیا آگ کی بھٹی میں تبدیل ہوگئی ہے، یہ سب کچھ ان نئی مصنوعات (products) کے استعمال کی وجہ سے جس کی وجہ سے ہر فرد انفرادی لذت حاصل کرنے اور دنیا کو جہنم میں تبدیل کرنے میں لگا ہوا ہے، گذشتہ کئی سالوں سے کاربن ڈائی آکسائیڈ (Co_2) اور گرین ہاوس گیسز (Green House Gases) برف پگھلنے کے باعث خارج ہوکر فضاء میں شامل ہورہی ہیں، اور گلوبل وارمنگ میں مسلسل اضافہ ہورہا ہے، کئی ماہرین کا کہنا ہے کہ اگر آئندہ پچاس برس میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کے اخراج کے عمل کو کم نہیں کیا گیا تو تباہی پھیل جائے گی۔

اسی ماحولیاتی تبدیلیوں کی وجہ سے آرٹک اور بحر اٹلانٹک کی برفانی تہیں اور گرین لینڈ کے علاقوں میں برف مسلسل پگھل رہی ہے، ماہرین کے اندازے کے مطابق ۲۰۵۰ تک دنیا کے ہزاروں شہر ڈوب جائیں گے، تو دوسری طرف عالمی جنگ بھی پانی کے حصول کے لئے لڑی جائے گی۔(۱)

انسان جس کو سائنس دریافت نہ کرسکی

جدید علماء سائنس طویل تجربہ کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ سائنسدانوں کی عقل وفکر حقیقت انسانی کے ادراک میں بے بس اور ناکام ثابت ہوئی ہیں؛ کیونکہ انسان کے جسم میں حیاتیاتی مظاہر گویا ایک طلسماتی جنگل ہیں جہاں رنگ برنگ کے بے شمار درخت مسلسل طور پر اپنی جگہ اور اپنی شکل بدلتے رہتے ہیں۔

چنانچہ فرانس کے ایک بڑے نامی گرامی کاریل نے پوری ایک کتاب ''نامعلوم انسان'' کے نام سے لکھ ڈالی کہ انسان نے گو بے شمار علوم وفنون کے کتب خانے بھر ڈالے ہیں؛ لیکن خود یہ یا اس کی انسانیت ہے کیا؟ اس سے جاہل ہی چلا جاتا ہے، اس طرح ایک اور بڑے عالم سائنس نے ایک ضخیم کتاب ''سائنس کے ناحل مسائل'' پر لکھ ڈالی، اس میں بھی سائنس کا سب سے ناحل مسئلہ انسان کو قرار دے کہا:

''سائنس دان کسی بحث ومسئلہ میں اس سے زیادہ عاجز درماندہ جتنا خود

(۱) حوالہ: سابق:۱۰۲

انسان کے معاملے میں: وہ ایٹم کو توڑ سکتا ہے، بعید سے بعید ستاروں کی روشنی کی تحلیل وتجزی کرسکتا ہے، وہ بجلی کو غلام بنا سکتا ہے، لیکن یہی سائنسدان جب زندگی کی حقیقت اور اس سے بڑھ کر خود اپنی یا انسان کی حقیقت سمجھنا چاہتا ہے تو مشکلات ہی مشکلات سے دوچار ہوتا ہے‘‘ (۱)

سائنس صرف مشاہدات اور تجربات پر مبنی ہے

سائنس صرف محسوسات، تجربات اور مشاہدات کی بات کرتی ہے، مثلاً جب کوئی آدمی یہ دریافت کرے کہ پانی کیسے بنا؟ تو اس کے اس سوال کے جواب سے یہ منشا ہوگا کہ جواب دینے والا پانی بننے کے واقعے کا تجزیہ کر کے یہ بتلائے کہ جس مرکب کا نام پانی ہے، اس کی ترکیب کن عناصر سے ہوئی ہے اور ان عناصر کے باہم ملانے کا طریقہ کیا ہے؟ تو سوال کا یہ منشا جواب کو واقعات اور ان کے مشاہدات اور ان کے اور ان کے درمیان علت ومعلول کے رشتوں کی دریافت تک محدود کردینا ہے، سائنس صرف محسوسات ومشاہدات اور تجربات کی بات کرتی ہے۔

جب کہ مذہب صرف حسی مشاہدوں ہی نہیں؛ بلکہ بصیرت کی آنکھوں سے ضروری ہے؛ تاکہ اس مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر خدا کو پہچانا جائے، یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ان لوگوں کو اندھا اور بہرا کہہ دیا جو محسوسات میں الجھ گئے؛ حالانکہ وہ حقیقی طور پر اندھے اور بہرے نہیں تھے؛ بلکہ بصیرت اور معرفت خداوندی سے اندھے اور بہرے تھے۔

قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے:

’’صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ‘‘ ادراک بالحواس کے ہوتے ہوئے اگر معرفتِ الٰہی کی سعادت سے محروم ہوجائے تو اس کو اندھا اور بہرا ہی کہا جاتا ہے، چاہے وہ مادی ترقی کتنا ہی کرے، اسی وجہ سے سائنس اندھی اور بہری جو کسی صورت میں معرفتِ خداوندی کے لئے کافی نہیں۔

سائنس جو کہ صرف حسی اور مشاہداتی اور تجرباتی حقائق سے گفتگو کرتی ہے اور جو چیز

(۱) مذہب اور سائنس: ۵۱-۵۲

مشاہدہ اور تجربہ میں نہ آسکے اس کا انکار کرتی ہے، جب کہ مذہب ہزاروں ایسی چیزوں کی باتیں کرتا ہے جو ماوراءِ محسوس ہو، محسوس اور غیر محسوس کا یہ فرق ان دونوں کے درمیان تضاد اور تخالف کو نمایاں کرتا ہے، مثلاً معجزہ، ملائکہ، روح، جنت، دوزخ، حضرت آدم علیہ السلام کا مٹی سے پیدا ہونا، حیات بعد الممات، خدا، آخرت، وحی، مذہب میں بنیادی عقائد ہیں اور ایک مذہبی آدمی ان سب عقائد کو محسوس نہ ہونے کے باوجود دل وجان سے قبول کرتا ہے۔

سائنس جو خدا کا انکار کرتی ہے، آخرت اور وحی کا انکار کرتی ہے، اس کی اسلام کاری کیسے ممکن ہوسکتی ہے، البتہ اسے محض اپنے آرام وراحت کے حصول کے لئے ذریعہ ضرور بنایا جاسکتا ہے، لیکن اس کو مطمحِ نظر اور مقصد زندگی نہیں بنایا جاسکتا، چونکہ اس سائنس نے اور جدید ایجادات نے انسان کا اپنے خدا سے روحانی رشتہ ختم کردیا، جس نے خدا کی جگہ ایک نئے دیوتا کا روپ دھار لیا اور جس نے انسان کو قائم بالذات ہونے کے زعم میں مبتلا کردیا اور اس کو عیش پرست کردیا۔(۱)

اقبال یہاں نام نہ لے علم وخودی کا
موزوں نہیں مکتب کے لئے ایسا مقالات
بہتر ہے کہ بے چارے ممولوں کی نظر سے
پوشیدہ رہیں باز کے احوال ومقامات
محکوم کے حق میں ہے یہی تربیت اچھی
موسیقی وصورت گری وعلم ونباتات

قرآن کی ہزاروں آیتیں جدید سائنس کی مخالف ہیں

بہت سارے لوگوں کا یہ دعوی کہ قرآن کے کسی بھی بیان کو جدید سائنس کی روشنی میں غلط نہیں قرار دیا جاسکتا، یہ دعوی بالکل غلط اور حقائق سے کوسوں دور ہے اور یہ قرآن اور سائنس کو بے جا ایک لائن میں لا کھڑا کرنا سعی لاحاصل ہے، قرآن بالکل علاحدہ چیز ہے اور سائنس بالکل علاحدہ چیز ہے جیسا کہ مذکور ہوا، قرآن کا مقصود بھی سائنس بیان کرنا نہیں ہے۔

(۱) حوالہ سابق: ۱۲۷

قرآن کہتا ہے کہ: خدا موجود ہے جو کہ تمام مخلوقات کا رب ہے، قرآن مجید میں اللہ تعالی فرماتے ہیں: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ"(۱) "وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ، إِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ" (۲) "اَللّٰهُ لَاۤ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ" (۳) قرآن کہتا ہے کہ خدا موجود ہے؛ لیکن سائنس تو خدا کا انکار کرتی ہے؛ کیوں کہ سائنسی نظریہ میں اب انسان حواس ظاہرہ اور اپنی عقل کی بناء پر بالغ ہو چکا ہے، اب کسی ماورائے انسان، وجود یا ذریعے سے علم ورہنمائی کا محتاج نہیں، اس کے برعکس قرآن یہ علم اور یقین بخشتا ہے کہ خالق کا وجود ہے، وہی خالق کھانا بھی کھلاتا ہے، شفاء بھی بخشتا ہے، اختیار وقدرت بھی صرف اسی کو حاصل ہے، انسان ہر لحظہ اس کا فقیر اور غلام ہے۔

قرآن میں متعدد مقامات پر آخرت کا ذکر آیا ہے، کیا کوئی جدید سائنس سے آخرت کو ثابت کر سکتا ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

"مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحاً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ
عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ" (۴)

اسی طرح صلاۃ (نماز) کا ذکر قرآن میں ۶۷ مقامات پر، رسول پیغمبر انبیاء کا ذکر ۵۰۰ سے زائد مقامات پر، جنت ۷۰ مرتبہ، جہنم ۶۴ مرتبہ، جنات ۷۰ مرتبہ، قیامت: ۶۶ مرتبہ بیان کئے گئے ہیں، لیکن ان میں کوئی بھی چیز جدید سائنس سے ثابت نہیں کی جا سکتی ہے، ان متعدد آیات کا سائنس کے ساتھ ٹکراؤ ہے؛ بلکہ جدید سائنس کی روشنی میں یہ آیات غلط ہیں۔

جدید سائنس عیسائیت سے مادیت پرستی تک

جدید سائنس کی اصل حقیقت کو سمجھنے کے لئے ہمیں مادیت پرستی کی تاریخ کا مطالعہ کرنا ہوگا، عیسائیت سے مادیت کا یہ سفر کیسے طئے ہوا؟ کون اس کا ذمہ دار تھا؟ یورپ

(۱) الفاتحۃ:۱ (۲) البقرۃ:۱۱۵
(۳) البقرۃ:۲۵۵ (۴) البقرۃ:۲۶

میں نصف سے زیادہ زمینوں کی ملکیت کا کلیسا کے پاس ہونا، کلیسا کی دولت پرستی میں مبتلا ہونا، قوت کے زعم میں مظالم کا ارتکاب یونانی سائنسی نظریات کو عیسائی الٰہیات واعتقادات کا حصہ بنانے کے بعد اس کے سائنسی ابطال کو تسلیم کرنے سے انکار اور ان مذہبی وسائنسی نظریات کے ابطال کرنے والوں پر بہیمانہ تشدد کی تاریخ جب کلیسا نے ہزاروں عیسائیوں اور عورتوں پر مظالم کئے، قتل کیا، عورتوں کو زندہ جلا دیا، کلیسا کے اخلاقی انحطاط کے نتیجے میں کلیسا کی شکست، کلیسا کی دنیا پرستی اور بربریت کے ردعمل میں یہ پروٹسٹنٹ ازم کا فروغ، تحریک تنویر، تحریک رومانویت، قومی ریاستوں کا قیام، سرمایہ داری کا وجود، جدید فلسفہ اور جدید سائنس کا فروغ، نوآبادیات کا قیام کے نتیجے میں دولت کی لوٹ مار اور اس کے دروازے سمیٹ کر یورپ میں جمع ہونا، سرمایہ دارانہ فکر کا ارتقاء، سرمایہ دارانہ نظام کی تاریخ، امریکی ریاست کا قیام، بنیادی حقوق کے منشور کی تاریخ وغیرہ وغیرہ، ان مباحث پر گہری نظر کے بغیر جدید سائنس کے حیرت انگیز ارتقاء کی کہانی سمجھ میں نہیں آسکتی۔

سائنس: نیچرل فلاسفی کہلاتی تھی

انیسویں صدی کے آخر تک سائنس نیچرل فلاسفی کہلاتی تھی، لیکن انیسویں صدی کے اختتام پر اسے فلسفہ سے الگ کر دیا گیا اور سائنس خود ایک ذریعہ علم بن گئی، سائنس اور فلسفے میں جب تک ہم آہنگی تھی چیزوں کی حقیقت اور قدر کا سوال برقرار رہتا تھا مثلاً یہ سوال موجود رہتا تھا کہ میں پانی کیوں پیوں؟ لیکن سائنس جب فلسفے سے الگ ہوئی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ سوال بے کار تھا کہ پانی پیا جائے یا نہیں، اس سوال کی ضرورت ہی نہ رہی، اصل سوال یہ ہوگیا کہ اچھے طریقے سے پانی کیوں پیا جائے دلیل (reason) اور (rational) عقلیت جب آلاتی (instrumental) ہوگئے تو سائنس فلسفہ سے الگ ہوگئی، جدید سائنس کا بانی نیوٹن ایک مذہبی شخص اور فلسفی بھی تھا، اس نے بھی سائنس کو فلسفے سے الگ نہیں سمجھا، اس کی کتاب کا نام (principle mathematical natural philosophy) تھا، نیوٹن نے نصف زندگی مذہبی کتابیں لکھیں، وہ خدا

کے وجود کا قائل تھا؛ لیکن اس کا خیال کہ خدا کائنات بنا کر اس سے الگ تھلگ ہو گیا ہے، اس تصور نے ایک نئے بے خدا سائنس تیار کرنے میں مرکزی کردار ادا کیا، لطف کی بات ہے کہ ڈیکارٹ نے بھی ذہن سے خدا کا تصور پیش کیا، کانٹ نہایت مذہبی شخص تھا؛ لیکن ڈیکارٹ، نیوٹن اور کانٹ جو خدا کے قائل تھے ان کے پیش کردہ فلسفہ کے نتیجے میں خدا کا وجود مغربی تہذیب و تاریخ سے خارج کر دیا گیا، قدیم سائنس میں خدا کا تصور، خدا کا کردار موجود تھا؛ کیوں کہ وہاں انسان مخلوق تھا، خالق نہ تھا، اپنے مخلوق ہونے کا احساس اسے خدا اور آخرت کے تصورات سے وابستہ رکھتا تھا، لیکن (newonian) تصور کائنات کے بعد کائنات ایک (subject) ہے اور انسان محض (object) اس کے نتیجے میں مادی تصور کائنات وقوع پذیر ہوا جس نے خالق کی جگہ لے کر انسان کو خالق قرار دیا۔

ہندوستان کی دولت ایجادات کی باعث

اٹھارہویں صدی کے وسط تک انگلستان زرعی ملک تھا؛ لیکن پلاسی کی جنگ کے بعد ہندوستان کی دولت سمندری طوفان کی طرح انگلستان میں آنے لگی، یہی دولت ایجادات کا باعث بنی، برطانیہ کی صنعتی تاریخ کے ماہر ڈاکٹر کنگھم نے لکھا ہے کہ ’’ایجادیں اتنے بڑے پیمانے پر صرف اس لئے نہیں ہوئیں کہ جیسے لوگوں کی ذہانت آناً فاناً پھوٹ پڑی ہو، اصل وجہ یہ تھی کہ ملک میں سرمایہ اتنا اکھٹا ہو گیا تھا کہ ان ایجادات کا مصرف نکلنے کا امکان پیدا ہو گیا تھا‘‘ اس موضوع پر (leo huberman) کی کتاب (man`s worldy goods) بہت سے حقائق آشکارا کرتی ہے، نو آبادیات میں لوٹ مار کہانی مائیکل مین کی کتاب (Darkside of Democracy) اور رومیل کی کتاب (Death by Government) میں پڑھی جا سکتی ہے، مائیکل مین کہتا ہے کہ نسلی قتل عام مغربی تہذیب کی خصوصیت ہے جس کی بنیاد قوم پرستی پر رکھی گئی جو مغربی تہذیب کی بہیمیت کا فطری جواز مہیا کرتی ہے، اس کے الفاظ ملاحظہ کیجئے:

the unfortunately for us murderous ethnic

cleansing is not primitive or it belongs ti our own eivilization and us .most say this is the rise of nationalism in the world and this ture

پچاس کروڑ لوگوں کی لاشوں اور کھربوں روپیئے کی لوٹ مار پر جدید سائنس کی عمارت کھڑی کی گئی ہے، لوٹ مار کی یہی دولت اس حیرت انگیز سائنسی ترقی کی بنیاد بنی جو آج ہر شخص کو فطری حقیقی ضروری اور عین اسلامی معلومات دیتی ہے، کیا مذہبی ریاستیں جبر و استبداد اور لوٹ مار کا مذہبی جواز فراہم کر سکتی تھیں، مذہبی معاشروں میں اس بہیمیت کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا، عیسائیت کی خامیوں، کوتاہیوں اور مذہبی استبداد کے باوجود اس کا موازنہ اگر مہذب متمدن جدید سائنسی یورپی انسانوں کی لوٹ مار سے کیا جائے تو ہمیں مذہبی دور جو مغرب کی اصطلاح میں (dark age) تاریک دور، جدید دور (enligthened) روشن خیال کے مقابلے میں زیادہ شریفانہ، محبت اور قابل رشک نظر آئے گا، اس کے ظلم و جبر بھی لامحدود نہیں تھے، محدود ہی تھے؛ کیوں کہ عسکری آلات بھی اسی علمیات کے نتیجے میں تیار ہوئے تھے، جس کے مطابق تمام مخلوق اللہ کا کنبہ سمجھی جاتی تھی اور اس کنبہ کی ہولناک تباہی کا تصور الہامی مذاہب میں نہیں پایا جاتا، مذہبی تہذیبوں کی سائنس ایٹم بم بنانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی، اس سوال پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ مغربی تہذیب و معاشرت تین سو سال میں ایک حضرت عمر ؓ، حضرت عمر بن عبد العزیز ؒ، حضرت جنید بغدادی ؒ جیسی ہستی پیدا نہ کر سکی، اس سوال کو دوسری طرح بھی دیکھا جائے کہ اسلامی معاشرے میں نیوٹن، آئن اسٹائن کیوں پیدا نہیں ہو سکے اور اسلامی تاریخ جدید سائنس کیوں مہیا نہ کر سکی؟

سائنسی ترقی میں براعظموں کی لوٹ مار: مرکزی عامل

مغربی فکر و فلسفے سے نکلنے والی خلق جدید کی بہیمیت کی اس تاریخ کو اور سرمایہ داری کی ابتدائی تاریخ کو پڑھے بغیر سائنسی ایجادات و ترقی کا سبب سمجھ میں نہیں آ سکتا، اس

سلسلے میں جو مظالم ہوئے ہیں اور براعظموں کو جس طرح لوٹا گیا ہے خصوصا امریکہ ، آسٹریلیا، افریقہ، ایشیا اور وہاں کے لوگوں کو جس طرح تہس نہس کر کے مال لوٹا گیا، اس کے نتیجے میں صنعتی ترقی اور سائنس کا پہیہ چلا ہے، صنعتی ترقی کے لئے کروڑوں افریقی غلام استعمال ہوئے ، اور ہلاک کئے گئے ، غلاموں کا اس طرح استعمال کسی مذہبی معاشرے میں نہیں ہوا، ۱۷ویں صدی سے پہلے ہونے والے عیسائیوں کے مظالم وغیرہ بھی اس کے سامنے ہیچ ہیں، پھر سرمایہ داری نے مزدور کا جو حشر کیا وہ عبرتناک ہے، جاگیرداری کے زمانے میں ظلم تھا؛ لیکن محدود۔(۱)

سائنسی تحقیقات کا مقصد: سرمایہ کس کا تھا؟

ہم لوگ سرمایہ کاری کے آغاز ارتقاء کی تاریخ سے واقف نہیں ہیں ؛ لہٰذا سائنسی ایجادات سے متاثر ہوجاتے ہیں، اس وقت بھی جتنی سائنسی تحقیقات ہورہی ہیں اس کے پیچھے سرمایہ کس کا ہے؟ سائنسی تحقیقات کا مقصد کیا ہے؟ انسانیت کی خدمت؟ یا دولت کمانا؟ دولت کمانا ہی اصل مقصد ہے، لہٰذا یہ محرک تیزی سے ایجادات کا سبب بن رہا ہے ؛ لہٰذا سائنس یا اس کی ترقی کو مغرب کے فلسفے تاریخ، مابعد الطبعیات، نوآبادیات میں لوٹ مار، تصور انسان تصور نفس اور تصور کائنات تصور آخرت کو سمجھے بغیر مجرد دیکھنا اور سمجھنا مناسب نہیں ہے، کوئی مذہبی ریاست دوسروں کو لوٹ کر ترقی کا پہیہ نہیں چلا سکتی، ایسے ظالم ترقی یافتہ معاشرے کو ترجیح دینا دین کا تقاضہ بن جاتا ہے۔آج کل سائنس کمپیوٹر کے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتی، یعنی آج سائنس ٹکنالوجی کی محتاج ہوچکی ہے، اور ٹیکنالوجی سرمایہ کی محتاج ہے اور سرمایہ صرف سرمایہ کے ذریعے ہی اپنی مقدار میں اضافہ کرسکتا ہے، لہٰذا سائنس، ٹیکنالوجی اور سرمایہ داری کے مثلث کے بغیر سائنسی ترقی کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے؛ چوں کہ ٹیکنالوجی پر بھاری سرمایہ کاری کرنا پڑتی ہے، لہٰذا سرمایہ کار صرف ان شعبوں میں ٹیکنالوجی پر سرمایہ کاری کرتا ہے، جہاں وہ بھاری منافع حاصل کرسکے، اس کے نتیجے میں سائنس کے افق بڑھنے کے بجائے سکڑ رہے ہیں اور سائنس وٹیکنالوجی

(۱) اس کے لئے مطالعہ کیجئے مفتی ابولبابہ شاہ منصور کی کتاب ’’ہسپانیہ سے امریکہ تک‘‘

صرف سرمایہ داری کے بہترین خدمت گذار بن گئے ہیں، دنیا میں سب سے زیادہ سرمایہ طب، آلات حرب وضرب، تفریحات اور تعیّشات فسق وفجور کی صنعتوں میں ہورہی ہے، جس کا علمی نام میڈیکل ٹیکنالوجی انفارمیشن ٹیکنالوجی ہے، جدید سائنس وٹیکنالوجی کو اس حال تک مادیت پرستی کے مغربی فلسفے نے پہنچایا تھا، پہلے پہل سائنس مغربی فکر وفلسفے سے الگ ہوگئی اور اب وہ خود ایک علم بن چکی ہے ، حالانکہ دنیا کی تاریخ میں سائنس اور فلسفہ میں چولی دامن کا ساتھ رہا ہے، دنیا کا پہلا فلسفی تھیلس سائنس دان بھی تھا، تھیلس کے فلسفے اور سائنس کا مقصد حقیقت مطلق تک رسائی تھا وہ نہیں جو آج کی سائنس اور فلسفے کا محور ومرکز ہے کہ دنیا کی زندگی کو کس طرح خوبصورتی سے بسر کیا جائے اور زمین کو جنت بنا دیا جائے ، تمام بڑے بڑے سائنس داں فلسفی تھے، لیکن بیسویں صدی میں صرف سائنس داں پیدا ہورہے ہیں، یہ سائنس دان فلسفی نہیں ہیں؛ لہٰذا سائنس کی سمت، اہداف مقرر کرنے والا کوئی عامل باقی نہیں رہا، اس پر نقد کرنے والا کوئی ادارہ اس سے وابستہ نہیں رہا؛ لہٰذا جدید سائنس جو اول دن سے آزادی کی قدر پر اپنے وجود کا اظہار کررہی تھی، اب بے مہار ہوگئی ہے اور اس کے پیدا کردہ خطرات کا ازالہ مشکل ہوگیا ہے ، اس جدید سائنس کی اسلامی صورت گری ممکن ہی نہیں ، البتہ عارضی طور پر دفاعی ضرورت کے پیش نظر اس سے حدود کے اندر استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کا کام، تسخیر کائنات یا تسخیر قلوب انسانی

مسلمانوں کے زوال پر گفتگو میں بار بار ان کے سائنسی اور جدید علوم وٹیکنالوجی سے محرومی کو زوال کا اصل سبب قرار دیا جاتا ہے، لیکن جب انبیاء علیہم السلام اور ان کے پیروکار پرانی تہذیبوں سے نبرد آزما ہوئے تو وہ کون سے پڑھے لکھے تھے ان کے پیروکار فلسفی سائنس داں تھے، یا ان پڑھ تھے، قرآن نے بعض انبیاء علیہم السلام کے پیروکاروں کے بارے میں ان کے مخالفین کا قول نقل کیا ہے کہ تمہاری پیروی تو ’’اراذل‘‘ نے اختیار کی ہے اور خود تم مادی طور پر ہمارے مقابلے میں کچھ نہیں، تاریخ بتاتی ہے کہ اس وقت کے جدید علوم تو انبیاء علیہم السلام کے مدمقابل کے پاس تھے؛ لیکن انہوں نے سب پر فتح

پائی، یہ اعتراف کہ ہم تسخیر کائنات میں پیچھے رہ گئے احمقانہ اعتراف ہے، اصل بات یہ ہے کہ ہم تسخیر قلوب انسانی میں پیچھے رہ گئے جو انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا اصل مقصد ہے جس کی بنیاد محبت کا بے پناہ جذبہ ہے، انبیاء علیہم السلام تسخیر کائنات کے لئے نہیں تسخیر قلوب انسانی کے لئے آتے ہیں، یہ کام صرف اور صرف محبت سے ہوتا ہے، عدل وانصاف مساوات سے نہیں، محبت سے کیوں کہ تمام نیکیوں کا سرچشمہ اللہ سے محبت ہے، یہ محبت جتنی مستحکم ہوگی عروج بھی اسی قدر مستحکم ہوگا، انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ سے محبت کا یہ چراغ ہر دل میں روشن کرتے ہیں، اللہ سے محبت کرنے والے انبیاء علیہم السلام اس محبت کو امتوں میں تقسیم کرتے ہیں، اور ہر دل کو یاد الٰہی کا آستانہ بناتے ہیں، وہ صرف اللہ سے نہیں اس کی مخلوق سے بھی محبت کرتے ہیں اور مخلوق سے محبت انہیں اس دردمندی سے آشنا کرتی ہے، جس کے ذریعے مخلوق کو جہنم کی آگ سے بچانے کے لئے بے قرار ہوجاتے ہیں، ان کی بے قراری اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو مداخلت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور وہ فرماتے ہیں: "لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ"(۱) اے نبی (ﷺ)! شاید تم اس غم میں اپنی جان کھو دو گے کہ یہ ایمان نہیں لاتے۔

محبت کا یہ معاملہ اپنے مخاطب کفار و مشرکین سے صرف انبیاء علیہم السلام کا نہیں ہوتا؛ بلکہ ان کے پیروکاروں کا بھی یہی رویہ ہوتا ہے؛ اسی لئے قرآن نے مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ تم ان سے محبت رکھتے ہو، مگر وہ تم سے محبت نہیں رکھتے "تُحِبُّونَهُمْ وَلَا يُحِبُّونَكُمْ"(۲) یہ محبت انبیاء علیہم السلام اور ان کے امتی اپنی امتوں سے کرتے ہیں اور اس محبت کا چراغ ہر دل میں روشن کرتے ہیں، یہ محبت ہی دلوں کے دروازے کھولتی ہے اور انقلاب بپا کرتی ہے، انبیاء اور ان کے پیروکاروں کا یہ معاملہ صرف انسانوں سے نہیں ہوتا، تمام مخلوق سے محبت کا یہی عالم ہوتا ہے، امتیوں کو یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ جانوروں کو کس طرح ذبح کیا جائے کہ انہیں پانی پلایا جائے، تیز چھری استعمال کی جائے؛ تاکہ انہیں اذیت نہ ہو، خوف زدہ نہ کیا

(۱) الشعراء:۳ (۲) آل عمران:۱۱۹

جائے، زندہ جانور کے سامنے اس کے ساتھی کو ذبح نہ کیا جائے، الگ رکھا جائے، ان پر زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے وغیرہ وغیرہ۔

انبیاء علیہم السلام انسان تیار کرتے ہیں، مشینیں نہیں

انبیاء علیہم السلام کتابیں نہیں لکھتے، وہ انسان تصنیف کرتے ہیں، وہ انسان تیار کرتے ہیں، ایسے انسان جو بڑی بڑی کتابوں، بڑے بڑے فلسفوں اور بڑے بڑے سائنس دانوں پر بھاری ہوں؛ کیوں کہ انسان تیار کرنا سب سے مشکل کام ہے، سائنس وٹیکنالوجی اپنی جدید شکل میں بھی کوئی انسان تیار کرنے سے قاصر ہے، انبیاء علیہم السلام لوگوں کے دلوں کی دنیا بدل لیتے ہیں، سائنس وٹیکنالوجی آسائش دے سکتی ہے، وہ نہ ذہنِ انسانی کو پڑھ سکتی ہے، نہ دلوں کو بدل سکتی ہے، دلوں کو بدلنے کا طریقہ صرف اور صرف انبیاء علیہم السلام اور ان کے صالح امتیوں کے پاس ہوتا ہے، انبیاء علیہم السلام انسانوں کے قلوب تسخیر کرتے، ان کے ذہن تبدیل کرتے اور ان کے طرز زندگی اور طرز معاشرت کو بدل ڈالتے ہیں، وہ امتوں کے موضوعات گفتگو تک بدل دیتے ہیں؛ حتی کہ ان کے سونے اور جاگنے کے اوقات بھی بدل دیتے ہیں، دنیا کو تبدیل کرنا زمین وآسمان کو بدل ڈالنا آسان ہے، لیکن کسی انسان کو تبدیل کرنا محال ہے، یہ کام انبیاء علیہم السلام اور ان کے امتی کرتے ہیں۔

اللہ پر قربان ہونے میں کامیابی

نظامِ کائنات پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ ہر ادنی اعلیٰ پر قربان ہورہا ہے، ہر بے اہمیت، قیمتی اور اہم چیز پر قربان ہورہی ہے، جمادات، زمین، پتھر وغیرہ قربان ہورہے ہیں نباتات یعنی پودوں پر، ان کے لئے بچھ جاتے ہیں، سڑ جاتے ہیں، پھٹ جاتے ہیں، اسی طرح نباتات، پھل پھول، گھاس پھوس قربان ہوجاتے ہیں حیوانات کے لئے اور بڑا سے بڑا درندہ حیوانات میں سے گرفتار ہوجاتا ہے انسان کے ہاتھوں، اب انسان کا قیمتی ہونا یہ ہے کہ وہ رب کریم پر قربان ہوجائے، یہ اس کی اہمیت کا گرجانا ہے کہ وہ اپنے سے ادنی پر اپنے آپ کو کھپائے۔

ڈگری کا روزی سے کوئی تعلق نہیں، حکماء نے کہا: اگر روزی عقل سے ہوتی تو سارے بیوقوف بھوکے مرجاتے اور یہ انسان اتنا مکار ہے کہ اپنی چالبازی سے درندوں کی روزی کھا جاتا ہے، ایک ہی سال ایک ہی ڈگری حاصل کرنے والے ہم سبق دو طلباء کا مقدر ایک نہیں ہوتا، ایک باپ کے دو عالم یا دو حافظ بیٹوں کا نصیب بھی ایک نہیں ہوتا؛ لہٰذا دو کفِ جو کو مقصد زندگی بنالینا دین اور قوم وملت کے اعتبار سے نہایت نقصان دہ ہے، سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ موجودہ عصری علوم کو معرفتِ رب اور خدمت انسانیت سے کاٹ دیا جائے؛ اس لئے سارے عالم میں یہ واقعات سامنے آرہے ہیں کہ جو جتنا بڑا اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے وہ اتنی بڑی چوری اور رشوت ستانی اور گھوٹالے میں ملوث ہے، ایک طرف لڑکیوں کے لئے اعلیٰ تعلیم کے ادارے قائم ہورہے ہیں، دوسری طرف مہیلا عدالتوں اور دار القضاء میں طلاق وخلع کا بازار گرم ہے، شرحِ پیدائش گھٹتی جارہی ہے، مادری شفقت سے دل خالی ہوتے جارہے ہیں، انجینئروں اور ڈاکٹروں کی تعداد میں بھی اضافہ ہے اور دار المعمرین، آرام گھر، اولڈ ایج ہوم کی تعمیرات کا سلسلہ بھی جاری ہے، جو نیوکلیر کا مالک ہے، وہی انسانیت کا قاتل ہے، دنیا کا سب سے بڑا ڈاکو اور چور ہے، دوائیں اصل مواد سے خالی ہوتی جارہی ہیں، ڈاکٹر مردوں سے بھی حصولِ مال کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔

علامہ اقبال کیا خوب فرماتے ہیں:

خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر
لب خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ
ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ
گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما
لے کے آئی مگر تیشہ فرہاد بھی ساتھ

اور علامہ اقبال نے اور جگہ فرمایا:

علم کا مقصود ہے پاکی عقل وخرد
فقر کا مقصود ہے عفت قلب ونگاہ

یہ مشینوں کی ترقی ہے نہ کہ انسان کی

کیا انسان بجائے نو مہینے کے دو مہینے میں بننے لگ گیا، بجائے دو پیر کے چار پیر سے چلنے لگ گیا، دنیا گلوبل ویلیج تو بن گئی؛ لیکن بہن بھائی کو بھی ایک دسترخوان پر کھانے کے لئے سالوں، مہینوں کا انتظار کرنا پڑتا ہے، مواصلاتی فاصلہ، کمیونیکیشن گیاپ ختم ہوگیا؛ لیکن محلے کی بیوہ اور یتیم کی خبر لینے والا کوئی نہیں، تیز رفتار سواریاں بڑھ گئیں، پھر بھی انسان کے پاس وقت نہیں، ماؤں کو دواخانہ لے جانے والی اولاد نہیں، ہواؤں میں انسان تو اڑنے لگ گیا؛ لیکن زمین پر چلنے کا سلیقہ نہ مل سکا، انسانی ترقی یہ ہے کہ حیاء میں اضافہ ہو، اخلاق واقدار میں ترقی ہو، انسانیت کا درد بڑھے، رشتے استوار ہوں، اللہ والی مائیں اور گودیں نصیب ہوں، قوم وملت کے بہی خواہ، تعمیر کے خواہش مند وجود میں آئیں، موجودہ اسکولس اور کالجس کے فارغین نہ اپنے لئے باعث راحت ہیں، نہ والدین کے آنکھ کا تارہ ہیں، نہ اہل محلہ کے لئے نافع ہیں، نہ حکومت کے لئے نفع بخش ہیں، نہ یہ گاندھی جی کا خواب ہے نہ ابوالکلام اور ڈاکٹر ذاکر حسین کا نظریۂ تعلیم۔

علامہ اقبال نے فرمایا تھا:

تیرا وجود سراپا تجلی افرنگ
کہ تو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر
مگر یہ پیکر خاکی خودی سے ہے خالی
فقط نیام ہے تو زر نگار وبے شمشیر
تری نگاہ میں ثابت نہیں خدا کا وجود
مری نگاہ میں ثابت نہیں وجود تیرا


عصری تعلیم
اسلامی نقطۂ نظر

اسلام میں عصری فنون کی اہمیت و شرعی حیثیت

اسلام نے علومِ دینیہ کے سوا دیگر علوم و فنون کے حصول کو شجرِ ممنوعہ نہیں قرار دیا، بلکہ ضرورت اور حاجت کے درجے اور مراتب کے لحاظ سے ان علوم اور فنون کے حصول کی بھی ترغیب دی ہے اور ان علوم و فنون کے حصول پر ابھارا ہے جس پر تمدنی زندگی کا دارومدار ہے اور جن پر انسانی معاشرت، عمرانی ضرورت اور جسمانی آسائش کا مدار ہے، اسلام نے نہ صرف ہمیں دنیاوی، عمرانی، اجتماعی اور معاشرتی ضرورتوں کے لئے دوسرے علموں کے حاصل کرنے کی اجازت دی؛ بلکہ بعض موقعوں پر ہمت افزائی کی ہے اور ان کے تعلیم و تعلم میں دینی حیثیت سے کسی قسم کی مداخلت روا نہیں رکھی ہے، ارشادِ نبوی ہے "أَنْتُمْ أَعْلَمُ بِأُمُوْرِ دُنْيَاكُمْ"(۱) "تم اپنے دنیوی امور کے زیادہ جاننے والے ہو"۔

یہ ملحوظ رہے کہ ہر کام میں اصل مدار انسانوں کی نیتوں پر رکھا گیا ہے؛ اس لئے اگر کسی دنیوی سی دنیوی علم کی تحصیل بھی مثلاً مخلوقِ خدا کو فائدہ پہنچانے اور شہر و وطن کے لئے لوگوں کو آرام دینے اور اہل و عیال کی پرورش کرنے کے لئے اس نیت سے کئے جائیں ان کے حقوق ادا کر کے اور انہیں فائدہ پہنچا کر حکمِ خداوندی بجالانے کی توفیق حاصل ہوگی تو بارگاہِ الٰہی سے اسے مقبولیت کی سند عطا ہوگی۔

احادیث میں اس مفہوم کی مختلف روایتیں ہیں مثلاً:

☆ اگر کسی شخص نے اپنے بچے کے منہ میں ایک لقمہ بھی اس نیت سے ڈالا کہ حکمِ خداوندی پورا ہوگا تو اللہ تعالیٰ اس کی نیت کا اجر عطا فرمائے گا، بہت سے ایسے عمل جو دنیاوی معلوم ہوتے ہیں وہ حسنِ نیت سے اُخروی اعمال بن جاتے ہیں، اور بہت سے وہ عمل جو دینی نظر آتے ہیں، وہ نیت کی برائی سے دنیوی بن جاتے ہیں۔

(۱) مسلم: باب وجوب امتثال ما قاله، حدیث: ٦٣٢٣

بہرحال اس حدیثِ مبارک میں رسول اللہ ﷺ نے دنیوی امور سے متعلق علوم کی جانکاری کی ترغیب دی ہے اور ان پر بھی علم کا اطلاق کیا ہے، البتہ وہی اخلاصِ نیت، خدمتِ خلق اور حلال رزق کی تلاش اس سے مقصود ہو۔

☆ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان جو بھی میوہ دار درخت لگاتا ہے یا کھیتی کرتا ہے اور اس سے پرندے، آدمی اور چوپائے کھاتے ہیں اس کا ثواب اس کو ملتا ہے: "فَيَأْكُلُ مِنْهُ سَبُعٌ أَوْ طَائِرٌ أَوْ شَيْءٌ إِلَّا كَانَ لَهُ فِيهِ أَجْرٌ"(۱) پودا لگانے پر وہ اگر کسی جانور کے لئے نفع بخش ہو جائے تو اس میں ثواب ملتا ہے تو کیا انسانی جان کی حفاظت کے لئے اگر کوئی انجکشن اور کوئی ٹائبلٹ وغیرہ بناتا ہے تو اس کو ثواب نہیں ملے گا؟

☆ حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: میں نے رسول اللہ ﷺ کی دو باتوں کو یاد کر رکھا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ہر چیز پر بھلائی فرض کر دی ہے تو جب بھی تم قتل کرو تو اچھی طرح قتل کرو اور جب بھی تم ذبح کرو تو اچھی طرح ذبح کرو اور تم میں سے ایک کو چاہئے کہ اپنی چھری کو تیز کرے اور اپنے جانور کو آرام دے۔(۲)

جب جانور کے ذبح کرنے میں مہارت اور لیاقت ضروری ہے تو کیا انسان کے آپریشن اور رہائش کے لئے تعمیرات میں مہارت ضروری نہیں؟ چنانچہ انجنیئرنگ اور میڈیکل میں مہارت ضروری ہوئی۔

☆ ہر اچھی اور مفید چیز میں مہارت اور قابلیت مطلوب ہے اس کی طرف حضور اکرم ﷺ کی یہ روایت اشارہ کرتی ہے: نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ عز وجل یہ پسند کرتا ہے جب کوئی کام کیا جائے تو مہارت کے ساتھ کیا جائے:

(۱) مسلم: باب فضل الغرس والزرع، حدیث: ۴۰۵۲

(۲) مسلم، باب الأمر بإحسان الذبح، حدیث: ۵۱٦۷

"إِنَّ اللهَ يُحِبُّ إِذَا عَمِلَ اَحَدُ كُمْ عَمَلًا أَنْ يُّتْقِنَهُ"(۱)

☆ اور ایک روایت میں پیشہ ور مومن کی فضیلت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا: "إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُؤْمِنَ الْمُحْتَرِف" (۲) اللہ عزوجل پیشہ ور مومن کو پسند فرماتے ہیں۔

☆ اور ایک جگہ ارشاد نبوی ﷺ ہے: "إِنَّ اللهَ جَمِيْلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ" (۳) اللہ عزوجل جمال کے حامل ہیں اور جمال اور خوبصورتی کو پسند فرماتے ہیں۔

اس میں جسمانی ظاہری جمال کے ساتھ کردار کا جمال، کارکردگی کا جمال، خدمات کا جمال شامل ہے، ہر وہ چیز جس میں کمال و جمال حاصل کیا جانا اللہ کی مشیت کے موافق ہو۔

اسی کو مرحوم اکبر الہ آبادی نے یوں کہا تھا:

تم شوق سے کالج میں پھلو، پارک میں پھولو
جائز ہے غباروں میں اڑو، چرخ پر جھولو
بس ایک سخن بندۂ ناچیز کا رہے یاد
اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

☆ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو علمِ نجوم اور علمِ انساب سیکھنے کا حکم کیا تھا:

"تم علمِ نجوم سیکھو، تاکہ تم خشکی اور تری کی تاریکیوں میں راہیاب ہو جاؤ، پھر اس سے رک جاؤ" (تَعَلَّمُوْا مِنْ هٰذِهِ النُّجُوْمِ مَا تَهْتَدُوْنَ بِهِ فِيْ ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ثُمَّ أَمْسِكُوْا) اور ایک روایت میں ہے: تم علمِ نجوم سیکھو تاکہ راستے

(۱) شعب الایمان: الأمانات وما یجب أدائها إلی أهلها، حدیث: ۵۳۱۴، علامہ ہیثمی فرماتے ہیں: اس کو ابویعلی نے روایت کیا ہے، اس میں مصعب بن ثابت ہیں جن کی ابن حبان نے توثیق کی ہے اور ایک جماعت نے ان کو ضعیف قرار دیا ہے۔

(۲) المعجم الاوسط: من اسمہ مقدام، حدیث: ۸۹۳۴، اس حدیث کو سالم سے عاصم بن عبید اللہ کے علاوہ کسی نے روایت نہیں کیا اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے یہ روایت اسی سند سے مروی ہے، اس کو روایت کرنے میں ابوالربیع السمان منفرد ہیں۔

(۳) مسلم: باب تحریم الکبر وبیانہ، حدیث: ۹۱

کی رہنمائی حاصل کرسکو اور علمِ انساب سیکھو تاکہ صلہ رحمی کرسکو، رشتہ داری جوڑسکو "تَعَلَّمُوْا مِنْ هٰذِهِ النُّجُوْمِ مَا تَهْتَدُوْنَ بِهَا وَتَعَلَّمُوْا مِنَ الْأَنْسَابِ مَا تَتَوَاصَلُوْنَ بِهَا" (۱)

☆ نبیٔ کریم ﷺ نے غزوۂ خندق کے موقع سے حضرت سلمانِ فارسی رضی اللہ عنہ کے مشورہ سے ایرانیوں کی معروف جنگی حکمتِ عملی سے فائدہ اٹھایا تھا اور مدینہ کے اطراف ان کے مشورہ کے مطابق خندق کھدوائی تھی اور اس طرح دشمنوں کے حملہ کے خطرے سے حفاظت کر لی تھی۔(۲)

☆ ان ہی سلمانِ فارسی رضی اللہ عنہ کے مشورہ سے غزوۂ طائف کے موقع پر آپ ﷺ نے دو نئے آلاتِ حرب استعمال فرمائے جو بعض روایات کے مطابق حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے خود اپنے ہاتھ سے بنائے تھے، اُن میں ایک منجنیق تھی جسے اس زمانے کی توپ کہنا چاہئے، اور دبابے تھے جسے اس دور کے ٹینک کہا جاسکتا ہے۔(۳) اس زمانے کے اعتبار سے نشانے پر مارنے والی ٹکنالوجی حاصل کرنا اور اس کا صحیح اسعمال کرنا بھی ضروری ہے۔

☆ حافظ ابنِ کثیر رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے:

آپ ﷺ نے دو صحابہ حضرت عروہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت غیلان رضی اللہ عنہ کو باقاعدہ شہرِ "جرس" بھیجا، تاکہ وہاں سے دبابے، منجنیق اور صنبور کی صنعت سیکھ کر آئیں، "جرس" شام کا مشہور صنعتی شہر تھا اور صنبور دبابے کی ہی طرح کا ایک آلہ تھا، جسے اہلِ روم جنگوں میں استعمال کرتے تھے، چنانچہ یہ دونوں صحابہ غزوۂ حنین اور غزوۂ طائف میں اسی لئے شریک نہ ہوسکے کہ وہ دونوں حضرات شام میں یہ صنعت

(۱) حیاۃ الصحابۃ: ۳/۲۷۸، کنز العمال: علم النجوم، حدیث: ۲۹۴۳۰۔

(۲) سیرت ابن ہشام: ۲/۲۲۴ (۳) البدایۃ والنہایۃ: ۴/۳۴۸

سیکھ رہے تھے۔(۱)

☆ حافظ ابن جریر رحمہ اللہ نقل کرتے ہیں:

''زراعت کی ترقی کے لئے آپ نے اہلِ مدینہ کو زیادہ سے زیادہ کاشت کرنے کا حکم دیا اور پیداوار کو بڑھانے کے لئے یہ تدبیر بتائی کہ کھیتوں میں اونٹوں کی کھوپڑیاں استعمال کیا کریں'' ''وَاَكْثِرُوْا فِيْهَا مِنَ الْجَمَاجِمِ''(۲)

زراعت اور معدنیات سے فائدہ اٹھانے کے لئے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اُطْلُبُوْا الرِّزْقَ فِيْ خَبَايَا الْأَرْضِ'' یعنی زمین کی پوشیدہ نعمتوں میں رزق تلاش کرو'(۳)

☆ عرب بحری بیڑے سے ناواقف تھے، لیکن حضور ﷺ نے مسرت کے ساتھ پیشن گوئی فرمائی کہ میری امت کے کچھ لوگ اللہ کی راہ میں جہاد کے لئے سمندری موجوں پر اس طرح سفر کریں گے جیسے تخت نشین بادشاہ ''يَرْكَبُوْنَ هَذَا الْبَحْرَ الْخَضِرَ كَالْمُلُوْكِ عَلَى الْأَسِرَّةِ''(۴) اور پھر مسلمانوں کی پہلی بحریہ کے بیڑے کے فضائل بیان فرمائے، چنانچہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرتِ عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں پہلا بحری بیڑا تیار کیا، اور اس سے مسلمانوں کی تگ وتاز، قبرص اور صقلیہ تک پہنچ گئی، یہاں تک پورا بحرۂ روم ان کے لئے مسخر ہوگیا۔

☆ حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ ان کے سو غلام تھے، ان میں

(۱) طبقات ابن سعد: ۲/۲۲۱، تاریخ طبری: ۱۶۲۹، البدایۃ والنہایۃ: ۳۴۸/۴

(۲) کنز العمال: أنواع الکسب، حدیث: ۹۸۷۶، ابن جریر کہتے ہیں: یہ سند ہمارے یہاں صحیح ہے۔

(۳) مسند ابی یعلی، مسند عائشۃ، حدیث: ۴۳۸۴، عجلونی نے ''کشف الخفاء: ۱۳۸/۱، دار احیاء التراث العربی'' میں کہا ہے کہ اس کو ابو یعلی، طبرانی اور بیہقی نے سند ضعیف کے ساتھ نقل کیا ہے۔

(۴) بخاری: کتاب الجہاد، فضل من یصرع فی سبیل اللہ، حدیث: ۲۶۴۶۔

سے ہر غلام علاحدہ زبان میں گفتگو کرتا تھا، چنانچہ حضرت ابن الزبیر رضی اللہ عنہ کو ان غلاموں میں سے ہر ایک کی زبان پر درک حاصل تھا، اور وہ ہر ایک سے اس کی زبان میں گفتگو کرتے تھے، عمرو بن قیس راوی کہتے ہیں:

''میں جب ان کو ان کے دنیوی امور ومشاغل میں دیکھتا تو ان کی دانائی اور دانشمندی سے یہ باور کرتا کہ: یہ شخص لحہ بھر کے لئے اللہ کا طلب گار نہیں ہوگا اور جب میں ان کے دینی امور اور مشاغل کو دیکھتا تو لگتا کہ شاید یہ شخص لحہ بھر کے لئے دنیا کی طرف متوجہ نہیں ہوتا''(۱)

''اِذَا نَظَرْتُ اِلَيْهِ فِيْ أَمْرِ دُنْيَاهُ قُلْتُ: هَذَا رَجُلٌ لَمْ يُرِدِ اللهَ طَرْفَةَ عَيْنٍ، وَاِذْ نَظَرْتُ اِلَيْهِ فِيْ أَمْرِ اٰخِرَتِهِ قُلْتُ: هَذَا رَجُلٌ لَمْ يُرِدِ الدُّنْيَا طَرْفَةَ عَيْنٍ''(۲)

اقوالِ اکابر

چنانچہ امام غزالی رحمہ اللہ نے حدیثِ نبوی ﷺ ''طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ''(۳) پیش کر کے جس علم کی تحصیل ہر مسلم پر ہے، اس کو دکھا کر اس علم کا بیان جس کی تحصیل فرض کفایہ ہے'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

''علوم کی اوّلاً دو قسمیں ہیں: (۱) علومِ شرعیہ (۲) علومِ غیر شرعیہ۔

علومِ شرعیہ سے میری مراد وہ علوم ہیں جو انبیائے کرام علیہم السلام سے براہِ راست حاصل ہوتے ہیں، ان کی طرف عقل کی رہنمائی اس طریقہ سے نہیں ہوسکتی، جیسے عقل کے ذریعہ علم حساب سیکھا جاتا ہے، نہ وہ تجربہ سے حاصل ہوسکتے ہیں جیسے علمِ طب کی تدوین ہوتی ہے اور نہ محض سننے سے ان کا حاصل کرنا ممکن ہے، جیسے علمِ لغت حاصل کیا جاتا ہے۔

(۱) حیاۃ الصحابہ: ۲۷۸/۳

(۲) المستدرک: ذکر عبداللہ بن الزبیر، حدیث: ۶۳۳۵

(۳) احیاء علوم الدین: الباب الثانی فی العلم: ۱۴/۱، دار المعرفۃ، بیروت

اس کے بعد جو علوم غیر شرعیہ ہیں، ان میں بعض پسندیدہ ہیں اور بعض ناپسندیدہ اور بعض ایسے جو صرف درجۂ مباح رکھتے ہیں''

۱- علومِ پسندیدہ وہ ہیں جن سے دنیاوی امور کی مصلحتیں وابستہ ہوتی ہیں جیسے علم طب اور حساب وغیرہ، پھر ان علوم پسندیدہ میں اپنے درجوں کے لحاظ سے بعض ایسے ہیں جنکا حاصل کرنا فرض کفایہ ہے، بعض ایسے ہیں جنھیں حاصل کرنا افضل ہے اور بعض ایسے ہیں جن کو حاصل کیا جاسکتا ہے، مگر ان کی تحصیل فرض نہیں ہے۔

پھر ان میں سے فرضِ کفایہ وہ علم ہے جس سے ہم دنیاوی زندگی اور کاروبار کے قائم اور باقی رکھنے میں بے پروا نہیں ہوسکتے، جیسے علم طب ہے کہ اس کی تحصیل صحت کے باقی رکھنے کے لئے لازم ہے، یا علمِ حساب ہے مختلف معاملوں، وصیتوں اور ترکہ کی تقسیم میں اس کی ضرورت ہوتی ہے، اگر کوئی شہر ان علوم کے جاننے والوں سے خالی ہوجائے، تو شہر والوں کو دقت پیش آئے گی، اور جب کوئی شخص بھی ان کا جاننے والا ان کے درمیان پیدا ہوجائے تو اس کے ذریعہ سے شہر کی ضرورتیں پوری ہوسکتی ہیں، اسلئے یہ فرض اس کی موجودگی میں دوسروں کے ذمہ سے ساقط ہوجائے گا، اسی طرح مختلف پیشے کاشتکاری، باغبانی، پارچہ بافی، ایسے ہی، حجامت اور خیاطی وغیرہ ہیں، کہ اگر ان میں سے کسی پیشہ والے سے کوئی شہر خالی ہوجائے تو زحمت پیش آئے اور بعض پیشہ والوں کی غیر موجودگی میں ہلاکت تک کی نوبت آجائے، پس جس نے بیماری اتاری، اس نے دوا بھی بتائی، ان کے استعمال کے طریقے بتائے اور ان کے مہیا کرنے کے اسباب پیدا کئے، اسلئے ان پیشوں کو چھوڑنا جائز نہ ہوگا۔

اور بعض علوم جن کا حاصل کرنا فرض نہیں، مگر افضل ہے، وہ جیسے علم حساب وطب میں باریکیاں پیدا کرنا ہے کہ انسان ان سے مستغنی نہیں ہوسکتا ہے؛ لیکن ان کی تحصیل سے فائدہ پہنچنے کے پہلوؤں میں اضافہ ہوتا ہے۔

ناپسندیدہ علوم میں سحر، شعبدہ بازی، اور نظر بندی وغیرہ ہیں اور علمِ مباح میں جیسے

ایسے اشعار کا پڑھنا جن میں رکاکت نہ ہو یا علم تاریخ وغیرہ سے دلچسپی رکھنا ہے''

پھر امام غزالی رحمہ اللہ نے بھی ایک دوسرے موقع پر بھی ''علم'' کے مصداق میں مختلف علوم اور پیشوں کو داخل کیا ہے، ان کے بیان کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے:

''جب علم تمام امور میں افضل ہے تو اس کا حاصل کرنا افضل چیز کا حاصل کرنا ہے اور اس کی تعلیم دینا افضل چیز کا مہیا کرنا ہے، اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ انسان کی پیدائش کے مقاصد دین اور دنیا دونوں کے مجموعہ پر مشتمل ہے، کیونکہ دین کا نظام جب تک دنیاوی نظام قائم نہ ہو، قائم نہیں ہوسکتا اور امر دنیاوی کا انتظام انسانوں کے کاموں اور پیشوں پر موقوف ہے اور انسانی پیشے تین قسم کے ہیں:

ایسے پیشے جو عالم کے قیام کے لئے بنیاد کے طور پر ہیں اور وہ چار ہیں: (۱) زراعت انسان کی غذا کے لئے (۲) پارچہ بافی تن پوشی کے لئے (۳) تعمیر سکونت کی جگہ کے لئے (۴) اور سیاست خاندان اور ملک کے نظام اور معیشت کے اسباب کے مہیا کرنے اور اس کی حفاظت کرنے کے لئے۔

۲۔ دوسرے وہ پیشے جو ان چاروں پیشوں کے لئے آلات اور وسیلے مہیا کریں، جیسے لوہاری، اور ندافی (دھنائی) وغیرہ۔

۳۔ تیسرے وہ پیشے ہیں جو پہلی قسم کے پیشوں کو مدد پہونچائیں، جیسے کھانا پکانے اور سینے پرونے وغیرہ کے پیشے۔

ان سب پیشوں میں پہلی قسم کے پیشوں کو فضیلت حاصل ہے، اور ان میں سے بھی سے افضل سیاست کا پیشہ ہے جس سے نظم اور ضبط کا وجود عمل میں آتا ہے اور اس کے ذریعہ سے مخلوق کی اصلاح کی جاتی ہے اور انہیں حق کی راہ دکھائی جاتی ہے۔

پیشۂ سیاست کے چار درجہ قرار پاسکتے ہیں:

۱) پہلے درجہ میں انبیائے کرام علیہم السلام کی سیاست ہے جو وہ اپنے پیغاموں سے خلق کی رہبری فرماتے ہیں۔

۲) دوسرا درجہ خلفاء اور سلاطین کو حاصل ہے، ان کے احکام عوام وخواص پر نظم وانتظام کے لئے جاری ہوتے ہیں؛ لیکن ان کی حکومت ظاہر پر ہوتی ہے، باطن پر نہیں۔

۳) تیسرے علمائے کرام ہیں، یہ انبیاء کرام کے وارث ہیں ان کی حکومت لوگوں کے دلوں پر ہوتی ہے اور یہ باطن کی اصلاح کرتے ہیں۔

۴) چوتھے واعظ ہیں جو صرف عوام کی اصلاح کرتے ہیں۔

پس ان پیشوں میں سب سے بڑھ کر پیشہ نبوت کے بعد علم کا فائدہ پہنچانا اور لوگوں کو تہذیب اور اخلاق سکھانا ہے اور یہی فن تعلیم کا حقیقی مقصود ہے‘‘(۱)

اس کے ساتھ اسلامی نقطۂ نظر سے علم دین کے حاصل کرنے والوں کے لئے یہ بھی جائز نہ تھا کہ وہ اس علم کی فضیلت پر ناز کرکے دوسرے غیر شرعی علوم کو حقارت سے دیکھیں؛ کیونکہ دنیاوی زندگی میں ان علوم کی ضرورتیں مسلم تھیں، امام غزالی رحمہ اللہ نے اس مبحث میں اس لحاظ سے بھی گفتگو کی ہے اور نتیجہ کے طور پر دکھایا ہے کہ علم دین حاصل کرنے والوں کی مثال ان مجاہدین سے دیجاسکتی ہے جو جہاد کے میدان میں اپنا سر ہتھیلی پر لئے دین کی حمایت میں لڑ رہے ہیں اور دوسرے علوم کے حاصل کرنے والوں کی مثال فوج کے اس دستہ سے دی جائے گی جو سرحدی قلعوں پر سرحد کی حفاظت کیلئے متعین ہوتا ہے‘‘۔(۲)

یہ کیا جاسکتا ہے کہ علمِ نافع میں بھی وہ علم مقدم ہے جو مقصدِ زندگی ہے جس سے آدمی اپنے عقائد، عبادات، معاملات، معاشرت اور اخلاقیات کو درست کرتا ہے یہ فرضِ

(۱) احیاء علوم الدین: الباب الثانی فی العلم: ۱/۱۴، دارالمعرفۃ، بیروت

(۲) احیاء علوم الدین: الباب الثانی فی العلم: ۱/۱۴، دار المعرفۃ، بیروت

عین ہے، اور جو علم ضرورتِ زندگی ہے (جیسے ڈاکٹر، انجینئر) اس کا درجہ بعد کا ہے اور وہ فرضِ کفایہ ہے، ضرورتِ زندگی والا علم بھی ایمانی مزاج کے ساتھ ساتھ ہی انسانیت کے حق میں نفع بخش ہوسکتا ہے، کتنے انجینئروں کو اپنے والدین کی خدمت تو کجا ان کے جنازہ کو کاندھا دینا بھی نصیب نہیں ہے، اور کتنے ڈاکٹر مردہ جنازوں کو زندہ بتلا کر روپے بٹورتے ہیں، کتنے جج ظالم زانی کے حامی بن چکے ہیں، کتنوں نے سائنس کو پڑھ کر بجائے قدرتِ خداوندی کے معترف ہونے کے ملحد اور بد دین ہوگئے۔

ہر وہ علم جس سے دین یا دنیا میں انسانیت کو فائدہ پہونچ سکتا ہو اسلام اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے، اسلام علم وحکمت کو گمشدہ خزانہ قرار دیتا ہے، آپ نے عبرانی اور سریانی زبانوں کے سیکھنے کی تعلیم دی۔

عباسی خلیفہ مامون رشید نے ۱۲۵ھ میں ’’**بیت الحکمت**‘‘ قائم کیا، یہ ایک علمی انجمن تھی، جس میں ایک رسد خانہ اور پبلک لائبریری تھی، اس کام کے لئے مامون نے دو لاکھ درہم خرچ کئے جو اس زمانے کے اعتبار سے سات ملین سے زیادہ ہوتے ہیں اور مترجمین کا ایک ایسا گروہ ملازم رکھا جو مختلف زبانوں اور علوم میں مہارت رکھتے تھے۔

مامون نے ’’ابن طریق‘‘ اور ’’حجاج بن مطرح‘‘ جیسے لوگوں کو جو مختلف زبانوں کے ماہر تھے، دوسرے ممالک میں اس لئے بھیجا کہ وہاں سے ہر فن کی علمی کتابیں مثلاً طب، فلسفہ، ریاضی کی تصانیف جو ہندی، کلدانی، عبرانی، یونانی زبانوں میں لکھی گئی ہوں، خرید خرید کر بغداد روانہ کردیں، مورخین نے لکھا ہے ان کتابوں کو سو (۱۰۰) اونٹوں پر لادا گیا۔(۱)

مسلمانوں کے ہر نفع بخش علوم کے تئیں حصول کا جذبہ اس سے سمجھ میں آتا ہے؛ چنانچہ یورپی مؤرخ لکھتا ہے:

’’جس زمانہ میں کتاب ولائبریری یورپ والوں کے لئے کوئی اہمیت

(۱) دائرۃ المعارف بحوالہ دینی وعصری تعلیم۔ مولانا سید احمد ومیض ندوی مدظلہ

نہیں رکھتی تھی اور تمام کلیساؤں میں راہبوں کے پاس سو سے زیادہ کتابیں نہ تھیں، اور وہ بھی مذہبی تھیں، اس وقت بھی اسلامی ممالک میں کافی سے زیادہ کتابیں اور لائبریریاں تھیں، خود بغداد کی لائبریری بیت الحکمت میں چار ملین اور قاہرہ کی لائبریری میں ایک ملین اور طرابلس کی لائبریری میں تین ملین کتابیں تھیں، اور تنہا اسپین میں سالانہ ستر، اسی ہزار کتابیں اکھٹا کی جاتی تھیں''(۱)

بہر حال روزِ اول سے ہی اسلام نے ضروریاتِ زندگی سے متعلق علوم وفنون کو سیکھنے کی ترغیب دی تھی، خود حضراتِ انبیاء علیہم السلام حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت نبیٔ کریم ﷺ تک ضروریاتِ زندگی سے متعلق فنون کو انبیاء علیہم السلام نے بذاتِ خود برتا ہے، یا اس کی ترغیب دی ہے، پھر یہ سلسلہ اسلام کی تاریخ میں عہدِ اخیر تک رہا ہے۔

حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی صاحب رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

''دشمن کے مقابلے کے لئے قوتِ حرب (جنگی طاقت) کو اس حد تک بڑھانا چاہئے کہ دشمن پر ہیبت طاری ہوجائے، ہمارے پہلے خلفاء وسلاطین اس حکم پر پوری طرح عامل تھے، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے خلافتِ عثمانیہ میں پانچ سو بحری جہازوں کا جنگی بیڑہ تیار کیا تھا، دشمن کی جنگی قوت کی مدافعت کا پورا سامان تیار کرتے تھے، دوسروں کے دستِ نگر نہ تھے، جیسے آج کل ہم دوسروں کے محتاج ہیں، سب مسلمانوں کو مل کر اسلحہ سازی کے کارخانے قائم کرنے چاہیئے، اور نئی نئی ایجادیں بھی کرنی چاہئے، یہ سب ''أَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ'' میں داخل ہیں''(۱)

حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب عثمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''صبر وتقویٰ اور اﷲ تعالیٰ پر ایمان وتوکل تو مسلمانوں کی اصل

(۱) تاریخ تمدنِ اسلام وعرب: ۳/ ۳۲۹ بحوالہ دینی وعصری تعلیم: از مولانا سید احمد ومیض ندوی مدظلہ

اور ناقابلِ تسخیر طاقت ہے، اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ہر زمانے اور ہر مقام کے مناسب اسلحہ اور سامانِ جنگ بھی جمع کیا جائے، رسول اللہ ﷺ نے ہمیشہ جنگی مشقوں کا اہتمام فرمایا، اس زمانے میں جنگ کے جو ہتھیار تھے ان کو جمع کرنے کی ہدایتیں فرمائیں، امامِ حدیث وتفسیر ابن کثیر نے اپنی تاریخی کتاب ''البداية والنهاية'' میں غزوۂ حنین کے تحت نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے دو صحابہ حضرت عروہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور غیلان بن اسلم رضی اللہ عنہ اس جہاد میں اسلئے شرکت نہیں کرسکے کہ وہ بعض جنگی اسلحہ اور سامانوں کی صنعت سیکھنے کے لئے دمشق کے مشہور صنعتی شہر میں اس لئے گئے تھے کہ وہاں دبابہ اور صنبور کی وہ جنگی گاڑیاں بنائی جاتی تھیں جن سے اس وقت ٹینکوں جیسا کام لیا جاتا تھا، اسی طرح منجنیق کی صنعت بھی وہاں موجود تھی۔

اس واقعہ سے یہ بھی ثابت ہوا کہ مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ اپنے ملک کو جنگی اسلحہ اور سامان کے لئے خود کفیل بنائیں، دوسروں کے محتاج نہ رہیں ورنہ یہ بھی ممکن تھا کہ یہ جنگی گاڑیاں اور منجنیق وہاں سے خرید کر درآمد کرلی جاتیں، ہمارا فرض ہے کہ ہم اس پر غور کریں......ہم جیسے لوگوں کو اس کی ضرورت کس قدر زیادہ ہے، موجودہ زمانے میں جنگ کے لئے جس طرح اسلحہ اور آلات اور سامان کی ضرورت ہے، ان میں سے کسی سے پیچھے نہ رہیں اور اس کوشش میں لگ جائیں تو قریب سے قریب مدت میں ان چیزوں کے لئے اپنے ملک کو خود کفیل بنا سکیں''(۲)

حضرت مولانا تقی عثمانی مدظلہ نت نئی ایجادات اور یورپی صنعتی انقلابات اور اس کے زندگی پر اثر کے بارے میں لکھتے ہیں:

(۱) ماہنامہ البلاغ: جمادی الاولی: ۱۳۸۷ھ

(۲) جہاد: ۵۳-۵۶، مطبوعہ کراچی

’’اس سلسلے میں ہمیں عرض کرنا یہ ہے کہ یورپ کے صنعتی انقلاب کے نتیجے میں زندگی کے ہر شعبہ میں جو تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں وہ دو قسم کی ہیں: کچھ تو تبدیلیاں وہ ہیں جو موجودہ ترقی کے لئے ناگزیر اور ضروری تھیں اور ان کے بغیر سائنس اور ٹکنالوجی کا موجودہ معیار تک پہنچنا ممکن نہ تھا، انہی کی بدولت دنیا میں نئی نئی ایجادات سے آشنائی، بڑے بڑے کارخانے بنے، پل تعمیر ہوئے، بند باندھے گئے، اور انسانی معلومات میں مفید اضافے ہوئے، صنعتی انقلاب کا پہلو بلا شبہ قابلِ تعریف ہے، عالم اسلام کے لئے اس میدان میں آگے بڑھنا ضروری ہے، اور اسلام نہ صرف یہ کہ اس راہ میں کوئی رکاوٹ عائد نہیں کرتا؛ بلکہ ’’**اعداد قوت**‘‘ کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی کچھ تبدیلیاں وہ ہیں جو صنعتی اور مادی ترقیات کے لئے ہرگز ضروری نہیں تھیں، مغرب نے انہیں خواہ مخواہ صنعتی انقلاب کے سر منڈھ دیا تھا، چنانچہ آج وہ بھی اپنی اس خامکاری پر نوحہ پڑھ رہا ہے، فحاشی وعریانی، مخلوط اجتماعات، رقص وموسیقی، سود اور ضبطِ ولادت وغیرہ‘‘(۱)

اس سلسلے میں شاہ محدث ولی اللہ الدہلوی رحمہ اللہ نے ’’**حجۃ اللہ البالغۃ**‘‘ میں منصف تراتیب الاداریۃ نے اور علامہ تلمسانی رحمہ اللہ نے ’’**التراتیب الاداریۃ والدلالات السمعیۃ**‘‘ میں بسط وتفصیل کے ساتھ بتلایا ہے کہ اسلام شعبہ معاشیات وانتظامیات میں کیا رہبری کرتا ہے، قانون بین المالک یعنی انٹرنیشنل لا میں ڈاکٹر حمید اللہ حیدرآبادی کی تحریریں اردو، عربی، فرانسیسی زبان میں بے مثال ہیں، حربیات وعسکریات پر مختلف مسلمان جنرلوں نے اردو اور عربی زبان میں بہت خوب لکھا ہے، کاش ہم لوگ متقدمین علماء کی ان ساری خوبیوں سے فائدہ اٹھاتے اور نسلِ نو کو عصری لب ولہجہ

(۱) اسلام اور جدت پسندی: ۲۳، کتب خانہ حسینیہ دیوبند

میں پیش کر پاتے، اس طرح انسانیت کے نہایت پیچیدہ مسائل کا حل بھی ہو جاتا اور ہمارے نوجوانوں میں خود اعتمادی وداعیانہ کردار بھی بلند ہو جاتا۔

صوبہ آندھرا پردیش کے امیر تبلیغی جماعت محترم الحاج نعیم اللہ خان صاحب بہت اہتمام سے مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ کا ایک ملفوظ نقل فرماتے ہیں:

’’عصری طلبہ میں تبلیغی کام گویا یورپ کا اسلام ہے، یعنی ان تمام طلبہ کو اگر تقوی والی زندگی کے ساتھ اپنے ہنر کا ماہر بنا دیا جائے اور دعوت کی صفات سے آراستہ کر لیا جائے تو جس صوبہ وحکومت میں وہ جائیں گے اسلام کا صحیح نمائندہ بنیں گے، جس ملک اور یونیورسٹی میں جائیں گے اپنے ایمان کا سودا نہیں کریں گے، ان کی بے داغ جوانی اور پاک دامنی، معاملات کی صفائی اور حسن معاشرت یورپ کی پیاسی قوم کے لئے دعوت کا ذریعہ بن جائے گا‘‘۔

مختلف زبانوں کے سیکھنے کی اہمیت وفضیلت

آج پوری امت کو بالخصوص عصری مدارس کے طلباء کو یہ بات پوری قوت سے سمجھانے کی ضرورت ہے کہ دین کی ضروری باتیں جاننے کے ساتھ دوسری زبانوں میں مہارت حاصل کرنا اس کی دعوت دینے کے لئے بھی ضروری ہے اور تجارت وملازمت کرنے کے لئے اور بھی تحقیق شدہ بات ہے کہ بحیثیت زبان اسلام کسی زبان کی مخالفت نہیں کرتا، لیکن اگر کوئی قرآن وحدیث اور اس کی زبان کو بالکل چھوڑ دیتا ہے یا ہلکا سمجھتا ہے اور دوسری زبانوں میں بولنے کو باعث فخر سمجھتا ہے یا اغیار کی زبان سیکھنے کے ساتھ ان کے مزاج وطبیعت کو بھی قبول کر لیتا ہے، ان کی تہذیب وتمدن میں ڈوب جاتا ہے تو اسلام اس کی ہرگز اجازت نہیں دیتا، آج مصیبت یہ ہے کہ ہمارے طلبہ انگریزی زبان جاننے سے پہلے انگریز بن جاتے ہیں، یا انگریزی زبان کم سیکھتے ہیں اور انگریزی تہذیب زیادہ جذب کر لیتے ہیں، اس لئے ذیل کی روایتوں میں ان سارے پہلوؤں پر غور کر لیا جائے۔

یہی وجہ ہے کہ ایران کے فتح ہونے سے پہلے فارسی زبان جو ایرانی روایات وتہذیب ومعاشرت کی ترجمان تھی، اسلامی روایات اور تمدن سے بالکل متضاد تھی، اس لئے اسلام نے فارسی کی عمومی تعلیم کی اجازت نہیں دی، کیونکہ اس صورت میں فارسی زبان کے راستہ سے ایرانی روایات وطرز معاشرت کے اسلامی معاشرے میں راہ پانے کا اندیشہ تھا، جس کی وجہ سے عرب قوم فارسی سے مانوس ہونے کی بناء پر کچھ تو اپنی عربی تہذیب کی نمائندگی کرتی اور فارسی زبان کے راستہ سے اس کے روایات کو بھی اپنے اندر سموتی، کچھ ادھر کچھ ادھر کے ہوجاتے، اس کو حضور ﷺ نے نفاق سے تعبیر فرمایا: "مَنْ يُّحْسِنُ أَنْ يَّتَكَلَّمَ بِالْعَرَبِيَّةِ فَلَا يَتَكَلَّمُ بِالْعَجَمِيَّةِ فَإِنَّهَا يُوْرِثُ النِّفَاقَ" (۱) جو عربی اچھی طرح بول سکتا ہے وہ (عجمی) نہ بولے؛ کیونکہ وہ نفاق پیدا کرتی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کو یہ ہدایت فرمائی تھی "إِيَّاكُمْ وَرَطَانَةَ الْأَعَاجِمِ" عجمیوں کی سی بک بک سے بچو، اور فرمایا کہ وہ دھوکہ ہے۔ (۲)

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک قوم کو عجمی یعنی فارسی میں قبل از فتح ایران گفتگو کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: "مَا بَالُ الْمَجُوْسِيَّةِ بَعْدَ الْحَنَفِيَّةِ؟" (۳) یہ حنفیت کے بعد مجوسیت کیسی؟

یہاں حضور ﷺ نے اس وقت کی فارسیت کو نفاق اور فاروقِ اعظم نے دھوکہ بتلا کر یہ اصول بتایا کہ جب تک کسی قوم کی زبان پر اپنا اور اپنے مزاج وذوق کا رنگ چڑھ نہ جائے، اور ہمارے مخصوص اعتقادات واخلاقیات اس کا غالب عنصر نہ بن جائے اس کی عام تعلیم یا اسے عام طور پر قبول کرنا دھوکہ، نفاق اور دورخی پن پیدا کرتا ہے، جس سے انسان نہ پوری طرح اپنا ہی رہتا ہے، نہ غیر ہی کا ہوتا ہے۔

اگر کسی زبان کو اس پر مکمل غلبہ حاصل کرنے اور بالکل فتح کرنے سے پہلے کسی

(۱) اقتضاء الصراط المستقیم: فصل فی الاعیاد: ۱۱/۴۹
(۲) اقتضاء الصراط المستقیم: ۱۱/۶، دارعالم الکتب، بیروت
(۳) اقتضاء الصراط المستقیم: فصل فی الاعیاد: ۱۱/۴۸

اسلامی ضرورت سے مثلاً دعوت وتبلیغ یا غیر ممالک سے سیاسی وغیر سیاسی تعلقات کو قائم کرنے کیلئے سیکھا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ ایک تو ہے کسی غیر زبان میں کلام کرنا، یا خصوصی طور یا مخصوص افراد کو اس کی تعلیم دینا ہے، اور دوسرے اسے بطورِ شعار قبول کرنا، پہلی صورت تو جائز ہے، دوسری صورت میں بطورِ شعار کے اس زبان کو اسی وقت استعمال کیا جاسکتا ہے جبکہ وہ زبان بالکل مفتوح ہوکر اس کی روایات کی فارسی زبان کی طرح اسلامی حامل ہوجائے، محض دینی یا سیاسی ضروریات کیلئے غیر عربی زبان کو سیکھنے کی اجازت ان روایات سے معلوم ہوتی ہے۔

جنابِ رسول اللہ ﷺ نے بعض اقوام سے عبرانی زبان میں مراسلت کرنے کیلئے یہود کو ترجمان بنایا، لیکن جب لکھنے پڑھنے میں ان سے خیانت ثابت ہوئی تو آپ ﷺ نے مخصوص صحابہ رضی اللہ عنہم کو عبرانی زبان سیکھنے پر مامور فرمایا اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے سترہ دن میں عبرانی زبان سیکھ کر اس بارے میں حضور ﷺ کو یہود سے مستغنی کردیا۔

ایک مرتبہ حضور ﷺ نے حبشی زبان کے بعض کلمات کا تکلم فرما کر خصوصاً مخصوص حالات میں غیر زبانوں کے خصوصی تکلم کی اجازت دی، حضرت ام خالد بنت ابن سعید ابن العاص حبشہ میں پیدا ہوئی تھیں، جبکہ ان کے والد نے حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی، حضور ﷺ نے ان کو قمیص مبارک پہنایا اور فرمایا: "يَا أُمَّ خَالِدٍ! هَذَا سَنَا" (۱) اے ام خالد! یہ بہت خوشنما ہے (سنا حبشی زبان میں خوبصورت کو کہتے ہیں)۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: (جب کہ ایک فارسی کے پیٹ میں درد ہوا) "اشکم بدرد" (۲) کیا پیٹ میں درد ہے۔

لفظِ "علم" کا حقیقی مصداق

قرآن وحدیث میں واردلفظِ علم کا حقیقی مصداق کیا ہے؟ کیا اس کا اطلاق عصری

(۱) اقتضاء الصراط المستقیم: فصل فی الأعیاد: ۱۱/۵۱
(۲) اقتضاء الصراط المستقیم: باب الاعیاد: ۱۱/۵۲

علوم پر بھی ہوسکتا ہے۔اختراعات کے اس دور میں جو فتنوں کے عروج کا دور ہے، جہاں بہت سارے الفاظ واصطلاحات کو اس کے اصل مفہوم سے ہٹا کر غیر اصل کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی گئی ہے، انہیں میں سے ایک علم بھی ہے، ’’روشن خیال‘‘ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہمارا اچھا خاصا، سنجیدہ دین دار طبقہ بھی بے جا وسعت ظرفی کا مظاہر کرتے ہوئے معنیٔ علم میں وسعت کے درپے ہے، ان کا کہنا ہے کہ: علم ایک اکائی ہے، اس کی تقسیم ممکن نہیں ؛ لہٰذا علم دین اور علم دنیا کی یہ تقسیم غلط ہے، تمام علوم ایک ہی ہیں، قرآن وحدیث نے جس علم کی فضیلت بیان کی ہے وہ ان تمام کو شامل ہے، جب کہ علمائے ربّانیین اور راسخین فی العلم کی اکثریت بلکہ جمہور علماء اس کے قائل ہیں کہ: علم کی تقسیم مسلم ہی نہیں، علم تو صرف ایک ہے اور وہ علم دین ہے، کیوں کہ وہ آخرت کی فکر پیدا کرتا ہے ؛ لہٰذا قرآن وحدیث میں جو فضیلت وارد ہے وہ صرف اسی کی ہے، کسی اور کی نہیں اور دنیوی علوم علم کے زمرے میں داخل ہی نہیں، وہ تو فن، ہنر اور کاریگری ہے، وہ علم کہے جانے کے قابل ہی نہیں، اگر علم کو لغتاً معلومات کے معنی میں لیا جائے تب بھی تو تقسیم کے سوا چارہ کار نہیں، آخرت کی فکر پیدا کرنے والا علم دین اور دنیا اور معاش کا مسئلہ حل کرنے والا علم دنیا، اسی کو ’’علم معاش وعلم معاد‘‘ بھی کہتے ہیں۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا سلیم اللہ خان صاحب پاکستانی تلمیذ رشید حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ کشف الباری میں تحریر فرماتے ہیں:

’’یہاں علم سے مراد علمِ دین ہے، جس کی تعلیم کے لئے حضرت جبرائیل علیہ السلام آئے، اور اس علم دین کی طلب ہر مسلمان مرد وعورت پر فرض ہے‘‘ (بحوالہ فتح الباری) تفصیل یہ ہے کہ ایسے تمام امور جن کی ادائیگی کو انسان پر فرض قرار دیا گیا ہے، ان کا علم حاصل کرنا بھی فرض ہے، لیکن امور واجبہ کا علم حاصل کرنا واجب ہے، اور علومِ مسنونہ ومندوبہ کا علم حاصل کرنا مسنون اور مستحب ہے، اور قرآن وحدیث کے جملہ علوم کی تحصیل اور ان میں کمال حاصل کرنا فرضِ کفایہ ہے، فرضِ عین نہیں ہے‘‘

آج کل اسکولوں اور کالجوں میں جو دنیوی فنون سکھائے جاتے ہیں وہ مطلوبِ علم نہیں، یعنی اسکو فرض عین نہیں کہا جائے گا، بعض ان میں فرضِ کفایہ کے درجے میں آتے ہیں، اگر وہ مخلوقِ خدا کے فائدے کے لئے درکار ہوں اور خلافِ شرع امور پر مشتمل نہ ہوں، یا ان کو صرف جواز کا درجہ دیا جائے گا؛ لیکن جو ایسے امور پر مشتمل ہو، جس کی شریعت میں کوئی گنجائش ہی نہیں، تو ان کا حاصل کرنا ناجائز ہوگا‘‘ (۱)

علم کے حقیقی مصداق کے متعلق متقدمین کے کچھ اقوال

ابوداؤد اور ابن ماجہ شریف میں حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: دین کے ضروری علم تین ہیں، (۱) قرآن کا علم، (۲) احادیثِ شریفہ کا علم (۳) اور ان احکام کا علم جو اجماع اور قیاس کے ذریعہ قرآن وحدیث سے مستنبط کئے جائیں، اس کے علاوہ سب علوم زائد علوم ہیں، خواہ وہ کسی بھی طرح کا علم ہو۔

اس حدیث شریف میں شارع علیہ السلام کا مقصد اس بات کو بیان کرنا ہے کہ علومِ شرعیہ انہی تین علوم میں منحصر ہیں، تا کہ امت ان تین علوم کے علاوہ کی طرف سے توجہ ہٹا کر ضروری علوم کی طرف توجہ مبذول کر سکے، اور یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب کہ باقی علوم کو زائد علوم کہا جائے۔(۲)

حضرت امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں :

’’اِنَّ الْعِلْمَ عِلْمَانِ ، عِلْمُ الدِّیْنِ وَعِلْمُ الدُّنْیَا. فَالْعِلْمُ الَّذِیْ لِلدِّیْنِ فَھُوَ الفِقْہُ، وَالْعِلْمُ الَّذِیْ لِلدُّنْیَا فَھُوَ الطِّبُّ، وَمَا سِوَی ذٰلِكَ مِنَ الشِّعْرِ وَنَحْوِہٖ فَھُوَ سَفْہٌ أَوْ عَبَثٌ‘‘ (۳)

---

(۱) کشف الباری پاکستان: ۳/ ۴۴

(۲) مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوۃ المصابیح: ۱/ ۴۵۶

(۳) تاریخ دمشق: محمد بن إدریس بن العباس: ۵۱، ۴۱۰، دار الفکر۔ بیروت

’’علم دو طرح کے ہیں، علم دین اور علم دنیا، علم دین فقہ ہے، اور علم دنیا طب اور ڈاکٹری ہے، اس کے علاوہ علوم میں مشغول ہونا بے وقوفی یا بے کار ہے‘‘

حضرت حسن بن ربیع رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

’’میں نے حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمہ اللہ سے پوچھا کہ ارشادِ نبوی: ’’طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ‘‘ کا مطلب کیا ہے؟ تو حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمہ اللہ نے فرمایا کہ: اس سے وہ دنیوی علوم مراد نہیں جو تم حاصل کرتے ہو، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی دینی معاملہ میں مبتلا ہو تو اس کے بارے میں پہلے جانکار لوگوں سے علم حاصل کرے ’’يَسْأَلُ عَنْهُ حَتّٰى يَعْلَمَهُ‘‘(۱)

حضرت امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

’’اَلْعِلْمُ عِلْمَانِ: النَّافِعُ هُوَ مَا يَتَعَلَّقُ بِالْاٰخِرَةِ وَعِلْمُ أَحْوَالِ الْقَلْبِ وَاَخْلَاقِهِ الْمَذْمُوْمَةِ وَالْمَحْمُوْدَةِ وَهُوَ مَرْضِيٌّ عِنْدَ اللهِ‘‘(۲)

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنے کسی شاگرد کو وصیت فرماتے ہوئے تحریر فرمایا:

’’اجماع الخير أن يستعين بالله سبحانه فى تلقى العلم الموروث عن النبى ﷺ فانّه هو الذى يستحق أن يسمى علما وما سوىٰ ذلك انّما أن يكون علما فلا يكون نافعاً واما أن لا يكون علما فان سمى به ولئن كان علما نافعا فلا بد أن يكون فى ميراث محمد ما يغنى عنه مما هو مثله وخير منه‘‘(۳)

---

(۱) الفقیہ والمتفقہ: وجوب التفقہ فی الدین: ۱/۱۷۱، دار ابن الجوزی، السعودیۃ

(۲) فیض القدیر: حرف السین: ۴/۱۰۸، المکتبۃ التجاریۃ، مصر

(۳) مجموع فتاوی ابن تیمیہ: ملازمۃ الذکر وأفضلہ ’’لا إلہ إلا اللہ‘‘: ۱۰/ ۶۶۴، دار الوفاء، بیروت

حضور ﷺ سے موروث علم کے حصول میں اللہ عزوجل سے مدد طلب کرے، چونکہ یہی علم کہلانے کے مستحق ہے، اور اس کے علاوہ دیگر علوم علم تو ہیں؛ لیکن نافع نہیں ہیں، یا تو وہ علم ہی نہیں ہیں، اگر ان کو علم کہا بھی جاتا ہے تو گرچہ وہ نافع بھی ہو تو ضروری ہے کہ محمد ﷺ کی میراث میں ایسی چیز موجود ہو جو اس سے بے نیاز کرتی ہو جو اسی کے مثل ہو یا اس سے بہتر ہو۔

بخاری شریف کی کتاب التفسیر میں جہاں آیت ’’وَقُلْ رَبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا‘‘ مذکور ہے اس کی شرح میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تحریر فرمایا:

’’والمراد بالعلم العلم الشرعى الذى يفيد معرفة ما يجب على المكلف من أمر عباداته ومعاملاته والعلم بالله وصفاته وما يجب من قيام أمره وتنزيهه ومدار ذلك على التفسير والحديث والفقه‘‘

’’علم سے مراد وہ علم شرعی ہے جو مکلف پر واجب چیزوں کی معرفت عطا کرتا ہو عبادات، معاملات، اللہ عزوجل کی ذات وصفات اور اس کے اوامر ونواہی وغیرہ اور ان تمام علوم کا مدار تفسیر، حدیث اور فقہ پر ہے‘‘

ترمذی شریف وابن ماجہ شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ یوں فرماتے تھے:

’’اَللّٰهُمَّ انْفَعْنِى بِمَا عَلَّمْتَنِيْ وَعَلِّمْنِيْ مَا يَنْفَعُنِيْ وَزِدْنِيْ عِلْماً وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى كُلِّ حَالٍ، وَأَعُوْذُ بِاللهِ مِنْ حَالِ أَهْلِ النَّارِ‘‘

اس حدیث میں ’’عَلِّمْنِيْ مَا يَنْفَعُنِيْ‘‘ کی شرح میں ملا علی قاری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ: علم سے مراد شریعت محمدیہ کا علم ہے، اور اس میں تفسیر حدیث فقہ اور اصولِ فقہ کا علم بھی داخل ہے۔

قرآن کریم کی آیت ’’يَرْفَعِ اللهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوْا

الْعِلْمَ دَرَجٰت"، اس آیت کریمہ کی تفسیر میں علامہ شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

یہاں "اَلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ" سے مراد وہ لوگ ہیں جو قرآن پڑھتے ہیں، اولی یہ ہے کہ آیت کو عموم پر محمول کیا جائے، یہ ہر اس مومن اور ہر دین کا علم حاصل کرنے والا اس آیت میں شامل ہے۔ "حمل الآیة علی العموم فی کل مؤمن وصاحب علم من علوم الدین من جمیع أهل هذه الآیة"۔(۱)

علامہ آلوسی رحمہ اللہ کہتے ہیں:

"والذین اوتو العلم أی الشرعی" اسی طرح قرآن کریم کی آیت "وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْماً" کی تفسیر میں علامہ بغوی رحمہ اللہ نے معالم التنزیل میں، نسفی نے "مدارك التنزيل" میں، ابو اللیث سمرقندی رحمہ اللہ نے "بحر العلوم" میں، شوکانی رحمہ اللہ نے "فتح القدیر" میں علم سے مراد قرآن کا علم اور اس کا فہم ہی مراد لیا ہے، اور قرآن کریم میں حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق "وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا"، وہاں علم سے مراد یہ بات مسلم ہے کہ وہ تشریعی علم نہیں، بلکہ وہ تکوینی علم ہے، اسلئے قرآن کریم میں "اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ" میں وحی کا سلسلہ حضرت نوح علیہ السلام تک بیان کیا گیا ہے، حضراتِ مفسرین رحمہم اللہ نے اس میں یہی مذکورہ نقطہ بیان فرمایا ہے"

اور حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق "عَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ" فرمایا گیا ہے، تو وہاں علم شرعی مراد نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق کسب و پیشہ سے ہے، احادیث میں اس کے لئے صراحۃ کسب یا عمل بالید کا لفظ استعمال ہوا ہے: "كَانَ دَاؤُدُ عليه السلام لَا يَأْكُلُ اِلَّا مِنْ كَسْبِ يَدِهٖ"۔(۲)

(۱) فتح القدیر: سورۃ الجمعۃ: ۵/۲۲۶ (۲) طبرانی: قطعة من المفقود، حدیث: ۹۵

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھایا کرتے تھے۔

نیز نبیٔ کریم ﷺ کی بعثت کا مقصد علم شرعی کی دعوت و اشاعت ہے، دنیوی علوم کے لئے آپ ﷺ مبعوث نہیں کئے گئے، مسلم شریف کی حدیث میں ہے کہ:

"حضور ﷺ ایک قوم کے پاس سے گذرے، جو تلقیح کرتے تھے (یعنی اچھے اور زیادہ پھل حاصل کرنے کی غرض سے نر درخت کا خوشہ مادہ درخت کے خوشہ میں رکھ دیتے تھے) آپ ﷺ نے فرمایا: کہ اگر تم لوگ ایسا نہ کرو تو اچھا ہے، "لَوْ لَمْ تَفْعَلُوْا الصَّلُحَ"، ان لوگوں نے اس عمل کو ترک کر دیا، راوی کہتے ہیں کہ: اس مرتبہ ردی کھجوریں پیدا ہوئیں، اور آپ کا ان پر دوبارہ گذر ہوا، تو آپ ﷺ نے پوچھا: کہ تمہارے کھجوروں کا کیا حال ہے؟ انہوں نے جواباً کہا کہ: آپ ﷺ نے ایسا کہا تھا، ہم نے ویسا ہی کیا اور ردی کھجوریں پیدا ہوئیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ: تم لوگ اپنے دنیاوی کاموں سے زیادہ واقف ہو "اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْيَاكُمْ"۔(۲)

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دنیوی علوم اگر نبیٔ پاک ﷺ کے مقاصد میں داخل ہوتے آپ ﷺ صحابہ رضی اللہ عنہم سے "اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْيَاكُمْ"(۳) نہ فرماتے۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ علم کے صحیح مصداق کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

"علم کا شرف معلوم کے شرف پر موقوف ہے اور معلوم اس کو کہتے ہیں جس کے حالات اس علم میں بیان کئے جائیں"۔

(۱) مسلم: باب وجوب امتثال ما قاله، حدیث: ۶۲۷۷

(۲) مسلم: باب وجوب امتثال ما قاله، حدیث: ۶۲۷۷

علم دین کا معلوم حق تعالیٰ شانہ کی ذات ہے اور تمام علم دین کا حاصل بھی یہی ہے اور دیگر تمام علوم ماسوی اللہ ہے، پس جو نسبت دنیا یا ماسوی اللہ کو حق تعالیٰ کے ساتھ ہے، وہی نسبت علوم دینیہ کو علم دین کے ساتھ ہوگی اور اس کی نسبت بجز اس کے کیا کہا جا سکتا ہے۔

ع چہ نسبت خاک را با عالم پاک

حق تعالیٰ کی ذات وصفات تو کسی چیز کے ساتھ کچھ نسبت نہیں رکھتے، وہ باقی اور سب فانی، وہ زندہ اور سب مردہ، وہ غنی اور سب محتاج، وہ موجود اور سب معدوم (كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ)۔

غرض دونوں چیزوں میں کوئی نسبت نہیں قرار دی جا سکتی ہے، سوائے اس کے علم دین پر موجود کا اطلاق کیا جائے اور علم دنیا پر معدوم، اب میرا دعویٰ قریب المفہوم ہو گیا ہے کہ علم دین کے سامنے دیگر علوم کہلانے کے مستحق ہی نہیں؛ تو مقابلہ کیا کیا جائے؟ علومِ دنیا کو علوم مت کہو، فن کہو، پیشہ کہو، حرفت کہو (انفاس عیسی)

شیخ الاسلام ترجمان اہل سنت والجماعت حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی نور اللہ مرقدہٗ تو ’’جدید دور میں علم اور اس کا استعمال، فتنۂ الفاظ کا جائزہ‘‘ کے تحت فرماتے ہیں:

’’موجودہ دور کے علمی وذہنی فتنوں میں سے ایک بڑا فتنہ ’’فریب الفاظ‘‘ کا بھی ہے، ایک لفظ جسے ہم بولتے ہیں، وہ اپنے مفہوم کے اعتبار سے ایسے حقائق پر مشتمل ہوتا ہے، جو بالکل صحیح وصادق، مقدس ومتبرک، اور نہایت معقول ومحمود ہے، مگر اسی لفظ کے عام لغوی معنی کی وسعت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اسے بہ طور تلبیس وتلمیح، ایک ایسے معنی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو بجائے مقبول ہونے کے مردود اور مذموم ہوتا ہے، اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ مخاطب کو مغالطہ دے کر، محض خوش نما اور دل فریب الفاظ سے مسحور کر دیں‘‘۔

آزادی، مساوات، تہذیب، ترقی اور اسی طرح کے اور الفاظ ہیں، جو اگر اپنے اصلی وحقیقی معانی میں مستعمل ہوں، نہایت محمود، مستحسن اور قابلِ تعریف ہیں، لیکن جب

کسی زشت وشنیع مفہوم کو خوبصورت ظاہر کرنے کے لیے یہی الفاظ بہ طور نقاب استعمال ہونے لگیں، تو یہ خالص تلبیس وخداع ہے۔ ٹھیک یہی صورت آج کل، لفظ ’’علم‘‘ کے متعلق واقع ہوئی ہے۔

کسی مسلم اسکول کا افتتاح ہو، کسی کالج کی بنیاد رکھی جائے، کسی یونیورسٹی کی تقسیم اسناد کا جلسہ ہو، آپ دیکھتے ہیں کہ حضرات مقررین کس شد ومد سے ’’علم‘‘ کے فضائل میں، قرآنِ پاک کی بہت سی آیات اور رسول کریم ﷺ کی بے شمار احادیث پڑھتے رہتے ہیں، گویا اپنے اس طرزِ عمل سے مخاطبین پر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ جدید علم کے ایسے ایسے فضائل قرآن پاک میں موجود ہیں، حالاں کہ قرآن کریم کو ایک سرسری نظر سے پڑھ جائیے تو ظاہر ہو جائے گا کہ وہ خود علم کی دو قسمیں قرار دیتا ہے:

ایک علم نافع مطلوب ومحبوب؛ دوسرا مضر ومردود۔۔۔۔۔۔اس کے نزدیک ایک علم زہر ہے، دوسرا تریاق، ایک پاک شراب ہے، دوسرا محض سراب۔ ایک سببِ ہلاکت ہے، دوسرا سامانِ نجات۔ ایک آسمان کی بلندیوں پر اٹھانے والا ہے، دوسرا اسفل السافلین کی پستیوں میں پہونچانے والا۔

جو علم اپنے اثرات کے اعتبار سے آخر کار خشیت الٰہی اور رغبتِ آخرت پر منتج نہ ہو، جو علم انسان کو خدا سے نڈر اور زندگی کے آخری انجام سے بالکل غافل کر دے، جو علم ایسی مادی دنیا کی لذت وانبساط وشہوات حیوانیہ کو (خواہ وہ کتنی ہی ترقی یافتہ شکل میں ہوں) انسان کا معبود ٹھہرائے، کیا ایسا علم بارگاہ رب العزت میں درخور اعتنا یا لائق التفات ٹھہر سکتا ہے؟ یا قرآن حکیم اس کے اکتساب کی ایک لمحہ کے لیے بھی ترغیب دے سکتا ہے؟

قرآن تو ایسے علم کی نسبت صاف طور پر یہ حکم دیتا ہے:

فَأَعْرِضْ عَن مَّن تَوَلَّىٰ عَن ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ إِلَّا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ○ ذَٰلِكَ مَبْلَغُهُم مِّنَ الْعِلْمِ (۱)

(۱) النجم:۲۹-۳۰

”تو منہ پھیر لے اس کی طرف سے، جس نے ہماری بات سے منہ پھیر لیا
اور جس کا مقصد اس دنیوی زندگی سے آگے کچھ نہیں، ان کے علم کی رسائی
اور پرواز یہیں تک ہے“

اس کے بالمقابل ایک وہ لوگ ہیں، جو اللہ سے ڈرتے ہیں، اس کی مخلوق پر رحم کھاتے ہیں اور ادب وتہذیب کے قاعدوں پر عمل کرتے ہیں۔ اخلاقی پاکیزگی ان کا جوہر ہے، ایمان کے نور سے ان کے دل روشن ہیں۔ غرض کہ علم ان کے اندر اِنابت الی اللہ، رحمت علی الخلائق کے اوصاف پیدا کرتا ہے، تو اسی طرح کے اولوا العلم کے حق میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”یَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِیْنَ أُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ“(۱)

قرآن پاک نے ایک شخص (قارون) کا ذکر کیا ہے، جس کی دنیوی دولت اب تک ضرب المثل ہے۔ جس کے خزائن کی کثرت کا اندازہ ”ان مفاتحہ“ کے الفاظ سے ہوسکتا ہے، جس کا سامان دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی تھیں، حتی کہ بہت سے تمنا کرتے تھے کہ ”یٰلَیْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِیَ قَارُوْنُ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ“ اس نے ترقی کی اس معراج پر پہونچ کر ایک علم کا دعویٰ کیا تھا، جس کے ذریعہ اس کو یہ عروج حاصل ہوا ”قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِیْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِیْ“۔

بہرحال وہ علم تھا، اس کے بالمقابل دوسرا گروہ تھا، جس کا ذکر حق تعالیٰ اس طرح فرماتا ہے:
”وَقَالَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَیْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَیْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا“ یہ ”الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ“(۲) اُس علم والے تھے جو قارون کے اُس تمام ترقیات اور علم وہنر کو حقیر سمجھ رہے تھے اور اُدھار کو نقد پر ترجیح دے رہے تھے۔ قرآن کریم نے تو ایک آیت میں مسئلہ کا دوٹوک فیصلہ کردیا ہے: ”اِنَّمَا یَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا“۔(۳)

اس ”انما“ کے لفظ پر غور کیجئے۔ گویا جو علم قلب میں خشیت الٰہی پیدا نہ کرے، وہ

(۱) المجادلۃ:۱۱ (۲) القصص:۸۰ (۳) الفاطر:۲۸

علم ہی نہیں۔ ایسے اصطلاحی علم سے جہل ہزار درجے بہتر ہے۔

حدیث صحیح میں نبی کریم ﷺ نے اس علم سے پناہ مانگی ہے، جو نفع سے خالی ہو، قرآن کریم میں بھی ہے: ”وَیَتَعَلَّمُوْنَ مَا یَضُرُّهُمْ وَلَا یَنْفَعُهُمْ“(۱) معلوم ہوا کہ علم نافع بھی ہوتا ہے اور مضر بھی۔

پس ایسے علوم جو انسان کو شیطان یا درندہ بنادیں یا اسے ترقی یافتہ بہائم کے زمرہ میں داخل کردیں۔ ان کی طرف ترغیب دلانے کے موقع پر مطلق علم کے فضائل قرآن وحدیث سے پیش کرنا، انتہائی تلبیس اور گمراہی ہے۔

مقصد یہ ہے کہ ہم یہ نہیں کہتے کہ علوم وفنون حاصل نہ کیے جائیں، لیکن درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، اگر علم وفن کی ترقی کا ماحاصل یہی ہے جو ہم دیکھ رہے ہیں تو فی الحقیقت ایسے علم سے جہل بہتر ہے، اگر علم وفن کی چکاچوند کرنے والی ترقیات مذہبی اور دینی علم وتہذیب کے ماتحت رہتیں تو دنیا کو ایسے بھیانک نتائج ہرگز نہ دیکھنے پڑتے۔(۲)

حقیقتِ علم

انگریزوں نے بھی علم کی تعریف محض مادہ اور معدہ کی پرورش نہیں قرار دیا؛ بلکہ انہوں نے بھی زندگی کے حقیقی مقصد بناتے والے علم پر علم کا اطلاق کیا ہے:

جان اسٹورٹ مل مغرب کے ان مشاہیر میں سے ہے جنہوں نے تعلیم کے مفہوم کو وسعت دینے کی کوشش کی ہے وہ کہتا ہے:

تعلیم صرف ان باتوں ہی کا احاطہ نہیں کرتی جو ہم اپنی فطرت کے کمال سے قریب تر ہونے کی بناء پر وضع مقصد کی خاطر اپنے لئے کرتے ہیں یا دوسرے ہمارے لئے کرتے ہیں، اپنے وسیع تر مفہوم میں اس کی حدود بہت زیادہ ہیں، انسانی کردار اور صلاحیت پر پڑنے والے ان چیزوں کے بالواسطہ اثرات بھی اس کے دائرہ کار میں شامل ہیں، جن کے فوری مقاصد بالکل ہی دوسرے ہوتے ہیں۔

جان ملٹن تعلیم کی تعریف یوں کرتے ہیں:

(۱) البقرۃ:۱۰۲ (۲) بیداری، حیدرآباد، سندھ، جون ۲۰۰۶ء

''میرے نزدیک مکمل اور شریفانہ تعلیم وہ ہے جو انسان کو بحالت جنگ
وامن اپنی اجتماعی ونجی زندگی کے فرائض ودیانت ومہارت اور عظمت
کے ساتھ ادا کرنے کے لئے تیار کرتی ہے''

بے عقیدہ تعلیم نئی نسل کے قلب وروح میں اخلاقی اقدار کو اجاگر کرنے میں ناکام رہتی ہے، اس کا تعلق صرف دماغ کے مطالبات سے ہوتا ہے، روح کے مطالبات سے یہ بے گانہ وار ہی گذر جاتی ہے، دونوں کی نشوونما دو متضاد سمتوں میں ہوتی ہے، جس کا نتیجہ ایک زبردست قومی نقصان کی شکل میں نکلتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ علم اس وقت حقیقی دوست اور رہنما کا کام کرسکتا ہے جب اس کا محور دل ہو ورنہ صرف تن پرستی کے چکر میں یہ انسان کے لئے سانپ جیسا خطرناک بھی ہوسکتا ہے۔

ڈاکٹر ایڈ یلوٹ نے امریکی تعلیم کے بارے میں کہا ہے:

''مقاصد کے بجائے تکنیک اور ذرائع سے وابستگی ادب، فلسفہ، تاریخ
اور مذہب کے مطالعے کو حقیقی آزادی سے محروم کررہی ہے''۔

مشہور اہل قلم والٹرلپ میں، نے اس مضطرب دنیا میں تعلیم کی کیفیت کے موضوع پر ایک تقریر میں کہا تھا:

''اسکول اور کالج دنیا میں ایسے افراد بھیجتے رہے ہیں جو اس معاشرے کے
تخلیقی اصولوں کو نہیں سمجھ پاتے، جس میں انہیں رہنا ہے، اپنی ثقافتی
روایت سے محروم نئے تعلیم یافتہ مغربی افراد اپنے ذہن وجذبات میں
مغربی تہذیب کے تصورات، اصول اور بنیادوں کا اورا سکے منطق
واستدلال کا کوئی احساس وشعور نہیں رکھتے، اگر یہی نہج رہی تو موجودہ تعلیم
آخرکار مغربی تہذیب کو تباہ کردے گی اور واقعہ یہ ہے کہ یہ تباہ کررہی ہے''۔

امریکی تعلیم پر راک فیلر کی رپورٹ بھی اسی خامی کی نشاندہی کرتی ہے:

''طلبہ اپنی زندگی کا کوئی مقصد ومفہوم چاہتے ہیں، اگر ان کا زمانہ ان کی
ثقافت اور جب ان کے رہنما انہیں کوئی عظیم مفہوم، مقاصد وتصورات نہ

دیں تو پھر وہ اپنے لئے حقیر اور فرد مایہ مقاصد متعین کر لیتے ہیں''

تعلیم کے پس منظر کے مکمل جائزے کے بعد پروفیسر ہیرلڈ ایچ ٹیٹس لکھتے ہیں:

''تعلیم نے اپنے آپ کو ماضی کے روحانی ورثے سے الگ کرلیا ہے، مگر
اس کا کوئی مناسب متبادل دینے میں ناکام رہی ہے، نتیجتاً پڑھے لکھے
افراد بھی ایقان وایمان سے، نئی زندگی کی اقدار کے صحیح احساس سے
اور دنیا کے بارے میں کسی ناقابل شکست ہمہ گیر نقطہ نظر سے عاری ہیں''

مقصد تعلیم:

تعلیم بجائے خود منزل نہیں، منزل کے حصول کے لئے ایک ذریعہ ہے، حقیقی منزل ان لوگوں کا نظریۂ حیات اور تمدن وثقافت ہے جن کی خدمت اسے کرنی ہے، اے این وایٹ ہیڈ نے یہ کہہ کر زور دیا ہے کہ:

''تعلیم کی روح یہ ہے کہ وہ مذہبی ہو''

علامہ اقبال کا بھی خیال یہی تھا کہ اسلام ہماری زندگی اور تعلیم کا مقصد ہونا چاہئے، انہوں نے خواجہ غلام السیدین کو اک خط میں لکھا ہے:

''علم سے میری مراد وہ علم ہے جس کا دارومدار حواس پر ہو، عام طور پر میں
نے علم کا لفظ انہیں معنی میں استعمال کیا ہے اس علم سے وہ طبعی قوت ہاتھ آتی
ہے جس کو دین کے ماتحت رہنا چاہئے، اگر یہ دین کے تحت نہ رہے تو محض
شیطنت ہے، مسلمان کے لئے لازم ہے کہ علم کو مسلمان کرے''۔

بولہب را حیدر کرار کن

''اگر یہ بولہب حیدر کرار بن جائے یا یوں کہیے کہ اس کی قوت دین کے
تابع ہوجائے تو نوع انسان کے لئے سراپا رحمت ہے''

ترے صوفی ہیں افرنگی ترے قالین ہیں ایرانی
لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی
امارت کیا شکوہ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل

نہ زورِ حیدری تجھ میں نہ استغنائے سلمانی
نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیبِ حاضر کی تجلی میں
کہ پائی میں نے استغناء میں معراجِ مسلمانی (۱)

مذکورہ بالا تفصیل سے معلوم ہوا کہ علم کی دو قسمیں ہیں: ایک علم دین اور دنیا کے اعتبار سے۔ اور دوسرا نفع اور نقصان کے اعتبار سے۔ تحصیل علم دین تو خیر الناس والا عمل یعنی انسانوں کے کاموں میں سے ایک بہترین کام ہے، البتہ علم دنیا کے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتے، ہاں اگر اچھی نیت ہو مثلاً کسبِ حلال کی نیت سے دینی تمام احکام کی رعایت کرتے ہوئے اسے حاصل کیا جائے تو ہو سکتا ہے کارِ ثواب ہو جائے، جب کہ کوئی حلال چیز کا کسب حلال طریقے سے ہو، اور اگر محض ''علمِ دنیا'' ہی مقصود ہو، تب تو ہلاکت اور ضرر کے علاوہ کچھ بھی نہیں، جتنی احادیث اور آیات فضیلتِ علم میں وارد ہوئی ہیں وہ سب علم دین کے بارے میں ہیں۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ تو فرماتے ہیں:

''علم نام ہی علمِ نافع کا ہے، ورنہ اگر عمل نہ ہو تو علم نہیں معلومات ہے، چاہے علمِ دین ہی کیوں نہ ہو، کیوں کہ ایسا علم دین جس پر عمل نہیں بندہ پر حجت اور دلیل بن جاتا ہے، جو ازدیادِ عذاب کا سبب ہوگا، اسی لیے مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نوراللہ مرقدہٗ تحریر فرماتے ہیں، کہ علم کا ثمرہ اور اس کی حقیقی علامت اللہ تعالیٰ کی خشیت ہے''۔(۲)

حکم ''اقرأ'' کا پیغام

حضرت مولانا ابوالحسن ندوی رحمہ اللہ قرآن کریم کی آیت ''اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ'' کے تحت مفید اور غیر مفید اور تخریبی علم کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرماتے ہیں:

(۱) اسلام کا نظریہ تعلیم: پروفیسر خورشید احمد: ۱۳۔۱۴، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی

(۲) مقالہ مولانا حذیفہ وستانوی: ''تعلیم اور سماجی خرابیاں''، پیش کردہ بر موقع سمینار، جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم، اکل کوا، زیر نگرانی: مولانا آزاد نیشنل اردو، یونیورسٹی، حیدرآباد، ۱۲، جنوری تا ۲۱ جنوری: ۲۰۱۰ء

''حضور اکرم ﷺ نے نہ کبھی پڑھا اور نہ کبھی لکھا اور کہا گیا پڑھو، ''اقرأ'' یعنی اب جو امت پیدا ہوگی، وہ قرات والی امت ہوگی اور اس کا رشتہ علم کے دامن سے باندھ دیا جائے گا؛ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کی رہنمائی کی جا رہی ہے جس کو اکثر قوموں نے نظر انداز کر دیا اور ترقی یافتہ مغرب میں جب سے وہاں بیداری شروع ہوئی، ''اقرأ'' پڑھو؛ لیکن صرف پڑھنا کام نہیں آئے گا؛ بلکہ وہ علم تخریبی بن جائے گا، وہ تخریبی ذہن پیدا کرے گا اور انسانوں میں خود پرستی پیدا کرے، دوست پرستی پیدا کرے گا اور شہوانیت کی طرف لے جائے گا، ''اقرأ'' پڑھو؛ لیکن خالی 'اقرأ'' پڑھنا کام نہیں آئے گا، ''اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ'' اپنے پروردگار کے نام سے پڑھو، دنیا میں اب اگر تاریخ منصفانہ طریقہ پر حقیقت پسندانہ طریقہ پر لکھی جائے اور دیکھا جائے کہ دنیا میں انسانیت کا زوال کب سے شروع ہوا تو یہ عنوان قرار دینا ہوگا جب سے علم اور اسم کا رشتہ ٹوٹا، جب علم اسم سے آزاد ہوا اور انسان نے اسم کو بھلاتے ہوئے، فراموش کرتے ہوئے انکار کرتے ہوئے؛ بلکہ بغاوت کرتے ہوئے کہ اس کائنات کا کوئی خالق نہیں ہے، اگر اس کائنات کا کوئی خالق ہے بھی تو اس کا مالک نہیں ہے، وہ اس کا منتظم نہیں ہے ....ضرورت اس بات کی ہے کہ علم کو اسم کے ساتھ لے کر چلا جائے، علم اسم کی رہنمائی میں اسم کے سایہ میں اس کی سرپرستی میں آگے بڑھے اور اسم کی برکت بھی اس کے ساتھ ہو، تب جا کر ہماری ٹکنالوجی اور سائنس کی جتنی شاخیں اور جتنے تعمیری کام ہیں اور تعمیری ادارے ہیں اور ہماری دانش گاہیں ہیں، ہمارے تحقیقی مراکز ہی ہیں وہ سب اسی وقت مفید ہو سکتے ہیں کہ جب اسم کے سایہ میں ہوں''(۱)

(۱) ماخوذ از: انسانیت کے زوال کا سبب، علم سے اللہ کے نام کا جدا ہونا، حضرت مولانا ابوالحسن الندویؒ

غور کرنا چاہئے کہ پڑھنے کے حکم دینے کے بعد تیس پاروں میں قرآن نے کیا پڑھایا ہے، اس کے فورا بعد نازل ہونے والی آیتوں میں "یَا أَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ" اور "یَا أَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ" والی آیتوں میں کیا پیغام دیا گیا ہے۔ خود نبی رحمت ﷺ نے دار ارقم وصفّہ میں کونسے علوم پڑھائے؟ کلام کو متکلم کی زندگی کی روشنی میں سمجھا جاتا ہے۔

"أطلبوا العلم ولو بالصين" کی تحقیق:

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ اس حدیث کی توضیح اور اس کے صحیح مصداق کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> "جتنے فضائل احادیث میں علم کے لئے وارد ہیں، انگریزی تعلیم پر بھی ان کو جاری کرتے ہیں اور اس کے متعلق یہ حضرات ایک حدیث بھی پیش کرتے ہیں "اُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ بِالصِّیْنِ" یعنی علم کو طلب کرو اگرچہ چین میں بھی ہو، وہ کہتے ہیں کہ: دیکھئے! حضور ﷺ نے چین سے طلب علم کی ترغیب دی ہے، حالانکہ اس وقت چین میں دین کا علم نہ تھا؛ بلکہ محض دنیاوی علم تھا، معلوم ہوا کہ حضور اکرم ﷺ مطلق علم کی ترغیب دے رہے ہیں، خواہ دنیا کا علم ہو یا دین کا، پس انگریزی بھی علم ہے اور اس حدیث کے تحت میں داخل ہے، ان لوگوں کو اول تو اس حدیث کا ثبوت دینا چاہئے، ان الفاظ سے یہ حدیث محدثین کے نزدیک ثابت ہی نہیں۔

> "قُلْتُ ذُكِرَ لَهُ فِيْ الْمَقَاصِدِ طَرِيْقَيْنِ، وَقَالَ: هُوَ ضَعِيْفٌ مِنَ الْوَجْهَيْنِ، وَقَالَ ابنُ حِبّانٍ: أَنَّهُ بَاطِلٌ لاَ أَصْلَ لَهُ، وأخرجَهُ ابنُ الجَوْزِي فِي الموضُوْعَاتِ، قال وأخرجه البيهقي فى الشعبِ، قُلْتُ، قَدِ الْتَزَمَ أَنْ يُّخْرِجَ مَوْضُوْعًا فلَأَشْبَهَ الحُكْمُ عليه بالضعيف، والضعيف لا يُحْتَجُّ بِهِ فى الأحكام" (الجامع)

میں کہتا ہوں کہ: مقاصد میں اس کے دو سندیں ذکر کی گئیں ہیں، اور فرمایا ہے، یہ روایت ان دونوں سندوں سے ضعیف ہے، ابن حبان کہتے ہیں: یہ روایت باطل ہے، اس کی کوئی اصل نہیں، ابن الجوزی نے اس کو موضوعات میں ذکر کیا ہے، فرماتے ہیں کہ: اس کی بیہقی نے شعب الایمان میں تخریج کی ہے، میں کہتا ہوں: انہوں نے موضوعات کے ذکر کا بھی التزام کیا ہے، زیادہ بہتر اس پر ضعف کے حکم لگانے کا ہے اور ضعیف روایت سے احکام میں استدلال نہیں کیا جاسکتا۔

اور اگر ثابت بھی ہو تب بھی ان لوگوں کا مدعا اس سے حاصل نہیں ہوتا؛ کیوں کہ انہوں نے لفظ "ولو" پر نظر نہیں کی، یہ لفظ فرض کے لئے آتا ہے، مطلب یہ ہے کہ اگر بالفرض چین میں بھی علم ہو تو وہاں سے بھی کوشش کرکے حاصل کرنا چاہئے اور فرض اس چیز کو کیا جاتا ہے جو معدوم ومستبعد ہو، موجود کو فرض نہیں کیا جاسکتا، معلوم ہوا کہ حضور اکرم ﷺ کی مراد اس حدیث سے وہی علم ہے جو چین میں اس وقت موجود نہ تھا، اس لئے بطور فرض کے فرمارہے ہیں کہ اگر وہاں بھی ہو تو حاصل کرو اور یہ وہ علم دین ہی ہے، ورنہ اگر علم کو ایسا عام کیا گیا کہ دنیوی علم بھی اس میں داخل ہوگیا تو ایک بھنگی اور چماری کو بھی عالم کہنا چاہئے؛ کیوں کہ اس کو بھی علم حاصل ہے جو وہ کام کرتا ہے، اس کو خوب جانتا ہے اور اگر آپ ان کاموں کو بھی علم میں داخل کرلیں گے تو پھر آپ کی خاطر سے ہم انگریزی کو بھی اس میں داخل کریں گے اور خیر جانے دیجئے! ہم لفظ "لَوْ" سے بھی استدلال نہیں کرتے، مگر ہم کہتے ہیں: "اُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ بِالصِّیْنِ" میں تو تصریح نہیں کہ اس سے کون سا علم مراد ہے؟ اب شریعت کی دوسری نصوص سے اس کو دریافت کیا جائے، بس علم وہ ہے جس کو شریعت علم کہتی ہے جس کے جاننے والوں میں ایک شیخ سعدی رحمہ اللہ بھی ہیں:

علمے کہ راہ بحق ننماید جہالت است

اور حدیث میں ہے:

"اَلدُّنْیَا مَلْعُوْنَةٌ وَمَا فِیْهَا مَلْعُوْنٌ إِلَّا ذِكْرُ اللهِ وَمَا وَالَاهُ" (۱)

معلوم ہوا کہ جو چیز خدا کی طرف قریب نہ کرے، وہ دنیائے ملعونہ ہے، اس میں ایسے علوم بھی داخل ہیں، اب میں آپ سے ہی پوچھتا ہوں کہ کیا سائنس اور جغرافیہ اور انگریزی زبان سے کوئی خدا کے قریب ہوتا ہے؟ وصل ہوتا ہے یا فصل؟ قرب ہوتا ہے یا بعد؟ مشاہدہ ہے کہ ان سے بعد ہی بڑھتا ہے، گو چاہئے تو یہ تھا کہ سائنس سے خدا کی طرف قرب بڑھتا؛ کیوں کہ اس سے قدرت مانع کا انکشاف ہوتا ہے اور اپنا عجز زیادہ مشاہد ہوتا ہے؛ کیوں کہ اہل سائنس رات دن ترقی کی فکر میں رہتے ہیں، اس لئے ان کے مقاصد بہت وسیع ہیں جن میں کثرت سے ایسے مقاصد بھی ہیں جو عرصہ تک پورے نہیں ہوئے، زمانۂ دراز تک ان میں ناکامی رہتی ہے، بخلاف ہمارے مقاصد کے کہ وہ معدودے چند ہیں، جو اکثر پورے ہوجاتے ہیں، مگر ہم پھر بھی اپنے عجز کے معترف ہیں، ان لوگوں کے زیادہ مقاصد ناکام رہتے ہیں جو کھلی دلیل ہے عجز کی، مگر یہ لوگ باوجود مشاہدۂ عجز زائد کے پھر بھی اپنے کو قادر سمجھتے ہیں، وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے عجز پر نظر نہیں کرتے، بس عرصہ کے بعد جو کسی مقصود میں کامیابی ہوگئی، اس پر نازاں ہوتے ہیں کہ ہم نے یہ ایجاد کر لی؟ ڈلے پتھر، اگر ایجاد تمہارے ہاتھ میں تھی تو پہلے ہی کیوں نہ ایجاد کر لی؟ تمہارا کام صرف اتنا ہے کہ سوچو اور غور کرو، باقی ذہن میں ایجاد کا صحیح طریقہ آجانا یہ تمہارے اختیار سے بالکل خارج ہے، یہ محض حق تعالیٰ کے قبضے میں ہے، مگر عادت الٰہیہ ہے کہ جب کسی بات کے لئے انسان غور وفکر کرتا ہے تو وہ اکثر راستے کھول دیتا ہے، مگر عادت الٰہیہ ہے کہ جب کسی بات کے لئے انسان غور وفکر کے بعد بھی حقیقت ظاہر نہیں کرتے؛ چنانچہ اب تک کسی کو نہیں معلوم کہ مقناطیس لوہے کو کیوں جذب کرتا ہے؟ اور ایسی نظائر بکثرت موجود ہیں، اگر غور وفکر کے بعد حقیقت تک پہنچ جانا تمہارے اختیار

(۱) ترمذی: باب منہ، حدیث: ۲۳۲۲، امام ترمذی نے اس روایت کو حسن غریب کہا ہے

میں ہے تو ان چیزوں کا انکشاف کیوں نہ کر لیا؟" (۱)

ڈگری کا مقصد روٹی نہیں

رزاق حقیقی اللہ ہے، رزق کا انسان کی عقل، انسان کی ڈگری سے، یا اس کی محنت سے کوئی تعلق نہیں "اَللهُ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَاءُ وَیَقْدِرُ" (۲) (اللہ جس جس کے لئے چاہتا ہے رزق کو کشادہ کرتا ہے اور جس پر چاہے تنگ کرتا ہے) "وَاللهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ" (۳) جو شخص علم رزق ہی کے لئے حاصل کر رہا ہے وہ ناکامی کا منہ دیکھے گا؛ کیوں کہ ملے گا اتنا ہی جتنا اللہ چاہے گا، **اگر ڈگری حاصل کرنے کا نشانہ یہ ہے کہ اچھے خاندان میں نکاح ہوجائے، اونچے محل تعمیر ہوجائیں، ترقی یافتہ ممالک کی شہریت مل جائے، اونچے مواقع رزق حاصل ہوجائیں تو دنیا دیکھتی رہتی ہے کہ ان مقاصد کے ملنے سے پہلے ہی وہ شخص دنیا سے رخصت ہوگیا، یا ملنے کے بعد چند ہی دن میں موت کا بلاوا آگیا، یا یہ ساری چیزیں ملیں مگر بے برکتی، خدا سے دوری اور آخرت سے محرومی کے ساتھ ملی، اس لئے عصری علوم کے طلبہ کو بالخصوص چاہئے کہ وہ اللہ کی معرفت اور انسانوں کی خدمت ہی کے ارادہ سے ان فنون کو حاصل کریں، پڑھنے کے بعد ان ہی نیتوں سے ان فنون کا استعمال کریں، کچھ نہ بھی ملا تو اللہ مل جائے گا، مقدر کی روزی کے ساتھ محتاجوں کی دعائیں نسلوں کی قسمت کو بدل دیں گی، برکتوں کے دہانے کھل جائیں گے، پھر موت بھی آئے تو یہ نیت کرنے والا کامیاب ہی مرے گا۔**

انسانوں کی خدمت اور ان کے ساتھ حسن سلوک یہ اخلاقیات سے تعلق رکھتا ہے، ہر دور میں اللہ کے پیغمبروں اور آسمانی کتابوں نے خدمت خلق کی تعلیم دی ہے، سب سے آخری کتاب قرآن مجید اور رسولِ خدا ﷺ نے بھی اس کی طرف بطورِ خاص توجہ دی ہے، اس کی سخت تاکید کی ہے، لوگوں میں دوسروں کے تعلق سے ہمدردی کے جذبات ابھارے اور اسے خدا کی رضا اور خوشنودی کا ذریعہ قرار دیا۔

(۱) اشرف الجواب: حصہ چہارم: ۵۰۰، مکتبہ عمر فاروق، کراچی

(۲) الرعد: ۲۶ (۳) النحل: ۷۱

قرآن کریم نے اپنے آغاز نزول کے بعد ہی سے دو باتوں پر خصوصی زور دیا ہے، اول یہ کہ انسان کا خدا سے تعلق مضبوط ہو، وہ صرف اسی کی عبادت کرے اور اس کے سوا کسی کے سامنے اپنا سر نہ جھکائے، دوسرے یہ کہ انسانوں کے ساتھ اخلاق سے پیش آئے اور حق داروں کا حق ادا کرے ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرے، قرابت داروں، ہمسایوں، مسکینوں اور حاجت مندوں کی جو ضرورتیں پوری کر سکتا ہے پوری کرے، کوئی بھی شخص جو اس کی خدت کا مستحق ہو اور جس کی خدمت کرنا اس کے امکان میں ہو، وہ اس کی خدمت سے محروم نہ رہے، وہ طاقت ور ہے تو کمزوروں پر دست درازی نہ کرے، بلکہ ان کو سہارا دے اور ان کی تقویت کا ذریعہ بنے، لوگوں کی جان و مال اور عزت وآبرو کی اپنے جان و مال اور عزت وآبرو کی طرح حفاظت کرے، کسی کے ساتھ دھوکے اور فریب کا معاملہ نہ کرے، بلکہ ہر حال میں عدل وانصاف اور دیانت وامانت پر قائم رہے، اس کا وجود معاشرہ کے لئے کلفت وآزار کا باعث نہ ہو اور اس سے کسی کو ضرر اٹھانا نہ پڑے، قرآن مجید ان باتوں کو اس قدر اہمیت دی ہے کہ قرآن کریم میں کئی کئی بار کہیں تفصیل سے اور کہیں اختصار مختلف مواقع سے ان باتوں کو اجاگر کیا ہے، اس کا ایک بہترین نقشہ اور تصویر سورہ اسراء کی آیت ۲۳ سے آگے تک موجود ہے۔

''اللہ کا فیصلہ ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرو، وہ بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو خصوصیت سے ان کا خیال رکھو، ان کے سامنے تواضع اور خاکساری کے ساتھ جھک جاؤ، درشتی اور سختی سے نہ پیش آؤ اور ان کے لئے دعائیں کرتے رہو، قرابت داروں، مسکینوں اور مسافروں کا حق ادا کرو، اگر اپنی غربت اور افلاس کی وجہ سے ان کی مدد نہ کر سکو تو نرمی سے معذرت کر دو، اپنی اولاد کو اس خطرے سے نہ مار ڈالو کہ تم ان کو کچھ کھلا نہ سکو گے، اللہ تعالیٰ تمہیں بھی کھلائے گا اور انہیں بھی کھلائے گا، قتل اور وہ بھی اپنی اولاد کا قتل بہت بڑا سنگین گناہ ہے، زنا کے قریب نہ پھٹکو، یہ بے حیائی کا کام اور زندگی کا غلط

راستہ ہے، اللہ نے انسان کی جان کو باعزت اور محترم ٹھہرایا ہے، اس لئے جب تک حق وانصاف کا تقاضا نہ ہو، اس کے خون سے اپنے ہاتھ آلودہ نہ کرو، یتیم کو بے آسرا سمجھ کر اس کا مال نہ کھاؤ، جب وہ جوان ہو جائے تو اس کا مال اس کے حوالے کر دو، عہد و پیمان کو پورا کرو، خدا کے ہاں اس کے بارے میں باز پرس ہوگی، ناپ وتول میں کمی نہ کرو، جس بات کا تمہیں علم نہیں ہے اس کے بارے میں زبان نہ کھولو، یاد رکھو! کان، آنکھ، دل اور دماغ ہر ایک کے بارے میں خدا کے یہاں سوال ہوگا، تکبر اور غرور کی چال نہ چلو، تم نہ ٹھوکر مار کر زمین کا سینہ چاک کر سکتے ہو اور نہ سر اٹھا کر پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکتے ہو، یہ باتیں تمہارے رب کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں۔(۱)

بندگانِ خدا کی خدمت خدا کی خدمت ہے:

اسلام نے مخلوق کی خدمت کو خدا کی خدمت قرار دیا ہے، اس نے یہ تعلیم دی ہے کہ خدا کے بندوں کی معاونت و مدد دراصل خدا کی خدمت ہے، کیوں یہ بندہ خدا کی قدرت اور اس کی بناوٹ کا شاہکار ہے، یہ خدا کی مصنوعات میں سے ہے، اگر کوئی بندۂ خدا کے آپ کے سامنے ہاتھ پھیلائے اور آپ نے اس کے ہاتھ کو رد کر دیا تو گویا کہ اللہ عزوجل کے ہاتھ کو خالی لوٹایا، اگر بیمار مریض علاج کا محتاج ہو اور آپ نے اس کی مدد سے انکار کیا تو دراصل خدا کی مدد و نصرت سے اعراض کیا، خدا کی رضا وخوشنودی کے حصول کے لئے بندگانِ خدا کی رضا اور خوش نودی کو حاصل کیا جائے، ''اِرْحَمُوْا مَنْ فِي الْأَرْضِ يَرْحَمُكُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ'' روئے زمین پر بسنے والوں سے رحم وکرم اور اچھے برتاؤ اور سلوک کا معاملہ کرو آسمان والا تم پر رحم وکرم کرے گا۔(۲)

اور ایک حدیث قدسی میں ہے:

(۱) سورۃ الاسراء: ۲۳=۳۸

(۲) ترمذی: رحمۃ المسلمین، حدیث: ۱۹۳۴، امام ترمذی نے اس روایت کو حسن صحیح کہا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ عزوجل قیامت کے دن فرمائے گا اے ابن آدم میں بیمار ہوا اور تو نے میری عیادت نہیں کی وہ کہے گا اے پروردگار میں تیری عیادت کیسے کرتا حالانکہ تو تو رب العالمین ہے؟ اللہ فرمائے گا کیا تو نہیں جانتا کہ میرا فلاں بندہ بیمار تھا اور تو نے اس کی عیادت نہیں کی کیا تو نہیں جانتا کہ اگر تو اس کی عیادت کرتا تو تو مجھے اس کے پاس پاتا اے ابن آدم میں نے تجھ سے کھانا مانگا؛ لیکن تو نے مجھے کھانا نہیں کھلایا وہ کہے گا اے پروردگار میں آپ کو کیسے کھانا کھلاتا حالانکہ تو تو رب العالمین ہے؟ تو اللہ فرمائے گا کیا تو نہیں جانتا کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تھا؛ لیکن تو نے اس کو کھانا نہیں کھلایا تھا کیا تو نہیں جانتا کہ اگر تو اس کو کھانا کھلاتا تو تو مجھے اس کے پاس پاتا اے ابن آدم میں نے تجھ سے پانی مانگا؛ لیکن تو نے مجھے پانی نہیں پلایا وہ کہے گا اے پروردگار میں تجھے کیسے پانی پلاتا حالانکہ تو تو رب العالمین ہے؟ اللہ فرمائے گا میرے فلاں بندے نے تجھ سے پانی مانگا تھا؛ لیکن تو نے اس کو پانی نہیں پلایا تھا اگر تو اسے پانی پلاتا تو تو اسے میرے پاس پاتا: "أَمَا أَنَّكَ لَوْ سَقَيْتَهُ وَجَدْتَّ ذٰلِكَ عِنْدِيْ" (۱)

خدمت بھی عبادت ہے:

نماز بدنی عبادت ہے اور زکوۃ مالی عبادت ہے، نماز بندے کی طرف سے خدا کی عظمت و بزرگی اور اپنی عبدیت کا اعلان کیا ہے اور زکوۃ اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ ان کے دل میں ہم دردی اور غم خواری کا جذبہ موجود ہے اور وہ دوسروں کے لئے اپنا مال خرچ کرتا ہے، قرآن مجید میں نے نماز اور زکوۃ کا بالعموم ایک ساتھ ذکر کیا ہے، دونوں پر یکساں زور دیا ہے، گویا خدا کو خوش کرنے کے لئے جس طرح بدنی عبادت کو ضروری سمجھتا ہے، اسی طرح مالی عبادت کو بھی لازم قرار دیتا ہے:

"وَمَا أُمِرُوْا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَاءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ" (۱)

(۱) مسلم: باب فضل عیادۃ المریض، حدیث: ۲۵۶۹ (۲) البینۃ: ۵

ان کو بس اس بات کا حکم دیا گیا تھا کہ وہ اللہ کی عبادت کریں اپنے دین کو اس کے لئے خالص کر کے یکسو ہو کر، نماز قائم کریں اور زکوۃ دیں، یہی مضبوط دین ہے، اور ایک آیت فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (۱)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، رکوع کرو، سجدہ کرو اور اپنے رب کی عبادت کرو اور خیر پر عمل کرو اس امید سے کہ تم فلاح پاؤ گے۔

شریعت نے بتلایا کہ بعض اوقات مالی عبادت بدنی عبادت کا بدل بن جاتی ہے اور اس میں جو نقص اور کمی رہ جائے اس کی بھی اس سے تلافی ہو جاتی ہے چنانچہ جو لوگ بڑھاپے کی وجہ یا کسی سخت مرض کی وجہ سے روزہ رکھنے کی طاقت نہ رکھتے ہوں، ان کے لئے فدیہ کا حکم دیا گیا اور ہدایت کی گئی کہ وہ ایک روزہ کے عوض ایک مسکین کو دونوں وقت کا کھانا کھلا دیں (۲) رمضان کے روزوں کے بعد صدقہ فطر رکھا گیا اس کی وجہ اور حکمت یہ بتلائی گئی کہ روزوں میں اتفاق سے یا غیر شعوری طور پر کبھی لغو اور بے ہودہ حرکت ہو جائے تو صدقہ فطر جس کے ذریعہ مسکینوں کی جو تھوڑی مدد ہوتی ہے، اس سے یہ کمی اور نقص جاتا رہتا ہے "زَكَاةُ الْفِطْرِ طُهْرَةٌ لِلصِّيَامِ مِنَ اللَّغْوِ وَالرَّفَثِ وَطُعْمَةٌ لِلْمَسَاكِيْنِ" (۳) اسی طرح حج کو جو مالی اور جانی عبادت کا حسین امتزاج ہے اس میں حالت احرام میں بال مونڈھوانا منع ہے اگر کسی تکلیف سے بال منڈوانے کی ضرورت درپیش ہو تو آدمی روزے یا قربانی یا صدقے کی شکل میں اس کا فدیہ ادا کرے، اس میں قربانی کے گوشت اور فدیہ کے ذریعہ غریبوں کی خدمت ہو جاتی ہے، اسی طرح

(۱) الحج: ۷۷
(۲) بخاری، کتاب التفسیر، سورۃ البقرۃ، ابن کثیر: ۱/۲۱۴=۲۱۵
(۳) ابوداد: کتاب الزکاۃ، باب زکاۃ صدقۃ الفطر، حدیث: ۱۶۰۹، منذری فرماتے ہیں: اس کو ابوداؤد اور ابن ماجۃ نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اس کو بخاری کی شرط پر صحیح قرار دیا ہے۔

ظہار جس میں عرب ناراضگی کی صورت میں بیوی کو ماں کے مثل قرار دیتے تھے، اللہ عزوجل نے ان کی بے ہودگی پر تنقید کی اور اس سے رجوع کی کیفیت یہ بیان کی کہ پہلے بہ طور کفار غلام آزاد کیا جائے، اس کی استطاعت نہ ہو تو لگا تار ساٹھ روزے رکھے اور یہ بھی نہ ہو سکے تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے، اس کے بغیر بیوی سے تعلقات درست نہیں (۱) اسی طرح اگر اسلامی مملکت میں کوئی مسلمان کسی مسلمان کا قتل کر دے تو اسے ایک غلام آزاد کرنا ہوگا اور مقتول کی دیت بھی اس پر واجب ہوگی۔ اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو دو مہینے مسلسل روزے رکھے (۲) اسی طرح اگر آدمی کسی بات کو مستحکم کرنے کے لئے قسم کھائے پھر اس کو توڑ دے تو اس کا کفارہ یہ بتلایا گیا کہ دس مسکینوں کو اوسط درجے کا کھانا کھلائے یا ان کو کپڑا پہنائے یا غلام آزاد کرے، جس شخص کو ان میں سے کسی کی طاقت نہ ہو تو وہ تین دن روزہ رکھے۔

یہاں پر قرآن مجید اور احادیث نبویہ نے بعض مواقع حسن سلوک اور خدمت خلق کو بعض عبادات کا بدل قرار دے کر اور اس کے ذریعے ان کی کمی کو دور کر کے اس کی اہمیت وافادیت کو اجاگر کیا۔

خدمت سب کی کی جائے

بعض لول وہ ہوتے ہیں جنہیں صرف اپنی ذات سے غرض ہوتی ہے، وہ صرف اپنا مفاد سوچتے ہیں، انہیں دوسروں سے کوئی سروکار نہیں ہوتا، بعض لوگوں میں خدمت کا جذبہ ضرور ہوتا ہے، لیکن وہ اپنے اہل وعیال سے ہٹ کر نہیں سوچتے، اسلام نہ تو فرد کی اہمیت کو کم کرتا ہے، نہ خاندان اور قبیلہ کی اہمیت کو گھٹاتا ہے، بلکہ وہ تو رنگ، نسل، زبان اور علاقہ کی اختلاف کے بغیر ساری امت کو جسد واحد قرار دیتا ہے، بلکہ اس سے بڑھ کر اسلام انسان کو امت کا ہم درد بنانے کے ساتھ ساتھ تمام نوعِ انسانی کا ہم درد بناتا ہے تعصب آدمی کو نفرت اور عداوت سکھاتا ہے، جو شخص قومی تعصب میں گرفتار ہو وہ اپنی قوم کے سوا کسی دوسری قوم کے ساتھ ہم دردی اور محبت کا روادار نہیں ہوتا، اسلام اس کے

(۱) المجادلۃ: ۳، ۴ (۲) النساء: ۹۲

سراسر خلاف ہے، اس کے نزدیک خدا کی مخلوق اس کا کنبہ ہے، جو ان کی جتنی خدمت کرے وہ اس کا اتنا محبوب ہے، حضرت انس ؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اَلْخَلْقُ كُلُّهُمْ عَيَالُ اللهِ، أَحَبُّهُمْ إِلَيْهِ أَنْفَعُهُمْ لِعَيَالِهِ" (۱) مخلوق ساری کی ساری اللہ کا کنبہ ہے، اس میں وہ شخص اللہ کو سب سے زیادہ محبوب ہے جو اس کے کنبہ کو زیادہ نفع پہنچائے۔

قرآن مجید نے مسکینوں، محتاجوں، معذوروں، یتیموں ارو وسائل سے محروم انسانوں کی خدمت اور ان کے ساتھ حسن سلوک کا عام حکم دیا ہے، کہیں بھی اس نے یہ ہدایت نہیں کی کہ صرف مسلمانوں یا انسانوں کے کسی خاص گروہ اور جماعت کی خدمت کی جائے اور دوسروں کی نہ کی جائے، وہ چاہتا ہے کہ خدمت پوری نوع انسانی کی ہو، اپنوں کی بھی اور غیروں کی بھی، ہم خیال اور ہم عقیدہ افراد کی بھی اور ان لوگوں کی بھی جو ہم سے اختلاف رکھتے ہیں، وہ بھی اس کے مستحق ہیں، جو ہماری زبان بولتے ہیں اور وہ بھی جن کے اظہار خیال کا ذریعہ دوسری زبان ہے، نوعِ انسانی کا ہر فرد اس بات کا حق رکھتا ہے کہ آلام ومصائب میں اسے تنہا تڑپنے نہ چھوڑ دیا جائے؛ بلکہ اس کے درد وکرب کو محسوس کیا جائے اور امکان کی حد تک اسے دور کرنے کی سعی کی جائے، اس لئے رنگ ونسل قوم ووطن کے فرق کے باوجود احادیث میں خدمت خلق کے تعلق سے عمومی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔

حضرت جریر بن عبداللہ ؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"لَا يَرْحَمُ اللهُ مَنْ لَّا يَرْحَمُ النَّاسَ" (۲)

''اللہ تعالی اس پر رحم نہیں فرماتا جو انسانوں پر رحم نہیں کرتا''

حضرت عبداللہ بن عمر ؓ رسول اللہ ﷺ سے یہ حدیث نقل کرتے ہیں:

(۱) المعجم الكبير، عبد الله بن مسعود: حدیث: ۱۰۰۵۳، علامہ ہیثمی فرماتے ہیں: اس کو طبرانی نے کبیر اور اوسط میں روایت کیا ہے اور اس میں عمیر، وہو ابو ہارون القرشی ہیں اور وہ متروک ہیں۔

(۲) بخاری: کتاب التوحید، باب قل أعوذ باللہ، حدیث: ۶۹۴۱

"اَلرَّاحِمُوْنَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ ، اِرْحَمُوْا مَنْ فِي الْاَرْضِ يَرْحَمُكُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ" (۱)

رحم کرنے والوں پر اللہ رحم فرماتا ہے (لہٰذا) زمین والوں پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم ہرگز ایمان والے نہیں ہوسکتے جب تک کہ تم رحم نہ کرو، فرماتے ہیں کہ ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہم میں سے ہر شخص رحم کرتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: اس سے وہ رحم اور ہمدردی مراد نہیں ہے جو تم میں سے کوئی اپنے قریب کے آدمی کے ساتھ کرتا ہے، یہاں اس رحمت عامہ کا ذکر ہے جو تمام انسانوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ "وَلٰكِنَّ رَحْمَةَ النَّاسِ عَامَّةٌ" (۲)

خدمت خلق کے مختلف طریقے

ایک غریب اور نادار شخص کی خدمت تو روپئے پیسے کی ذریعہ کی جاسکتی ہے؛ لیکن جس کے پاس خود دولت ہو اسے ہمارے پیسے کی کوئی حاجت نہیں ہے؛ البتہ ہم دردی اور محبت اور اخلاقی رویہ کا محتاج ہر شخص ہے، نہ اس سے کوئی امیر بے نیاز ہوسکتا ہے اور نہ کوئی فقیر، بعض اوقات ہم دردی کا ایک لفظ، محبت بھری ایک بات اور ایک کلمہ خیر کی مادی تعاون سے زیادہ اہمیت ہوتی ہے، قرآن نے شیریں کلامی اور حسن تخاطب کو اتنی اہمیت دی ہے کہ ایک جگہ نماز اور زکاۃ سے پہلے اس کا ذکر کیا ہے:

"وَقُولُواْ لِلنَّاسِ حُسْناً وَأَقِيمُواْ الصَّلاَةَ وَآتُواْ الزَّكَاةَ" (۳)

اور لوگوں سے اچھے طریقے سے بات کرو، نماز قائم کرو اور زکوۃ دو۔

(۱) ترمذی: کتاب البر والصلۃ: باب فی ما جاء فی رحمۃ الناس، حدیث: ۱۹۲۴، امام ترمذی نے اس روایت کو حسن صحیح کہا ہے

(۲) مجمع الزوائد: باب رحمۃ الناس، حدیث: ۱۳۶۷۱، علامہ ہیثمی فرماتے ہیں: اس کو طبرانی نے روایت کیا ہے اور اس کے رجال صحیح کے رجال ہیں۔

(۳) البقرۃ: ۸۳

اس سے پتہ چلا کہ خدمت صرف روپیوں اور پیسوں کے ذریعے نہیں ہوتی؛ بلکہ کسی معذور کی مدد کرنا، کسی اندھے کو راستہ دکھانا، راستے سے کسی تکلیف دہ چیز کا دور کرنا، کسی کو پانی بھر کے دینا، حتی کہ کسی سے خندہ پیشانی سے ملنا اور تہذیب و شرافت سے پیش آنا بھی ان کی خدمت ہے اور مالی خدمت کی طرح یہ بھی صدقہ ہے، حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یا ہر مسلمان پر صدقہ لازم ہے عرض کیا گیا اگر یہ نہ ہوسکے تو کیا حکم ہے؟ فرمایا اپنے ہاتھوں سے کمائے اور اپنے آپ کو نفع پہنچائے اور صدقہ کرے، عرض کیا اگر اس کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو تو کیا حکم ہے؟ فرمایا ضرورت مند مصیبت زدہ کی مدد کرے، "فَيُعِيْنُ ذَا الْحَاجَةِ الْمَلْهُوْفِ" آپ سے عرض کیا گیا اگر یہ بھی نہ ہوسکے تو آپ ﷺ نے فرمایا نیکی کا حکم کرے اور یہ بھی نہ کرسکے تو آپ ﷺ کیا حکم دیتے ہیں؟ فرمایا برائی سے رک جائے اس کے لئے یہ بھی صدقہ ہے۔ (۱)

اس کے علاوہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے متعدد ارشادات میں یہ حقیقت واضح فرمائی ہے کہ نوعِ انسانی کی چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی جو خدمت بھی کی جاسکتی ہے کی جانی چاہئے، ہر خدمت صدقہ اور احسان ہے اور انسان پر اجر و ثواب کا مستحق ہوتا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ انسان کے بدن کے جوڑ پر طلوع آفتاب کے ساتھ ایک صدقہ واجب ہوجاتا ہے دو آدمیوں میں انصاف و عدل کرادینا صدقہ، کسی آدمی کو اس کے سوار ہونے میں مدد دینا یا اس کی سواری پر اس کا مال و اسباب لاد دینا صدقہ ہے، کسی سے اچھی بات کہنا صدقہ ہے اور ہر وہ قدم جو نماز کے لئے اٹھے صدقہ ہے اور تکلیف دینے والی چیز کو راستہ سے ہٹا دینا صدقہ ہے: "وَيُمِيْطُ الْأَذٰى عَنِ الطَّرِيْقِ صَدَقَةٌ" (۲)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی ایک اور روایت سے اس کی مزید وضاحت ہوتی ہے۔

(۱) مسلم: باب بیان أن اسم الصدقۃ یقع علی کل، حدیث: ۱۰۰۸

(۲) بخاری: کتاب الجہاد، باب أخذ الزکاۃ ونحوہ، حدیث: ۲۸۲۷

رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ اپنے مسلمان بھائی کے سامنے مسکرانا یعنی کسی سے خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آنا صدقہ ہے نیک کام کے لیے حکم کرنا صدقہ ہے۔ بری بات سے روکنا صدقہ ہے۔ بےنشان زمین میں کسی کو راستہ بتانا صدقہ ہے، وہاں کسی راستہ بھولے ہوئے مسافر کو اس کا راستہ بتادینے سے صدقہ جیسا ثواب ملتا ہے کسی اندھے یا کمزور نظر شخص کی مدد کرنا صدقہ ہے، راستے سے پتھر، کانٹا اور ہڈی ہٹا دینا صدقہ ہے اور اپنے ڈول سے اپنے بھائی کے ڈول میں پانی بھر دینا صدقہ ہے۔ ''وَإِفْرَاغُكَ مِنْ دَلْوِكَ فِيْ دَلْوِ أَخِيْكَ صَدَقَةٌ''۔(۱)

ان حدیثوں میں انسانوں کی خدمت اور ان کی بھلائی کی بہت سی صورتیں بیان ہوئی ہیں، ان میں سے بعض تو وہ ہیں کہ خدمت کا جذبہ ہو تو بڑی آسانی سے ان پر عمل ہوسکتا ہے۔

ایک روایت میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ''كُلُّ مَعْرُوْفٍ صَدَقَةٌ''۔ (۲) بھلائی کا ہر کام صدقہ ہے، یہ ایک جامع حدیث ہے جو خدمت خلق کی سب ہی شکلوں کی جامع ہے، بنی نوع انسانی کی جس شکل میں بھی خدمت کی جائے وہ اس پر صدقہ واحسان ہے اور خدمت کرنے والا اس کے اجر وثواب کا مستحق ہے۔

اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے:

''لَا تَحْقِرَنَّ مِنَ الْمَعْرُوْفِ شَيْئًا وَلَوْ أَنْ تَلْقَ أَخَاكَ بِوَجْهٍ طَلِيْقٍ''۔(۳)

بھلائی کے کسی کام کو حقیر ہرگز نہ سمجھو اگرچہ وہ اپنے بھائی سے مسکرا کر تمہارا ملنا ہی کیوں نہ ہو۔

---

(۱) ترمذی: ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی صنائع المعروف، حدیث: ۱۹۵۶، امام ترمذی نے اس روایت کو حسن غریب کہا ہے۔

(۲) بخاری: کتاب الأدب، باب کل معروف صدقة، حدیث: ۵۶۷۵

(۳) مسلم: باب استحباب طلاقة الوجه، حدیث: ۲۶۲۶

صنعت وحرفت میں تعاون کی اہمیت

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے اپنی ایک گفتگو میں نقل فرماتے ہیں: ایک مرتبہ میں نے بارگاہ رسالت میں عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ سب سے افضل عمل کون سا ہے؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اللہ تعالی پر ایمان لانا اور اس کی راہ میں جہاد کرنا، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کون سا غلام آزاد کرنا سب سے افضل ہے؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو اس کے مالک کے نزدیک سب سے نفیس اور گراں قیمت ہو عرض کیا کہ اگر مجھے ایسا غلام نہ ملے تو؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کسی ضرورت مند کی مدد کردو یا کسی محتاج کے لئے محنت مزدوری کرلو عرض کیا کہ اگر میں یہ بھی نہ کرسکوں تو؟ فرمایا لوگوں کو اپنی تکلیف سے محفوظ رکھو کیونکہ یہ بھی ایک صدقہ ہے جو تم اپنی طرف سے دیتے ہو۔ ''صَدَقَةٌ تُصَدِّقُ بِهَا عَلَى نَفْسِكَ''۔(۱)

اس حدیث میں پہلے ایمان باللہ، جہاد فی سبیل اللہ اور غلاموں کو آزاد کرنے کی فضیلت بیان ہوئی ہے، اس کے بعد آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تُعِيْنُ ضَائِعًا أَوْ تَصْنَعُ لِأَخْرَقَ''، اسی کی یہاں تھوڑی سی تشریح کی جائے گی، ''تعین ضائعا'' کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص غربت میں مبتلا ہو اور جس کے بیوی بچوں کے گذر بسر کی کوئی صورت نہ ہو، اس کی مدد کرو، اسے ضائع ہونے سے بچاؤ۔

ایک روایت میں ''ضائعا'' کی جگہ ''صانعا'' کا لفظ آیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ تم کسی ایسے شخص کی مدد کرو جس کے ہاتھ میں کوئی صنعت یا پیشہ ہے، اس کی مدد روپیئے، فنی تعاون، اوزار اور مشینوں کی فراہمی اور پیداوار کے لئے بازار اور مارکیٹ پیدا کر کے کی جاسکتی ہے، صاحب حرفت کی مدد کا ذکر خصوصیت سے اس لئے کیا گیا کہ اس کی مشکلات کا بالعموم احساس نہیں ہوتا اور اس کی مدد کی طرف ذہن نہیں جاتا۔

اس کے بعد فرمایا: ''أَوْ تَصْنَعُ لِأَخْرَقَ''، اخرق بے ہنر گویا ایسے شخص کو کہا جاتا ہے جو کوئی کام اچھی طرح نہ کرسکے، گویا پہلے ہنرمند کی مدد کا حکم دیا پھر بے ہنر کی مدد کی

---

(۱) بخاری: کتاب العتق، باب أی الرقاب أفضل، حدیث: ۲۳۸۲

طرف توجہ دلائی گئی، مطلب یہ ہے کہ جو شخص بے ہنر ہے یا اپنا کام ٹھیک سے انجام نہیں دے پا رہا ہے، اس کی مدد کی جائے، اگر معاشرہ میں اس کا احساس عام ہو اور اس طرح کے ادارے کام کرنے لگیں جہاں صنعت وحرفت کی تعلیم دی جائے، بے ہنر افراد کو ہنر مند بنایا جائے اور ان کے لئے روزگار کے مواقع فراہم کئے جائیں تو یہ خدمت خلق کی ایک عملی شکل ہو سکتی ہے اور اس سے کم زور طبقات کے معاشی مسائل بڑی حد تک حل ہو سکتے ہیں۔

☆ حضرت جابر ؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو مسلمان درخت لگاتا ہے پھر اس میں سے جتنا حصہ کھالیا جائے وہ درخت لگانے والے کے لئے صدقہ ہوجاتا ہے اور جو اس میں سے چرالیا جائے وہ بھی صدقہ ہوجاتا ہے یعنی اس پر بھی مالک کو صدقہ کا ثواب ملتا ہے اور جتنا حصہ اس میں سے چرند کھالیتے ہیں وہ بھی اس کے لئے صدقہ ہوجاتا ہے اور جتنا حصہ اس میں سے پرندے کھالیتے ہیں وہ بھی اس کے لئے صدقہ ہوجاتا ہے (غرض یہ کہ) جو کوئی اس درخت سے کچھ (بھی پھل وغیرہ) لے کر کم کر دیتا ہے تو وہ اس (درخت لگانے والے) کے لئے صدقہ ہوجاتا ہے۔ "وَلَا يَرْزَؤُهُ أَحَدٌ إِلَّا كَانَ لَهُ صَدَقَةٌ" (۱)

☆ حضرت قاسم ؒ فرماتے ہیں کہ دمشق میں حضرت ابوالدرداء ؓ کے پاس سے ایک شخص گذرے، اس وقت حضرت ابوالدرداء ؓ کوئی پودا لگا رہے تھے، اس شخص نے حضرت ابودرداء ؓ سے کہا: کیا آپ بھی یہ (دنیاوی) کام کر رہے ہیں؛ حالانکہ آپ تو رسول اللہ ﷺ کے صحابی ہیں؟ حضرت ابودرداء ؓ نے فرمایا: مجھے ملامت کرنے میں جلدی نہ کرو، میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا: جو شخص پودا لگاتا ہے اور اس میں سے کوئی انسان یا اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے کوئی مخلوق کھاتی ہے تو وہ اس (پودا لگانے والے)

(۱) مسلم: باب فضل الغرس والزرع، حدیث: ۳۹۶۸

کے لئے صدقہ ہوتا ہے۔

مَنْ غَرَسَ غَرْسًا لَمْ يَأْكُلْ مِنْهُ آدَمِيٌّ وَلَا خَلْقٌ مِنْ خَلْقِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ إِلَّا كَانَ لَهُ صَدَقَةٌ۔ (۱)

☆ حضرت ابوایوب انصاری ؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"مَا مِنْ رَجُلٍ يَغْرِسُ غَرْسًا إِلَّا كَتَبَ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ لَهُ مِنَ الْأَجْرِ قَدْرَ مَا يَخْرُجُ مِنْ ثَمَرِ ذٰلِكَ الْغَرْسِ" (۲)

جو شخص پودا لگاتا ہے پھر اس درخت سے جتنا پھل پیدا ہوتا ہے اللہ تعالیٰ پھل کی پیداوار کے بقدر پودا لگانے والے کے لئے اجر لکھ دیتے ہیں۔

جب پودے کے لگانے کا یہ ثواب ہے تو پھر کسی ایسے انجکشن کا بنانا جس سے کسی مہلک مرض کا علاج ہوجاتا ہو، یا آپریشن کا آلہ، یا ایسے چیز کی ایجاد جس سے کسی لاعلاج سمجھے جانے والے مرض سے شفا حاصل ہو، جب تک وہ دوا یا آلہ یا انجکشن سے جتنے لوگ فائدہ اٹھاتے رہیں گے ثواب ملتا رہے گا۔

ترقی کے وسائل استعمال کرنے کے سلسلے میں یہ روایت بہت غیر معمولی ہے، اگر کوئی شخص پودا لگانے کے لئے بیٹھا ہو، اس کے ہاتھ میں اسکے بیج یا قلم ہو اور قیامت کا صور پھونک دیا جائے تو حضور اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: اگر ہو سکے تو اس پودے کو لگا کر پھر اٹھو پھر دیکھو کہ قیامت آئی ہے "فَإِنِ اسْتَطَاعَ أَنْ يَغْرِسَ فَلْيَفْعَلْ"۔

☆ حضرت جابر ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص بنجر زمین کو کاشت کے قابل بناتا ہے تو اسے اس کا اجر ملتا ہے " مَنْ أَحْيَا

(۱) مسند احمد، ومن حدیث أبی الدرداء، حدیث: ۲۷۵۴۶، محقق شعیب الارنوط نے اس روایت صحیح لغیرہ کہا ہے۔

(۲) مجمع الزوائد: باب فی اتخاذ الشجر وغیر ذلکن حدیث: ۶۲۶۶، علامہ ہیثمی فرماتے ہیں: اس کو احمد نے روایت کیا ہے، اس میں عبداللہ بن عبدالعزیز اللیثی ہیں، جن کی امام مالک اور منصور نے توثیق کی ہے اور ایک جماعت نے ان کو ضعیف قرار دیا ہے، اور اس کے بقیہ رجال صحیح کے رجال ہیں۔

أَرْضًا مَيِّتَةً، فَلَهُ فِيهَا أَجْرٌ"۔(۱)

لہٰذا ہر وہ ٹکنالوجس سے بنجر زمین کی بعض آبادکاری کی جاسکتی ہے، مسلمان اس بات کا زیادہ حقدار ہے کہ اس ٹکنالوجی کو سیکھیں، فروغ دیں، اور اس کا استعمال کریں۔

قرآن کریم میں جا بجا **فساد فی الأرض** (زمین میں تباہی مچانے) سے روکا گیا، زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے زمینی ذخائر کا استعمال کرنا ضروری ہے، انسانیت کے مقام کو سامنے رکھتے ہوئے دنیا کو آباد کرنا اللہ کی نعمتوں میں ذکر کیا گیا ہے، "وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيهَا"۔(۲) اور آخرت کی منزل کو۔

فنون میں غیروں سے مشابہت ناجائز

یہ حقیقت ہے کہ ہر چیز کا وجود اس کی امتیازی خصوصیات، اسکے مخصوص نقشہ کی وجہ سے ہوتا ہے جو اوصاف اور نقشہ کسی دوسرے کو میسر نہیں، اگر زید عمر سے الگ دکھائی دیتا ہے یا ایک مکان دوسرے مکان سے علاحدہ نظر آتا ہے یا ایک کپڑا دوسرے کپڑے سے ممتاز معلوم ہوتا ہے تو وہ انہیں خصوصیات کے سبب جو ان میں مشترک نہیں، بلکہ آپس میں جداگانہ اور ممتاز ہیں، مکان کا ایک مخصوص نقشہ ہے جو دوسرے سے ممتاز ہے، کپڑے کو ہم اس کی رقت وغلظت، کپڑے کی چکناہٹ اور اس کے کرخت پن کے ذریعہ ایک دوسرے سے ممتاز کرتے ہیں، اسی طرح زید کے چہرے اور قد وقامت کی وہ مخصوص صفات واعراض ہیں جو عمرو کے لئے نہیں۔

ان اعیان کو چھوڑ کر اعراض کو لیں تو یہاں پر بھی صورت کا اختلاف ان کے وجود اور ہستی کے بقا کی وجہ سے ہوتا ہے، نور کی شکل اور ہے ظلمت کی اور، ان کی حقیقت جب ظہور کرتی ہے تو اپنی نورانی شکل میں اور رات اپنی تاریک اور بھیانک شکل پر، الوان کو دیکھو تو سیاہ رنگ، وہ شکل نہیں جو سرخ کی ہے اور سرخ کی وہ شکل نہیں جو سبز وسیاہ کی ہے؛ بلکہ ہر ایک اپنی امتیازی صورت میں اپنے وجود کی نمائش کر رہا ہے۔

---

(۱) صحیح ابن حبان: ذکر إعطاء اللہ جل وعلا الأجر للمسلم، حدیث: ۵۲۰۴

(۲) ہود: ۶۱

اسی طرح جمادات کے نوعی دائرے میں جب ہم پتھر کی تلاش میں نکلتے ہیں تو کبھی پتھر کے دھوکے میں ریت اور لکڑی نہیں اٹھاتے، کیونکہ پتھر کی ایک قدرتی شکل متعین ہے جس سے وہ پہچانا جاتا ہے، اس لئے نہ پتھر کو اینٹ کہہ سکتے ہیں، نہ اینٹ کو پتھر، نباتات میں آم کو دیکھ کر ہمیں کبھی سیب وانار ہونے کا دھوکہ نہیں ہوتا کہ ان کی صورتیں ممتاز ہیں۔

اسی طرح اگر ہم حیوانات میں انسانیت کے جویا ہوں تو گھوڑے اور گدھے اور شیر کی شکلوں میں اس کو تلاش نہیں کیا جاسکتا، بلکہ اس کو انسان ہی کی شکل میں تلاش کرنا ہوگا، جو اپنے قوی، قوت احساس وادراک، ایجاد واختراع کی طاقت، نفاست ونزاہت سے خوش آئند صفات کا حامل لباس، زینت کے خوش نما منظر، حالات اپنے اندر لئے ہوئے ہوتا ہے، پھر انسانوں کے آپسی حیوانی ونفسانی جذبات کے اتحاد کے باوجود ان میں صنفی اختلافات اور تفریق بھی ہے، جن میں ایک کو مرد اور دوسرے کو عورت سے تعبیر کرتے ہیں، اس اختلاف کی وجہ سے ان کے احکام بدل گئے، حقوق الگ ہو گئے۔

بہرحال دنیا کی اشیاء کی ہمہ ہمی اور رنگا رنگی میں ہی ان کے وجود کا راز پنہاں ہے، کوئی دیوانہ بھی یہ نہیں چاہے گا کہ رات اور دن ایک ہو جائیں، نور وظلمت میں کوئی امتیاز باقی نہ رہے، سارا عالم ایک ہی شکل اور ایک ہی رنگ میں ہو، ایک ہی حجم میں اور سب سب نہ ہوں؛ بلکہ وہ سب ایک ہوں، جو انسان ہو وہی گدھا ہو، اور جو گدھا ہو وہی شیر اور بکری بھی ہو، آم کے درخت کو ببول بھی کہا جائے اور ببول کو گلاب ویاسمین بھی پکارا جائے، اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ایک اور یکتائی کے سوا دوسرے اور دوئی کا پتہ بھی نہ ہوگا، گویا سب کچھ ہونے کے باوجود کچھ نہ ہوگا، پھر اس طرح اس عالم کا وجود بیکار ٹھہرے گا۔

اختلاط والتباس یہ کائنات کے وجود کو باطل کر دیتا ہے، اس کے بالمقابل امتیاز اور فصل ہی ہر چیز کے وجود کو نمایاں کرتا ہے۔

ٹھیک اسی طرح انسانیت میں تکوینی خصوصیات کے اس اتحاد کے باوجود کچھ معنوی خصائص اور باطنی امتیازات بھی ہیں جن کی وجہ سے انسان کی جسمانی صورتوں

کے اتحاد کے باوجود ان کی معنوی صورتیں علاحدہ کر دی ہیں۔

اسی طرح انسانوں میں بے شمار معنوی جتھے وجود میں آ گئے، مسلم قوم، آرین قوم، ہندو قوم، عیسائی اور یہودی اقوام، یہ تمام قومیں ایک ماں باپ کی اولاد ہونے کے باوجود مختلف اور متفاوت ہو گئیں، ان اقوام کے مابین اخلاق وعادات مختلف، ان کا تمدن وتہذیب مختلف، ان کے جذبات واحساسات مختلف، اگر ہم آج ایشائی قوموں کو یورپین اقوام سے مختلف کہتے ہیں تو اس وجہ سے کہ جو خصوصیات تمدن ومعاشرت اور جذبات واحساسات ایک قوم کے ہیں ان کا دوسرے میں وجود نہیں، انہی معنوی اور روحانی خصوصیات کا نام دین اور مذھب ہے، جس طرح مادیات میں حیوانیت، نباتیت اور جمادیت کے ظہور کے لئے مخصوص شکلوں اور صورتوں کی ضرورت ہے، اسی طرح معنوی طور پر مختلف اقوام میں شرعی اور مذہبی حقائق کے اظہار کے لئے مخصوص ہیئتوں اور ممتاز شکلوں کی ضرورت ہے۔

بہر حال اسلام جیسے ہمہ گیر اور وسیع مذہب کی بھی اپنے عقائد وتصدیقات، اعمال وعبادات، معاملات وسیاسیات، آداب ومعاشرت، سلوک، حالات ومقامات کے اعتبار سے ایک خاص شکل وصورت ہے، نماز، روزہ، حج، زکوۃ، اسی طرح محاسنِ اخلاق، سخاوت وشجاعت، حلم وایثار، معاملات، بیع وشراء، اور معاشرت، لباس، رہن سہن آپس کے حقوق متعین ہیں، اسلام اس مجموعی ہیئت اور صورت کا نام ہے۔

اس لئے اسلام یہ چاہتا ہے کہ علوم وفنون کے سلسلے میں ہمارا اپنا طریقۂ کار اور ہماری اپنی ایجاد اور اختراع ہو، ہم اس بارے میں بھی اپنے امتیاز باقی رکھیں، غیروں پر تکیہ کئے نہ رہیں۔

☆ نبیٔ کریم ﷺ نے فرمایا:
"لَا تَسْتَضِيْئُوْا بِنَارِ أَهْلِ الشِّرْكِ" (مشرکین کی آگ سے روشنی حاصل نہ کرو) حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر یوں کی ہے "لَا تَسْتَشِيْرُوْا الْمُشْرِكِيْنَ فِيْ شَيْءٍ مِنْ أُمُوْرِكُمْ" یعنی مشرکین

سے اپنے امور میں مشورہ نہ لیا کرو، اور پھر مطلب یہ ہے کہ ان سے علم حاصل نہ کیا کرو، یعنی علوم وفنون کے سلسلے میں ان پر اعتماد اور تکیہ کرنا درست نہیں"(۱)

☆ ایک موقع سے نبیٔ اکرم ﷺ اپنے دستِ مبارک میں عربی کمان لئے ہوئے تھے کہ آپ نے کسی کے ہاتھ میں فارسی کمان دیکھی تو ناخوشی سے فرمایا کہ: یہ کیا لئے ہو؟ اسے پھینک دو اور عربی کمان رکھو جس کے ذریعہ خدا نے تمہیں قوت وشوکت دی اور بلادِ ارض کو مفتوح کیا۔(۲)

چونکہ فارسی کمان کا بدل عربی کمان موجود تھی اس لئے غیرت دلا کر حضور اکرم ﷺ نے روک دیا، تاکہ غیر اقوام کے ساتھ ہر ممکن سے ممکن امتیاز پیدا ہو جائے اور چھوٹے سے چھوٹا اشتراک بھی منقطع ہو کر ایک مسلم اپنی ہی ہستی کے ساتھ نمایاں ہو، ہاں غیروں کی نئی نئی ایجادات، جدید اسلحہ وغیرہ استعمال بھی کئے جائیں، اگر ان کا بدل ہمارے یہاں موجود نہ ہو، تو بغیر مشابہت کی نیت کے استعمال کئے جائیں، اور اسی طرح کی جدید ٹکنالوجی، قوت حرب وسامان خود اپنے ملک میں پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح وشام پیدا کر
خدا اگر دل فطرت شناس دے تجھ کو
سکوت لالہ وگل سے کلام پیدا کر
اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احسان
سفال ہند سے مینا وجام پیدا کر
مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

(۱) شعب الایمان: حدیث: ۹۳۷۵ (۲) تجلیاتِ حکیم الاسلام: ۲: ۱۳۲، مطبوعہ فرید بک ڈپو

☆ ایک دفعہ حضرت ابوموسی ؓ کہتے ہیں کہ: میں نے حضرت عمر ؓ سے کہا: میں نے اپنے یہاں ایک نصرانی کاتب ملازم رکھا ہوا ہے، تو حضرت عمر ؓ نے فرمایا: مجھے کیا ہوا خدا تجھے غارت کرے کیا تو نے اللہ کا یہ حکم نہیں سنا کہ یہود ونصاری کو دوست مت بناؤ؛ کیونکہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں "لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰى أَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ" کیوں نہ تو نے کسی مسلمان کو ملازم رکھا۔ ابوموسیٰ ؓ کہتے ہیں کہ: اے امیر المؤمنین! میرے لئے اس کی کتابت ہے اور اس کے لئے اس کا دین ہے (مجھے اس کے دین سے کیا تعلق؟) حضرت عمر ؓ نے فرمایا: میں ان کی تکریم نہیں کروں گا جن کی اللہ نے توہین کی اور میں ان کو عزت نہ دوں گا جن کو اللہ نے ذلیل کیا اور میں انہیں مقرب نہ بناؤں گا جن کو اللہ نے دور کیا۔(۱)

یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تو
مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے

حضرت حکیم الاسلام قاری طیب صاحب ؒ اس مکالمہ کی وضاحت نکات کی شکل میں یوں فرماتے ہیں:

۱۔ جب تک کوئی مضطرارانہ ضرورت داعی نہ ہو اصل یہی ہے کہ غیر مسلمین سے استغاثہ اور وہ بھی ایسے کہ اس میں ان کی تکریم ہوتی ہو، قرین عقل و دین نہیں۔

۲۔ یہ عذر کسی طرح قابل سماعت نہیں کہ ہمیں صرف خدمت درکار ہے، نہ کہ ان کا مذہب؛ کیونکہ اس تحصیلِ خدمات کے ذیل میں ان کے ساتھ معیت اس شدت اور تغلیظ کو کم یا محو کر دے گی، جو ایک مسلمان کا اسلامی شعار بتلایا گیا ہے۔

۳۔ فاروقِ اعظم ؓ اور ابوموسیٰ ؓ کے بعد کوئی شخص ان جیسا تدیّن نہیں لا سکتا، لیکن اگر بالفرض لے بھی آئے تو کوئی وجہ نہیں کہ ابوموسی ؓ تو کفار کی خدمات حاصل کرنے سے روک دیئے جائیں اور اسے نہ روکا جائے۔

(۱) اقتضاء الصراط المستقیم: فصل فی ذکر الأدلة من الکتاب و السنة: ۱۱/ ۹۲

۴۔ جس مخلوق کی اس کے خالق نے تکریم نہ کی ہو اور ان کے لئے عزت کا کوئی شمہ گوارا نہیں کیا ہو، اس خالق کے پرستاروں کی غیرت وحمیت کے خلاف ہے کہ وہ علوم وفنون میں ان سے استفادہ کے ذریعہ اس کے دشمنوں کی تکریم کریں، وہ جسے پھٹکارے یہ اسے پیار کریں۔(۱)

☆ نعلِ سندی مجوسیوں کا مخصوص جوتا تھا، مروزی کہتے ہیں کہ: میں نے نعلِ سندی کے متعلق امام احمد بن حنبل ؒ سے سوال کیا کہ ان کا پہننا کیسا ہے؟ تو فرمایا: "اَمَّا اَنَا فَلَا اَسْتَعْمِلُهَا لٰكِنْ اِذْ كَانَ لِلْكَنِيْفِ اَوِ الْوَضُوْءِ" لیکن سو میں تو استعمال نہ کروں گا، البتہ جب کہ کیچڑ گارے کے لئے یا بیت الخلاء کے لئے (ایک روایت میں) اگر بیت الخلاء یا وضو کے لئے تو مناسب ہے اور جو زینت کا ارادہ نہیں، اور فرمایا کہ عجمیوں کی ہیئت ہے، علامہ تیمیہ ؒ فرماتے ہیں کہ: گویا امام احمد ؒ نے گلی کوچوں میں انہیں پہن کر چلنے کو مکروہ نہیں سمجھا ہے۔

☆ امام ابن مبارک ؒ سے نعلِ کرمانی (کرمانی جوتا) کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے اسے ناپسند فرمایا اور کہا کہ یہ (اسلامی جوتا) اس کے مقابلے میں تمہیں کافی ہے۔

☆ حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری ؒ اس پر بڑا افسوس اور قلق کا اظہار کیا کرتے تھے کہ مسلمان ممالک صنعت وحرفت اور اپنی ضرورت کو اپنے ملک میں ہی پیدا کرنے کی طرف توجہ نہیں کرتے، اور ان کی زیادہ تر دولت باہر سے ضروریاتِ زندگی کے درآمد کرنے پر صرف ہوتی ہے، حضرت مولانا ابوالحسن ندوی ؒ فرماتے ہیں کہ شعبان ۱۳۸۱ھ جنوری ۱۹۶۲ھ میں راقم نے اپنے چند رفقاء کے ساتھ کویت وقطر کا سفر کیا، جب اجازت اور رخصت کے لئے رائے پور حاضر ہوا تو بڑی عنایت اور محبت سے رخصت فرمایا: چلتے وقت خصوصیت سے

(۱) تجلیاتِ حکم الاسلام: ۵/ ۹۷، فرید بک ڈپو

فرمایا: ''ان بھلے مانسوں سے کہنا کہ اپنی دولت کا صحیح استعمال کریں، کارخانے بنائیں اور صنعتوں کو رواج دیں''(۱)

حضرت، اسلامی ممالک کے لئے مادی ترقی، نئے علوم کا اکتساب، جدید صنعتیں، سائنس میں ترقی، مالی استحکام اور خود کفالتی کو بہت ضروری سمجھتے تھے، ایک مرتبہ فرمایا:

''نیک نیتی سے ملک کی طاقت پیدا کرنے کی جو کوشش کی جائے سب دین ہی ہے ''وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ'' اگر ریاء یا نیتِ فاسد سے نماز بھی پڑھی جائے تو بھی قبول نہیں ہوتی اور رد ہے، اور اگر نیتِ صالح سے پڑھی جائے تو وہ عبادت ہے، اسی طرح نیتِ صالح سے حکومت کی ترقی کا جو بھی کام کیا جائے سارا کا سارا دین ہی ہے، ایسا نہ ہو کہ ''تا تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مردہ شود'' (تریاق کے عراق سے آنے تک سانپ کا کاٹا مرجائے) افراد کی اصلاح بھی ضروری ہے؛ لیکن ملک کی حفاظت بھی ضروری ہے''۔

اور ایک موقع سے فرمایا:

''اسلامی نظام خالی باتوں سے نہیں قائم ہوسکتا، اگر دنیا کے بڑے بڑے ملکوں کے دوش بدوش کھڑا ہونا ہے تو ان لوگوں کے علوم وفنون سیکھنے ہوں گے، مگر مشکل یہ ہے ان کے علوم کو سیکھتے سیکھتے اپنے دین ومذہب کو خیر باد کہہ دیتے ہیں، جب تک کوئی ملک اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہو تو اِس زمانہ میں دین ودنیا کا کوئی کام نہیں کرسکتا''۔(۲)

علامہ اقبال رحمہ اللہ نے فرمایا:

(۱) سوانح حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ: از مولانا ابوالحسن علی الندوی: ۲۸۰، مکتبۃ الاسلام، گوئن روڈ لکھنؤ

(۲) سوانح حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ، از مولانا ابوالحسن علی الندویؒ: ۲۷۹

فرنگ سے بہت آگے ہے منزلِ مومن
قدم اٹھا یہ مقام انتہائے راہ نہیں
اور کھلے ہیں سب کے لئے غربتوں کے میخانے
علوم تازہ کی سرمستیاں گناہ نہیں

حضرت مولانا ابوالحسن ندوی رحمہ اللہ اپنے مشہور زمانہ کتاب ''مسلمانوں کا عروج وزوال'' کتاب میں مادی اسباب کی تیاری کی اہمیت وافادیت کو بتلاتے ہوئے فرماتے ہیں:

عالم اسلام کا کام یہیں ختم نہیں ہوجاتا، اگر اس کو اسلام کے پیغام کی اشاعت کی خواہش ہے اور وہ دنیا کی قیادت ورہنمائی کا فرض انجام دینا چاہتا ہے تو اس کو اس کے لئے ممتاز قوت اور تربیت، صنعت وعلوم، تجارت اور فن حرب میں مکمل کی ضرورت ہوگی، اس کو زندگی کے ہر شعبہ اور اپنی ہر ضرورت میں مغرب سے مستغنی اور بے نیاز ہونا پڑے گا، وہ اس سطح پر ہو کہ اپنے لئے پہننے اور کھانے کا سامان کرسکے، اپنے لئے ہتھیار تیار کرسکے، اپنی زندگی کے معاملات کا انتظام اس کے ہاتھ میں ہو، اپنی زمین کے خزانے وہ خود برآمد کرسکے اور اس سے فائدہ اٹھا سکے اپنی حکومتوں کو اپنی دولت اور اپنے آدمیوں کے ذریعہ چلائے، اس کے چاروں طرف پھیلے ہوئے سمندروں میں بحری بیڑے اور جہاز شور کر رہے ہوں، وہ دشمن کا مقابلہ اپنے یہاں کے جنگی جہازوں، توپوں اور ہتھیارں سے کریں، اس کی برآمد اس کے درآمد سے زیادہ ہو اور اس کو مغربی ممالک سے قرض لینے کی ضرورت پیش نہ آئے، اس کو اس کے کسی جھنڈے کے نیچے نہ آنا پڑے اور وہ کسی کیمپ میں شامل ہونے پر مجبور نہ ہو۔

جب تک عالم اسلام علم وسیاست، صنعت وحرفت وتجارت میں مغرب

کا محتاج رہے گا، مغرب اس کا خون چوستا رہے گا، اسی کی زمین کا آبِ حیات نکالے گا، اسکا سامانِ تجارت اور مصنوعات ہر روز اس کی منڈیوں، بازاروں اور جیبوں پر چھاپہ مارا کریں گے اور اس کی ہر چیز پر ہاتھ صاف کرتی رہیں گی، جب تک عالم اسلامی مغرب سے قرض لیتا رہے گا اور اپنی حکومت کا انتظام کرنے، اہم کلیدی عہدوں کو پُر کرنے، اپنی فوج کو ٹریننگ دینے کے لئے مغرب کے آدمیوں کا رہین منت رہے گا، وہاں کا سامان تجارت وصنعت منگائے گا اور اس کو اپنا اتالیق اور استاذ، مربی اور سرپرست، حاکم اور سردار سمجھے گا، اس کے حکم اور اس کی رائے کے بغیر کوئی کام نہیں کرے گا، اس وقت تک وہ مغرب سے مقابلہ کرنا تو درکنار اس سے آنکھیں بھی نہیں ملا سکتا۔

یہ علمی وصنعتی زندگی کا وہ شعبہ تھا جس کے بارہ میں عالم اسلامی نے عہدِ ماضی میں کوتاہی سے کام لیا اور جس کی تعزیر اس کو طویل اور ذلیل زندگی کا مزہ چکھنا پڑا اور اس پر مغربی قیادت اور سرداری مسلط کی گئی، جس نے دنیا میں تباہی وغارت گری، قتل وخوں ریزی اور خودکشی برپا کی، اب اگر اس موقع پر بھی عالم اسلامی نے علمی وصنعتی تیاری اور اپنی زندگی کے معاملات میں آزادی کے بارہ میں غفلت برتی اور اس مرتبہ بھی اس سے یہ چوک ہوگئی تو دنیا کی تقدیر میں بدنصیبی اور شقاوت لکھ دی جائے گی اور انسانیت کے ابتلاء کی مدت اور طویل ہوجائے گی'' (۱)

حضرت مولانا محمد یوسف بنوری صاحب شیخ الحدیث مدرسہ عربیہ نیوٹاؤن کراچی ماہنامہ ''البینات'' کے اداریہ میں تحریر فرماتے ہیں:

''عالمِ اسلام بالخصوص عرب کے صحراؤں میں قدرتی وسائل، خام ذخائر اور مال ودولت کی کمی نہیں، بلکہ فراوانی ہے، مگر یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ ان

(۱) انسانی دنیا میں مسلمانوں کے عروج وزوال اثر: ۳۵۱ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنو

کے مال ودولت کا بڑا حصہ یا تو غیر ملکی بینکوں میں جمع ہونے کی وجہ سے دشمنانِ اسلام کے کام آتا ہے، بادشاہ خرچی، عیش پرستی، عافیت کوشی اور آسائش پسندی کے لئے ضائع کیا جاتا ہے، لیکن فوجی استحکام، عسکری تربیت اور اسلحہ سازی تقریباً صفر ہے، دشمنانِ اسلام جگہ جگہ ہوائی اڈے، بحری بیڑے، فوجی چھاؤنیاں اور اسلحہ سازی کے بڑے بڑے کارخانے قائم کررہے ہیں؛ مگر مسلمان خدافراموشی کے ساتھ ظاہری تدبیر سے بھی مجرمانہ غفلت میں مست ہیں''۔

عصری علوم میں غیروں کے محتاج نہ بنیں

موجودہ عصری تعلیم کا جو نظام اس وقت ہم پر لادا گیا ہے، اس کا بانی لارڈ میکالے تھا اور اس نے اپنی جو تاریخی یادداشت ۱۸۴۲ء میں مقبوضہ ہندوستان کے گورنر جنرل کو پیش کی تھی، بلکہ ڈھٹائی سے کھول کھول کر بیان کردیا تھا، اس کا سب سے بڑا مشن یہ تھا کہ ہندوستان کے باشندوں بالخصوص مسلمانوں کو اپنے سارے تہذیبی ورثے کے بارے میں شدید احساسِ کمتری کا شکار بنا کر ان کے دلوں پر مغرب کی ہمہ گیر بالا دستی کا سکہ بٹھا دیا جائے اور نئی نسل کو ہر ممکن طریقہ سے یہ یقین کرلینے پر مجبور کیا جائے کہ اگر دنیا میں ترقی اور سربلندی چاہتے ہو تو اپنی فکر اپنے فلسفے، اپنی تہذیب، اپنی معاشرت اور اپنے سارے ماضی پر ایک حقارت بھری نظر ڈال کر مغرب کے پیچھے پیچھے چلے آؤ اور اپنی زندگی کا ہر راستہ اسی کے نقوشِ قدم میں تلاش کرو، گویا اس تعلیمی نظام کی ساری مشینری سر سے لے کر پاؤں تک وہی ہے جو میکالے نے سرکاری ملازم یا زیادہ صحیح لفظوں میں اپنے ذہنی غلام پیدا کرنے کے لئے بنائی تھی۔

انگریزی اقتدار کے عہد میں ہم پر جو نظام مسلط کیا گیا تھا اس میں دوسری خرابیوں کے علاوہ ایک بنیادی خرابی یہ تھی کہ اس میں اسلام کو زندگی کے تمام شعبوں سے کاٹ کر عبادتوں اور نجی زندگی کے چند معاملات تک محدود کردیا تھا، یہ بات محتاجِ بیاں نہیں ہے کہ اسلام زندگی کا ایک مکمل نظام ہے اور وہ حکومت سے سیاست سے لے کر تجارت ومعیشت

تک زندگی کے ہر شعبے کے لئے اپنی مخصوص تعلیمات اور ہدایات رکھتا ہے ؛ لہٰذا جس وقت دنیا میں یہ دین عملاً نافذ تھا ، اس وقت نظامِ تعلیم کا حال بھی یہ تھا کہ اسلام کی تعلیم صرف اسلامیات کے مضمون کی حد تک محدود نہ تھی ، بلکہ ہر علم وفن کی تعلیم میں اسلام رچا بسا نظر آتا تھا ، طالب علم فلسفہ پڑھ رہا ہو یا منطق ، سائنس کی تعلیم حاصل کر رہا ہو یا حساب اور ریاضی کی ، طب کی تعلیم میں مشغول ہو یا صنعت وحرفت کی تعلیم میں ، غرض ہر علم وفن کی تعلیم کے رگ وریشہ میں اسے اسلامی نظریات اور مفکرین اسلام کے افکار یا کم از کم اسلامی طرزِ فکر سمایا ہوا ملتا تھا ، اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ علم وفن کے خواہ کسی گوشے کو اپنی زندگی کا محور بنالے ، وہ ذہنی اور عملی طور پر سچا اور پکا مسلمان ہوتا تھا ، اس کے دل ودماغ میں اسلام کے مقابلے میں دوسرے افکار سے مرعوبیت پیدا ہو ہی نہیں سکتی تھی ، یہ نظامِ تعلیم اس میں اتنی صلاحیت پیدا کر دیتا تھا کہ وہ ہر نئی تحقیق اور نئے فلسفے سے اس کے صالح اجزاء کو اپنالے اور غیر صالح کو چھوڑ دے ۔

اس لئے موجودہ عصری تعلیمی نظام کو بجائے اس کے یہ غیروں کا نصاب ہم پر مسلط رہے ، اس نظام کو بھی بدلنے کی ضرورت ہے ، اسلئے کہ موجودہ نظامِ تعلیم میں اسلام کی اس ہمہ گیر حیثیت کو سرے سے ختم کر دیا گیا ہے ، اسلام کو صرف ''اسلامیات'' کے ایک گھنٹے تک محدود کر دیا گیا ہے ، اور اس ایک گھنٹے میں بھی نصاب اور طرزِ تعلیم کے معیار کو اس قدر پست کر دیا گیا ہے کہ اس سے اسلام کی صحیح تعلیم کا ہزارواں حصہ بھی طالب علم کے سامنے نہیں آسکتا ۔

یہ بات چند مثالوں سے واضح ہوسکے گی :

☆ آج کل ہمارے کالجوں اور یونیورسیٹیوں میں جو فلسفہ پڑھایا جارہا ہے اس میں یونانی یا نو افلاطونی فلاسفے کے بعد طالب علم سیدھا یورپ کے نشأۃ ثانیۃ کے بعد کے فلسفے تک پہنچ جاتا ہے ، اور اس کے ذہن پر یہ تاثر قائم ہوجاتا ہے کہ نو افلاطونی فلاسفر سے کر ڈیکارٹ تک پورا زمانہ فکر اور فلسفے میں جمود کا زمانہ ہے ، علم وفن کی تاریخ میں بھی اس زمانہ کو تاریک زمانہ سے تعبیر کیا جاتا ہے ؛ حالانکہ یہ

دور صرف غیر مسلم یورپ کے لئے تاریک تھا ، ورنہ یہی وہ دور ہے جس میں مسلمانوں نے آدھی سے زائد دنیا میں علم وفن کے چراغ روشن کئے ہوئے تھے ، اور خود یورپ کا خطہ اندلس ان کی روشنی سے جگمگا رہا تھا ، اس دور میں مسلمان فلاسفہ اور متکلمین نے فکر اور فلسفہ کے میدان میں جونئی راہیں کھولی ہیں اور اپنی تحقیقات کا جو بیش بہا ذخیرہ چھوڑا ہے ، موجودہ نظامِ تعلیم میں سرے سے ان کا کوئی ذکر ہی نہیں ملتا ۔

جدید اسلامی نظام میں یہ ضروری ہے کہ اس وسیع علمی خلا کو پر کیا جائے جو مغرب کی تنگ نظری اور تعصب نے مصنوعی طور پر پیدا کیا ہے ، اور فلسفے کی تعلیم میں مسلمان فلاسفر اور متکلمین کے افکار کو ان کا صحیح مقام عطا کیا جائے ۔

☆ سائنس کے بارے میں یہ حقیقت آج پوری دنیا میں مان لی گئی ہے کہ سائنس کی موجودہ ترقی میں اس استقرائی طریقہ جس میں صرف قیاس وتخمین کے بجائے مشاہدہ اور تجربہ کے ذریعہ تحقیقات کی جاتی ہیں ، لیکن ساتھ ہی مغربی نظامِ تعلیم نے ہر کس وناکس کے ذہن پر یہ تاثر قائم کرا دیا ہے کہ استقرائی طریقہ ، استدلال کی بنیاد پر مسلمانوں نے ڈالی تھی ، انہوں نے ہی سائنس کا رخ موڑ کر اسے اس راستہ پر ڈالا تھا جس پر آج وہ برق رفتاری کے ساتھ دوڑ رہی ہے ، اس کے باوجود ہمارا سائنس کا طالب علم خالد بن یزید ، زکریا رازی ، ابن سینا ، خوارزمی ، ابوریحان ، بیرونی ، فارابی ، ابن مسکویہ ، ابن رشد ، کندی ، جابر بن حیان اور موسیٰ بن شاکر جیسے عظیم سائنس دانوں سے یکسر ناواقف ہے ۔

☆ معاشیات کی تعلیم میں طالب علم آج صرف یہ جانتا ہے کہ بنیادی طور پر معاشیات کے دو مکتبِ فکر ہیں ، سرمایہ داری اور اشتراکیت ، اسلام کے معاشی اصول اور قوانین اس کی نگاہوں سے بالکل اوجھل رہتے ہیں ، اور اس کو یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اسلام نے بھی معیشت کے بارے میں ایسا نظام بنایا ہے جو مذکورہ دونوں مکاتبِ فکر سے الگ ہے ، اسی طرح اس کو یہ پڑھایا جاتا ہے کہ علمِ معاشیات کی

بنیاد آدم اسمتھ نے رکھی تھی، اور اس سے بہت پہلے کے تمام فقہاء سے لے کر ابن خلدون رحمہ اللہ اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی جیسے مفکرین نے علم معاش کی جو خدمات انجام دی ہیں، ان کو فہرست سے یکسر خارج کر دیا گیا ہے۔

☆ علم سیاست میں بھی نو افلاطونی فلاسفر اور جدید مغربی فلسفہ کے درمیان ایک وسیع خلاء ہے جو صرف مغرب کے تعصب اور تنگ نظری کی پیداوار ہے، سیاست کے بارے میں اسلام کے اصول وتعلیمات اور مسلمان مفکرین کی کاوشوں کا کوئی ادنیٰ سا عکس بھی موجودہ نصاب میں نہیں ملتا۔

☆ یہی حال عمرانیات کا بھی ہے، شاید ہی کوئی منصف مزاج اس بات سے انکار کر سکے کہ اس علم کے مدون اول ابن خلدون ہیں؛ لیکن عمرانیات کے موجودہ نصاب سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اسلام یا مسلمانوں نے بھی اس علم پر کوئی کام کیا ہے۔

☆ نفسیات کی تعلیم اب بڑے پیمانے پر ہونے لگی ہے؛ لیکن اس سلسلے میں مسلمانوں کے علماءِ تصوف نے جو نئی نئی راہیں اور نفسِ انسانی کے عوارض پر مفید ترین بحثیں کی ہیں، موجودہ نظامِ تعلیم میں اس کی کوئی پرچھائیں بھی موجود نہیں ہیں۔

☆ قانون اور اصولِ قانون کے بارے میں بھی ہمارا نصابِ تعلیم سراسر مغربی افکار ونظریات ہی سے بھرا ہوا ہے، اصول قانون کی دقیق بحثوں کو جس بے نظیر انداز میں فقہائے اسلام نے اصولِ فقہ میں مدون کیا ہے اس سے استفادہ کا کوئی موقع طالب علم کو نہیں ملتا۔

☆ اسی طرح بعض علوم میں خالص اسلامی احکام کے اجزاء کی ضرورت ہے، مثلاً حساب میں سود اور سود در سود کے مسائل تو باقاعدہ پڑھائے جاتے ہیں، لیکن میراث اور زکوۃ نکالنے کے طریقوں سے طالب علم ناواقف رہتا ہے، اسی طرح جغرافیہ کی تعلیم میں سمت، قبلہ، اوقاتِ نماز اور مواقیتِ احرام معلوم کرنے کا طریقے اس کی نظر سے نہیں گذرتے، نصاب کی نئی تدوین میں اس قسم کی چیزیں شامل ہونی چاہیئے، غرض وہ علوم جنہیں آج جدید علوم یا مغربی علوم کا نام دیا گیا

ہے، ہمارے نظامِ تعلیم میں ٹھیک اسی ترتیب اور اسی ڈھانچے کے ساتھ لئے گئے ہیں جو مغرب نے اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ تعصب برتتے ہوئے اسلام کا نام لئے بغیر بنایا تھا، اب اگر اپنے نظامِ تعلیم کو اسلامی بنانا اور اس کے ذریعہ صحیح اسلامی قومی شعور پیدا کرنا مقصود ہے تو یہ بات خواہ کتنی منت طلب کیوں نہ ہو، لیکن ناگزیر اہمیت رکھتی ہے کہ ان علوم کے سلیبس کو اپنے قومی تقاضوں کے تحت اس طرح مرتب ومدوّن کیا جائے کہ اس میں اسلام اور مسلمانوں کے افکار اور کارنامے پوری طرح رچے بسے ہوں (نمونہ کے طور پر ڈاکٹر حمید اللہ صاحب رحمہ اللہ کی کتاب "قانون بين الممالك" ملاحظہ ہو جس میں بین الاقوامی قانون کو اس طرح مدون کیا گیا ہے)۔(۱)

خلاصہ یہ ہے کہ:

(۱) مسلمان قوم کی ترقی دین دار مسلمان، ڈاکٹر، انجینیر، سائنسداں سے ہے نہ کہ ملحد، غلامانہ ذہنیت والے افراد اور حقیقت یہ ہے کہ دوسری قسم ہی ہمیشہ نفاذِ شریعت میں رکاوٹ بنی، اور اعداء اسلام کا آلہ کار رہوئی ہے

(۲) دینی ضروری علم پر عصری علوم کو اتنی اہمیت نہ دی جائے کہ ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ اسلام کے تئیں احساسِ برتری، دینی تشخص کی حفاظت، داعیانہ کردار سے یکسر خالی ہو جائے، اہل علم اور اہل اللہ کی صحبتوں سے اسے مربوط کیا جائے۔

(۳) نصاب ونظام میں جرأت مندانہ اور انقلابی قسم کی تبدیلی پیدا کرنا نہایت ضروری ہے، یہ کام وہ ادارے بخوبی انجام دے سکتے ہیں جسے خود مسلمان چلا رہے ہیں۔

(۴) اللہ کی مدد کے بغیر کوئی کام نہ ہوا اور نہ ہو سکتا ہے اور نہ ہو رہا ہے، نصرت الٰہی، ایمانی صفات سے متوجہ ہوتی ہے، ایمانی صفات سے خالی نظام بھی انسانیت اور مسلمانوں کے لئے بھلائی کا ذریعہ نہیں ہو سکتا، غلبہ کا فیصلہ نہیں کرا سکتا، اقوام عالم پر تفوق نہیں دلا سکتا۔

(۱) ہمارا تعلیمی نظام: ۱۷-۲۰

(۵) تعلیم کو محض برائے امتحانات، برائے تجارت، برائے دولت نہ چلایا جائے؛ بلکہ برائے خدمت کا تصور پرورش کرنے کی بہت ضرورت ہے۔

اگر عصری علوم کی دینی علوم سے زیادہ اہمیت ہوتی تو رسول اللہ ﷺ نے کبھی تو صحابہ رضی اللہ عنہم کو موجودہ زمانے میں جن خبیث اعمال کو فنون لطیفہ کہا جاتا ہے، اس کے سیکھنے کے لئے بھیجا ہوتا، کیا وجہ ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے نہایت متمدّن اقوام کے سامنے داعیانہ اور قائدانہ احساسِ برتری کے ساتھ دینے والا ہاتھ لے جارہے ہیں، نہ کہ لینے والا، اگرچہ رسول اللہ ﷺ نے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو سریانی زبان سیکھنے کا حکم دیا تھا؛ لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ یہ دینی مزاج کے پختگی کے بعد تھا، صحابہ رضی اللہ عنہم جب فارسی ممالک میں گئے تو زبان سیکھنے سے پہلے اہل زبان پر اتنے مؤثر ثابت ہوئے کہ فارسی زبان کے رگ و پے میں اسلامی خون دوڑا دیا، یہ بات صحیح ہے کہ اسلام ہر علم نافع کی ہمت افزائی کرتا ہے؛ لیکن علم نافع میں فرض عین وفرض کفایہ کی تفریق بہت ضروری ہے، لیکن ایسا نہ ہو کہ فرض کفایہ کی ادائیگی کی فکر میں اور امت کو آنکھ، ناک کا ڈاکٹر دینے کے جذبہ میں خود کی اذکار نماز درست نہ ہو، فرائض اسلام سے دوری ہو یہ بہت تکلیف دہ اور غیر معتدل صورت حال ہے کہ عصری علوم کی اہمیت پر بولنے اور لکھنے والے نافع اور غیر نافع کی تقسیم پر چھوڑ دیتے ہیں، جس کی وجہ سے قرآن وحدیث والے علم کی تحقیر محسوس ہوتی ہے۔

عالمِ اسلام میں کرنے کا پہلا کام

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ موجودہ انگریز اور یورپین قوموں کے نصاب تعلیم کے امت اسلامیہ میں رواج پاجانے کی وجہ سے مسلمانوں میں جو مختلف ذہنی کشمکش جاری ہے، اور مختلف نظریات کی حامل مسلمان نسل وجود میں آرہی ہے، جو میدان کار میں آنے کے بعد مختلف طبقات کی شکل میں بٹ کر امت میں تفریق اور پھوٹ کا باعث بن رہی ہے، اس کی وجہ طرز تعلیم کو قرار دیتے ہوئے نصاب ونظام کی تبدیلی کی پرزور وکالت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”مغرب کی فکری وتہذیبی یلغار کے دور شروع ہونے اور اس کے مشرق کو

اپنے ارادہ یا بلا ارادہ مغربی طرز تربیت، نظام تعلیم، دبستان فکر، زندگی اور انسان کے مغربی تصور اور علوم وفنون کے مغربی زاویہ نگاہ میں یا زیادہ بہتر الفاظ میں اس کی گود میں اس طرح آجاتا ہے کہ وہ اس کے پورے نظام تعلیم یا مختصر الفاظ میں اس کے نظریۂ تعلیم کو ساری خرابیوں اور خامیوں کے باوجود جوں کا توں قبول کرلیتا ہے جو ایک ایسی سرزمین میں پیدا ہوا اور نافذ کیا گیا جس کے عقائد، بنیادی اصول، اخلاقی قدریں، اسلامی معاشرہ کی قدروں اور بنیادی ومسلمہ اصولوں سے ہر جگہ اور ہر سطح پر مختلف ہیں جن پر وہ پورا ایمان رکھتا ہے یا ان پر ایمان لانا، ان کے لئے جدوجہد کرنا ان کے لئے کچھ نہ کچھ قربانی دینا اپنے لئے ضروری سمجھتا ہے؛ بلکہ مغرب کی اخلاقی قدروں کی تردید اور ان کی بیخ کنی اور تحقیر ہی پر اس کی بنیاد ہے، ایسی حالت میں اس کی مثال بعینہ اس شخص کی سی ہوتی ہے جو آبِ حیات کے شوق میں زہر کا پیالہ پینا چاہے، یا کھاری اور نمکین پانی سے اپنی پیاس بجھانے کی کوشش کرے۔

انھوں نے اپنے تعلیمی منصوبوں اور علمی اداروں کی تشکیل میں بیرونی ملکوں کے تعلیمی مشیروں کو پورا اختیار دے رکھا ہے اور ان ملکوں سے صرف درسی کتابیں نہیں درآمد کررہے ہیں، وہ ان ملکوں میں اپنے تعلیمی وفود بھیجتے ہیں؛ تاکہ وہ مغربی ماہرین تعلیم اور اساتذہ کی تربیت میں نشوونما حاصل کریں، پھر ان کو ممالک اسلامیہ کے تعلیمی منصوبوں اور پالیسیوں کی تشکیل وتربیت کی پوری آزادی بھی دیتے ہیں کہ جس طرح چاہیں ان کا نقشہ بنائیں اور ان کا جو رخ چاہیں متعین کریں۔

اس کے نتیجے میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہوگیا جو اپنے عقائد وافکار اور اپنے اخلاق وسیرت سب میں ذہنی انتشار کا شکار ہے، فکر مغربی اور فکر اسلامی کے درمیان تذبذب کی حالت بھی بسا غنیمت تھی، لیکن اس نے اکثر

اوقات اپنے ملک وملت اور اپنے معاشرہ کے سارے معتقدات ومسلمات اوراصول واقدار سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

تعلیم کی یکسانیت کی وجہ سے آج مغرب میں عوام اور قیادت یا جمہور اورحکومت میں کسی گہری اور وسیع نظریاتی، ذہنی وفکری خلیج کا سراغ نہیں ملتا، وہاں صرف ایک طرز اور ایک آئیڈیل اور ایک قسم کے اصول ونظریات اور مقاصد ونصب العین پائے جاتے ہیں، وہاں مختلف طبقات اورسوسائٹی کے افراد کے درمیان کسی قسم کی ذہنی اور نفسیاتی رسہ کشی نہیں اوراسی وجہ سے یہ ممالک اندرونی سازشوں اور بغاوتوں سے محفوظ ہیں۔

مغرب کے بعد ان مشرقی ممالک کا نمبر آتا ہے جو مدت دراز سے اپنا کوئی عقیدہ نہیں رکھتے اوران کو حقائق پر یقین نہیں جن کی ایمان بالغیب اورانبیاء علیہم السلام کی تعلیمات وہدایات پر بنیاد ہے، ان کے پاس متعین آسمانی تعلیمات یا محفوظ آسمانی صحیفے بھی نہیں ہیں، وہ صرف ان قومی روایات اور جماعتی وشخصی مفادات کی حامل ہیں جن کو یہ تعلیمی نظام اور پروگرام چیلنج نہیں کرتے اور کسی جگہ ان دونوں کا کراس نہیں ہوتا، چنانچہ یہ ممالک بھی اسی طرح اس تضاد سے محفوظ ہیں جو مغربی نظام تعلیم پیدا کرتا ہے؛ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ انہوں نے اس نظام تعلیم سے صلح وصفائی کر لی ہے اور دونوں میں پوری مفاہمت پائی جاتی ہے، یا انہوں نے اپنے آپ کو ان تعلیمی وتربیتی نظریات کے مطابق ڈھال لیا ہے اوراسی لئے انقلابات اور سازشوں کا تناسب یہاں بہت کم اور تضاد بھی بہت کم یا اتنا کمزور ہے کہ قومی زندگی پر اس کا کوئی اثر ظاہر نہیں ہوتا، ملک سے غداری اور قومی خیانت کے واقعات شاذ ونادر ہی ہوتے ہیں اور یہاں بھی عوام اور رہنما طبقہ میں وہ وسیع خلیج حائل نہیں ہے جو ہمیں اسلامی ملکوں میں نظر آتی ہے، ان ممالک کے امراض اوران کے عیوب

دوسری نوع کے ہیں اور اس کے اسباب وعوامل بھی بالکل دوسرے ہیں جن کا تعلق ان کی تاریخ، ان کے قومی مزاج، مخصوص عقائد دینی حاسہ کی کمزوری، شعور کی کمی اور نظام تعلیم وتربیت کے فساد سے ہے۔

جہاں تک اسلامی ممالک کا تعلق ہے، وہاں یہ کشمکش اور عجیب تضاد بڑے وسیع پیمانہ اور مختلف سطح پر پایا جاتا ہے، وہاں ایک طرف حکومت اور جمہور میں کشمکش ہے، دوسری طرف اعلیٰ تعلیم یافتہ اور کم پڑھے لکھے یا ناخواندہ لوگوں میں رسہ کشی ہے، تیسری طرف دیندار اور آزاد خیال اور ترقی پسند افراد دست وگریباں ہیں اور یہ سب نتیجہ ہے اس نظام تعلیم کا جو مغربی ملکوں سے درآمد کیا جارہا ہے یا مغربی ذہن اور نظام تعلیم کے خطوط پر خود ان ملکوں میں تیار کیا جارہا ہے اور اس کے نتیجہ میں ایک ایسی نسل پیدا ہورہی ہے جو ان عقائد اور حقائق کو پوری طرح ہضم اور قبول نہیں کرپاتی، جن پر اس کے معاشرہ اور اس امت کی بنیاد ہے، اس لئے کہ یہ نظامِ تعلیم جس طرح کے خیالات کی آبیاری اس کے دل ودماغ میں کرتا ہے وہ ان حقائق اور عقائد سے کھلے طور پر متصادم ہیں جو اس معاشرہ کے لئے ناگزیر ہیں، کبھی خارق عادت طریقہ پر یا کسی بیرونی اثر سے وہ اس کو قبول کرتی ہے تو لازماً اس کے نتیجے میں یہ نظامِ تعلیم ضرور کمزور پڑتا اور دبتا ہے؛ لیکن بہت شاذ ونادر ہوتا ہے۔

جب یہ طبقہ اس نظام کے آغوش میں تربیت پاکر نکلتا ہے تو قوم کے عقیدہ، خیالات اور جذبات سے اس کی کشمکش شروع ہوجاتی ہے، اگر وہ قوی الارادہ ہوتا ہے تو وہ رجعت پسندی کے ملبہ کو (جیسا کہ اس طبقہ کے معین افراد یہ اصطلاح استعمال کرتے ہیں) راستہ سے ہٹا کر اپنی قوم وملک کو ماضی کے بارگراں سے رہائی بخشنا چاہتا ہے، اس موقع پر ایک ایسی طویل کشمکش برپا ہوتی ہے، جس پر ملت کی ساری توانائیاں

اورصلاحیتیں بے دریغ خرچ ہوتی ہیں اور اندرونی خانہ جنگیوں کا ایسا سلسلہ شروع ہوتا ہے، جوبیرونی جنگوں سے بڑھ جاتی ہے، یہ ان ممالک کا قصہ ہے جہاں ایسی قیادتیں برسراقتدار تھیں جو انقلابی، قوم پرستانہ اورلادینی فلسفوں اوردعوتوں پریقین رکھتی تھیں۔

اگراس طبقہ کی قوت ارادی کمزور ہوتی ہے اور وہ طاقتور شخصیت سے محروم ہوتا ہےتو وہ احساس کمتری کا شکار ہوجاتا ہےاوراس کے اندران عقائداورمقاصد کی طرف سے دلی نفرت پیدا ہوجاتی ہے، وہ آئے دن اس کے برخلاف سازشوں میں مصروف رہتا ہے، غیرملکوں اور بیرونی طاقتوں سے ساز باز کرلیتا ہے اورعوام کے قومی جذبہ اور دباؤ اورعلماء ودعوت دین کےعلمبرداروں کےاثر ورسوخ سے پہلی فرصت میں چھٹکارا حاصل کرلینا چاہتا ہے، چنانچہ اس کے نتیجہ میں غداری کے واقعات بار بارپیش آتے ہیں اور یہ ممالک مستقل طور پر بےیقینی، خوف ودہشت، ذہنی انتشاراورشبہ وبےاعتمادی کی فضا میں رہتے ہیں۔

اس غیرفطری اورغیرضروری صورت حال سے چھٹکارا پانے کی اس کے سوااورکوئی صورت نہیں ہے کہ اس پورے تعلیمی نظام کو یکسر تبدیل کردیا جائے اوراس کوختم کرکے نئے سرے سے ایک نیانظامِ تعلیم تیارکیا جائے جو اس ملت اور امت کے قد وقامت پر راست آتا ہو اوراس کی دینی ودنیاوی ضروریات پورا کرسکتا ہو۔

یہ عالم اسلام کا سب سے بڑا مسئلہ، اس کی سب سے اہم اور ناگزیر ضرورت، وقت کی آوازاوراسلامیانِ عالم کا سب سے بڑا فرض ہے۔

اس مسئلہ کا حل خواہ وہ کتنا ہی دشوارگذارنظرآرہا ہواورصبرآزما اور دقت طلب ہو، اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس نظامِ تعلیم کوازسرِنوڈھالا جائے اوراس کوامت مسلمہ کے عقائد، زندگی کے نصب العین، مقاصد اورضروریات

کے مطابق بنایا جائے اوراس کے تمام اجزاء سے مادیت، خدا سے سرکشی، اخلاقی وروحانی قدروں سے بغاوت اورجسم وخواہشات کی پرستش کی روح اوراسپرٹ کوختم کیا جائے اوراس کے بجائے تقوی، انابت الی اللہ، آخرت کی اہمیت اورفکراور پوری انسانیت پرشفقت کی روح اس میں جاری کردی جائے، اس مقصد کے لئے زبان وادب سے لےکرفلسفہ اورعلم النفس تک اورعلوم عمرانیہ سے لےکراقتصادیات ومعاشیات تک صرف ایک روح پیدا کرنی ہوگی، مغرب کے ذہنی غلبہ اورتسلط کا خاتمہ کرنا، اس کی قیادت وامامت کا انکار کرنا پڑے گا، اس کے علوم ونظریات پرعلمی تحلیل وتجزیہ اوربےلاگ تنقید کا مسلسل اور جرأت مندانہ عمل کرنا ہوگا اور یہ ثابت کرنا ہوگا کہ مغرب کی کامیابیوں اورپیش قدمیوں نے انسانیت اورتہذیب کوکتنا بڑا نقصان پہنچایا ہے، اس راہ میں اگرچہ بہت سے سنگ گراں ہیں اورنتائج بھی بہت تاخیر سے ظاہر ہوسکتے ہیں؛ لیکن یہ تجدد پسندی، آزاد خیالی اورمغرب کی ذہنی غلامی کی اس طوفانی موج کوروکنے کا واحد طریقہ ہے جس نے عالم اسلام کوایک سرے سے دوسرے سرے تک ہلا کررکھ دیا ہے اوراسلام کےفکری واجتماعی ڈھانچہ اورملت ابراہیمی کے شیرازہ کے لئے ایک چیلنج بن گئی ہےاورجس کے نتیجہ میں مسلم اقوام کے پرجوش اسلامی جذبات، ان کی سادہ دلی اورگرمجوشی، ان کی قربانیاں اورسرفروشیاں اوراخلاص ووفا کی قیمتی سوغات (جس کا ان حکومتوں کے قیام اورغیرملکی اقتدار سے آزادی میں سب سے بڑا اور براہِ راست دخل ہے) افرنگیت اورمغربیت کے تنور کی حقیر ایندھن بن رہی ہے، سادہ لوح، بےزبان، سچے مخلص مسلم عوام، خاموشی اورسکون کے ساتھ بکریوں کے ریوڑ کی طرح کسی نامعلوم منزل کی طرف ہنکائے جارہے ہیں اور یہ طبقہ ان کی قسمت کا مالک بن گیا ہے"(۱)

(۱) اسلامی ملکوں میں نظام تعلیم کی اہمیت: ۲۱-۲۳، حضرت مولانا ابوالحسن ندوی

عصری مدارس اور عصری علوم محتاجِ اصلاح

اسلامی نظریہ تعلیم	مغربی نظریہ تعلیم
شخصیت کی تعمیر، فطری صلاحیتوں کے ابھار واستعمال کی ترغیب ، اورجذبہ خدمتِ خلق کی تحصیل۔	عیسائی عقیدہ، تہذیب کا فروغ، پرتعیش زندگی کی تحریص، اور ڈگری کے ذریعہ شہرت وناموری کا فریب، اور تہذیبِ اسلامی کے تشخص وامتیاز کی پامالی
نصاب	**نصاب**
متعلقہ علوم وفنون کے اتنے مواد کی فراہمی جو ہر مضمون کی ضرورت پوری کرسکے، اس کی تسہیل، پھر درجہ بدرجہ تدوین اس طور پر کہ ہر مضمون میں اخلاقِ اسلامی کا عنصر اور اس کی روح کارفرما ہو۔	ہر مضمون میں یورپ کا محض تقلیدی مواد جو ازدیادِ معلومات کا کام کرتا ہو، مگر تخلیقی صلاحیتوں کو ابھار کر تحقیقی میدان میں سرگرم کرنیکی صلاحیت نہ رکھتا ہو، جس کے ذریعہ بس کسی سند کا حصول اور چند ٹکوں کا وصول ہو سکے۔
نظام	**نظام**
باحیاء اور پاکیزہ ماحول ، بلند کردار ، ہمدرد وملنسار، خوش عقیدہ ومتبع سنت ، اساتذہ، اور سہولت وسائل کی فراہمی	لڑکوں اور لڑکیوں کا اختلاط، صلیبی کلچر اور مسیحی ماحول اور مخالف اسلام ذہن سازی وہ بھی کمرشیل بنیادوں پر۔
نتیجہ	**نتیجہ**
خداترس، پاکباز، انسانیت نواز ایک دوسرے کے ضرر سے محفوظ، ایک دوسرے کو فائدہ پہنچانے والے منظّم ومتحد معاشرہ اور مہذب وروبہ ترقی سماج کی تشکیل ، یعنی انسانیت کی تکمیل ۔	خدا فراموش، دین بیزار، بد اخلاق ، حیاء وحجاب سے عاری ، نہایت خود غرض، اور آخرت سے یکسر غافل وبے پرواہ سوسائٹی کا وجود ، جس کا عقیدہ وعمل مسیحیت سے قریب اور اسلام

	سے دور ہو ، جس میں ایمان ویقین شکوک وشبہات سے مبدل اور اخلاق واعمال ایثار وقربانی سے عاری ہوں۔
ثبوت کے لئے	**ثبوت کے لئے**
اسلامی نظامِ تعلیم کے رد میں پیدا شدہ دینی وعصری علوم کے ماہرین پر نظر ڈالی جائے کہ وہ اپنے اپنے فنون میں یکتائے زمانہ اور نادر روزگار ہونے کے ساتھ ساتھ ،صورت وشکل ، کردار وعمل اور خدمتِ خلق کے اعتبار سے کیسے کامل ومکمل اور مخلص وبے لوث تھے۔اس کے ساتھ علم وہنر میں حقائق میں مہارت کا یہ عالم تھا کہ وہ کائناتی حقائق جو معلومات کی تنگی اور مشاہدہ کے محدود وسائل کی وجہ سے انسانی عقل سے بالا تر تھے اور جن کے بارے میں موجودہ معلومات کی تنگی اور مشاہدہ کے محدود وسائل کی وجہ سے انسانی عقل سے بالا تر تھے اور جن کے بارے میں موجودہ معلومات ومزعومات کو عقائد کا درجہ اور توہمات کا ٹیکہ دیکر اسی پر اکتفاء کر لیا گیا تھا ، انہیں توہمات کی جکڑ سے آزاد کر کے	جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی اکثریت کا حال دیکھ لیا جائے جو تکلف وتصنع کو اخلاق اور اخلاقِ اسلامی کو تشدد سے تعبیر کرتے ہیں ، جن کی نظر میں یورپین اقوام ہی خوش نصیبی اور ترقی کی ضامن ہیں، ان کی تقلید جامد کے بغیر زمانہ میں پنپنا اور رفتارِ ترقی کا ساتھ دینا ناممکن ہے ، بہت سوں کی مغربی غلامی کا یہ حال ہے کہ وہ اسلام کی تعریف بدلنے اور قرآن کی نئی تعبیریں وتشریح کے حق میں نظر آتے ہیں، یورپ کا ہر اعتراض ان کو اپنے مذہب پر ایسا داغ نظر آتا ہے کہ اس کو مٹانے کے لئے وہ اس حکم کو حذف کردینے پر آمادہ ہیں، اور اس کی حفاظت کرنے والے ملاوں سے سخت چڑ ہے ۔ان لوگوں کو اولا دینداری دقیانوسی محسوس ہوتی ہے ، اور اگر ادھر کچھ رغبت بھی ہوتی ہے تو وہ اسلام کو علماء اسلام سے سمجھنے اور حاصل

تحقیقات وانکشافات کا ایسا سلسلہ قائم فرمایا جو آج تک پورے کروفر کے ساتھ رواں دواں ہے ، یورپ کی سائنسی ترقی اور تخلیقی دوڑ اگر چہ بہت آگے بڑھ گئی ، اور بڑھتی جارہی ہے ، مگر تاریخ اقوام ناطق اور چشمِ فلک گواہ ہے کہ خود یورپ نے یہ دولت مسلمان سائنسدانوں کی شاگردی میں حاصل کی ہے ، آٹھویں صدی ہجری تک جدھر دیکھو مسلم سائنسدانوں ہی کا غلغلہ اور شور مچا ہوا تھا ؛ لیکن شامتِ اعمال سے اس کے بعد مسلمانوں کا یہ علمی ورثہ یورپ کی میراث بن گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے دنیا کی نظروں سے اس حقیقت کو چھپا دیا گیا۔

کرنے کے بجائے دشمنانِ اسلام یا ان کے شکار مسلم اسکالرز کے ذریعہ حاصل کرنے کو ترجیح دیتے ہیں ، نتیجۃً اسلام کی کوئی نئی تعبیر اور خود ساختہ تصویر لیکر میدانِ دعوت میں اتر جاتے اور اہلِ اسلام کیلئے دردسر بن جاتے ہیں ، ان کا حال عربی کے اس مقولہ کا ہوجاتا ہے ''اگر تو نہیں جانتا تو یہ ایک مصیبت ہے اور اگر جانتا ہے تو یہ اس سے بڑی مصیبت ہے''۔

تعلیم اور اسلاف

چناں چہ جس دور میں یہ تمام علوم وفنون اہل اسلام کے ہاتھوں پروان چڑھ رہے تھے ، ان علوم وفنون سے انسان کو انسانیت کا سبق ، شرافت کا درس ، اخلاق فاضلہ میں رسوخ ، حق و باطل میں تمیز و پہچان کی صلاحیت ، بھرپور طریقے پر حاصل ہوتی رہی اور انسان ہدایت کی شاہراہ پر گامزن اور صراطِ مستقیم پر قائم تھا ، سائنس کا ہر سبق اس کے لیے وجود خداوندی اور توحید باری کا سبق تھا ، ٹکنالوجی کے فنون اس کے لئے قدرتِ خداوندی پر یقین کا باعث بن جاتے تھے ، تاریخ کے واقعات اور قوموں کے عروج وزوال کی داستانیں اس کے لئے عبرت وموعظت کے اسباق قرار پاتے تھے ،

اور وہ ان سے ہدایت حاصل کرنے پر مجبور ہوجاتا تھا : غرض یہ کہ تمام علوم وفنون اس کی رہنمائی کرتے تھے اور وہ رضائے الٰہی وقرب خداوندی کی دولت سے مالا مال ہوجاتا تھا۔(۱)

زوالِ اسپین کے بعد

مگر اسپین کے زوال کے بعد جب یہ تمام علوم وفنون (جس کو ہمارے اسلاف نے ایمانی فراست اور روحانی حرارت کے ذریعہ پروان چڑھایا تھا اور ان علوم وفنون سے انسانیت کی خدمت لیتے رہے) الحاد ودہریت کے شکار لوگوں ، خدا ورسول کے باغیوں ، انسانیت وشرافت سے محروم لوگوں ، حرص و ہوس کے پجاریوں کے ظالمانہ ومجرمانہ پنجے اور قبضے میں چلے گئے ، تو ان علوم وفنون کو ان کے اصل مقصد ومنشاء کے خلاف استعمال کیا جانے لگا اور اپنے ذاتی مفادات کے لیے ان کا کھلے طور پر استحصال کیا جانے لگا۔ اور یہ ملحد وزندیق اور اہلِ حرص وہوا لوگ اپنی مکاری وعیاری ، چالاکی و چالبازی سے شعبۂ تعلیم پر چھاتے ہی چلے گئے ، یہاں تک کہ ان علوم وفنون کو انہوں نے خدا اور رسولوں سے بغاوت ، مذہب وایمان سے عداوت ، انسانیت وتہذیب سے تلعب و استہزاء اور اخلاقی اقدار کی تحقیر وتوہین کے لئے استعمال کرنا شروع کردیا۔

خلافت عثمانیہ کے زوال کے اسباب

علامہ ابوالحسن ندویؒ خلافتِ عثمانیہ کے زوال کی تاریخ اور وجوہات کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ :

> ''سب سے بڑا مرض جو ترکوں میں پیدا ہوا تھا وہ جمود تھا اور جمود بھی دونوں طرح کا علم وتعلیم میں بھی جمود اور فنون جنگ اور عسکری تنظیم وترقی میں بھی .... علمی جمود اور ذہنی اضمحلال اس وقت صرف ترکی اور اس کے علمی اور دینی حلقوں کی خصوصیت نہیں تھی ، واقعہ یہ ہے کہ پورا عالم اسلامی مشرق سے مغرب تک ایک علمی انحطاط کا شکار تھا ، دماغ تھکے

(۱) جواہرِ شریعت:۱۸

تھکے سے اور طبیعتیں بجھی بجھی سی نظر آتی تھیں اور ایک عالمگیر جمود اورافسردگی چھائی ہوئی تھی، اگر ہم احتیاطاً آٹھویں صدی سے اس ذہنی اضمحلال کی ابتداء نہ کریں تو اس میں شبہ نہیں کہ نویں صدی وہ آخری صدی تھی، جب جدت فکر، قوت اجتہاد اور ادب وشاعری، حکمت وفن میں ندرت اور تخلیق کے آثار نظر آتے ہیں، یہی وہ صدی ہے جس میں مقدمہ ابن خلدون جیسی مفکرانہ تصنیف عالم اسلام کو حاصل ہوئی، دسویں صدی سے بہت واضح طور پر افسردگی، شدت تقلید اور نقالی کے آثار نظر آنے لگتے ہیں، یہ افسردگی اور اضمحلال کسی خاص شعبہ اور کسی خاص فن کے ساتھ مخصوص نہیں تھا، دینی علوم، شعر وادب، انشاء وتاریخ تعلیمی نصاب ونظام سب کے سب کم وبیش اس سے متاثر نظر آتے ہیں، پچھلی صدیوں کے علماء کے تذکرے اور کتب سوانح پڑھئے، سینکڑوں ناموں میں ایک ایسے شخص کا ملنا مشکل ہوگا جس پر عبقری (genius) کے لقب کا اطلاق درست ہو یا جس نے کسی موضوع پر کوئی نئی چیز پیش کی ہو، یا کسی خاص علم میں اس نے کوئی گرانقدر اضافہ کیا ہو......سوائے مجدد الف ثانی کے مکتوبات اور شاہ ولی اللہ دہلوی کی حجۃ اللہ البالغۃ، شاہ رفیع الدین کی تکمیل الاذہان، شاہ اسماعیل شہید کی چند ایک تصانیف......

صرف علم دین پر منحصر نہیں، ادب وشاعری بھی اپنی زندگی اور تازگی کھو چکی تھی اور ان پر بھی تقلید وتتبع کا غلبہ تھا، نثر وانشاپردازی کو تکلف وتصنع وقافیہ پیمائی، لفظی صناعی اور عبارت آرائی نے بے رونق اور بے روح بنا رکھا تھا، دوستوں کے خطوط، تاریخ کی کتابیں اور دفتریں تحریریں اور فرامین سے بھی اس عیب پاک نہیں تھے، کہیں کہیں ادب وانشاء کا کوئی ایسا نمونہ آجاتا ہے جو اس زمانے کے مذاق عام سے الگ اور پست سطح سے بلند نظر آتا ہے''

پھر آگے فرماتے ہیں کہ:

''سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی ہی سے ترک تنزل وانحطاط، علمی پسماندگی اور جمود کا شکار ہو چکے تھے، تاریخ انسانی کا یہ وہ اہم ترین عہد ہے جس کا اثر بعد کی صدیوں پر نقش ہے، یورپ اس میں اپنی لمبی نیند سے بیدار ہوا تھا اور ایک جوش وجنوں کی حالت میں اٹھ کر غفلت اور جہالت کے اس طویل زمانہ کی تلافی کرنا چاہتا تھا، وہ ہر شعبہ حیات میں گریز ترقی کر رہا تھا، طبعی قوتوں کو مسخر، کائنات کے اثرات کو منکشف اور نامعلوم سمندروں اور اقلیموں کی دریافت کر رہا تھا، ہر علم وفن میں اس کی فتوحات اور زندگی کے ہر شعبہ میں اس کے اکتشافات جاری تھے، اس مختصر سی مدت میں اس کے یہاں ہر علم میں بڑے بڑے محقق، موجد اور مجتہد فن پیدا ہوئے، کوپرنیکس copernicus گلیلو galilio کیپلر kepler اور نیوٹن newton وہ عالم اور محقق تھے، جنہوں نے ہیئات وطبعیات کا ایک جدید نظام پیدا کردیا، سیاحوں اور جہاز رانوں میں کولمبس columbus واسکوڈی گاما vascoda gama اور میگلن manglin جیسے عالی ہمت، اولوالعزم پیدا ہوئے، جنہوں نے نئی دنیا اور نامعلوم ممالک دریافت کئے۔

علم وصنعت کے میدان میں ترکوں کی پسماندگی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ سولہویں صدی مسیحی سے پہلے ترکی میں جہاز سازی کی صنعت شروع نہیں ہوئی تھی، اٹھارہویں صدی عیسوی میں ترکی پریس ومطابع حفظانِ صحت کے مراکز اور فوجی تعلیم طرز کے مدارس سے روشناس ہوئے، اٹھارویں صدی کے آخر تک ترکی کی نئی ایجادات اور ترقیوں سے اس قدر بیگانہ تھا کہ جب قسطنطنیہ کے باشندوں نے دارالسلطنت پر ایک غبارہ baloon کو پرواز کرتے ہوئے دیکھا تو

اس کو سحر یا کیمیا کی کرشمہ سازی سمجھے، نہ صرف یورپ کی چھوٹی چھوٹی سلطنتیں ترکی سے اس میدان میں بازی لے جا چکی تھیں؛ بلکہ مصر بھی بعض مفید نئی چیزوں سے فائدہ اٹھانے میں پیش قدمی کر چکا تھا، ترکی سے چار سال پہلے مصر میں ریلوے کا نظام قائم ہو چکا تھا، ڈاک ٹکٹ بھی چند مہینے پہلے مصر میں رائج ہو چکا تھا۔

جب ترکی کا یہ حال تھا جو عالم اسلام کا قائد تھا تو دوسرے عرب ممالک کا جو ترکی کے زیر اثر یا دست نگر تھے جو کچھ حال ہوگا، اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، چھوٹی چھوٹی نئی صنعتیں بھی ابھی ان ملکوں میں رواج پذیر نہیں ہوئی تھیں، ایک فرانسیسی سیاح موسیو والنی volney (جس نے اٹھارویں صدی میں مصر کی سیر کی ہے اور شام میں چار سال تک مقیم رہا ہے) اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ ”یہ ملک صنعت میں اس قدر پیچھے ہے کہ اگر تمہاری گھڑی خراب ہو جائے تو غیر ملکی کے علاوہ کوئی درست کرنے والا نہیں ملے گا“ (۱)

پھر مسلمانوں کا تنزل صرف حکمت وعلوم نظریہ اور صنعت وحرفت ہی میں نہ تھا؛ بلکہ یہ ایک ہمہ گیر اور عمومی انحطاط تھا جو مسلمانوں پر پورے طور پر محیط تھا، حتی کہ وہ اپنے جنگ میں بھی یورپ سے پیچھے رہ گئے ہیں جن میں ترکوں کو درجۂ امامت واجتہاد حاصل تھا اور ان میں ان کی فوقیت کا دنیا کو اعتراف تھا؛ لیکن یورپ اپنی ایجاد واجتہاد اور تنظیم کی بدولت فنون حربیہ میں بھی ترکوں سے بہت آگے بڑھ گیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی فوجوں نے ۱۷۷۴ء میں عثمانی افواج کو شرمناک شکست دی اور دنیا پر ظاہر کر دیا کہ ترک جنگی طاقت میں عیسائی قوموں سے پیچھے رہ گئے ہیں“ (۲)

اور آج کے دور میں علم وتعلیم نام ہی اس بات کا ہے کہ مذہب وایمان کو فضول

(۱) زعماء الإصلاح في العصر الحديث، الدكتور أحمد أمين
(۲) انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر: ۱۹۰-۱۹۴

اور بیکار چیز سمجھا جائے، اخلاقی اقدار جیسے شرم وحیاء تواضع وانکساری، احسان وسلوک وغیرہ کو عجز وکمزوری پر محمول کیا جائے اور انسانی اقدار کو دقیانوسی ٹھہرایا جائے اور اس کے برعکس ہر بے حیائی اور بے شرمی کو تعلیم کا لازمہ اور ہر بے ایمانی اور بداعتقادی کو عقل وشعور کا نتیجہ اور ہر بداخلاقی وبدتہذیبی کو روشن خیالی کا اثر قرار دیا جائے۔ (۱)

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب مدظلہ فرماتے ہے:

”(میکالے کا) سب سے بڑا مشن یہ تھا کہ ہندوستان کے باشندوں بالخصوص مسلمانوں کو اپنے سارے تہذیبی ورثے کے بارے میں شدید احساس کمتری کا شکار بنا کر ان کے دلوں پر مغرب کی ہمہ گیر بالا دستی کا سکہ بٹھا دیا جائے، اور نئی نسل کو ہر ممکن طریقہ سے یہ یقین کر لینے پر مجبور کر دیا جائے کہ اگر دنیا میں ترقی اور سربلندی چاہتے ہو تو اپنی فکر، اپنے فلسفے، اپنی تہذیب، اپنی معاشرت اور اپنے ماضی پر ایک حقارت بھری نظر ڈال کر مغرب کے پیچھے پیچھے آؤ اور اپنی زندگی کا ہر راستہ اسی کے نقوش قدم میں تلاش کرو“ (۲)

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ فرماتے ہے:

”یہ مغربی نظام تعلیم درحقیقت مشرق اور اسلامی ممالک میں ایک گہرے قسم کی لیکن خاموش نسل کشی کے مرادف تھا، عقلائے مغرب نے پوری نسل کو جسمانی طور پر ہلاک کرنے کی فرسودہ اور بدنام طریقہ کو چھوڑ کر اس کو اپنے سانچے میں ڈھال لینے کا فیصلہ کیا اور اس کام کیلئے جابجا مراکز قائم کئے، جن کو تعلیم گاہوں اور کالجوں کے نام سے موسوم کیا“ (۳)

مریم جمیلہ فرماتی ہیں:

”مسلمان ماں کو کسی بھی قیمت پر اپنے بچوں کو عیسائی مشینری اسکول، یا

(۱) جواہر شریعت: ۱۹ (۲) ہمارا نظام تعلیم، ص: ۴۸
(۳) مسلم ممالک میں مغربیت اور اسلامیت کی کشمکش: ۲۴۷

کانونٹ کو بھیجنے راضی نہ ہونا چاہیے، جہاں ان بچوں کو پوری طرح اپنے مذہبی ومعاشرتی ورثا سے الگ کردیا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ بھی یقین کرنا چاہیے کہ سرکاری اسکول بھی کچھ زیادہ تسلی بخش سامان مہیا نہیں کرتے'' (۱)

نومسلم مغربی مصنف محمد اسد فرماتے ہیں:

''مسلم نوجوانوں کی مغربی تعلیم ان کو رسول اللہ ﷺ کے پیغام پر ایمان ویقین رکھنے اور اپنے آپ کو اس مخصوص الٰہی تمدن وتہذیب کا نمائندہ سمجھنے کے قابل نہ رکھے گی جو اسلام لے کر آیا ہے''

اس کے بعد پھر آگے چل کر فرماتے ہیں:

''یعنی جو کچھ بھی ہو، اس میں شبہ نہیں کیا جاسکتا کہ ''ان روشن خیالوں'' کے اندر دینی عقائد بڑی تیزی کے ساتھ کمزور ہوتے جارہے ہیں، جن کی تعلیم مغربی بنیادوں پر ہوئی ہے)''۔

پھر آگے ایک عجیب بات فرماتے ہیں کہ:

''ہماری (مسلمانوں کی) پوری تعلیمی پسماندگی اور بے بضاعتی ان مہلک اثرات کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی جو دینی بنیادوں پر مغربی تعلیم کی اندھی تقلید کی وجہ سے مرتب ہوں گے'' (۲)

بعض بلکہ اکثر لوگ آج مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کا رونا روتے ہیں اور ان کو مشورہ دیتے ہیں کہ جو کچھ بھی اور جیسا بھی بن پڑے وہ عصری علوم حاصل کریں ایسے لوگ محترم محمد اسد صاحب کی اس عبارت کو بار بار پڑھیں اور غور کریں کہ انہوں نے کیا فرمایا ہے؟

بلاشبہ پسماندگی بری چیز ہے مگر مغربی تعلیم پر اندھا دھند فریفتہ ہونا اور اس کو جوں کا توں از اول تا آخر لے کر خوش ہوجانا، ایمان اور دینی بنیادوں پر کیا مہلک اثرات مرتب

(۱) Islam and Women Today-10

(۲) Islam at the Cross Road P.100

کرتا ہے؟ اس کا موازنہ تعلیمی پسماندگی سے کیا جائے تو اس پسماندگی کی کوئی حیثیت نہ ہوگی بشرطیکہ ایمان واسلام کی قدر دل میں ہو۔

مغرب نے تعلیم کو کاروبار بنادیا ہے، اسلام میں تعلیم خدمت اور مشن ہے، تعلیم کا مقصد ملازمت قرار دیا گیا، راتوں ورات امیر بننے کی خواہش پیدا کی، عزت کا معیار دولت کو قرار دیا، سیکولرزم یعنی اسلامی مذہبی احکام سے بے اعتنائی اور دین کو محض چند رسوم ورواج کا مجموعہ سمجھا جانے لگا، اور عقائد، تجارت، معاشرت، اور معیشت سیاست سے دین کو نکالا، اس کی جگہ انسان پرستی humanism اور موجودیت یعنی خدا کی جگہ انسان کو خود مختار بناکر اس کی خدائی کا اعلان آخرت کے مقابلہ دنیوی زندگی پر اصرار، اور العیاذ باللہ خدا کے اقتدار کا خاتمہ سیکولرزم کے روپ میں مذہبی اور اخلاق کے بجائے مادہ اور جسم کو ترجیح دینے کے لئے مادہ پرستی (Materialism) کو فروغ دیا اور وحی اور عقل کو چھوڑ کر تجربیت (Empiricism) نتائجیت ایجابیت اور افادیت پسندی کو عام کیا، اسلام میں تجدید کی کوشش کرنا دین کو دنیوی ترقی کا ذریعہ نہ سمجھنا، مغربی نظریات کو عین اسلامی قرار دینا، یہ سمجھنا کہ سود کے بغیر معیشت نہیں چل سکتی، سگریٹ ونسوار پینا، فحش فلموں، گندے ڈراموں، اور گانوں کو گناہ نہ سمجھنا، مغربی لباس کو تفاخر کے طور پر پہننا، کھیل کود کو پیشہ اور مقصد حیات بنانا وغیرہ۔ (۱)

عالمی سطح پر wto اور gatt کے ذریعہ اقوام عالم کو ایک ایسی لادین اور سیکولرزم تعلیمی پالیسی میں شامل ہونے پر مجبور کردیا ہے جو محض معاشی حیوان پیدا کرسکتی ہے۔

زندگی کے چند اہم شعبوں میں اسلامی ومغربی عقائد ونظریات کا موازنہ پیش خدمت ہے:

ش	اسلامی فکر	ش	مغربی فکر
(۱)	انسان اللہ کو راضی کرنے کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لیے ہر	(۱)	انسان اپنی مرضی کے مطابق جو کرنا ہو بلا روک ٹوک کرے۔

(۱) اسلامی اور تہذیب مغرب کی کشمکش

	وقت تیار رہے۔		
(۲)	اخروی کامیابی کو اپنا ہدف بنائے	(۲)	دنیوی ترقی کے لیے جو چاہے کرے۔
(۳)	دنیا کی طرف بقدر ضرورت شریعت کے حدود و قیود میں رہ کر التفات کرے۔	(۳)	دنیا کی محبت ہی سے ترقی حاصل ہوگی۔
(۴)	عفت، عصمت، حیا، نکاح، معاشرت و معیشت، اخلاق ہر چیز میں شریعت کا پابند رہے۔	(۴)	مرد اور عورت کو بالکلیہ آزادی حیاء کو بیماری کا نام دیا گیا؛ نکاح کی کوئی ضرورت نہیں۔
(۵)	عورت اور مرد کے الگ میدان عمل اور اسلامی معاشرے میں متقی اور فاجر میں فرق۔	(۵)	مساوات مرد وزن اور فاجر اور متقی کا کوئی فرق نہیں۔
(۶)	انسان کے ظاہری و باطنی ہر قول عمل میں اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت لازم، حلال وحرام کا معیار قرآن و حدیث اور صحیح اجتہاد۔	(۶)	انسان پر نہ اللہ کی اطاعت لازم، نہ رسول کی بلکہ حلت وحرمت کا اختیار فرد اور ارکانِ پارلیمینٹ کو حاصل۔
(۷)	معیشت اور معاشرت میں سادگی، قناعت، انفاق اور صلہ رحمی عبادت اور کارِ ثواب۔	(۷)	ذاتی منافع کا محرک انسان خود ہے، لہٰذا صرف اپنے فائدے کو پیش نظر رکھنا اور ہر ممکن سرمایہ میں اضافہ کرنا چاہیے۔ سود سے ہو، چاہے رشوت سے ہو، چاہے سٹہ سے ہو، اور ٹھاٹھ باٹ طرزِ زندگی۔

(۸)	ماخذ علم قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس صحیح اس میں اول الذکر دو اصل اور ثانی الذکر کی حیثیت ثانوی۔	(۸)	ماخذ علم، انسانی عقل اور مشاہدہ وتجربہ اور مذہب کی عدم مداخلت۔
(۹)	مقصد علم: حقوق اللہ اور حقوق العباد کی معرفت کے بعد اس پر عمل درآمد۔	(۹)	انسانی صلاحیتوں کی نشوونما، تاکہ دنیوی زندگی کامیابی سے گذر سکے۔
(۱۰)	غایت علم: دنیا میں اللہ اور رسول کی اطاعت تاکہ آخرت میں کامیابی سے ہمکنار ہوجائے۔	(۱۰)	غایت علم: دنیا کی تسخیر تاکہ العیاذ باللہ، اللہ اور قدرت کا مقابلہ کرسکے۔
(۱۱)	سیاست اور مذہب ساتھ ساتھ اسی لیے خلافت کا قیام تاکہ دنیا دین وآخرت دونوں میں فرد اور معاشرہ کامیابی اور سلامتی سے گذر جائے۔	(۱۱)	جمہوریت: یعنی سیاست اور دین میں تفریق صرف دنیا کی کامیابی اور کسی پر غلبہ حاصل ہوجائے۔(۱)

اکابرینِ امت کا عصری تعلیم کے تعلق سے اظہارِ خیال

۲۹/اکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی گڑھ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاسیس کے وقت شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رحمہ اللہ کے خطبۂ صدارت کے یہ تاریخی فقرے ہمارے کانوں میں ابھی بھی گونج رہے ہیں:

”اے نونہالانِ وطن جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غمخوار، جس میں میری ہڈیاں پگھلی جارہی تھیں، مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف سے بڑھایا اور اس طرح ہم نے

(۱) مقالہ مولانا حذیفہ وستانوی، تعلیم اور سماجی خرابیاں، پیش کردہ بر موقع سیمینار، جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم، اکل کوا، زیر نگرانی: مولانا آزاد نیشنل اردو، یونیورسٹی، حیدرآباد، ۱۲، جنوری تا ۲۱ جنوری: ۲۰۱۰ء

ہندوستان کے تاریخی مقاموں دیوبند اور علی گڑھ کا رشتہ جوڑا''

باوجود یہ کہ دیوبند کی خالص دینی تعلیمی درسگاہ کے بالمقابل علی گڑھ پر خالص دنیوی تعلیم کا غلط لیبل چسپاں کر دیا گیا ہے، لیکن کیا ہم بھول جائیں کہ سرسید نے جس درسگاہ کا خواب دیکھا تھا اس کے متعلق انہوں نے خود کہا تھا: ''فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا، نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا تاج سرپر''

لدھیانہ مشن اسکول کو خطاب کرتے ہوئے سرسید فرماتے ہیں:

''یاد رکھو کہ اسلام جس پر تم کو جینا ہے اور جس پر تم کو مرنا ہے، اس کو قائم کرنے سے ہماری قوم قوم ہے، اے عزیز بچے! اگر کوئی آسمان کا ستارہ ہو جائے، مسلمان نہ رہے تو ہم کو کیا وہ ہماری قوم میں نہ رہا''

دوسری طرف مولانا ابو الکلام آزاد جدید تعلیم کے علم برداروں کے خلاف قلم اٹھاتے ہیں تو اس لئے نہیں کہ انہیں جدید تعلیم سے کوئی خلاف تھا، بلکہ اسلامی نقوش کے مٹنے کا درد تھا جو ان الفاظ میں ظاہر ہوا

''میں جو نئے تعلیم یافتہ حضرات کا ہمیشہ شاکی رہتا ہوں تو اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کی ہر گذشتہ خوبی کو ان سے دور پاتا ہوں اور ان کی جگہ کوئی نئی خوبی مجھے نظر نہیں آتی، ہماری گذشتہ مشرقی معاشرت، اوضاع واطوار، اخلاق وعادات، طریق وبود وماند، یہ سب کے سب انہوں نے ضائع کر دیئے، اخلاق وتمدن کے بعد مذہب کا نمبر آیا اور جدید تعلیم وتہذیب کے مندر پر مذہب کی قربانی چڑھائی گئی'' مانا کہ مذہب کی قربانی کے خلاف اس پر جو احتجاج کا نشانہ نئے تعلیم یافتہ حضرات بنائے گئے، لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ علماء کا طبقہ عصری تعلیم کا مخالف تھا محض جواب ترکی بہ ترکی ہے، جدید تعلیم سے متعلق علمائے دیوبند کی فکر کا محور مذہبِ اسلام اور اسلامی تہذیب وتمدن کا تحفظ وبقاء تھا اور آج کے

حالات نے اس کی حقانیت پر اپنی مہرِ تصدیق ثبت کر دی ہے، جامعہ ملیہ کی تاسیس کے موقع پر حضرت شیخ الہندؒ کی اپنے نظریہ تعلیم کی وضاحت دور رس فکر کا ایسا نمونہ ہے جو اسی سال کے بعد کہنہ اور بوسیدہ نہیں ہوا، اسے دہراتے ہوئے ایسا نہیں لگتا کہ کوئی پرانی بات دہرائی جارہی ہو؛ بلکہ یہ کل بھی سچ تھا اور آج بھی سچ ہے،۔

فرماتے ہیں کہ:

''آپ میں سے جو حضرات محقق اور باخبر ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ میرے بزرگوں نے کسی بھی وقت کسی اجنبی زبان سیکھنے یا دوسری قوموں کے علوم وفنون حاصل کرنے پر کفر کا فتوی نہیں دیا، ہاں یہ بیشک کہا کہ: انگریزی تعلیم کا آخر اثر یہی ہے جو عموماً دیکھا گیا کہ لوگ نصرانیت کے رنگ میں رنگ جائیں یا ملحدانہ گستاخیوں سے اپنے مذہب اور اپنے مذہب والوں کا مذاق اڑائیں یا حکومت وقت کی پرستش کرنے لگیں تو ایسی تعلیم پانے سے ایک مسلمان کے لئے جاہل رہنا اچھا ہے''

چنانچہ ۱۹۲۰ میں شیخ الہند نے جس جامعہ ملیہ اسلامیہ کا سنگ بنیاد رکھا وہ ''عصری علوم کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ایک ایسی آزاد درسگاہ تھی جس کا تمام تر نظامِ عمل اسلامی خصائل اور قومی احساسات پر مبنی ہو''۔

مسلم لیگی اخبار ''منشور'' (دہلی) کے مدیر مسٹر حسن ریاض ۹/جون ۱۹۴۰ء کے اداریہ میں لکھتے ہیں کہ:

''گذشتہ تیس برس سے مسلمان بچے بالعموم صرف انگریزی اسکولوں میں تعلیم پا رہے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس دور کے جتنے تعلیم یافتہ ہیں وہ اسلامی کلچر، اخلاق اور اسلامی تصورات سے بالکل نابلد ہیں''

ڈاکٹر ہنر کا قول ہے:

''ہمارے انگریزی اسکولوں میں پڑھا ہوا کوئی نوجوان ہندو یا مسلمان،

ایسا نہیں جس نے اپنے بزرگوں کے مذہبی عقائد کو غلط سمجھنا نہ سیکھا ہو‘‘(۱)

ہاتف نے کہا فردوس میں ایک روز حالی سے
مخاطب ہوئے یوں سعدی شیرازی
کچھ کیفیت مسلم ہندی کی تو بیاں کر
درماندۂ منزل ہے کہ مصروفِ تگ وتاز
مذہب کی حرارت بھی ہے کچھ اس کے رگوں میں
تھی جس کی فلک سوز کبھی گرمیٔ آواز
باتوں سے ہوا شیخ کی حالی متاثر
رورو کے لگا کہنے کہ اے صاحب اعزاز
جب پیر فلک نے ورق ایام کا پلٹا
آئی یہ صدا پاؤ گے تعلیم سے اعزاز
آیا مگر اس سے عقیدہ میں تزلزل
دنیا تو ملی طائر دین کر گیا پرواز
دین ہوتو مقاصد میں بھی پیدا ہو بلندی
فطرت ہے جوانوں کی زمین گیرد زمین تاز
بنیاد لرز جائے جو دیوار چمن کی
ظاہر ہے کہ انجام گلستاں کا آغاز
پانی نہ ملا زمزم ملت سے جو اس کو
پیدا ہیں نئی پود میں الحاد کے انداز
یہ ذکر حضور شہہ یثرب نہ کرنا
سمجھیں نہ کہیں ہند کے مسلم مجھے غماز

(۱) مسلمانان ہند:۱۴۲بحوالہ فتاری رحیمیہ:۲/۱۲۵

خدما نتوان یافت ازاں خار کہ کشتیم
دیبا نتواں یافت ازاں پشم کے رشتیم

اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

’’آج کل تعلیم جدید کے متعلق علماء پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ جدید تعلیم سے روکتے ہیں اور اس کو ناجائز بتلاتے ہیں؛ حالانکہ میں بہ قسم کہتا ہوں کہ اگر تعلیم جدید کے یہ آثار نہ ہوتے جو علی العموم اس وقت اس پر مرتب ہورہے ہیں، تو علماء اس سے ہرگز منع نہ کرتے، لیکن اب دیکھ لیجئے کہ کیا حالت ہورہی ہے، جس قدر جدید تعلیم یافتہ ہیں، بہ استثناء شاذونادر نہ ان کو نماز سے غرض ہے، نہ روزے سے، نہ شریعت کے کسی دوسرے حکم سے، بلکہ ہر بات میں شریعت کے خلاف چلتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ: اس سے اسلام کی ترقی ہوگی‘‘(۱)

اور فرماتے ہیں کہ:

’’مدارس اسلامیہ میں بیکار ہوکر رہنا لاکھوں کروڑوں درجہ انگریزی تعلیم میں مشغول رہنے سے بہتر ہے، اس لئے کہ گو لیاقت اور کمال نہ ہو؛ لیکن کم از کم عقائد تو فاسد نہ ہوں گے، اہلِ علم سے محبت تو ہوگی، اگر چہ کسی مسجد کی جاروب کشی ہی میسّر ہو، یہ جاروب کشی انگریزی میں کمال حاصل کرنے اور وکیل، بیرسٹر وغیرہ بننے کہ جس سے اپنے عقائد فاسد ہوں اور ایمان میں تزلزل ہو اور اللہ اور رسول اور صحابہ وبزرگانِ دین کی شان میں بے ادبی ہو کر جو اس زمانے میں انگریزی کا اکثری بلکہ لازمی نتیجہ ہے اور یہ ترجیح ایک محب دین کے نزدیک تو بالکل واضح ہے، ہاں جس کو دین کے جاننے کا غم ہی نہ ہو وہ جو چاہے کہے‘‘(۲)

سرسید مرحوم لکھتے ہیں کہ:

(۱) فضل العلم والعلماء:۸
(۲) حقوق العلم:۶۳، ۶۴، بحوالہ فتاوی رحیمیہ:۱/۲۲

''اسی طرح لڑکیوں کے اسکول بھی قائم کئے گئے جن کے ناگوار طرز نے یقین دلایا کہ عورتوں کو بدچلن اور بے پردہ کرنے کیلئے یہ طریقہ نکالا گیا ہے'' (۱)

آنریبل مسٹر فضل حق وزیر اعظم صوبۂ بنگال نے ۱۹۳۸ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل منعقدہ پٹنہ کے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے فرمایا:

''جس قسم کی تعلیم (کالج اور اسکولوں میں ان کو دی گئی ہے، دراصل اُس نے اُن کو نہ دنیا کا رکھا ہے، نہ دین کا، اگر ایک مسلمان بچہ نے اونچی سے اونچی تعلیم کی ڈگری حاصل کر بھی لی؛ لیکن اس کوشش میں مذہب کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تو اس کا ڈگریاں حاصل کرنا قوم کیلئے کیا مفید ہوسکتا ہے؟ مفید اس وقت ہوسکتا ہے کہ جب مسلمان رہ کر ترقی کریں، کیا خوب کہا اکبرالہ آبادی نے

فلسفی کہتا ہے کیا پروا ہے گر مذہب گیا
میں یہ کہتا ہوں ، بھائی یہ گیا تو سب گیا(۲)

حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمہ اللہ کا ارشادِ گرامی ہے کہ:

''انگریزی تعلیم کا آخری اثر یہی ہے جو عموماً دیکھا گیا ہے کہ لوگ نصرانیت کے رنگ میں رنگ جائیں، یا ملحدانہ گستاخیوں سے اپنے مذہب اور مذہب والوں کا مذاق اڑائیں یا حکومت وقت کی پرستش کرنے لگیں تو ایسی تعلیم پانے سے ایک مسلمان کے لئے جاہل رہنا ہی اچھا ہے'' (۳)

حضرت مولانا ابوالحسن ندوی رحمہ اللہ قرآن کی آیت کریمہ ''قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَأَھْلِیْکُمْ نَارًا وَّقُوْدُھَا النَّاسُ وَالْحِجَارَۃُ'' (اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو،

(۱) اسباب بغاوتِ ہند

(۲) ''مدینہ'' (سہ روزہ) بجنور، ۹؍اکتوبر ۱۹۳۸ء

(۳) خطبۂ صدارت جلسہ افتتاحیہ مسلم نیشنل یونیورسٹی علی گڈھ ۱۹۲۰ء

اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو ایسی آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں اور جس پر تندخو اور سخت مزاج فرشتے مقرر ہیں جو اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور جس کا ان کو حکم دیا جاتا ہے وہ بجالاتے ہیں)، اس آیت کے تحت ان طلباء کے تعلق سے فرماتے ہیں جنہیں دینی تعلیم سے دور رکھ کر صرف اسکول کی غیر اسلامی ماحول میں تعلیم دی جاتی ہے:

''کیا اس آیت کا مطلب اس کے سوا اور کچھ ہوسکتا ہے کہ اپنے بچوں کو اپنے گھر والوں کو ایسی چیزوں سے بچاؤ جو آگ تک لے جانے والی ہیں جن کا انجام یہ ہونے والا ہے کہ دوزخ میں جائیں، ورنہ وہ کونسے انسان ہیں جو اپنے بچوں کو آگ کی طرف جاتے ہوئے دیکھیں اور ان کو نہ روک لیں؟ اب صورتحال اس وقت یہی ہے بچوں کی دینی تعلیم کا انتظام نہ کرنا بچوں کو اس ماحول کے بالکل حوالہ کردینا اور ان کو اس کے رحم وکرم پر چھوڑ دینا جو اس بات کا نہ مکلف ہے نہ اس بات کا مدعی، نہ اس بات کا اہل کہ بچوں کو وہ تعلیم دے گا جس پر نجات موقوف ہے، پیغمبروں کی لائی ہوئی وہ تعلیم جس سے ناواقفیت کے نتیجہ میں ایمان کا خطرہ ہے، آخرت کی ہلاکت ہے تو اب یہ دیکھنا چاہئے کہ اس بات کو بچے کے لئے کیسے گوارا کیا جارہا ہے؟ موجودہ تعلیمی نظام صرف لادینی (secular) ہی نہیں وہ ایک مثبت ومعین نظام تعلیم (System of education Hindu mythology) ہے، ہندون مالا اس میں شامل ہے، انگریزوں کے زمانے کی تعلیم سیکولر تھی، بلی، کتے کے قصے ہوتے تھے اور ہم میں سے بہت سے لوگوں نے انگریزوں کے عہدِ حکومت میں انگریزی پڑھی ہے، اس وقت زبان سکھانے والی ابتدائی کتابوں میں کسی کے عقیدہ پر اثر نہ پڑتا تھا، نہ کسی مخلوق کا تقدس پیدا ہوتا تھا اور نہ اس کائنات میں کسی مخلوق کا تصرف واختیار معلوم ہوتا تھا، اس وقت

بھیڑیئے، چیتے، بندر اور لومڑی اور بلی، کتے کے قصے بچے پڑھتے تھے، ویسے کے ویسے ہی گھر آتے تھے جیسے جاتے تھے، لیکن اب صورتحال حال یہ نہیں ہے، سرکاری نصابی کتابوں میں عقیدہ پر اثر ڈالنے والے اسباب، قصے کہانیاں اور مضامین ہوتے ہیں اور جو کسر کتابوں میں باقی رہ جاتی ہے، وہ ماسٹر صاحبان پوری کرتے ہیں، بچوں کو کچھ اجتماعی کام ایسے کرنے پڑتے ہیں جو اسلام کے عقیدۂ توحید کے منافی ہیں؛ لہٰذا موجودہ تعلیمی نظام سے بچے کا ایمان کیسے سلامت رہے گا؟ اگر خارجی واضافی دینی تعلیم کا انتظام نہیں ہے کہ اسکول میں جو کچھ پڑھ کر آتا ہے، اس کی اصلاح کی جاتی ہے اور اگر اس کو کوئی ایمانی توحیدی (dose) دیا جاتا ہے، صباحی یا شبینہ مکتب ہیں، تعلیمی حلقے ہیں، کوئی دینی کتاب سنائی جاتی ہے ایسا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ............آج یہ حالت ہو رہی ہے کہ ایک بڑے طبیہ کالج کے جس کی ایک تاریخ ہے، ایک طالب علم سے کوئی مضمون لکھوانا تھا یا خط لکھوانا تھا، تو سوچا کہ یہ صاحب تو طب کی کتابیں پڑھتے ہیں جو عام طور پر عربی فارسی میں ہیں، بہت نیچے اتر آئیں تو اردو میں ہیں، ان سے کہا: آپ لکھئے، وہ لکھتے رہے، لوگ سمجھتے رہے کہ لکھ لیا، دیکھا تو وہ ہندی میں تھا، ان سے کہا گیا کہ آپ یونانی طب پڑھتے ہیں اور اردو نہیں لکھ سکتے؟ انہوں نے کہا کہ: ہمیں تو یہی پڑھایا گیا ہے، تو ایک ایسی نسل تیار ہونے کا محض اندیشہ نہیں، مشاہدہ میں آرہا ہے، دین کی بنیادی چیزوں سے ناواقف، بنیادی عقائد سے ناواقف، اللہ اور رسول اللہ ﷺ کا ہمارے دل میں جو عقیدہ بسا ہوا ہے اس سے ناواقف............آنکھوں سے دیکھا گیا ہے کہ سیرت پر تقریر کرنی ہے، اسلامیہ اسکول ہے، کالج ہے، جامعہ ہے اور ایک مسلمان نوجوان طالب علم کو کسی نے سیرت کا مضمون دیا، وہ ہندی میں لکھ

کر لایا اور اردو میں پڑھا، الفاظ تو اردو اور رسم الخط ہندی اور رسم الخط تو وہ چیز ہے کہ آرنلڈ ٹوائن بی (Arnold Toynbee) جو اس زمانہ کا بڑا فلسفی (Philosopher)، مؤرخ (Historian) ہے، اس نے لکھا ہے کہ اب کسی کتب خانہ کو آگ لگانے کی ضرورت نہیں، رسم الخط بدل دینا کافی ہے، اس سے اس قوم کا رشتہ اپنے ماضی سے بالکل ٹوٹ جائے گا اور اس کی پوری تہذیب اس کے لئے بے معنی ہو کر رہ جائے گی اور پھر جس طرف چاھے لے جاؤ، جو چیز چاہے کسی ملت کو اس کے ماضی سے، اس کے مذہب سے، اس کی تہذیب سے، اس کے کلچر سے ملاتی ہے، وہ رسم الخط ہے، رسم الخط بدلا نسل بدل گئی۔

آج سے ساٹھ برس پہلے اکبر مرحوم نے کہا تھا:

شیخ مرحوم کا قول اب مجھے یاد آتا ہے
دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے (۱)

لڑکیوں کے لئے عصری تعلیم

خدا کے بندوں کو دیئے گئے زندگی گذارنے کے نورانی طریقے میں مرد وزن میں فرق مسلم ہے، ان کی ذمہ داریاں اور ان کا دائرہ کار مکمل واضح ہے، اسلام ہی دین فطرت ہے اور اسلام ہی مرد وعورت کی جسمانی ساخت، جذبات کو اعتدال کے ساتھ پورا کرنے والا ہے، معاش کی ذمہ داری اسلامی نقطۂ نظر سے عورت پر عمومی حالات میں نہیں ہے، عورت کا اصل کام کامیاب بیوی، سلیقہ مند ماں، فرماں بردار بیٹی، پاک دامن بہن بننا ہے، انسانی معاشرہ کو خدا ترس خادم دین وملت دینا ہے، اگر عورت اس فرض منصبی کو پورا کرتے ہوئے اور اس سے ہٹے بغیر کچھ ضروری عصری فنون کی طرف حدود شرع میں وقت دیتی ہے تو کوئی حرج نہیں ہے۔

نسوانی ذمہ داریاں پورا کرنے کے لئے اللہ پر توکل ہو، قناعت، صبر، تواضع، حسنِ

(۱) ماخوذ از: دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے، حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی

انتظام، تربیت کی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے، اگر عفت و پاک دامنی نہ ہو تو گھر کی چہار دیواری میں رہنا بوجھ محسوس ہوتا ہے، خاندانوں کو نبھانا طبیعت بالکل نہ چاہتی ہو ایسی عورتیں انسانی معاشرہ کو بکھیرنے کا ذریعہ بن سکتی ہیں، تعمیر و تشکیل کا سبب نہیں بن سکتیں، حالات حاضرہ میں عورت کو وہ حقیقی علم دیا ہی نہیں جا رہا ہے جس سے وہ کسی ولی کی ماں بن جاتی، یا کسی عالم دین کو جنم دیتی، قوتِ دعا، انابت الی اللہ کا کچھ سرمایہ اس کے پاس ہوتا، وہ فاطمہ رضی اللہ عنہا و عائشہ رضی اللہ عنہا کی حیاء کو اپنا نمونہ بناتیں، بشر حافی کی بہن یا حضرت ملفوسہ والی قناعت، رضا و تسلیم کا اسے کوئی حصہ مل جاتا، حضرت خنساء رضی اللہ عنہا، اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا جیسی جان فروشی اور اولاد کو اعلائے کلمۃ اللہ پر ابھارنے کے جذبات دیئے جاتے۔

اگر پندے ز درویشے بگیری
ہزار امت بہ میرد، تو نہ میری
بتولے باش و پنہاں ازیں عصر
کہ در آغوش شبیرے بگیری

علامہ اقبالؒ کی نگاہ میں ایسی تعلیم سراسر موت ہے جس کی وجہ سے عورت اپنی نسوانیت کے جوہر کو کھودے اور ایک مسلمان ماں کی خوبیوں سے محروم ہو جائے اور اس کا دینی کردار ختم ہو جائے۔

تہذیب فرنگی ہے اگر مرگ امومت
ہے حضرت انسان کے لئے اس کا ثمر موت
جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نہ نازن
کہتے ہیں اس علم کو ارباب نظر موت

اس کے برخلاف علم کے نام پر پائی جانے والی جہالت سے بیٹیاں ماؤں پر جری ہوگئیں ہیں، علم بغیر دینی تربیت کے ناخواندہ باپ پر انہیں جری کر دیا، مسلمان بہن کو اس جہالت کی ضرورت نہیں ہے، جہاں ڈگری کے ہاتھ میں آنے سے پہلے دامنِ عفت ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہو، ڈگریوں کے انبار کے ساتھ طلاق و خلع کا بازار بھی گرم ہو جاتا ہے،

بچوں کی تربیت کو بوجھ سمجھا جا رہا ہو، یہ تہذیب نہیں ہے، ایر ہوسٹس پچاس سو مسافروں کی خدمت بخوشی بجالائے اور ان کی ناز برداری کرے اور ایک شوہر کا تحمل نا قابل برداشت ہے، یہ اخلاقی اور عقلی دیوالیہ پن نہیں ہے تو اور کیا ہے، یا کسی کمپنی کا عورت کو منیجر بنا کر، یا پرنسپل ٹھہرا کر دسیوں معاملات کو درست کر رہی ہوں؛ لیکن اپنے خاندان کی ناہموار طبیعتوں کو نبھانے سے، ناموافق مزاجوں کو لے کر چلنے سے کنارہ کشی اختیار کر رہی ہوں، انانیت اس قدر بڑھ چکی ہو کہ اپنی ساس کے ساتھ کچھ نبھاؤ نہ کر سکے۔ عورتوں کو کالج کے ماحول میں جو تعلیم دی جا رہی ہے، اس سے عورت کی نسوانیت تار تار ہو رہی ہے۔

حج کے لئے جانے والا کوئی بدکاری کے ارادہ سے نہیں جاتا، تب بھی وہاں دوران طواف پردہ معاف نہیں، مسجد میں بھی آنے والیوں کو حکم تھا کہ لباس سادہ قسم کا ہو، خوشبو لگی ہوئی نہ ہو، مردوں سے پہلے مسجد سے نکل جائیں تو مسجد کے اندر کعبہ کے سائے میں بے محابا اختلاط خیر القرون میں درست نہیں تھا تو دورِ فتن میں کیسے درست ہوگا؟ وہ بھی بازاروں اور کالجوں میں۔

ہمیں یہ یقین کرنا ہے کہ مریم بنت عمران اور یحیٰ بن زکریا علیہما السلام بھی تنہا جمع ہوں تو تیسرا شیطان ہوتا ہے(۱) اور بقول جنید بغدادی رحمہ اللہ اگر پڑھانے والا اللہ کا ولی حسن بصری ہو اور پڑھنے والی رابعہ بصریہ رحمہما اللہ ہو اور یہ دونوں تنہا بیت اللہ میں کلام اللہ پڑھیں تو تیسرا شیطان ہوتا ہے؛ لہٰذا ہمیں بہر صورت مخلوط تعلیم کو ختم کرنا ہے، اسٹاف میں بھی غیر محرموں سے اختلاط نہ ہونے پائے، چہرے، ہاتھوں، پیروں کی پردہ، ہمیں بطریقۂ ترغیب پورا اہتمام کرانا ہے، کھیل صرف تفریح طبع کے لئے اور بچوں کی نشو و نما کے لئے، لڑکے اور لڑکیوں کے مزاج کا لحاظ کر کے کھلانا ہے، جوان بچیاں نامحرم کوچ سے بے تکلف کرائے، فٹ بال، ٹینس سیکھیں، پھر بھی دل پاک رہیں ہیں، نہیں ہوسکتا، بہت عجیب بات ہے کہ غیروں کے اسکول تو اپنے مذہبی مزاج کی دعوت دے رہے ہیں اور مسلمان اپنے آسمانی مذہب کو حصولِ علم میں رکاوٹ سمجھتا ہے۔

(۱) ذم الہوی لابن الجوزی: فی ذکر تحریم الخلوۃ: ۱/۱۴۸

اس کے متعلق علامہ اقبال نے کہا تھا:

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو ارباب نظر موت
بیگانہ رہے دین سے اگر مدرسۂ نسواں
ہے عشق ومحبت کے لئے علم وہنر موت

اور ایک جگہ علامہ اقبال نے فرمایا تھا کہ

ہزار بار حکیموں نے اس کو سلجھایا
مگر یہ مسئلہ زن رہا وہیں کا وہیں
قصور زن کا نہیں ہے کچھ اس خرابی میں
گواہ اس کی شرافت پہ ہیں مہ وپرویں
فساد کے ہے فرنگی معاشرت میں ظہور
کہ مرد سادہ ہے بیچارہ زن شناس نہیں

اگر کالج صرف لڑکیوں کے لئے مخصوص ہے تو پڑھانے والے غیر مسلم یا بے حیاء ہوں تو ضرور اپنے استاذ کے اوصاف سے غیر شعوری طور پر انجذاب کرتا ہی ہے، ٹنکی کا پانی ہی نلوں میں منتقل ہوتا ہے، استاذ طالب علم کی نگاہ میں مثالی شخصیت بن جاتا ہے، ان کی فیشن پرستی، خدابیزاری، اخلاقی بے راہ روی، ان کے دلی رجحانات کا پرتو ہماری بہو، بیٹیوں پر پڑ کر رہے گا، صبح سے شام تک پانچ، دس، پندرہ، بیس، پچیس سال کی صحبت کیا ان میں اثر انداز نہیں ہوگی؟ ضرور ہوگی، اور ہو رہی ہے، بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ غیر مسلم لڑکیوں سے پردہ ایسا ہے جیسے کہ اجنبی مسلمان سے۔

خلاصہ یہ ہے کہ:

۱) عورت کو سب سے پہلے امور خانہ داری، حسن انتظام، حسن معاشرت، عبادت واطاعت والی مومناتی صفات سے آراستہ کرنا ہماری اولین ترجیح ہے۔

۲) کم سے کم جماعت سوم سے زیادہ سے زیادہ جماعت پنجم سے مخلوط تعلیم کا

سدباب ہوجانا چاہئے۔

۳) انتظامیہ میں، معلمین میں کوئی مرد نہیں جماعت پنجم میں پڑھانے والا نہ ہو؛ مگر یہ کہ پردہ کا پورا اہتمام ہو۔

۴) یہ بات خوب ذہن نشیں کرلینا چاہئے کہ پردہ دینی یا عصری اعلیٰ تعلیم کے لئے مانع نہیں ہے، چنانچہ اسلام میں سینکڑوں نمونے احکامِ الٰہی کی مکمل پابندی کے ساتھ پیدا کر کے دکھائے ہیں، جس کا تذکرہ مختلف کتابوں میں ہے۔

۵) کوئی خاتون اگر ماہر امراضِ نسواں یا خواتینِ اسلام کو بالخصوص نفع پہنچانے والے کوئی فن کو سیکھ رہی ہے تب بھی اسے اصل اور اہم کام شوہر کی اطاعت، اولاد کی تربیت اور دینی گھرانے کی بنیاد ڈالنے کو ہی اپنا نصب العین اور مقصد بنانا چاہئے۔

کوئی پوچھے حکیم یورپ سے
ہند ویونان ہیں جس کے حلقۂ بگوش
کیا یہی ہے معاشرۃ کا کمال
مرد بے کار زن تہی آغوش

موجودہ صورتِ حال

حدیث وسیرت کے بعد اگر فقہی عبارتوں کا جائزہ لیا جائے تو متعدد جگہوں پر فقہاء نے عصری فنون حاصل کرنے کو فرض کفایہ قرار دیا ہے، **یہ بات اچھی طرح جان لینا چاہئے کہ اسلام کی نظر میں عصری فنون کی اتنی اہمیت نہیں ہے کہ دینی علوم سے صرف نظر کرلیا جائے، ہمارے انجنیئرس اور ڈاکٹرس کو اپنی مذہبی بنیادی معلومات بھی نہ ہوں، ضروریات دین سے ناواقف اور اس کے حاصل کرنے والوں کو بندۂ شکم اور بندۂ شہوت بنا کر چھوڑ دیا جائے، والدین کے رشتہ کا تقدس اور بے داغ جوانی سے وہ بے بہرہ ہوں ، دیانت داری، انسانیت نوازی کا کوئی جذبہ ان کے تحقیق وملازمت میں دخل نہ رکھتا ہو۔**

علامہ اقبالؔ نے مغربی تہذیب کے ساتھ ساتھ مغربی نظام تعلیم کو بھی اپنی تنقید کا

نشانہ بنایا اوراس کے نقائص کو یوں بے نقاب کیا، فرماتے ہیں:

ہم سمجھتے ہیں کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ
گھر کے پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما
لے کے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ

اورایک مقام پرفرمایا:

وہ علم نہیں زہر ہے احرار کے حق میں
جس علم سے حاصل ہے جہاں میں دو کف جو

عصر حاضر میں ڈاکٹرس، انجنیرس اور سائنسدانوں کی کمی کا مسئلہ نہیں ہے؛ بلکہ دیانت دار، قوم وملت کے خادم، احساس ذمہ داری، زندہ ضمیر وباشعور افراد کی کمی سب سے بڑا مسئلہ ہے، ان اوصاف کے فقدان اور مذہبی تعلیمات سے دوری ہی کی وجہ سے جو جتنا پڑھا لکھا ہوتا ہے وہ اس زمانہ میں ڈاکہ زنی، چوری، رشوت ستانی کے بڑے بڑے واقعات میں ملوث ہوتا ہے، وہ انگریزی زبان سے واقف تو کم ہے؛ لیکن انگریزوں کا غلام زیادہ ہے، بالوں میں تراش خراش، لباس وپوشاک میں تہذیب وتمدن پوری قوم میں غلامی کو تسلیم کرلیا گیا ہے، وہ کامیاب شہری تو کیا حکومت اور قوم کے لئے نقصاندہ ہورہا ہے، نہ ہی یہ اسلام کا نقطۂ نظر ہے، نہ ہی گاندھی، ڈاکٹر ذاکر حسین، مولانا ابوالکلام آزاد کا نظریۂ تعلیم، مغربی موادِ تعلیم کے ساتھ مغربی نظامِ تعلیم کو بھی جوں کا توں نافذ کردیا گیا ہے، نہ ہی نظام تعلیم میں عمل جراحی کرکے غیر اسلامی اثرات کو پاک کیا گیا اور نہ اسلامی مواد کو داخل کیا گیا، مسلمان خود ہی نظام تعلیم میں مخلوط تعلیم کو گناہ ہی نہیں سمجھتا؛ بلکہ بہت سے دینی علوم کے ساتھ عصری علوم کو پڑھانے کا خوشنما نام لگانے والے بھی جماعت پنجم کے بعد مردوزن کے اختلاط کو ختم کرنا ہی نہیں چاہتے، جب کہ طلباء بالغ ہوجاتے ہیں اور زمانہ آئے دن اسکولوں، کالجوں میں پیش آنے والے واقعات سے نالاں ہے۔علامہ اقبال نے فرمایا:

جب پیر فلک نے ورق ایام کا الٹا
آئی یہ صدا پاؤ گے تعلیم سے اعزاز
آیا ہے مگر اس سے عقیدوں میں تزلزل
دنیا تو ملی ، طائر دیں کر گیا پرواز
دین ہو تو مقاصد میں بھی پیدا ہو بلندی
فطرت ہے جوانوں کی زمین گیر ، زمین تاز
مذہب سے ہم آہنگئ افراد ہے باقی
دین زخمہ ہے جمعیت ملت ہے اگر ساز
پانی نہ ملا زمزم ملت سے جو اس کو
پیدا ہیں نئی پود میں الحاد کے انداز

اورایک موقع سے فرمایا:

یہ مدرسہ ، یہ جواں ، یہ سرور ورعنائی
انہی کے دم سے ہے خانۂ فرنگ آباد

یہ تو باطنی اثرات تھے، ظاہری نظام کے اعتبار سے اگر نظر ڈالئے تو بچوں کے لئے یونیفارم میں نہایت چھوٹے شلوار رکھے گئے اور بچیوں کے لئے ایسا فراک کہ جس سے ان کا ستر کھلتا رہتا ہے اور رگ وپیٹے سے حیاء کرید لی جاتی ہے، دسویں جماعت تک بھی اسی لباس میں لڑکیوں کو دیکھا جارہا ہے، سر کو ننگا رکھنے، کمر پر بیلٹ بندھوانے کا مقصد سوائے بے حیائی ظاہر کرنے کے کچھ نہیں ہوسکتا، سیکھنے سکھانے سے اس کا کوئی تعلق نہیں، کھیل تو کھیل ہے، ناچ کیا ہنر ہوسکتا ہے، اس زمانے میں کھیل اور ناچ ایک مقصد زندگی، ذریعہ معاش، شہرت کا آسان سبب بن چکا ہے، سائنسدانوں، اعلی تعلیم یافتہ، قوم وملت کے خادم افراد کی وہ قدر نہیں رہی جو رقاصاؤں اور کھلاڑیوں کو ہوچکی ہے، انہیں کو پوری قوم کا نمائندہ اور مثالی شخصیت شمار کیا جارہا ہے، کھیل اور ناچ مغربی تہذیب کی تشہیر کے لئے نہایت مؤثر ذریعہ ہوچکے ہیں، یہودی تجارت کے فروغ کے لئے جادوئی ہتھیار بن چکے

ہیں، اسی سے متاثر ہوکر اسکولوں میں بھی رقص وسرور، ڈیانس، سوئمنگ، پکنک، فلم بینی، تاریخی مقامات کی سیر، سالانہ تعلیمی مظاہروں کا سلسلہ جاری کیا گیا، ان سے وہ سب کچھ ہورہا ہے جو ہونا نہ چاہئے، پھل وقت سے پہلے پک رہے ہیں، نابالغی میں جنسی تشدد کے واقعات پیش آرہے ہیں، خود تعلیمی نظام مضمحل ہورہا ہے، اس تعلیمی نظام سے گذر کر بچہ جب بیرونی ممالک کا سفر کرتا ہے تو قدیم زمانے میں مائیں اپنے بچوں کہتی تھیں بیٹے ہم نے تمہارے لئے خاندانی لڑکی دیکھ رکھی ہے وہاں نکاح نہ کرنا، کچھ عرصہ پہلے یہ کہہ رہیں تھیں اگر وہاں نکاح کرنا ہو تو مسلمان عورت سے کرنا کسی عیسائی لڑکی سے نہ کرنا، آج کل یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ بیٹے یورپ جارہے ہو اگر نکاح کی ضرورت محسوس ہو تو عورت سے نکاح کرنا مرد سے نکاح ہرگز نہ کرنا، ڈگریوں کی اہمیت اتنی اختیار کرگئی کہ ڈگریوں کی تکمیل کے لئے بچیوں کے اچھے رشتوں کو ٹھکرایا جارہا ہے اور اس دور فتن میں اور اس بے حیاء نظامِ تعلیم میں رکھ کر بچوں کو نکاح میں غیر معمولی تاخیر کی جارہی ہے، اگر اعلیٰ ڈگریاں مل جائیں تو بچوں کے اس تناظر سے رشتوں کی تلاش میں مزید تاخیر ہورہی ہے اور اس معیار کے نکاح کا تقاضا بھی ہورہا ہے۔

یہ کہاں کی عقل مندی ہے کہ لڑکیوں کی تصاویر ان کے اونچے رینک آنے پر برسرعام سڑکوں پر اور اخباروں میں شائع کیا جائے، اس تعلیمی سال کے ابتداء میں نئے داخلہ شدہ لڑکیوں میں حسیناؤں کا درجہ طئے کیا جائے یا ریگنگ کے ذریعہ سے اخلاق سوز حرکتیں کی جائیں بالکل جائز نہیں ہے کہ اولاد کو اعلیٰ تعلیم کے عنوان پر اس حال میں یورپ وامریکہ بھیجا جائے کہ اس کا ایمان اور تقوی ہی درست نہ ہو، اسلامی شناخت کے تحفظ وبقا کا امکان نہ ہو؛ بلکہ مغربی ماحول میں رل مل جانے کا قوی اندیشہ ہو اور عملی تجربے ہورہے ہیں، اس کے لئے سودی قرضے گوارا کئے جارہے ہیں۔

انتظامیہ کی خدمت میں کچھ اہم گذارشات:

۱) چاہے وحدتِ تعلیم کا نقطۂ نظر ہو، یا عصری ماحول میں دینی تعلیم کے اسکولس ہوں یا دینی اقامت گاہوں یعنی مسلم ہاسٹلس کا قیام، جیسے انتظامیہ یہ چاہتی ہے کہ طلبہ کو

شریعت کا پابند بنایا جائے اور اللہ کے احکام کو ان میں زندہ کیا جائے، اسی طرح وہ خود بھی ملازموں کے ساتھ برتاؤ میں، ماتحتوں کے ساتھ لین دین کے مسائل میں اور پارٹنرس اپنے معاملات میں حلال وحرام کا لحاظ رکھیں، طئے ہونے والے معاہدات کو اہل علم کی نگاہ سے گذاریں، خود اسٹاف وعملہ سے پودہ کا اہتمام کریں، اس کے بغیر اسلام کے نام پر چلائے جانے والے ادارے اسلام کی بدنامی اور غلط نمائندگی کا ذریعہ بنیں گے۔

۲) اہلِ علم یا دین دار حضرات کی نگرانی میں چلائے جانے والے ان اداروں کا مذہبی مزاج سیکھنا بھی ضرور ہے، اسی طرح عصری تعلیم کا معیار باقی رکھنا بھی ضروری ہے، چاہے دینیات کا نظام جتنا بھی مستحکم اور بڑے بڑے علماء کے بیانات ہورہے ہوں، لیکن عصری تعلیم معیاری نہیں ہے تو اس قسم کے ادارے ہرگز مغرب زدہ طبقہ کو قریب کرنے کا ذریعہ تکرار نہیں بن سکتے۔

آخری بات یہ ہے کہ ساری مسلمان تنظیمیں، مسالک سے بالاتر ہوکر عصری اسکولوں کے چلانے میں ایک دوسرے کے تجربات سے فائدہ اٹھائیں، باہمی ارتباط کے ذریعے سے نصاب ونظام کی خوبیوں کا لین دین کریں، ہر آدمی اپنی جگہ پر تجربات کو دہرا کر اپنا اور طلبہ کا مال وقت ضائع نہ کرے۔




مسلمان سائنسدانوں
کے خصوصیات وامتیازات

(۱) تجرباتی طریقۂ کار:

کسی بھی علمی تحقیق، ایجاد، اکتشاف کے تعلق سے مسلمانوں نے اس پر بحث ونظر پر ہی اکتفا نہیں کیا؛ بلکہ انہوں نے تجربات بھی کئے، یونانی اور ہندی تو بیشتر نظریات قائم کرنے پر ہی اکتفا کرتے تھے۔(اس کو عملی جامہ نہیں پہناتے تھے، اس کو عملی جامہ نہ پہنانے کی وجہ سے بہت سارے نظریات علمی تحقیق سے متعلق یکجا ہوئے، جس میں صحیح اور غلط کے درمیان فرق اور خط فاصل قائم کرنا مشکل ہوگیا، پھر) مسلمانوں نے ان تمام نظریات کو تجربات کی کسوٹی پر پرکھا (چنانچہ مسلمان سائنسداں ہر نظریہ قائم کرنے کے بعد اس پر سرچ، تحقیق اور تجربہ بھی کرتے تھے، جس سے صحیح اور غلط نظریہ واضح ہوجاتا تھا، یہ تجرباتی) یہ طریقہ مسلمانوں ہی کی ایجاد ہے۔

چنانچہ مسلمانوں نے سابقہ تمام نظریات کو تجربات کی کسوٹی پر پرکھا ہے، انہوں نے سابقہ نظریہ قائم کرنے والے کی شہادت پر نظر نہیں کی؛ بلکہ ہر نظریہ کو عملی کسوٹی پر پرکھا ہے، اس طرح سابقہ نظریات کی اغلاط کی اصلاح کی گئی، یہ لوگ نہ صرف سابقہ نظریات کو جانچتے اور پرکھتے تھے؛ بلکہ خود نظریہ قائم کرتے اور اس کو تجربہ اور تحقیق کی کسوٹی پر رکھ کر اس کی حقانیت اور صداقت کو اجاگر کرتے۔

جن مسلمان سائنسدانوں کو اس فن میں مہارت تھی، ان میں جابر بن حیان، خوارزمی، رازی، حسن بن ہیثم، ابن النفیس سرفہرست ہیں۔

جابر بن حیان کہتا ہے: ''وَمِلَاکُ کَمَالِ ہٰذِہِ الصَّنْعَةِ الْعَمَلُ وَالتَّجْرِبَةُ، فَمَنْ لَمْ يُجَرِّبْ لَمْ يَظْفَرْ بِشَيْءٍ أَبَدًا'' (۱) اس صنعت کا کمال عمل اور تجربہ ہے، جو شخص تجربہ نہیں کرتا، وہ کچھ نہیں پاتا۔

(۱) کتاب التجربة: لابن حیان، ضمن مجموعة مصنفات فی علم الکیمیاء للحکیم جابر بن حیان، ۱۹۲۸

اپنی کتاب ''خواص کبیر'' میں کہتا ہے:

''إِنَّمَا نَذْكُرُ فِيْ هٰذِهِ الْكُتُبِ خَوَاصَّ مَا رَأَيْنَاهُ فَقَطْ دُوْنَ مَا سَمِعْنَاهُ، أَوْ قِيْلَ لَنَا، وَقَرَأْنَاهُ بَعْدَ أَنْ اِمْتَحَنَّاهُ وَجَرَّبْنَاهُ، فَمَا صَحَّ أَوْرَدْنَاهُ، وَمَا بَطَلَ رَفَضْنَاهُ، وَمَا اِسْتَخْرَجْنَاهُ نَحْنُ أَيْضًا قَايَسْنَاهُ عَلَى أَحْوَالِ هٰؤُلَاءِ الْقَوْمِ'' (۱)

''ہم نے ان کتابوں میں صرف ان چیزوں کے خواص کا تذکرہ کیا ہے جن کو ہم نے دیکھا ہے، نہ کہ صرف سنا ہے، یا ہم کو بتلایا گیا ہے یا ہم نے جس کو پڑھا ہے اس کے جانچ پڑتال کرنے اور تجربہ کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد، اس میں جو صحیح ہے اس کو ہم نے ذکر کیا ہے، اور جو غلط اور باطل ہے اس کو ہم نے ٹھکرادیا ہے، جس کو ہم نے استنباط کیا ہے اس کو بھی اس قوم کے احوال پر قیاس کیا ہے''۔

اس لئے جابر بن حیان وہ پہلا شخص شمار ہوتا ہے جس نے علمی طریقۂ کار میں تجربہ کو شامل کیا۔

اور ایک جگہ وہ کہتا ہے کہ:

''فَمَنْ كَانَ دَرِبًا كَانَ عَالِمًا حَقًّا، وَمَنْ لَمْ يَكُنْ دَرِبًا لَمْ يَكُنْ عَالِمًا، وَحَسْبُكَ بِالدُّرْبَةِ فِيْ جَمِيْعِ الصَّنَائِعِ أَنَّ الصَّانِعَ الدَّرِبَ يَحْذِقُ، وَغَيْرَ الدَّرِبِ يُعَطِّلُ''

''جو شخص تجربہ کرتا ہے وہ حقیقی عالم ہے اور جو شخص تجربہ نہیں کرتا وہ عالم ہی نہیں۔ تمام صناعات اور ایجادات میں یہ بات مسلّم ہے کہ تجربہ کرنے والا حاذق ہوتا ہے اور غیر مشاق بے کار رہتا ہے''۔

رازی دنیا کا پہلا طبیب ہے جس نے اس تجرباتی طریقہ کار کو اختیار کیا، چنانچہ اس

(۱) کتاب خواص الکبیر: ۲۳۲

نے دواؤں کو انسان پر استعمال کرنے سے پہلے جانوروں پر اس کا تجربہ کیا خصوصاً بندروں پر، یہ طریقۂ کار (بہت کم مدت سے) پوری دنیا میں اس وقت رائج ہے، چنانچہ وہ اس حوالہ سے کہتا ہے:

"عِنْدَمَا تَكُوْنُ الْوَاقِعَةُ الَّتِيْ تُوَاجِهُنَا مُتَعَارِضَةٌ مَعَ النَّظْرِيَّةِ السَّائِدَةِ يَجِبُ قُبُوْلُ الْوَاقِعَةِ ، حَتّٰى وَإِنْ أَخَذَ الْجَمِيْعِ بِالنَّظْرِيَّاتِ السَّائِدَةِ تَأْيِيْدًا لِمَشَاهِيْرِ الْعُلَمَاءِ" (۱)

''جب کوئی واقعہ یا حادثہ جس سے ہم کو واسطہ پڑتا ہے اور یہ لوگوں میں رائج نظریہ سے متعارض ہوتا ہے تو ہم اس واقعہ کو قبول کرتے ہیں، چاہے تمام لوگ مشاہیر علماء کی تائید میں اس نظریہ کی تائید نہ کریں''۔

اس سے پتہ چلا کہ بسا اوقات تمام لوگ بڑے اور مشہور علماء کے آراء سے متاثر ہوتے ہیں اور ان کے نظریات پر تکیہ کئے رہتے ہیں، کبھی تجربہ کسی نظریہ سے متعارض ہوتا ہے تو اس وقت نظریہ کو رد کرنا پڑتا ہے۔ اسی تجرباتی طریقہ کار کی وجہ سے ابن الہیثم، اقلیدس، بطلیموس کے نظریات کی علمی قدر ومنزلت کے باوجود ان کو تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔

اسی تجرباتی طریقہ کار کے ذریعہ انسان کو یہ پتہ چلتا ہے کہ حقیقت تک کیسے پہنچا جاسکتا ہے، صحیح اور درست حقیقتِ حال کیسے دریافت کی جاتی ہے؟

(۲) عملی طریقۂ کار

کسی بھی نظریہ کو عملی جامہ پہنانا اور اس کو عملی شکل دینا یہ بھی مسلمانوں کا ہی عظیم کارنامہ ہے۔

گذشتہ سائنسداں نت نئے نظریات قائم کرتے، اکثر وبیشتر یہ نظریات بالکل صحیح ہوتے؛ بلکہ ان کی صحت اور قوت کے باوجود یہ نظریات صرف کاغذی حد تک ہوتے، لیکن ان نظریات کی عملی تطبیق اور تنفیذ نہ ہوتی، اسی کو عملی طریقۂ کار کہتے ہیں، ان مختلف نظریات کو عملی جامہ پہنا کر اس کو انسان کے آرام وسہولت کے لئے مفید بنانا ضروری ہے۔

(۱) ابن ابی صبیعۃ: طبقات الأطباء: ۱/۷۷،۷۸

جب مسلمان بحیثیت دنیا کے معمار اور مصلح کے منظر عام پر آئے تو اس طرح مسلمان ہر پرانے نظریہ کو عملی جامہ پہنا کر اس کو لوگوں کے لئے مفید ذریعہ بنانے لگے۔

اس کی مثال موسیٰ بن شاکر کی اولاد کا سیرابی کے آلات اور پہاڑوں کی بلندیوں پر پہنچانے والے آلات کی ایجاد ہے، اسی طرح باریک اور نازک گھڑیوں کی ایجاد یہ ساری چیزیں قدیم نظریات کی اساس پر ہوئی ہیں، ہاں البتہ اسی میں انہوں نے کچھ اپنے نظریات کو بھی شامل کر کے مفید آلات کی ایجاد کی اور اس کے ذریعے لوگوں کو نفع پہنچایا۔

اسی طرح زہراوی نے کئی ایک آلاتِ جراحی ایجاد کی، مثلاً اسے نظریاتی طور یہ پتہ چلا کہ جب دواء براہِ راست خون سے لگتی ہے تو اس کا بجلد اثر ہوتا ہے، تو اس نظریہ کی وجہ سے اس نے حقنہ کی ایجاد کی، اس سے دواء بجلد خون تک پہنچائی جاتی ہے''(۱)

اسی طرح ابن بیطار نے اسی (۸۰) سے زیادہ دوائیں معرض وجود میں لائیں، ایسے ہی جابر بن حیان نے کیمیائی اشیاء کو ایسی چھتری کی ایجاد کے لئے استعمال کیا جو پانی سے متاثر نہیں ہوتی اور ایسے کاغذ بنائے جو اہم معلومات لکھنے کے لئے استعمال ہوتے ہیں اور اس پر آگ اثر نہیں کرتی۔(۲)

(۳) علمی امانتداری

علمی امانت داری کا اصول بھی ایک نیا اصول تھا جو اسلام کی آمد کے بعد ہی ظاہر ہوا ہے، دین اور اخلاق کے نہ ہونے کی وجہ سے صرف شہرت اور نفع کے حصول کے لئے مختلف ایجادات کو لوگوں نے اپنی جانب منسوب کیا۔

گرچہ علمی امانت داری کا تقاضا تو یہ تھا کہ کسی کے بھی فکری اور علمی حقوق کا تحفظ کا احترام کیا جاتا اور کسی بھی محنت اور جدوجہد اور ایجاد کو اسی کی جانب منسوب کیا جاتا ہے؛ لیکن مسلمان سائنسدانوں کی تحقیقات اور ایجادات کا بکثرت سرقہ کیا گیا اور اس کی نسبت

(۱) حضارۃ الإسلام وأثرها في الترقي العالمي: جلالی مظہر: ۲۳، ۳۳۲
(۲) حضارۃ العرب: ۴۷۵-۴۷۶

ان کے بہت بعد آنے والے یورپین سائنسدانوں کی طرف کردی گئی۔

اور یہ بات بھی کسی پر مخفی نہیں ہے کہ خون کی چھوٹی دوران (pulmonar circulation) کے محقق اور مفتش ابن النفیس کی اس تحقیق کو جس نے اسے نہایت باریک بینی کے ساتھ اپنی کتاب (شرح تشریح القانون) میں نوٹ کی تھی اور یہ بات بہت زمانے سے مخفی تھی ، اس کو بعد کے زمانے میں غلطی سے ایک انگریز ڈاکٹر ''وُلیام ہارفی'' کی جانب منسوب کیا گیا، جس نے خون کی دوران کی ابن النفیس کی وفات کے بعد تین صدیوں سے بھی زائد مدت گذرنے کے بعد دریافت کیا اور لوگوں کو دوران خون کی حقیقت معلوم کرنے والے کی حیثیت سے ابن النفیس کا نام معلوم نہ تھا ، پھر ڈاکٹر محی الدین التطاوی نے اس کا اکتشاف کیا۔

اسی طرح ایٹالی ڈاکٹر الباجو نے ۹۵۴ھ=۱۵۴۷م میں ابن النفیس کی (شرح تشریح القانون) کے کئی اقسام کا لاطینی ترجمہ کئے، ان ابحاث میں سے ایک بحث خون کی آنتوں سے متعلق تھی، ایک اسپین ڈاکٹر جس کا نام ''سرفیتوس'' تھا، یہ پیرس یونیورسٹی کا لکچرر تھا، اس کو الباجو کا ابن النفیس کی کتاب کا ترجمہ مل گیا، اس پروفیسر کو اس کے عقائد میں خلط ملط کی وجہ سے یونیورسٹی سے نکال دیا، اس کو اور اس کی کتابوں کو جلا دیا گیا، اس کی بعض کتابیں بغیر جلی ہوئی محفوظ رہیں، جن میں خون کی دوران کے متعلق ابن النفیس کی کتاب کا الباجو کا کیا ہوا ترجمہ بھی تھا، بعد کے لوگوں نے اس کتاب کے اس کے پاس موجود ہونے کی وجہ اس کتاب کی نسبت اس کی طرف کردی۔ کہ اس کا سہرا اس کے سر جاتا ہے پھر ہارفی کے سر، یہ خیال ۱۳۴۲ھ/ ۲۹۲۴ء تک قائم تھا یہاں تک کہ مصری طبیب ڈاکٹر محی الدی التطاوی نے اس وہم کو ختم کیا، انہوں نے شرح تشریح القانون پر برلن کے کتب خانہ میں ایک نسخہ پایا، اور اس سلسلے میں انہوں نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی حاصل۔(۱)

سماجی علم اور سوشل کی نسبت فرانسیسی یہودی ''دورکائم'' کی جانب کی گئی ہے، حالانکہ اس علم کے بانی اور موجد علامہ ابن خلدون ہیں۔

(۱) تطور الفکر العلمی عند المسلمین:۲۰۸، محمد صادق العضیلی

اسی طرح ''روجر بیکون'' کی کتاب ''cepus majus'' کی فصل خامس یہ صرف اور صرف ابن الہیثم کی کتاب المناظر کا حرف بحرف ترجمہ ہے، اس نے بغیر اس کو اس کے مؤلف کی جانب منسوب کئے ہوئے ترجمہ کیا ہے۔

مسلمانوں کے ساتھ یہ علمی خیانت بہت زیادہ ہوئی، لیکن مسلمانوں نے کبھی اس علمی خیانت کا ارتکاب نہیں کیا؛ بلکہ ہر تحقیق اور ایجاد کو اس کے حقیقی بانی اور موجد کی جانب ہی منسوب کیا۔ بلکہ مسلمان علماء اور سائنسدانوں اور محققین کی کتب گذشتہ فلسفیوں کے ناموں سے بھری پڑی ہیں،، جیسے بقراط، جالینوس، سقراط، ارسطو وغیرہ۔




مسلمان اطباء
اوران کے کارنامے

جس طرح مسلمان علماء اور اہلِ علم نے دیگر علوم وفنون کی آبیاری کی اور ان کو بامِ عروج تک پہونچایا، نت نئے ایجادات کے ذریعہ موجودہ سائنس کو ترقی کی راہ دکھائی، وہیں علمِ طب کے حوالے سے بھی ان کے کارنامے کچھ کم نہیں ہیں، اس علم وفن کے اس گوشہ، خدمتِ خلق کے اس پیشہ کو بھی انہوں نے اپنے تجربات، اپنی قلمی جولانیوں اور فکری توانائیوں کی آماجگاہ بنایا، خود مغربی مفکرین اور اطباء کو مسلمان اطباء کی عظیم خدمات اور اس فن کے بامِ عروج تک پہونچانے میں اس کے رول اور کردار کا اقرار اور اعتراف ہے۔

آج کل علمِ طب کی ہیئت وصورت کے مکمل طور پر بدل جانے کے باوجود اس علم طب کی اصل بنیاد گذشتہ مسلمان اطباء کی دواسازی اور علم طب سے متعلق وضع کردہ قواعد وضوابط پر ہی ہے۔ پیچیدہ اور دشوار گذار امراض کے لئے وہی گذشتہ اصول آج بھی نسخۂ کیمیا اور حرفِ آخر ہیں۔

خود مغربی علماء اور مفکرین کو مسلمانوں کے طب اور دواسازی کے میدان میں مسلمان علماء اور حکماء کے بلندیٔ مرتبت اور اس فن میں ان کے مقامِ بلند کا اعتراف ہے کہ اس فن کے ابتدائے بانی اور اس کی داغ بیل رکھنے والے مسلمان علماء ہی ہیں۔

برطانیہ انسائیکلوپیڈیا میں ہے جس کی عربی عبارت براہِ راست لکھی جارہی ہے:

"وَالْحَقُّ أَنَّ كَثِيْراً مِنْ أَسْمَاءِ الأَدْوِيَّةِ وَكَثِيْراً مِنْ مُرَكَّبَاتِهَا المعروفِ حتّٰى يومِنَا هَذَا، وَفِيْ الحقِيْقةِ المبْنِيِّ الْعَامِ لِلصَّيْدَلَةِ الحَدِيْثَةِ، فِيْمَا عَدَا التَّعدِيْلَاتِ

الكيمياويَّةِ الحدِيْثَةِ الحَالِ، قد بدَأَ العَرَبُ" (۱)

"حق تو یہ ہے کہ بہت ساری دواؤں کے نام اور اس کے بہت سے مشہور ومعروف مرکبات آج تک جس پر طب جدید کا اعتماد ہے سوائے چند کیمیاوی مشمولات کے، اس کی ابتداء عربوں نے ہی کی ہے"

اس تحریر کے اور مسلمان اطباء کے کارناموں اور ان کی طبی خدمات کے ذکر کے ذریعہ ایک تو مسلمانوں کی اس فن میں ان کی خدمات اور اس کو ترقی کی راہ دکھانے میں ان کے کردار کو اجاگر کرنا ہے اور دوسرے خود مسلمانوں کو یہ باور کرانا مقصود ہے کہ وہ مغرب کی مادی ترقیات اور نت نئے ایجادات اور طبی اور علمی میدان میں ان کی ترقی سے مرعوب اور حیران وششدر نہ ہوں؛ کیونکہ اس ساری ترقی کی بنیاد اور اس قافلہ کے سالار اول اور اس فن کے سرخیل مسلمان ہی رہے اور اس کی عمارت کی پہلی بنیاد اور داغ بیل مسلمانوں ہی نے رکھی ہے، ہاں اس کے ساتھ یہ پیشِ نظر رہے کہ ان علماء اور اطباء نے جہاں اس فنِ طب کی خدمت کو اپنا پیشہ بنایا اور اس میں کامل مہارت اور حذاقت کے ذریعہ تاریخ کے صفحات میں اپنے نام درج کروائے ہیں، وہیں اس کے ساتھ ان کا خاص وصف یہ بھی رہا ہے کہ انہوں نے اپنے دین وایمان کے ساتھ سودا کبھی گوارا نہیں کیا، اور اپنے دین ومذہب کے ساتھ ان کا لگاؤ اور تعلق ہر قدم پر قائم رہا۔

مسلمانوں میں یونانی طب کا رواج حکمائے یونان کی ان کتابوں سے ہوا جو یونانی یا سریانی زبان سے عربی میں ترجمہ کی گئی، مترجمین عیسائی، یہودی یا صابی تھے، ان میں "یوحنا بن ماسویہ" (المتوفی ۸۵۷ء) حنین بن اسحاق (المتوفی ۸۷۷ء) اور قسطا بن لوقا (المتوفی: ۹۰۰ء) خاص طور پر مشہور ہیں، حنین بن اسحاق کے اہل خاندان اور ان کے رفقاء تلامذہ نے طب یونانی کو عربی جامہ پہنانے میں اہم رول ادا کیا، ان کے نوے شاگرد بغداد کے بیت الحکمۃ میں ترجمے کا کام کرتے تھے، حنین نے فلسفہ اور طب سے متعلق جالینوس کی کتابوں کے ایک سو سریانی اور انتالیس عربی ترجمے کئے، ان کے فرزند

(۱) أحكام الأدوية في الشريعة الاسلامية، ص: ۱۴۵

اسحاق (المتوفی: ۹۱۰ء) اور بھتیجے حبیش نے ساٹھ کتابوں کو عربی اور تیرہ کو سریانی میں منتقل کیا، یوحنا ابن ماسویہ نے متعدد کتابوں کے ترجمے کئے، نویں صدی کے آغاز میں سائنسی موضوعات میں سریانی زبان عربی کے مقابلے میں مالا مال تھی، مگر ترجمے کا کام اس سرعت سے جاری رہا کہ صدی کے اختتام تک عربی زبان سریانی کو پیچھے چھوڑ گئی۔

(۱) خالد بن یزید (۸۵ھ)

علوم وفنون کا شیدا خالد بن یزید حضرت امیر معاویہ کا پوتا تھا، جس کو دیگر علوم وفنون کے ساتھ علم طب سے خصوصی دلچسپی اور لگاؤ تھا، اس کے علوم وفنون کے ساتھ لگاؤ کا اندازہ اس طرح لگایا جا سکتا ہے کہ شاہی خاندان کے فرد ہونے اور جس دور میں بنی امیہ میں خلافت اور حکمرانی کے لئے رسہ کشی اور خلفشار برپا تھا، تمام شاہی کروفر اور تصنع سے دور علوم وفنون کی آبیاری اور خدمت کے لئے وقف ہو گیا تھا۔

علمی کارنامے

اس کے علمی کارناموں میں سب سے برتر اور بلند تر کارنامہ یہ ہے کہ اس نے نت نئے علوم وایجادات، طب، سائنس سمیت مختلف علوم کے ماہرین کو اپنے یہاں جمع کیا، قدیم یونانی اور قطبی زبانوں کی مشہور زمانہ کتابوں کے عربی میں ترجمہ کرائے، گرچہ اس کی شہرت بحیثیت کیمیاداں زیادہ ہوئی، حالانکہ ابن ندیم (۱) اور ابن خلکان (۲/ ۲۲۴) دونوں کے بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ خالد کی طب کے تعلق سے معلومات بھی کافی وسیع تھیں۔

بہر حال اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے ہی قدیم علمی کتابوں کے ترجموں کا آغاز کیا، اس کی نگرانی میں طب سے متعلق جن کتابوں کا ترجمہ ہوا ان میں "کتاب الحرارت"، "کتاب الصحیفۃ الکبیر"، "کتاب الصحیفۃ الصغیر" وغیرہ شامل ہیں (۲)

(۱) کتاب الفہرست، ص: ۳۵۴ (۲) دیکھئے تاریخ الطب: حکیم سید محمد حسان نگرامی

مذہبی رنگ اور دین سے وابستگی

اس نے نہایت نیک طینت اور صالح طبیعت پائی تھی، شاہی خاندان کا فرد اور رکن رکین ہونے کے باوجود شاہی تکلفات سے ہمیشہ دور ہی رہا، فن طب اور کیمیاء میں کامل مہارت کے ساتھ دینی علوم میں بھی کمال حاصل کیا۔

(۲) جابر بن حیان (۱۹۸ھ = ۸۱۷ء)

جابر بن حیان فن کیمیاء کا باوا آدم تسلیم کیا جاتا ہے، اسے سونا بنانے کی عجیب دھن تھی، جس نے اسے علم کیمیاء پر تجربات کروائے۔

اس کی پیدائش ۱۲۰ھ مطابق ۷۳۷ء میں ہوئی، یہ ایک غریب گھرانے کا فرد تھا، باپ عطار (دوائی فروخت کرنے والا) تھا، تربیت کا سارا بوجھ ماں پر آن پڑا، بچپن میں کوفہ اپنے رشتہ داروں کے پاس بھیج دیا گیا، سن شعور کو پہنچا تو کوفہ کے علمی ماحول سے متاثر ہوا، اور مدرسہ کی مروجہ تعلیم حاصل کی، اس کی کھوجی طبیعت نے اسے کیمیاداں بنادیا۔ (CHEMISTRY)

علمی خدمات اور کارنامے

۱۔ عمل تصعید یعنی دوا کا جوہر اڑانا (SUBLIMATION) اس طریقہ کو سب سے پہلے اسی جابر نے اختیار کیا، تاکہ لطیف اجزاء کو حاصل کر کے دواؤں کو مزید مؤثر بنایا جا سکے۔

۲۔ جابر نے قلماؤ کرنے (CRYSTALLISTION) کا طریقہ دریافت کیا اور اس نئے طریقہ سے دواؤں کو قلمایا۔

۳۔ جابر نے دھات کو بھسم کر کے کشتہ بنانے (OXIDISATION) کا نازک طریقہ دریافت کیا، کسی دھات کو جڑی بوٹیوں کے ساتھ کس طرح آنچ دے کر بھسم کرتے ہیں، اس میں صحیح اندازے اور تجربے کی ضرورت ہوتی ہے۔

۴۔ جابر کی ایک بڑی اور مفید ایجاد قرع انبیق ہے (DISTILLATION

(APPARATUS

(۳) ابوالحسن علی بن سَہَل رَبَّن طبری (۲۵۱ھ=۸۷۰ھ)

یہ فن طب کا ماہر تھا، اس نے اس فن کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی، پھر بغداد کے جملہ اسپتالوں کا نگراں مقرر ہوا، یہ مرو کا باشندہ تھا، اسکے والد قابل طبیب تھے، وہ بغداد آکر مقیم ہوگیا، اس نے بغداد کے دستور کے مطابق درس دینا شروع کیا، چونکہ وہ کامل مہارت رکھتا تھا، اس لئے اس کے یہاں فن طب کے طلبہ کا ہجوم ہوگیا علی بن سہل کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ فن طب کا مشہورِ دنیا طبیب زکریا رازی کا استاذ ہے۔

علمی خدمات اور کارنامے

علی بن سہل ایک روشن دماغ اور باکمال طبیب تھا، اس کی اس طبی مہارت کی وجہ سے سرکاری اسپتالوں کا نگراں مقرر کیا گیا، اس طرح اسے بے شمار مریضوں کے علاج ومعالجہ کا موقع ملا اور اس نے خوب تجربات حاصل کئے، اور علاج کے نت نئے طریقے ایجاد کئے اور اپنے ان تجربات اور مجربات کو ڈائری میں نوٹ کرتا رہا، پھر اس کو مرتب کر کے کتابی شکل دی اور اس کا نام ’’**فردوس الحکمت**‘‘ رکھا۔

یہ کتاب ابجد کے اصولوں پر مرتب کی گئی ہے جیسا کہ آج کل انسائیکلوپیڈیا کا طرز ہے، عربی زبان میں اس قدر محیط اور جامع کتاب نہیں لکھی گئی، اس کتاب میں بیشتر طبی مباحث کا ذکر ہے۔

اس میں اس نے دماغ، دردسر، دوران سر (vertigo) نسیان (Amnesia) ڈراؤنا خواب (Nightmare) کزاز (Tetanus) تشنج (Spasm) فالج، دمہ، امراض صدر، ناک، کان اور حلق کے امراض، پھیپھڑوں کے بیماریاں، جنسی امراض، سرطان، نقرس (Gout) عرق النساء (Sciatica) گھٹیا (Rheumatism) جذام، گنگرین (Gangrene) امراضِ چشم، امراضِ معدہ، ہچکی (Hiccough) استسقاء (Dropsy) طحال اور پتے کی بیماریاں، ذات الجنب

(Pleurisy) چیچک، فیل یا (Elepnantiasis) طاعون (Plague) آکلہ (lupus) سرخبادہ (Erysipelas) وغیرہ

اور ایک کتاب ’’دین ودولت‘‘ اس قابل مصنف نے مرتب کی جو اخلاقی تعلیم اور معلومات کا قابلِ قدر ذخیرہ ہے۔

مذہبی رنگ ومزاج

حقیقت یہ ہے کہ علی بن ربن سہل انسائیکلوپیڈیا کا موجد، حفظِ صحت کے اصول اور احتیاط کے قاعدے بتانے والا طبیب حاذق، علم الاخلاق کا مالک، سماجی زندگی کو عمدہ طریقہ سے فروغ دینے والا اور دین ودولت کو توازن کے ساتھ لے کر چلنے والا معلم اور عظیم شخصیت کا مالک تھا۔ اس کا بڑا کارنامہ طبی انسائیکلوپیڈیا ہے۔

(۴) ابوحنیفہ دینوری (م ۱۸۹۴ ۸۹۵ء)

یعقوب الکندی (م ۸۷۳ء) اور ابن ربن طبری (م ۸۵۰ء) کے زمانہ حیات میں ہی ایک اور کوہ قامت علمی شخصیت پیدا ہوئی جو الکندی ہی طرح ہمہ جہت تھی، وہ شخصیت ابوحنیفہ دینوری کی تھی، وہ مورخ بھی تھی، ریاضی داں بھی، ماہر فلکیات بھی اور جغرافیہ داں بھی، وہ مفسر قرآن بھی تھے، قرآن کی تفسیر انہوں نے تیرہ جلدوں میں لکھی، ان سب علوم کے ساتھ ساتھ وہ ماہر نباتات بھی تھے، ہم ان صفحات میں صرف ان کی ماہر نباتیات کی حیثیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کریں گے کیوں کہ نباتات کا علم الادویۃ کے ساتھ نہایت گہرا تعلق ہے۔

ابوحنیفہ دینوری کا پورا نام ابوحنیفہ احمد بن داؤد بن الدینوری تھا، وہ فارسی الاصل تھا، جارج سارٹن کے مطابق وہ ۵۱۵ تا ۳۵ عیسوی بمطابق ۲۰۰ تا ۲۱۰ ہجری عراق کے قصبہ دینور میں پیدا ہوئے اور ۸۹۵ء مطابق ۲۸۲ھ میں وفات پائی۔

دینوری کی ایک کتاب ’’کتاب النبات‘‘ کی اہمیت مسلم ہے، اس میں ۱۱۲۰ پودوں کی خاصیات کو بیان کیا گیا ہے۔

اس کتاب کے اوراق جگہ جگہ سے دستیاب ہوئے ، ڈاکٹر حمید اللہ کو اس کے چالیس صفحات ۱۹۷۴ء میں مدینہ منورہ میں دستیاب ہوئے ،ڈاکٹر برن ہارڈ لیون کو اس کا ایک زیادہ ضخیم مگر بھی نامکمل نسخہ ۱۹۴۸ء میں استنبول میں دستیاب ہوا، ان دونوں کو جوڑ کر اور مزید اوراق کو اور جگہوں سے دستیاب ہوئے ہوں گے، ''کتاب النبات'' کا نسخہ مکمل ہوا، ڈاکٹر حمید اللہ نے اسے جدید طرز پر مرتب کیا جو عربی زبان میں ہے، اس کا تعارف انہوں نے انگریزی میں لکھا ہے۔

کتاب النبات میں پودوں کے بیان کو حروف تہجی کے ترتیب کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے، اور ہر پودے کے بارے میں اس زمانے تک جتنی معلومات دستیاب تھیں وہ سب بیان کر دی گئی ہیں کہ کوئی پودا اپنی نشو ونما کے آغاز سے اپنی طبعی عمر کے اختتام تک کن کن مرحلوں سے گذرتا ہے، اس میں پھول کب کھلتے ہیں، اس کے پھل کس قسم کے ہوتے ہیں۔

معروف پودوں میں گند، جو، انگور، کھجور، آٹے والے اناج ، چمڑا رنگنے والے پودے، خضاب کے کام آنے والے پودے، چقماق (Flint) کے طور پر استعمال ہونے والے درخت ،مسواک والے درخت، ریشہ دار چھال والے درخت جن سے رسیاں بنائی جاتی ہیں اور دیگر اقسام کے پودوں کے بارے میں مختلف النوع معلومات یکجا کرنے کے علاوہ معلومات کی ایک اور قسم جو دینوری نے یکجا کر دی ہے اور علم الادویہ کیا ساتھ اس تعلق کو قائم کرتی ہے، وہ ادویاتی اہمیت کے پودوں کے بارے میں ادویاتی معلومات ہیں۔(۱)

(۵) علی بن عبّاس مجوسیؒ (م ۳۸۴ھ)

طب یونانی جب اپنے عربی واسلامی دور میں نقل وترجمہ سے آگے بڑھ کر تصنیف وتالیف کے مرحلے میں داخل ہوئی، تو اسکو جن اطباء نے اسے پروان چڑھایا اور اپنی

(۱) دنیائے اسلام میں سائنس وطب کا عروج: ۱۲۶، ڈاکٹر حفیظ الرحمن الصدیقی، اریب پبلیکیشنز، دہلی

گراں قدر تصنیفات کے ذریعہ تاریخ میں گہرے نقوش چھوڑے، ان میں ایک نمایاں نام ''الکتاب الملکی کامل الصناعة الطبیة'' کے مصنف علی بن عباس کا بھی ہے، بعض مؤرخین نے اسے عظیم اسلامی اطباء میں شمار کیا ہے اور اسکی تصنیف کو ''طبی انسائیکلو پیڈیا'' قرار دیتے ہوئے اسے محمد بن زکریا رازی کی کتاب ''کتاب الحاوی'' اور بوعلی سینا کی کتاب ''القانون فی الطب'' سے بعض اعتبارات سے بہتر قرار دیا ہے۔

علی بن عباس المجوسی کے حسب ونسب، تاریخِ پیدائش اور ابتدائی حالاتِ زندگی پر کوئی روشنی نہیں ملی ، حاجی خلیفہ نے وفات ہجری ۳۸۴ھ اور جارج سارٹن نے عیسوی ۹۹۴ء تحریر کیا ہے۔

پروفیسر براؤن نے ان کو مسلمان کہا ہے، مجوسی اس کی نسبتِ اسمی سے ظاہر ہے کہ اس کا باپ یا دادا ان کے قدیم زرتشتی مذہب کا پیرو تھا، واندیک امریکائی نے اپنی کتاب ''اکتفاء القنوع بما هو المطبوع'' میں علی بن عباس کا لقب علاء الدین بیان کیا ہے، اور ظاہر ہے کہ اس قسم کے القاب مخصوص بالاسلام ہیں۔

علمی خدمات اور کارنامے

علی بن عباس نے اپنے استاذ ابو ماہر موسیٰ بن سیار سے کسبِ فیض کرنے کے علاوہ خود بھی تحصیلِ علم میں محنت کی اور فنِ طب میں مہارت اور درک پیدا کرلیا، ابن ابی صبیعہ نے تحریر کیا ہے کہ '' وہ ماہر طبیب تھا، فن طب میں اسے امتیازی حیثیت حاصل تھی، تاریخِ طب میں متعدد باتوں کی تحقیق وایجاد کا سہرا علی بن عباس عباسی کے سر جاتا ہے۔

۱۔ وہ پہلا طبیب ہے جس نے شرائین واوردہ کے درمیان عروقِ شعریہ کا جال ہونے کا تصور دیا۔

۲۔ پہلا طبیب ہے جس نے ریٔوی سل کو عسیر العلاج مرض قرار دیا اور اس کا سبب پھیپڑے کی مسلسل حرکت بتلایا۔

۳۔ اس نے احتباس بول کی صورت میں قاثاطیرہ CATHAER کے ذریعہ

پیشاب جاری کرنے کا طریقہ بتلایا۔

۴۔ اس نے سب سے پہلے یہ بتلایا کہ وضعِ حمل کے دوران بچہ خود باہر نہیں آتا، بلکہ رحم اپنی حرکت کے ذریعہ اسے باہر ڈھکیلتا ہے۔

۵۔ اس نے اپنی کتاب میں بہت سے دلچسپ سریریاتی مشاہدات بیان کئے ہیں۔

۶۔ اس نے اطباء پر برابر اسپتالوں میں حاضری دینے اور وہاں داخل مریضوں کا معائنہ کرنے اوران کے ذریعے تجربہ حاصل کرنے پرزور دیا۔

اس کی مذکورہ بالا تصنیف کی حیثیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ابن سینا نے اس کے بارے میں کہا ہے کہ ''اگر'' کامل الصناعۃ'' پہلے میری نظر سے گزری ہوتی تو مجھے ''القانون'' لکھنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔

کتاب الملکی میں طب عملی، علم تشریح، علم جراحت وغیرہ پر گفتگو کی گئی ہے، نیز مصنف نے اس میں یونانی، شامی اور مسلم اطباء پر نقد وتبصرہ کیا ہے، کتاب میں بیس مقالے ہیں اور تقریباً چار لاکھ الفاظ ہیں، کتاب لاطینی میں دومرتبہ ترجمہ ہوا، پہلا ترجمہ لاطینی میں اسٹیفن انطا کی نے ۱۱۲۷ء میں کیا تھا۔

سارٹن نے علی بن عباس کو ممبرا اسلام کے عظیم ترین اطباء میں شمار کیا ہے:

Ali ibn abbas(Haly abbas)who flourished a little later, was one of the greatest physicians of Islam(۱)

''علی بن عباس جو ذرا بعد میں مشہور ہوئے ہیں اسلام کے عظیم ترین اطباء میں سے ایک تھے''۔

موصوف نے ان کو مشرقی خلافت کے تین عظیم ترین اطباء میں سے ایک مانا ہے اور باقی دو رازی اور ابن سینا ہیں۔

المجوسی نے ۹۹۴ء میں شیراز میں وفات پائی۔

(۱) p.677introduction to the histry of science vol.1

علی بن اسحاق مجوسی کی حذاقت اور مہارت

علی بن اسحاق المجوسی کے پاس ایک مزدور آیا جس کو دردِ سر کی شکایت رہتی تھی، مجوسی نے اس مریض کا عجیب علاج کیا، اس نے مریض کے سر پر کئی مرتبہ چوٹ پہنچائی جس سے نکسیر کی شکل میں خون جاری ہوگیا اور مادۂ فاسدہ جو اس مرض کا سبب تھا خون کے ساتھ خارج ہوگیا، اس عمل سے مریض کو بہت سکون ہوا اور اس کا دردِ سر ہمیشہ کے لئے دور ہوگیا۔

(۶) ابو یوسف یعقوب بن اسحاق کندی (۲۵۴ھ/ ۸۷۳ء)

یعقوب کندی علم ہیئت اور نجوم کا ماہر، علم الاعداد اور اسکی خاصیتوں پر تحقیق کرنے والا پہلا محقق، ماہر ریاضی اور روشنی پر تحقیق کرنے والا اعظیم دانشور تھا۔

یعقوب کندی کے والد خلیفہ مہدی اور ہارون رشید کے عہد میں کوفہ کے امیر تھے، یعقوب کے آباء واجداد اگر چہ طبقۂ امراء سے تعلق رکھتے تھے اور یعقوب کی پرورش اور تربیت بھی شاہانہ ماحول میں ہوئی تھی، مگر اسے علم وفن سے فطری لگاؤ اور کمالِ شغف تھا، وہ دولت وثروت اور سیاسی زندگی کے طمطراق کے بالکل قریب نہیں گیا۔

وہ شاہانہ زندگی کو چھوڑ کر علمی زندگی کو اختیار کیا اور علمی وفنی کتابوں کے مطالعہ میں مصروف ہوگیا۔

علمی خدمات اور کارنامے

یعقوب علمِ ہیئت کا ماہر اور علمِ نجوم کا قابل تھا اس نے اپنے کمالات فن کا بار بار ثبوت دیا، وہ باکمال طبیب بھی تھا، علم ادویہ کے موضوع پر اس نے گہرا مطالعہ کیا، نئی نئی جڑی بوٹیوں کو تلاش کر کے اس پر تجربہ کئے، ان کی خاصیتوں اور اثرات کو صحیح صحیح معلوم کیا اور پھر ان کی درجہ بندی کی، پھر دواؤں کے استعمال میں وزن کا تعین یہ یعقوب کے زبردست کارنامے سمجھے جاتے ہیں۔

جارج فارٹن بھی اس خیال سے متفق ہے کہ مسلمانوں میں وہ پہلا فلسفی تھا، یونانی

فلسفے اور سائنس کا گہرا علم رکھتا تھا، فلسفہ میں وہ نو افلاطونیت کا مقلد تھا، اس کے زمانے میں کیمیا گری یعنی سونا بنانے کی کوشش سے دلچسپی عام تھی، مگر الکندی اسے سعی لا حاصل سمجھتا تھا۔

اس نے علمِ طب کے سلسلے میں بے شمار کتابیں لکھیں، اس کے شاگرد اس کی کتابوں کے نقل کرنے اور مسودات کے صاف کرنے پر مشغول رہتے تھے، "کتاب الطب البقراطی"، "کتاب فی الغذاء والدواء"، "کتاب تدبیر الاصحاء"، "کتاب فی القرابادین"، "کتاب الادویہ"، "فساد الأخلاط"، "کتاب فی الباہ" یہ اس کی طب سے متعلق کتابیں ہیں، ان میں بعض کتابوں "قرابادین" اور "کتاب فی الباہ" کے مخطوطے آج بھی صوفیا لائبریری میں موجود ہیں۔

(۷) ثابت بن قرّہ حرّانی (۲۷۳ھ/۹۰۱ء)

ثابت حران کا باشندہ تھا، حران شمالی عراق میں ایک مردم خیز علاقہ تھا، ولادت مقامِ حران میں ۲۱۱ھ میں ہوئی۔

اس کا آبائی پیشہ صرافی تھا، ثابت نے تعلیم اپنے وطن میں حاصل کی اور ذہانت سے اپنی قابلیت میں اضافہ کیا، یہ فن طب میں علم تشریح الابدان میں باکمال فلسفی اور طبیب تھا، ساتھ ہی ساتھ علم ہیئت کا ماہر بھی تھا۔

علمی خدمات، مہارت اور کارنامے

بغداد میں ثابت بن قرہ نے محمد بن موسی شاکر کے قائم کردہ علمی ادارے میں کئی بیش قیمت کام کئے، کئی زبانیں جانتا تھا، اعلیٰ درجہ کا مترجم تھا۔

ثابت کے لئے بے شمار طبی علاج سے متعلق واقعات مشہور تھے، ایک واقعہ ہے کہ دربارِ خلافت جارہا تھا، بازار سے شور اٹھا کہ قصاب اچانک فوت ہوگیا، ثابت بن قرہ نے کہا: مرا نہیں، لوگ حیرت زدہ ہوگئے، ادھر اس کی نعش کو غسل دینے کی تیاری ہورہی تھی، ثابت نے نبض دیکھی اور ملازم سے قصاب کے پیروں پر ضرب مارنے کو کہا، پانی منگا

کر کوئی دوا ڈالی اور حریرہ تیار کر کے اس کو پلایا، قصاب نے آنکھیں کھول دیں، خلیفہ نے اس واقعہ کا طبی پہلو دریافت کیا تو ثابت نے بتایا کہ روزانہ میں جب راستہ سے گذرتا تھا تو دیکھتا تھا کہ قصاب کلیجی کے پارچے پر نمک چھڑک کر کھایا کرتا تھا، اس کی یہ نازیبا حرکت مجھے ناپسند تھی، اور یہ یقین ہوگیا کہ ایک دن سکتہ کا مرض اس کو لاحق ہوگا، چنانچہ خبر پاتے ہی میں نے سمجھ لیا اور قصاب کا علاج سکتے کے مرض کا کیا۔ اب وہ کل سے حسبِ دستور اپنا کام کرے گا۔

ثابت نے ۷۷ رسال کی عمر پا کر ۲۸۸ھ میں وفات پائی۔

ثابت کے حکیمانہ اقوال

ثابت کے درج ذیل حکیمانہ اقوال بھی اس کی فنی مہارت اور دینی مزاج کا پتہ دیتے ہیں۔

بوڑھے آدمی کے پاس اچھا باورچی اور خوبصورت کنیز مت رکھو، کیوں کہ اچھا کھانا زیادہ کھا کر بیمار ہوگا اور کنیز اچھی ہوگی تو کمزوری زیادہ ہوگی۔

بغداد کے مشہور ریاضی دان ثابت ابن قرۃ (متوفی ۹۰۱ء) amicable numbers تلاش کرنے کے لئے ایک منفرد فارمولا دریافت کیا تھا، عجیب بات یہ ہے کہ سات سو سال بعد فرانس کے ممتاز ریاضی داں پیئر فیرمٹ (۱۶۰۱-۶۵) نے ثابت ابن قرہ کے عین فارمولے سے ملتے جلتے کو استعمال کر کے second pair of amicable number دریافت کئے، مگر آف کورس اس کا کریڈٹ کسی اور کو نہ دیا۔

(۸) ابوبکر محمد زکریا رازی (۳۰۸ھ=۹۳۲ء)

بقراطِ زماں، جالینوس العرب ابوبکر محمد بن زکریا رازی ایران کے بے حد مردم خیز شہر "رے" میں ۱۷/اگست ۸۶۰ء میں پیدا ہوا، یہ شہر ایران کے موجودہ پایہ تخت طہران سے چند میل کے فاصلے پر واقع ہے، اسی نسبت سے اسے عربی میں رازی اور لاطینی زبان میں ریزر rhazar کے نام سے اس کی شہرت ہوتی ہے۔

لڑکپن لا ابالی اور عود کا بجانا وغیرہ جیسے مشاغل میں گذرا، جب شادی ہوئی اور فکر معاش پیدا ہوئی تو کیمیا گری کی طرف متوجہ ہوا، کیمیا گری میں بھٹی کے کاموں سے آشوبِ چشم کا شکار ہوا پھر اڑتیس سال کی عمر میں وطن سے نکل کر تلاشِ علم کی جستجو میں بغداد پہونچا، وہاں علی بن سہل وغیرہ کے حلقہ درس میں شامل ہوا، اسپتالوں کا نگراں مقرر ہوا، مریضوں کو بڑی توجہ سے دیکھتا، بڑا سخی اور غریبوں کا ہمدرد واقع ہوا تھا، اکثر دوائیں، پرہیزی کھانے اپنی جانب سے مہیا کرتا، قیام کا نظم کرتا۔

علمی خدمات اور کارنامے

ابوبکر محمد بن رازی نے فن طب کو نہایت بامِ عروج تک پہنچایا، اس نے سرکاری اسپتالوں کے نظام میں اصول اور ضابطے قائم کئے، اور مختلف شعبوں میں باقاعدہ طبی سہولیات کو رائج کیا، دواؤں پر تحقیق مشاہدہ کے لئے باقاعدہ شعبہ جات قائم کیا، شفاخانوں میں ابتدائی طبی امداد (first aid) کا طریقہ پہلی مرتبہ ایجاد کیا۔

حکومتِ وقت ایک شہر میں نیا اسپتال قائم کرنا چاہتی تھی، چنانچہ رازی نے گوشت کے بڑے بڑے مختلف مقامات پر مناسب جگہوں پر آویزاں کروائے، اطباء کی ایک جماعت نے ان گوشت کے ٹکڑوں کا کئی روز مشاہدہ کر کے ان پر ہونے والے اثرات کی رپورٹ تیار کیا، جس مقام کا گوشت بہتر حالت پر باقی تھا وہیں اسپتال قائم کیا گیا۔

رازی نے دواؤں کے صحیح صحیح وزن کے لئے ’’میزانِ طبی‘‘ ایجاد کیا، میزانِ طبی (hydrostatale -balance) سے چھوٹی چھوٹی شئی کا وزن صحیح معلوم کیا جاتا ہے، یہ ترازو آج کل سائنس روم میں استعمال ہوتا ہے۔

رازی کا سب سے بڑا کارنامہ چیچک پر تحقیق ہے، یہ موذی مرض انتہائی خطرناک اور لاعلاج تھا، چیچک کے اسباب، احتیاط اور علاج دریافت کر کے تفصیل سے اس مرض پر کتاب تصنیف کی جو اس موضوع پر پہلی کتاب تھی، اور یورپ میں صدیوں پڑھائی جاتی رہی۔ اس کتاب کا نام ’’ کتاب الجدری والحصبة ‘‘ تھا، بیوبرگر کے الفاظ میں یہ رسالہ عربوں کے طبی لٹریچر میں ایک زیور کی حیثیت رکھتا ہے اور اپنی اہمیت کے لحاظ سے

اس کا بہت بڑا درجہ ہے، موصوف کے بقول وبائی امراض کی تاریخ میں یہ سب سے پہلی کتاب ہے، جو ہمیں بتاتی ہے کہ رازی بڑے روشن ضمیر اور ذی ہوش طبیب تھے، سارٹن نے اس رسالے کو مسلم طب کا شاہکار مانا ہے، ول دوران اس کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> His treatise on small pox and measles was a master piece of direct observation and clinical analysis it was the first accurate study of infectious disease, the effort to distinguish the two ailments. we may judge its influence and repute by forty English editions between 1498 and 1866 (1)

’’چیچک اور خسرے کے موضوع پر ان کا رسالہ براہِ راست معائنے اور کلینکل تجزیئے کا ایک شاہکار ہے، یہ لگنے والی بیماریوں کا پہلا باقاعدہ مطالعہ اور دو بیماریوں میں فرق کرنے کی پہلی کوشش ہے، ہم اس کے اثرات اور شہرت کا اندازہ ان چالیس انگریزی ایڈیشنوں سے کر سکتے ہیں جو ۱۴۹۸ء اور ۱۸۶۶ء کے درمیان نکلے‘‘

رازی نے عملِ جراحی میں ایک کارآمد آلہ بنایا جس کو نشتر setion کہتے ہیں، رازی الکحل کا موجد تھا۔ ایک کتاب اس نے گردے اور مثانے کی پتھری پر تصنیف کی، جو یورپ میں مقبول ہوئی اور عربی متن کے ساتھ فرانسیسی ترجمہ ۱۸۹۶ء میں شائع ہوا۔

پیچیدہ امراض کے علاج کا صحیح طریقہ تجویز کرنا اس کے علم کا کمال تھا۔

ایک بار ایک رئیس زادے کو تھوک کے ساتھ خون آنے کا مرض لاحق ہوا، متعدد

(۱) p.677introduction to the histry of science vol.1

اطباء کا علاج کارگر نہ ہوا، تو رازی کو رجوع کیا، نبض وقارورہ دیکھ کر حیران ہوا کہ سل دق یا کسی ایسے مرض کی علامت نہیں، رئیس زادے کے حالاتِ سفر اور پانی پینے کے متعلق معلومات سے اس نتیجہ پر پہنچا کہ پانی کے ساتھ جونک پی لیا تھا، جو آنتوں کو زخمی کر رہی ہے، علاج کیا اور رئیس زادہ شفایاب ہوا۔

رازی علاج بالغذاء کا حامی تھا، اس کا قول تھا کہ جب تک علاج غذاؤں سے ممکن ہو دواؤں کا استعمال نہیں کرنا چاہئے۔

فن طب پر اس کی کتابیں تقریباً سو ہیں۔

اس عظیم طبیب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ’’فن طب مردہ ہوگیا تھا جالینوس نے اسے زندہ کیا، وہ منتشر اور پراگندہ تھا رازی نے اس کو مرتب کرکے ایک شیرازے میں منسلک کردیا، وہ ناقص تھا، اسے کامل کیا۔

رازی کی مشہور ترین کتاب ’’الحاوی‘‘ ہے، جو اس کے تجربات، خیالات اور نظریات کا نچوڑ ہے، دوسری کتاب اس کی ’’المنصوری‘‘ ہے، بہت سی کتابیں مختلف موضوعات پر ہیں، اکثر کتابوں کا ترجمہ یورپ کی مختلف زبانوں میں ہوچکا ہے۔

رازی نے مختلف موضوعات پر تقریباً دوسو پچاس سے زائد کتابیں یادگار چھوڑیں، جن میں آدھی کتابیں طب پر ہیں، طبی تصانیف ’’الحاوی، کتاب الطب المنصوری، کتاب الجدری والحصبۃ‘‘ بہت مشہور ہیں۔

رازی کی مشہور زمانہ کتاب ’’الحاوی‘‘ جو فن طب کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے، اس کا لاطینی ترجمہ صدیوں تک یورپ میں داخل نصاب رہا، لاطینی ترجمہ چارلس اول انجو کے عہد میں ایک یہودی عالم فرج بن سالم جیسے یورپ میں (Farragut) کہتے ہیں، نے کیا، اس کا ترجمہ ۱۲۷۹ء میں مکمل ہوگیا، لاطینی میں الحاوی کا نام (liber continents)۔

ول دوران لکھتے ہیں:

Translated into latin liber continents, it

was probably most highly respected and freguently used medical textbook in the world for centuries, it was one of the main book that composed the whole liberary of the medical at the unversity of paris in 1395)(۱)

’’اس کا لاطینی ترجمہ (liber continents) کے عنوان سے شائع ہوا یہ غالباً سفید دنیا میں صدیوں تک سب سے محترم اور سب سے زیادہ مطالعہ کی جانے والی نصابی کتاب بنی رہی، ۱۳۹۵ء میو پیرس کی یونیورسٹی کی میڈیکل فیکلٹی ساری لائبریری میں کل نو کتابیں تھیں، جن میں ایک کتاب یہ تھی‘‘

الحاوی کا لاطینی ترجمہ پچیس جلدوں پر مشتمل ہے، یہ کتاب پہلی بار ۱۴۸۶ء میں شائع ہوئی، کتاب ضخیم اور دام زیادہ تھے، مگر اس کی مقبولیت کا عالم یہ رہا کہ ۱۵۴۲ء میں اس کا پندرھواں ایڈیشن نکلا، کتاب کے مختلف حصوں کے جو ترجمے مختلف وقتوں میں ہوئے وہ ان میں شامل نہیں۔

رازی کی ایک بلند پایہ ضخیم کتاب ’’المنصوری‘‘ ہے جو دس جلدوں میں ہے، یہ کتاب انہوں نے امیر خراسان منصور بن اسحاق کے لئے لکھی تھی اور یہی وجہ تسمیہ ہوئی، رازی کی یہ کتاب بھی بہت مشہور ہوئی۔ ول دوران کہتے ہیں کہ:

The most famous of al- razi works was a ten volume survey of medicine, the kitab al - mansuri (book for al- mansoor.) dedicated to the prince of khurasan

(۱) 247/the age of faith pp 246

Gerar of cremona translated it into latin. the ninth volume of this translation the almansori was a popular text in Europe till the sixteenth century (۱)

’’رازی کی سب سے مشہور تصنیف ’’کتاب المنصوری‘‘ دس جلدوں پر مشتمل ہے، جسے انہوں نے امیر خراسان المنصور کے نام کیا تھا، اس کا ترجمہ جرار القرمونی نے لاطینی میں کیا، ترجمے کی نویں جلد جس کا نام ’’نونز المنصوریس‘‘ تھا، سولہویں صدی تک یورپ کی مقبول نصابی کتاب تھی‘‘

رازی کی بلندی کا اندازہ اس سے کیجئے کہ: بین الاقوامی طبی کانگریس کا اجلاس ۱۹۲۳ میں لندن میں ہوا تو اس میں رازی اور فنِ طب پر اس کی تحقیقات، کام اور نظریات پر خاص طور پر مضامین پڑھے گئے اور اسے فن طب کا امام تسلیم کیا گیا۔

دوسری مرتبہ رازی کی ہزار سالہ برسی فرانس کے شہر پیرس میں بڑی شان سے منائی گئی، یہ جشن ۱۹۳۰ء میں ہوا تھا۔

زکریا رازی کے فنّ طب میں مہارت اور حذاقت کے واقعات

بغداد کے ایک رئیس زادے کو دورانِ سفر خونی قئی (قئی الدم) کا مرض لاحق ہو گیا، جب کسی طبیب کے علاج سے فائدہ نہیں ہوا تو شہرِ رے آیا، اور وہاں کے مشہور طبیب محمد بن زکریا رازی کو دکھایا، زکریا رازی نے نبض اور قارورہ دیکھا تو اسے سل دق اور پیٹ کے کسی مرض کی کوئی علامت نظر نہیں آئی، جس سے وہ مایوس ہوا مگر مرض کے بارے میں مسلسل غور کرتا رہا، اس نے مریض سے مسلسل سوالات کئے، اور پوچھا کہ دورانِ سفر کس قسم کا پانی پیا ہے، رازی فوراً سمجھ گیا کہ ضرور اس نے پانی کے ساتھ کوئی جونک اپنی حلق میں اتار لی ہے، اور یہی جونک معدہ میں پہنچ کر خون چوس رہی ہے اور یہی خون بذریعۂ قئے خارج ہو رہا ہے۔

(۱) p.247:the age of faith

دوسرے دن رازی بغرضِ علاج کائی سے بھرے ہوئے دو برتن منگائے اور مریض سے کھانے کے لئے کہا: مریض کو پہلے تو کراہیت محسوس ہوئی، لیکن معالج کے حکم سے اس نے تھوڑی سی کائی کھانے شروع کی اور پھر بعد میں انکار کر دیا، مجبوراً رازی نے حکم دیا کہ اس کو لٹا کر اور ہاتھ پیر باندھ کر اسکے منہ میں زبردستی کائی ٹھونسی جائے، اس طرح ایک برتن ختم ہو گیا، اور دوسرے کی باری آئی تو مریض چلایا اور التجا کی کہ اب میں مزید نہیں کھا سکتا، مجھے قئی ہو رہی ہے، یہ سن کر رازی کو اس کی صحت کے کچھ آثار نظر آئے، اس نے مریض کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے تھوڑی سی کائی اور کھلا دی، اچانک مریض کو زور سے قئی ہوئی اور بہت سی کائی خون و بلغم کے ساتھ باہر نکل آئی، رازی کو اس کائی میں ایک جونک نظر آئی اور پھر مریض کو دکھا کر یوں کہا کہ: تیرے مرض کا سبب یہی جونک ہے، اب یہ مرض تجھے کبھی نہ ہوگا۔(۱)

زکریا رازی کے مطب کا عجیب انداز

زکریا رازی کے مطب کا بھی عجیب انداز تھا، وہ اپنے مطب میں سب سے پیچھے بیٹھتا تھا، اس کے آگے اس کے شاگرد بیٹھتے تھے، اور اس کے بعد اس کے شاگردوں کے شاگرد بیٹھتے تھے، اور پھر ان کے شاگرد بیٹھتے تھے، جب کوئی مریض آتا تو وہ سب سے پہلے آگے بیٹھے شاگردوں سے اپنا حال کہتا، ان کی سمجھ میں نہیں آتا تو وہ اپنے سے پچھلے والے لوگوں کے پاس بھیج دیتے تھے، اگر ان کی بھی سمجھ میں نہیں آتا تو وہ اس سے زیادہ قابل کے پاس بھیجتے تھے، سب سے آخر میں زکریا رازی کا نمبر آتا تھا، یعنی جس کا کوئی علاج نہیں کر پاتا تو وہ رازی کے زیرِ علاج ہوتا۔

بلند اخلاقی اور مذہبی رنگ

رازی بہت ہی بلند اخلاق شخصیت کا مالک تھا، لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کرتا، فقراء اور بیماروں کا خوب خیال اور اہتمام کرتا۔

(۱) اخبار الطب کراچی: اپریل ۱۹۵۸ء

(۹) سنان بن ثابت حرانی (۳۲۰ھ = ۹۴۳ء)

سنان بن ثابت حرانی ماہر طبیب، ریاضی داں اور اچھا منتظم تھا، اس نے فن طب میں بہت سی اصلاحات کیں، اور ترقی دی، اس نے تقریباً ایک درجن بادشاہوں کا دور دیکھا اور ہر بادشاہ کے دور میں وزیر رہا

یہ عظیم طبیب حران میں پیدا ہوا، ثابت بن قرہ نے بنوموسیٰ شاکر کے ایماء پر ترکِ وطن کر کے پورے خاندان کے ساتھ بغداد میں سکونت اختیار کی، پیرانہ سالی میں جب ثابت بن قرہ مسلمان ہوا تو بیٹا سنان بن ثابت بھی بعمر چالیس سال حلقہ بگوشِ اسلام ہوا، اس نے شہرِ بغداد میں نامور اساتذہ سے اکتسابِ فیض کیا۔

۸۹۲ء میں خلیفہ معتضد کے دورِ خلافت میں ثابت بن قرہ جو افسر الاطباء کے اعلیٰ افسر منصب پر فائز تھا، اپنی پیرانہ سالی کے باعث اپنی جگہ لائق بیٹے سنان بن ثابت کو مقرر کیا، بعد ازاں اپنی لیاقت اور خوش انتظامی کے باعث آنے والے ایام میں ہر خلیفہ نے اپنے دور میں سنان کو ترقی دی اور وہ اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہوتا گیا اور بغداد کے جملہ شفاخانوں کا مہتمم رہا۔

طبی خدمات اور کارنامے

ملک میں شفاخانوں کا جال بچھا تھا، اسی دور میں مملکت میں غلط علاج سے ایک حادثہ ہوا، واقعہ ہے کہ ۹۳۱ء میں بغداد کے ایک عطائی طبیب کے غلط علاج سے ایک مریض کی جان چلی گئی۔

اطباء کا امتحان اور رجسٹری

سنان بن ثابت نے غور کے بعد کئی اصلاحات کیں، اس نے حکم دیا کہ جملہ اطباء کو شمار کیا جائے اور ان کا امتحان لیا جائے، چنانچہ جملہ اطباء کو شمار کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اطباء کی تعداد ایک ہزار کے قریب ہے، اب اطباء کا باقاعدہ تحریری اور تقریری امتحان لیا گیا، ایک ہزار سات سو اطباء کامیاب ہوئے اور تین سو ناکام رہے، جو کامیاب ہوئے تھے ان

کو حکومت نے رجسٹرڈ کر لیا، ان کو سرکاری سند دی گئی، مطب کرنے کا اجازت نامہ دیا اور ناکام کو مطب کرنے سے منع کر دیا گیا۔

گشتی شفاخانہ

سنان نے ہر ایک کو فائدہ پہنچانے کے لئے گشتی شفاخانہ کا طریقہ نکالا، اطباء کی ایک تعداد دواؤں اور دیگر ساز وسامان کے ساتھ محلے محلے گھومتی تھی اور مریضوں کا علاج کرتی تھی، لوگوں کو گھر بیٹھے علاج کی سہولتیں ہو جاتی تھیں۔

قیدیوں کا طبی معائنہ اور علاج

سنان نے علاج کے اس طریقہ کو بھی وسعت دی، اس نے قیدیوں کا جیل خانوں میں جا کر معائنہ کا طریقہ جاری کیا، وہاں ان کا علاج ہوتا تھا۔

مذہبی رنگ اور دینی مزاج

ایک بادشاہ کے اس کو نصیحت اور خیر خواہی کے مطالبہ پر اس نے اس کو جو غیظ وغضب کو قابو میں رکھنے کی نصیحت کی ہے اور اس کو قرآنی آیت کے بموجب "وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا أَلَا تُحِبُّوْنَ أَنْ يَغْفِرَ لَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ" اور ارشادِ خداوندی "وَأَنْ تَعْفُوْا أَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى" اس سے اس کے مذہبی اور دینی مزاج کا پتہ چلتا ہے۔(۱)

اس نے یکم ذی القعدہ ۳۳۱ھ مطابق ۷/جولائی ۹۴۳ء کو وفات پائی۔

(۱۰) اِبنُ الجزَّار: ۹۰۵ء تا ۹۸۴ء

دسویں صدی میں دنیائے اسلام میں ایک اور نامور طبیب اور ماہر علم ادویہ پیدا ہوئے، ان کی جائے ولادت تیونس کا نوآباد شہر قیروان تھی، طب و دواسازی ابن الجزار کو ورثے میں ملی تھی، ان کے والد ابراہیم اور چچا ابوبکر دونوں طبیب تھے۔

ابن الجزار کی کتابیں لاطینی، یونانی اور عبرانی زبانوں میں ترجمہ ہوئیں اور ان کے مرتب کردہ بہت سے نسخے فرانس وغیرہ کے فارکوپیا میں شامل ہوئے اور درجنوں نسخے

(۱) اخبار العلماء والحکماء: ۱/۸۴

آج بھی زیر استعمال ہیں۔

ابن الجزار کے بارے میں سامی حمارنا کا تبصرہ یہ ہے کہ فاطمی میں عہدِ حکومت میں طب ودواسازی اپنے نقطۂ کمال کوابن الجزار کے ہاتھوں پہنچی......طب کی تعلیم اوراس کی ترقی میں اسے پیشوا کی حیثیت حاصل رہی، فاطمی حکمراں المعز کے عہدِ حکومت (۹۵۲ءتا۸۷۱ء) وہ سب سے ممتاز طبیب تھا۔

مگر ابن الجزاز کی عظمت اور امتیاز کا اندازہ بہت تاخیر سے ہوا، اس لئے طب کی کتابوں میں اس کا تذکرہ بہت شاذ ہے، تاہم ابھی حال میں تونس کے ڈاکٹر سلیم عمار نے ابن الجزار پرایک کتاب بعنوان:(ibn Al jazzar and the medical School of Kairouan)لکھی ہے، اس میں ابن الجزار کی طبابت، دواسازی اورتصانیف کا تذکرہ کافی تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔

۱۹۸۰ء میں اس کی وفات کا پہلا ہزارہ مکمل ہوا تو تیونس میں اس کی یادمنانے کے لئے ایک بین الاقوامی کانفرس منعقد کی گئی جس میں مصر، انگلستان، فرانس، اطالیہ، سوئزلینڈ، ریاست ہائے متحدہ امریکہ، شام اورلبنان سے مندوبین شریک ہوئے، ستمبر ۱۹۹۸ء میں بھی تیونس کے شہر کا تھیج میں تاریخِ طب کی چھتسویں بین الاقوامی کانفرس ہوئی تو اس میں ابن الجزار کے کام کوخصوصی اہمیت دی گئی۔

ابن الجزار کی تصانیف

ابن الجزار کی باقی رہ جانیوالی چیزیں اس کی تصانیف ہیں، اس نے متعدد کتابیں لکھیں، چھوٹی بڑی کتابوں کوملا کران کل تعداد ۴۳ بنتی ہے، ان میں سے ایک کتاب زادالمسافر نے سب سے زیادہ شہرت حاصل کی، یہ کتاب مسافروں کے لئے لکھی گئی تھی؛ تاکہ سفر کے دوران جہاں طبیب دستیاب نہیں ہوتے، مسافر مریض اس کتاب کی مدد سے اپنی دوا خود تیار کرے، اس کتاب کے بہت سے نسخے آج بھی رائج ہیں، اس میں بہت سے امراض کے نسخے ہیں۔

زادالمسافر دنیائے عرب سے باہر بھی بہت مقبول ہوئی، اس کے ترجمے لاطینی، یونانی اورعبرانی زبانوں میں ہوئے، لاطینی زبان میں اس کا ترجمہ مشہور مترجم constantinus

Africanus (م ۱۰۸۷ء): یااوراسی نے اس کالاطینی نام Viaticum رکھا؛ مگراس نے اس کتاب کی تصنیف سرقہ کرنے کی کوشش کی، اس سے مراد یہ ہے کہ اس نے خودکواس کا مترجم نہیں؛ بلکہ مصنف ظاہر کیا، یونانی زبان میں اس کے ترجمے کا نام Ephode رکھا گیا، زادالمسافر کے تراجم کے نسخے آکسفورڈ کی Bodleian Library، برٹش میوزیم، وائنا (vienna) فلورنس، پیرس، تولوس Toulouse اور لایون (lyon) کے کتب خانوں میں موجود ہیں، اس کا ایک نسخہ نپولین بھی اپنے پاس رکھا کرتا تھا۔

اس کی اورایک کتاب" كتاب الاعتماد في الأدوية المفردة "ہے، جس کواس نے فاطمی خلیفہ قائم بامراللہ کے لئے لکھی تھی، واضح رہے کہ ابن الجزار کے زمانے میں فاطمیوں کی حکومت قائم ہوچکی تھی، اس کی داغ بیل تیونس میں پڑی تھی، مگر بعد میں مصر میں یہ منتقل ہوگئی تھی، فاطمی حکمرانوں نے طب اوراطباء کی سرپرستی جاری رکھی، علم الادویہ میں اس کتاب کا مرتبہ ایک تیونسی طبیب ڈاکٹر رازی جازی کے بقول(Dicorides) کی قرابادین کے قریب قریب ہے، اس میں ۲۸۰ مفرد ادویہ کو بیان کیا گیا ہے، اوران ادویات کی خصوصیات کو بتایا گیا ہے، اس کے علاوہ تیس مرکب ادویات بھی بیان کی ہیں۔ یہ کتاب بھی دوسری زبانوں میں ترجمہ ہوئی۔

ابن الجزار کی ایک اورتصنیف امراضِ اطفال پر ہے جس کا نام "سياسة الأطفال وتدبيرهم"ہے، اس کا دعوی تھا کہ امراض اطفال پر یہ پہلی کتاب ہے۔

تصنیفات توابن الجزار کے اوربھی ہیں، مگران کے تذکرے کی کوئی ضرورت نہیں، البتہ یہ بات قابل ذکر ہے کہ علاج ومعالجہ میں اس نے ادویات استعمال کرنے کے علاوہ فصد کھلوانے، داغنے اورخوشبویات استعمال کرنے کا مشورہ بھی دیا ہے، اس نے ۲۵ خوشبودار پودوں کے نام تجویز کئے ہیں، ان میں دارچینی، لوگ، جائفل، الائچی، بالچھڑ، کباب چینی وغیرہ شامل ہیں۔

ابن الجزار کی غرباء پروری

ابن الجزار نہایت غریب پرورطبیب تھا، وہ امیر وغریب مریضوں کے درمیان کسی قسم کا امتیاز نہیں برتتا تھا، سلیم عمار نے ابن جلجل کے حوالے سے مریضوں کے ساتھ ابن الجزار

کے مساویہ سلوک کا ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک بار قیروان کے قاضی کا بھتیجا تھا، جس کا نام نعمان تھا، قاضی کے بیٹے کا علاج کرانے ابن الجزار کے مطب میں پہنچا، مطب مریضوں سے بھرا ہوا تھا، قاضی کے بھتیجے کو وہاں بیٹھنے کی جگہ نہیں ملی، اس لئے وہ کھڑا رہا، ابن الجزار نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا اور پہچان لیا، پھر بھی اسے جگہ دینے لئے کسی مریض کو اٹھانا مناسب نہیں سمجھا، باری آنے پر ابن الجزار نے قاضی کے بیٹے کے قارورہ کا معائنہ کیا اور نسخہ تجویز کیا، اس کے علاج سے قاضی کا بیٹا شفایاب ہوگیا، مریضوں کے ساتھ ابن الجزار کے مساویانہ سلوک کا سن کے اور اپنے بیٹے کو شفایاب دیکھ کر قاضی بہت خوش ہوا اور اس نے ایک بیش قیمت قبا اور تین سو مثقال (تقریباً سوا کلو گرام) سونا تحفے میں بھیجا، مگر ابن الجزار نے یہ دونوں چیزیں، لینے سے شائستگی کے ساتھ معذرت کر دی۔

ابن الجزار کی ایک کتاب ایسے غریب لوگوں کے لئے جو زاد المسافر میں تجویز کردہ دوائیں مہنگی ہونے یک وجہ سے خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے، لہٰذا اس میں سستی دواؤں کے نسخے ہیں اس وجہ سے ابن الجزار نے اس کا نام ''کتاب الفقراء والمساکین'' رکھا ہے، اس کتاب کے دو نسخے پیرس اور اسکوریل (اسپین) میں موجود ہیں۔

(۱۱) ابو منصور موفق بن علی ہروی (۳۴۰ھ=۹۶۱ء)

موفق بن علی ہروی اپنے دور کا عظیم طبیب، علم الادویۃ کا زبردست ماہر اور اچھا سائنس داں تھا، ہرات (ایران) کا باشندہ تھا، اس شہر میں تعلیم حاصل کی اور پھر مطالعہ اور تجربہ میں مصروف ہوگیا، اس نے دواؤں کی طرف توجہ کی اور جڑی بوٹیوں پر تجربہ کئے، اس فن میں کمال پیدا کیا۔

علمی خدمات اور کارنامے

موفق بن علی کو طبی سائنس سے گہرا لگاؤ تھا، وہ علمِ نباتات (botany) کا محقق، علم الادویہ پر نئے نئے تجربہ کرنے والا، اپنے فن کا ماہر اور باکمال طبیب تھا، اس نے ہر جڑی بوٹی پر خود تجربہ کئے، ان کے خواص اور اثرات معلوم کئے، نیز نئے پودوں کی تلاش

میں دور دور کا سفر کیا، ناموں کی تحقیق کی، خواص اور اثرات کی بناء پر دواؤں کی درجہ بندی کی، اس نے معدنی ادویہ کی بھی تحقیق کی۔

موفق کی مشہور کتاب ''حقائق الادویہ'' ہے، دورِ اول کی یہ پہلی اور مستند جامع کتاب ہے، کتاب بڑے سلیقے سے مرتب کی گئی ہے، اس میں آیورویدک دواؤں کے نام اور خواص بھی درج ہیں۔

حقائق الادویہ: یہ کتاب ''حقائق الادویہ'' یہ جامع کتاب کی حیثیت رکھتی ہے، کتاب کی ترتیب اس طرح ہے کہ جملہ ادویہ کو پہلے دو بڑی قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے:

۱۔معدنی دوائیں　　۲۔نباتاتی اور حیوانی دوائیں

آج کل کی اصطلاح میں جن کو نامیاتی اور غیر نامیاتی (Organic inorganic) کہتے ہیں، نامیاتی ادویہ کی مزید قسمیں کی گئی ہیں۔

اس ضخیم اور مستند کتاب میں پہلے کل پانچ سو پچاسی دواؤں کے نام اور ان کی صحیح پہچان بتائی گئی ہے، پھر ان سب کی خاصیت اور اثرات کے لحاظ سے ان کے چار درجے قائم کئے گئے ہیں: (۱) گرم وتر دوائیں (۲) گرم اور خشک دوائیں (۳) سرد اور تر دوائیں (۴) سرد اور خشک دوائیں، اس درجہ بندی کے بعد ان کے فائدے اور نقصانات بتائے گئے ہیں۔

معدنی ادویہ

معدنی ادویہ میں موفق نے کئی نئی دوائیں دریافت کیں، مثلاً سوڈیم کاربونیٹ (sodiumcarbonate) اور پوٹاشیم کاربونیٹ (potassiumcar bonate) مشہور دوائیں ہیں، وہ ان کے فرق کو بتاتا ہے اور اثرات بیان کرتا ہے۔

موفق معدنی مرکبات بھی بتاتا ہے، ان میں ارسینک آکسائڈ اور اینٹی مونی آکسائڈ (antimony oxide) نیز سلی سیک آکسائڈ (silcil oxid) ان سب معدنی مرکبات کی اصلیت، خواص، اثرات اور فائدے اور نقصانات ہروی نے یہ سب باتیں بیان کی ہیں۔

(۱۲) عُریب بن سعید الکاتب قرطبی (۳۵۶ء= ۹۷۶ء)

اندلس کے دانشوروں میں عُریب بن کاتب قرطبی ایک خاص اہمیت کا مالک تھا، یہ الحکم ثانی ۹۷۶ کے عہد میں گذرا ہے، عُریب قرطبہ میں پیدا ہوا، یہیں پرورش پائی، تعلیم کی تکمیل کے بعد مطالعۂ کتب میں مصروف ہوگیا اور علمِ طب کو خدمتِ خلق کے لئے اپنا پیشہ بنایا، اس نے طبی تحقیقات کا ایک خاص میدان اپنے لئے منتخب کیا، خلق اللہ کو اس سے بہت فائدہ پہنچا، عبد الرحمن جس کا زمانۂ حکومت طویل ترین ۹۱۲ء تا ۹۴۱ء تقریباً پچاس سال رہا ہے، اس نے عُریب کی فنی قابلیت دیکھ کر اسے اپنا طبیبِ خاص مقرر کیا، اس وقت سے عُریب زندگی بھر دربار سے منسلک رہا۔

علمی خدمات اور کارنامے

عُریب ایک عالی دماغ طبیب اور مستقل مزاج مفکر تھا، اس نے عورتوں کے امراض پر ریسرچ کیا، چنانچہ حمل سے متعلق تمام کیفیتوں کے سلسلے میں بڑی تحقیق وجستجو سے کام لیا، مشاہدے اور تجربے کئے، اور نتائج کو ڈائری میں قلم بند کرتا رہا، اس کے خاص مضامین تھے:

(۱) حمل کا قیام ......جنین اور اس کی ساخت (۲) زچّہ اور بچّہ (۳) دایہ گری۔

اس سے پہلے اس موضوع پر کبھی توجہ نہیں دی گئی تھی، اس نے تربیت یافتہ دایہ کا نصاب مرتب کر کے اس کی تعلیم وتربیت کا انتظام کیا۔

عُریب نے اپنے جملہ تجربات اور نظریات تفصیل سے قلم بند کئے، ان کو کتابی صورت میں الگ الگ مرتب کیا، علم طب کے اس خاص موضوع پر اس طبیب کی یہ تینوں کتابیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں اور اس علم سے متعلق یہ تینوں کتابیں سب سے پہلی تصنیف کہی جاتی ہیں۔

عُریب علم نباتات (botony) کا بھی ماہر تھا، اس نے اس اہم موضوع پر بھی ایک کتاب مرتب کی جس میں پودوں اور جڑی بوٹیوں سے متعلق اپنے تجربات بیان کئے ہیں۔

(۱۳) ابوالقاسم عمار موصلی (۸۸۳ھ=۱۰۵۵ء)

عمار موصلی امراضِ چشم، موتیا بند کا ماہر تھا (eye surgeon) اس نے موتیا بند کے سلسلے میں تحقیق کی اور اس کا علاج آپریشن کے ذریعہ ثابت کیا، مرض موتیا بند (cataract) تکلیف دہ مرض ہے، اور انسان آنکھیں رکھتے ہوئے مجبور ہو جاتا ہے، یہ مشہور طبیب الحاکم ۹۹۶ء کی عہد میں پیدا ہوا اور اس کے بیٹے کے عہد میں کام کیا۔ انہیں یورپ میں (canamusali) کہا جاتا ہے۔ جارج سارٹن نے انہیں امراض چشم کے مسلم ماہرین میں سب سے خلاق سائنسداں کہا ہے، انہوں نے "**کتاب المنتخب فی علاج العین**" تصنیف کی، جس میں آنکھ کی بیماریوں اور ان کے علاج کے علاوہ موتیا بند کے لئے چھ آپریشنوں کا بیان ہے، ان میں خاص طور پر وہ آپریشن قابل ذکر ہے جس میں مصنف نے غیر متحجر موتیا بند کا پانی دھات کی ایک نلکی سے جو خود ان کی اپنی ایجاد تھی کھینچ لینے کی وضاحت کی ہے۔

علمی اور طبی خدمات اور کارنامے

موصلی نے امراضِ چشم کے علاج سے متعلق ایک نیا طریقہ اختیار کیا اور بہت کامیاب رہا، اور یہ طریقہ آپریشن کا تھا، آنکھوں کے بعض امراض میں آپریشن کے ذریعہ علاج بہت کامیاب اور اطمینان بخش ثابت ہوا، موصلی آنکھوں کا پہلا سرجن تھا (eye surgen)۔

امراضِ چشم میں موتیا بند (cataract) ایک عام مرض ہے جس میں آنکھوں کی پتلی پر ایک باریک پردہ آجاتا ہے، موتیا بند کے لئے آپریشن کا طریقہ اسی مشہور ماہرِ امراض چشم کا ایجاد کردہ ہے، موصلی نے سرکاری اسپتال میں بے شمار مریضوں کی آنکھوں کا آپریشن کیا۔

عمّار موصلی نے آپریشن کے لئے ایک خاص قسم کا نازک آلہ ایجاد کیا، اس نے آپریشن کے اصول وقاعدے مقرر کئے، احتیاط اور علاج کا طریقہ بتایا، حفظِ ماتقدم کے

اصول بیان کئے، اوراپنی یہ تمام باتیں اورتجربے قلم بند کئے، موصلی نے اپنی اس ڈائری کو کتاب کی صورت مرتب کرکے اس کا نام ''علاج العین'' رکھا، ''علاج العین'' امراضِ چشم اورعلاج واحتیاط کے بارے میں مکمل اور جامع کتاب ہے، یہ کتاب یورپ میں بہت مقبول ہوئی، اوراس کا ترجمہ یورپین زبان میں کیا گیا۔

(۱۴) ابوالقاسم خلف بن عباس زہراوی (۳۹۵ھ= ۱۰۰۹ء)

ابوالقاسم الزھراوی یورپین اسے ابوالکیس اورالبوکسیس کہتے ہیں، قرطبہ کے قریب زہرنامی شہر جسے اندلس کا مشہور حکمراں عبدالرحمن الناصر نے قرطبہ سے چارمیل دور آباد کیا تھا، وہاں پیدا ہوا، اس کی پیدائش ۹۳۶ھ کو ہوئی، ابوالقاسم نے ابتدائی تعلیم ختم کرنے کے بعد قرطبہ یونیورسٹی میں داخلہ لیا، اس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے علم طب کے شعبۂ جراحت (surgen) کی طرف خصوصی توجہ اوراس فن میں کمال پیدا کیا، زہراوی دنیا کا پہلا سرجن (surgen) تھا، تعلیم ختم کرنے کے بعد مطالعہ سے قابلیت بڑھائی، فن طب میں تجربہ حاصل کئے، اورشہرت کے بعد شاہی اسپتال میں اسے شعبۂ جراحت کا ذمہ دار بنایا گیا۔ وہ خلیفہ کے شاہی معالج بھی تھے، ان کا انتقال قرطبہ میں ہوا۔

علمی خدمات اورکارنامے

ابوالقاسم الزھراوی نے غوروفکر اورتجربہ کے بعد علاج کے دوطریقے مستقل ایجاد کئے: (۱) علاج دوا کے ذریعہ (۲) علاج آپریشن کے ذریعہ۔

ابو القاسم نے سرجری (آپریشن) کے ذریعہ علاج کے طریقے کو مرتب کیا اوراسے ایک مستقل فن بنادیا، اس نے بتایا کہ کون کون سے امراض میں آپریشن ضروری ہے، سرسے پاؤں تک کے امراض کو اس نے بتایا، مثلاً حلق میں غدود کا بڑھ جانا (ٹونسل) بدگوشت، آنکھ میں موتیابند کا مرض، پھوڑے، پھنسیاں وغیرہ۔

زہراوی نے آپریشن کے ذریعہ علاج کے طریقہ کو بہت ترقی دی، اس نے آپریشن کرنے کے لئے بہت سے آلات ایجاد کئے، یہ آلات مختلف مواقع پر استعمال

کئے جاتے ہیں، اس طبیب نے سرسے پاؤں تک ایسے امراض جن میں آپریشن کی ضرورت پڑتی ہے، اس کے مطابق آلات بنائے، اس طرح اس عظیم طبیب نے جو آلات ایجاد کئے ان کی تعداد ۱۰۰ سے اوپر ہے، زہراوی نے آپریشن کے آلات میں صفائی پیدا کی اوران کو سبک بنانے کی کوشش کی، تاکہ وہ اورزیادہ کارآمد ہوں، اس کے لئے اعلیٰ قسم کا فولاد استعمال کیا، زہراوی کے ایجاد کردہ آلات آج بھی مستعمل ہیں۔

زہراوی نے اندرون جسم آپریشن کرنے کے نہایت نازک طریقے دریافت کئے، حلق، دماغ، سر، گردے کا آپریشن، پیٹ کا آپریشن، آنتوں کا آپریشن، ان سب کے طریقے اوراصول اس نے بتائے، زہراوی کی جراحیات کی وجہ سے ایسے بہت سے امراض جن کا علاج صرف آپریشن کے ذریعہ ہی ممکن تھا قابلِ علاج مرض بن گئے اوراس قسم کے بیمار انسان موت کا لقمہ بن جانے کے بجائے شفایابی حاصل کرنے لگے۔

مرض کینسر (سرطان) پربھی اس نے تحقیق کی، اس نے آگاہ کیا کہ مرضِ کینسر کے پھوڑے یا زخم کو ہرگز چھیڑنا نہیں چاہیئے، وہ خطرناک بن جاتا ہے۔

اس نے ہڈیوں کے کاٹنے کا طریقہ، آلات اوراحتیاط کو بتلایا، اس نے یہ بھی بتایا کہ مریض کو بے ہوش کس طرح کرنا چاہیئے، کیا دوائیں اس کے لئے مناسب ہیں، اس نے اپنے تمام تجربات اورنظریات اپنی مشہور کتاب ''**التصریف لمن عجز عن التالیف**'' میں بیان کردیئے ہیں۔ اس کا وہ حصہ خاص طور پر قابل توجہ ہے جوآپریشن سے متعلق ہے، ایک دفعہ انہوں نے ایک آنکھ والے آدمی کے موتیابند کا آپریشن کیا۔

الزہراوی نے آلاتِ جراحی کی ساخت پربھی توجہ دی اور وہ جراحی میں درکار آلات قرطبہ کے کاری گروں سے اپنی نگرانی میں تیار کروائے، یہ آلات اعلی قسم کے فولاد سے بنائے جاتے تھے، انہوں نے اپنی کتاب میں تقریبا دوسوایسے آلات کی تصاویر دی ہیں جوعمل جراحی میں درکار ہوتے ہیں، ان میں سے اکثر آلات انہوں نے خود ایجاد کئے ہیں، سرجری میں آج بھی انہیں استعمال کیا جاتا ہے۔

ابوالقاسم الزاہری نے جراحی کے اصول وقواعد وضع کرکے اسے فن کی شکل دی،

یہی وجہ ہے کہ انہیں سرجری کا موجد مانا جاتا ہے، مغرب کے اہل قلم اکثر اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ قرونِ وسطیٰ کے اس مسلم سائنسداں نے سرجری کی ترقی میں بنیادی کردار ادا کیا۔

زہراوی کی خدمات کی اہلِ یورپ نے بھی کھلے دل سے قدر کی اور اپنی کتابوں میں اچھے سے اچھے الفاظ میں ستائش کی، چودھویں صدی عیسوی کا ایک مشہور یورپی سرجن Guy De Chauliac جو The Restorer of Surgery کے لقب سے مشہور ہوا، زہراوی کو بقراط اور جالینوس کے پائے طبیب قرار دیتا ہے، اس نے اپنی کتاب میں زہراوی کا حوالہ دوسو مرتبہ دیا ہے، دیگر یورپی اطباء راجرآف پارما Roger of parma لین فرانک Lan Franc اور سیلی سیٹ Salicet نے بھی التصریف کی پرزور تعریف کی ہے اور اس سے بھرپور استفادہ کیا ہے، رالف ایم میجر Ralph M. Major اپنی تصنیف A History of Midicine Vol.1 میں لکھتا ہے کہ قرون وسطی میں یورپی اطباء جالینوس سے زیادہ حوالے زہراوی کے دیا کرتے تھے، جارج سارٹن لکھتا ہے کہ تیرہویں صدی میں پیڈوا یونیورسٹی کے ماہر طب برونوڈ لونگوبرگو Bruno Da Longo Burgo کی تصنیف Magna Chirugia مغرب میں عربی طب کی ترسیل کے لئے ایک نئی منزل کا نشان راہ بنی، اس تصنیف میں ابوالقاسم زہراوی برووڈا لونگر کا ذریعہ استناد تھا۔ یہ کتاب اسی صدی کے اندر عبرانی میں ترجمہ ہوئی، اس طرح سے عربی طب عیسائی طب اور یہودی دونوں پر اثر انداز ہوئی۔

زہراوی سرجن ہونے کے علاوہ طبیب اور ماہر دواساز بھی تھا، التصریف میں صرف جراحی نہیں؛ بلکہ دایہ گری Mid Wifery ، ادویہ سازی، قرابادین، طباخی، علم تغذیہ (Dietetics) علاجیات (Therapeutics) اور نفسیاتی علاج بھی موجود ہے، ان مصنفین کے مطابق زہراوی کو طب وجراحت کی بہت سی باتوں میں اولیت بھی حاصل تھی، وہ پہلا سرجن تھا جس نے گھٹنے کی ہڈی (Patella) کی شکستگی پر اسے آپریشن

کر کے نکال باہر کرنے کا طریقہ تجویز کیا، اس نے خواتین کے گردوں کی پتھری نکالنے کا طریقہ بھی تجویز کیا، اس نے زچگی کرانے کے لئے خاص قسم کے چمٹے (Forceps) متعارف کرائے جراحی کے لئے نئے قسم کے چاقو، نشتر (Scalpels) اور جدا جدا جسامتوں کے آنکڑے (Hooks) ڈیزائن کئے، اس نے کئی قسم کی قینچیاں ایجاد کیں، جن کے پھل خمیدہ یا مدور تھے، اس نے آنکھ کے ناسور (lacrymal Fistula) کو بیان اور اس کے آپریشن کا طریقہ بتایا اور یہ بھی تجویز کیا کہ اس آپریشن کے لئے نوکدار پتیاں (pointed Biades)، پرتوافگن (Speculums) اور آنکڑے استعمال کئے جائیں، دانت کی میل رہائی (scaling) کا طریقہ بھی تجویز کیا، کان کے ناسور (Aural poly) کو پہلی بار بیان کیا۔

پیٹ میں ہڈیاں

ابوالقاسم خلف بن عباس الزھراوی نے اپنی مشہورِ زمانہ کتاب میں واقعہ درج کیا ہے کہ اس نے ایک حاملہ عورت کو دیکھا جس کے پیٹ میں بچہ مرگیا تھا، اس کے بعد وہ دوسری مرتبہ حاملہ ہوئی، وہ بچہ بھی مرگیا جس کی وجہ سے کچھ زمانے کے بعد پیٹ میں ورم ہوگیا اور پھول گیا پھر اس میں مواد بھی آگیا، ابوالقاسم زہراوی کو علاج کے لئے بلایا گیا، اس نے کافی روز علاج کیا، جب کوئی فائدہ نہیں ہوا تو اس نے طاقتور مراہم استعمال کروائے، کچھ عرصہ کے بعد عورت کی شرمگاہ سے ایک ہڈی خارج ہوئی، کافی دن گذرنے کے بعد پھر دوسری ہڈی نکلی، اسے بہت تعجب ہوا کہ پیٹ ایسی جگہ ہے جہاں ہڈی نہیں ہوسکتی، اس نے اسی سے اندازہ لگایا کہ پیٹ میں مردہ بچہ کی ہڈیاں موجود ہیں، پھر زہراوی نے آپریشن کیا اور بقیہ ہڈیاں عورت کے پیٹ سے نکال لیں، اس کے بعد وہ عورت صحت مند ہوگئی اور کافی لمبے عرصہ تک زندہ رہی۔

(۱۵) علی بن عیسیٰ (۴۴۱ھ = ۱۰۳۱ء)

امراضِ چشم کا ماہرِ خصوصی (EYE SPECIALIST) تجربہ اور تحقیق کے

بعد قوت بصارت کو قائم رکھنے ، نیز آنکھوں کے مفید ترین دوائیں ، مناسب غذائیں و پرہیز تجویز کر کے ان کی مکمل فہرست پیش کرنے والا ، آنکھوں کے امراض ، اسباب وعلامات پر بحث کرنے والا۔

وطن غالباً بغداد ، یہ شخص خلیفہ عیسیٰ عباسی کے عہدِ حکومت میں گذرا ہے ۔اسے مغرب والے(jesu Haly) کہتے ہیں،

علمی خدمات اور کارنامے

یہ ان قابل ترین وباصلاحیت اطباء میں سے ہے جنہوں نے خاموشی کے ساتھ علمی وفنی کام کئے، اس نے شہرِ بغداد امیں گوشۂ گمنامی میں زندگی گذاری۔

اس نے اجزائے جسم میں سے صرف آنکھ کا انتخاب کیا اور جسم کے اس اہم ترین اور نازک ترین حصہ پر تحقیقی کام کیا، اس نے آنکھ کے امراض پر زبردست تحقیقات اور پھر اپنے جملہ ذاتی تجربات، مشاہدات اور نظریات کو اپنی صحیح اور میعاری کتاب تذکرۃ الکحلین میں جمع کردیں۔

تذکرۃ الکحلین

یہ کتاب نہایت مفصل اور ضخیم ہے، گویا یہ انسانی آنکھ کی انسائیکلوپیڈیا ہے، کتاب کا بڑا حصہ امراضِ چشم کے اس ماہر ڈاکٹر (EYE SURGEON) کے ذاتی تجربات اور مشاہدات پر مبنی ہے، کتاب کی پہلی جلد میں اس نے آنکھ کے مفصل حصوں کی تشریح اور منافعِ اعضاء یعنی ہر ہر جزء اور حصہ کو بیان کیا ہے اور اس کے فوائد بتائے ہیں جس کو انگریزی میں ''ٹانومی اور فریالوجی'' (ANATOMY PHYIOLLAGY) کہتے ہیں۔

دوسری جلد میں آنکھ کی ان بیماریوں کا علاج ہے جو ظاہری طور پر نظر آتی ہیں، علی بن عیسیٰ نے آنکھ کے جملہ ظاہری بیماریوں کو بتایا اور اس کے اسباب وعلامات تفصیل سے لکھے اور مکمل بحث کی۔

تیسری جلد نہایت اہم ہے، اس میں آنکھ کے ان بیماریوں کا علاج تفصیل سے

بیان کیا گیا ہے جو آنکھ کے اندرونی حصوں میں کہیں پیدا ہوتے ہیں جو آنکھوں کے لئے مفید ہیں، اور ان کو آنکھ کے امراض اور شکایتوں کے سلسلے میں استعمال کیا جاتا ہے۔

کتاب میں ایک سو تینتالیس / ۱۴۳ ایسی مفرد دواؤں اور جڑی بوٹیوں کے نام، ان کی پہچان ان کے خواص واثرات اور فوائد بیان کئے ہیں، جو آنکھوں کے لئے مفید ہیں اور ان کو آنکھ کے امراض اور شکایتوں کے سلسلے میں استعمال کیا جاتا ہے۔

کتاب کے ایک حصہ میں احتیاط اور پرہیزی غذاؤں کا بھی مفصل بیان ہے، آنکھ کے مریضوں کے لئے جو غذائیں مفید اور اچھی ہیں ان کو بتایا گیا ہے اور جن غذاؤں سے نقصان ہوتا ہے یا نقصان اور تکلیف کا اندیشہ ہے ان کو لکھ دیا گیا ہے۔

آنکھ کے سلسلے میں یہ کتاب مفصل، معیاری اور مستند تسلیم کی گئی ہے، اس فن میں یہ دوسری قابلِ ذکر کتاب ہے، ازمنۂ وسطیٰ میں اس کتاب کا ترجمہ لاطینی زبان میں ۱۴۹۹ء میں شائع ہوا اور یورپ کے ڈاکٹروں نے اس کی اہمیت کو سمجھا اور دورِ جدید کے دانشوروں نے اسے جب غور سے پڑھا تو اس کی افادیت کا احساس ہوا اور اسکا ترجمہ ۱۹۰۳ء میں فرانسیسی زبان میں شائع ہوا، پھر اس مفید کتاب کو ۱۹۰۴ء میں جرمن زبان کے قالب میں ڈھالا گیا۔

(۱۶) شیخ حسین عبداللہ بن علی سینا

دنیا کی باکمال اور جامع شخصیت، علم طبعیات (PHYSICS) اور حیاتیات کا ماہرِ خصوصی ، علمِ تشریح الأعضاء (B I O L O G Y) منافع الأعضاء (PGYSIOLOGY) نیز علم الاصلاح اور علم الامراض پر گہری نظر رکھنے والا ماہر، نئے نئے نکتے بیان کرنے والا عظیم محقق، علم الادویہ کا ماہر، دواؤں اور جڑی بوٹیوں پر نئے نئے تجربہ کرنے والا، مشاہدے اور تحقیق سے کام لینے والا الطبیبِ حاذق۔

بخارا کے ایک شہر خرمتین کے قریب واقع مقام افشنہ میں ۳/صفر ۳۷۵ھ مطابق ۹۸۰ء میں پیدا ہوا اور وفات ہمدان میں ۴۲۸ھ/۱۰۳۸ء میں ہوئی۔

والد کا نام اسماعیل تھا، پانچ سال کی عمر میں شہر بخارا میں ابتدائی تعلیم حاصل کی، دس سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کرلیا، وقت کے مشہور فقیہ اسماعیل زاھد سے علم فقہ اور ایک نامور ہندسہ داں، سبزی فروش محمود مساح سے علم ہندسہ، اور مساحت وریاضت کا درس لیا، کمالِ ذہانت کی وجہ سے قلیل مدت میں ان پر مہارت حاصل کرلی، اسی طرح ایک نامور عالم اور فلسفی عبداللہ نائلی وارد بخارا ہوا، چنانچہ شیخ کے والد نے فرزند کی تعلیم کے لئے ان کو مہمان کیا، چنانچہ جوہرِ قابل کی ذہانت دیکھ کر ایک عظیم عالم ہونے کی پیشن گوئی کی اور علم منطق پڑھائی۔

شیخ کو علمِ نحو کا شوق ہوا تو امیر نوح بن منصور سلمان بخارا کے درباری طبیب حسن نوح القمری کے حلقۂ درس میں شریک ہو کر اس فن میں کمال حاصل کیا، سولہ سال کی عمر میں تمام مروجہ علوم سے فراغت حاصل کرلی، پھر مجلس درس کو رونق بخشی، ان کے اطراف شاگردوں کا ہجوم ہوتا تھا۔

علمی خدمات اور کارنامے

انہیں دنوں حاکمِ وقت نوح بن منصور سخت بیمار ہوا، درباری اطباء کا علاج کارگر نہ ہوا تو شیخ کو طلب کیا گیا، جن کے علاج سے صحت یاب ہو گیا، اس طرح شیخ کی دربار میں رسائی ہوئی، شوقِ مطالعہ، ذوقِ علم کو دیکھتے ہوئے شیخ کے لئے شاہی کتب خانے کے دروازے کھول دیئے گئے۔

بوعلی سینا وہ پہلا طبیب ہے جس نے فن طب میں علم النفس (psychology) کو داخل کیا، اس نے بتایا کہ تمام نفسیاتی کیفیات، یعنی خوشی، غم، غصہ، فکر وتردد وغیرہ کا تعلق قلب سے ہوتا ہے۔

اس نے کم عمری ہی سے تصنیف وتالیف کو شغل بنایا، بے شمار تصانیف مختلف موضوعات پر یادگار چھوڑیں، شیخ کی یوں تو بے شمار تصنیفات ہیں، لیکن دو کتابیں خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں، جنہوں نے اسے سائنسدانوں کی صفِ اول میں لا کھڑا کیا، "القانون" اور "کتاب الشفاء"۔

"کتاب الشفاء" میں اس نے فلسفہ اور حکمت پر سیر حاصل بحث کی۔

شیخ فن طب اور علم تشریح الاعضاء اور منافع الاعضاء (PGYSIOLOGY) نیز علم العلاج (METRAMEDICA) میں اس کے انکشافات اور نظریات آج بھی مستند سمجھے جاتے ہیں۔

''شفاء'' کے بعد ''القانون'' شیخ کی یہ مشہور زمانہ تصنیف ہے، اس میں دس لاکھ الفاظ ہیں، اور پانچ جلدوں میں ہے، یہ عظیم ترین اور قابلِ فخر تصنیف صحیح معنوں میں علم تشریح الاعضاء، منافع الاعضاء اور علم العلاج کا ایک مکمل ترین انسائیکلو پیڈیا ہے۔

''القانون'' کی پہلی جلد میں شیخ نے انسانی جسم کے جملہ اعضاء اور نازک سے نازک حصوں کی مکمل تفصیل وتشریح بیان کی ہے، ان کے کام اور فوائد بیان کئے ہیں، اس لحاظ سے یہ جلد تشریح الاعضاء اور منافع الاعضاء پر مشتمل ہے۔

''القانون'' کی دوسری جلد میں تمام مفرد ادویہ اور جڑی بوٹیوں کو ترتیب سے لکھا ہے، ان کے خواص واثرات بیان کئے ہیں، شیخ نے اپنے مشاہدات اور تجربات بتائے ہیں، گویا یہ جلد کتاب المفردات ہے۔

تیسری اور چوتھی جلدوں میں انسانی امراض پر بحث ہے، مختلف بیماریوں کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، اسباب وعلامات بتائے گئے ہیں، نظری اور عملی علم العلاج (theory and practice of medicine) کے سلسلے میں یہ جلد نہایت وسیع اور مستند معلومات پر مکمل حاوی ہے۔

القانون کی پانچویں جلد القرابادین ہے جو مختلف بیماریوں کے لئے مجرب دواؤں اور نسخوں کا مستند مجموعہ (prescription book) ہے

شیخ سینا کی مشہور کتاب ''القانون'' یورپ کے میڈیکل کالجوں میں داخلِ نصاب رہی ہے۔

اس کتاب کی اہمیت وافادیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ پندرھویں صدی میں کتاب سولہ مرتبہ اور سولہویں صدی میں بیس مرتبہ چھپی، اور لاطینی زبان میں اس

کتاب کے کئی ترجمے شائع ہوئے۔

القانون کا وہ حصہ جو آنکھ کے امراض اور علاج میں ہے، اس کا ترجمہ ڈاکٹر نیپرے نے جرمن زبان میں کر کے شائع کیا ہے۔

فرنچ زبان میں بھی اس کتاب کے ترجمے شائع ہوئے۔

مشہور فرانسیسی فاضل گستاوی بان کا بیان ہے کہ فرانس اوراطالیہ کے دارالعلوموں میں طبی تعلیم بنیاد ان ہی (یعنی ابن سینا کی کتابوں) پر رہی، اٹھارہویں صدی تک یہ تصنیفات دوبارہ طبع ہوتی رہیں اوران کوفرانس میں متروک ہوئے پچاس سال سے زیادہ کا زمانہ نہیں گذرا۔

انسائیکلو پیڈیا برناٹیکا میں مذکور ہے:

The canonof medicine (al-anun fi-at- tibb) is the most bible for a longer period that any other wrke).

’’القانون فی الطب مشرق ومغرب کی تاریخ طب میں واحد مشہور ترین کتاب ہے‘‘

القانون کا ترجمہ ۱۴۷۳ء میں شائع ہوا، صرف ستائیس برسوں کے اندر ۱۵۰۰ء تک اس کتاب کے سولہ ایڈیشن نکلے، جن میں ۱۵ لاطینی اور ایک عبرانی تھا، سولہویں صدی میں اس کے بیس ایڈیشن شائع ہوئے اور سترہویں صدی میں بھی اس کے بہت سے ایڈیشن نکلے۔

بہر حال شیخ بوعلی سینا اپنے زمانے کا بہت بڑا محقق، مفکر اور مصنف گذرا ہے، اسکی زندگی ابتلاء وآزمائش کی زندگی تھی، کبھی تو وہ وزارتِ عظمیٰ کے بلند ترین عہدے پر متمکن نظر آتا ہے، اور کبھی غربت میں جان کے خوف سے بلاد وامصار اور جنگلوں کی خاک چھانتا پھرتا ہے۔

مذہبی رنگ اور دینی مزاج

بوعلی سینا نہایت بلند اخلاق وعادات کے مالک تھے، طبیعت میں بے نفسی

اور فقیری غالب تھی، حرص وہوس اور عیش وعشرت کے عادی نہ تھے۔

یہ ابتداء ہی سے راسخ العقیدہ مسلمان تھے، ان کے باپ اور بھائی دونوں اسماعیلی تھے اور شیخ کو بھی اس کی دعوت دیتے تھے، انہوں نے ان کی دعوت قبول نہ کی، تعلیم کے ابتدائی زمانہ میں جب کوئی مشکل مسئلہ پیش آتا تو شیخ سیدھا جامع مسجد جاتے، نماز پڑھتے جس کے نتیجے میں وہ پیچیدہ مسئلہ حل ہوجاتا۔

ان کے یہ اقوال بھی ان کے دینی مزاج کے غماز ہیں۔

’’اے میرے عزیز دوست! یہ میری وصیت ہے اسے یاد رکھو، تم کو اول وآخر اپنے ذہن وخیال میں اللہ جل شانہ کو رکھنا چاہیئے، اوراسکے دیدار کا سرمہ اپنی آنکھوں میں لگانا چاہیئے، نماز میں اللہ تعالیٰ کے سامنے نہایت ادب سے کھڑا رہنا چاہیئے۔

تم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ سب سے بہتر کرامت ’’نماز‘‘ ہے اور سب سے زیادہ سکون اور اطمینان بخشنے والا عمل روزہ ہے، سب سے فائدہ بخش نیکی صدقہ اور سب سے زیادہ رائیگاں کوشش ’’ریاکاری‘‘ ہے۔

(۱۷) ہبۃ اللہ ابوالبرکات بغدادی

ہبۃ اللہ ابوالبرکات بغدادی محدم بن ملک شاہ کے دور میں بغداد میں ایک نامور طبیب گذرا ہے، ہبۃ اللہ بچپن میں بغداد آ گیا، اس نے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد علمِ طب کو پسند کیا اور علمِ طب کے حصول کی طرف توجہ کی، یہ عراق میں پیدا ہوا، اور بعمر ۹۰ سال میں انتقال کیا۔

ابوالبرکات نے ابوالحسن سعید بن ہبۃ اللہ ایک مشہور طبیب سے علم طب حاصل کیا۔

علمی خدمات اور کارنامے

ہبۃ اللہ ابوالبرکات بغدادی نامور طبیب، فلسفی، جغرافیہ کا ماہر (geologist) اور علمِ اخلاقیات (moral pgilosophy) اور روحانیت (spirtyal) میں کامل تھا۔

ابوالبرکات کا شمار بغداد کے نامور اساتذہ میں ہوتا ہے، خصوصاً علم طب میں باکمال شخصیت کا وہ مالک تھا، اور طبابت میں اس نے بڑا نام پیدا کیا، بڑے بڑے شاہانِ وقت اور امراء نے اس سے علاج کرایا اور شفایاب ہوئے، ہر جگہ خلعت وانعام واکرام سے نوازا گیا۔

یہ شروع میں یہودی تھا اور ایک مشہور یہودی خاندان سے تعلق رکھتا تھا، مگر مسلمان ہوگیا۔

وہم کا علاج وہم سے

بغداد میں ایک شخص کو مالیخولیا ہوگیا، اسے وہم تھا کہ اس کے سر پر مٹی کا مٹکا رکھا ہے، اس خیال سے وہ کسی دروازے میں بغیر جھکے ہوئے داخل نہیں ہوتا تھا، راستہ میں مٹکے کے گرنے کے اندیشہ سے لوگوں سے ہٹ کر چلتا تھا، یہ مرض اس کے لئے بے حد تکلیف دہ تھا، اس کا علاج بھی ممکن نہ تھا، اوحد الزمان ابوالبرکات ھبۃ اللہ البغدادی کے پاس اسے لایا گیا، حکیم سمجھ گیا کہ وہم کا علاج وہم سے ممکن ہے، اس نے اپنے دو غلاموں کو سمجھا دیا کہ ان میں سے ایک مکان کی چھت پر مٹی کا مٹکا لے کر جا کر بیٹھے، اور دوسرا لکڑی لئے ہوئے تیار رہے، وہ مریض کو بلا کر صحن میں ایسی جگہ بٹھائے گا جو چھت سے قریب ہو، جب اشارہ کرے تو لٹھ بند غلام اس طرح لکڑی گھما کر مارے کہ مریض پر تو نہ لگے مگر کچھ فاصلہ سے ہوکر اس کے سر پر سے گذر جائے اور اس کی چھت پر جو غلام ہے وہ مٹی کے مٹکے کو یوں پھینکے کہ مریض کے پاس آ کر گرے اور ٹوٹ جائے۔

یہ انتظام کر کے حکیم اوحد الزماں ھبۃ اللہ نے مریض کو اپنے پاس بلایا، دیوان خانے کے باہر سائبان کے نیچے بٹھا دیا اور خود بھی وہیں بیٹھ کر باتیں کرنے لگا، جس وقت دیکھا کہ مریض محوِ گفتگو ہے، چپکے سے ہاتھ سے اشارہ کر دیا، ساتھ ہی نیچے کے غلام نے لکڑی گھمائی اور وہ مریض کے سر پر سے اس کی لاٹھی زناٹا بھرتے ہوئے نکل گئی، اور چھت پر جو غلام تھا اس نے مٹکا نیچے گرا دیا، یہ کام ایسی صفائی سے ہوا کہ مریض کو بالکل یقین ہوگیا کہ جو مٹکا ٹوٹا ہے وہی ہے جو اس کے سر پر رکھا ہوا تھا، اس طرح سے اس کو وہم

سے گلوخلاصی ہوئی۔(۱)

مذہبی رنگ اور دینی مزاج

اس کے دینی مزاج کا اندازہ اس کے ان اقوال سے لگایا جاسکتا ہے "اعمال کی بنیاد مکافاتِ عمل ہے، جیسی کرنی ویسی بھرنی، جو ذرہ برابر نیکی کرے گا اسے نیکی ملے گی، جو ذرہ برابر بدی کرے گا اس کا بدلہ پائے گا، خدا جو خالق اور مالک ہے وہ منصف ہے، انسان کی نیکیوں پر وہ خوش ہوتا ہے اور ثواب دیتا ہے، اور برائیوں پر ناراض ہو کر عذاب دیتا ہے۔

اور ایک جگہ کہتا ہے:

> "روحانی معاملات اور ہیں اور ہماری آنکھوں سے بالاتر ہیں، مادیات میں غلطی کا امکان ہے، آنکھ غلط بھی دیکھ سکتی ہے، عقل غلط بھی سمجھ سکتی ہے، مگر روحانی امور ذوق ووجدان سے تعلق رکھتے ہیں، وہاں چشمۂ بصیرت چاہئے"۔

پیغمبر مخبر صادق ہے، حق ہے، سچا ہے، اسکا دل اور سینہ صحیفۂ کائنات ہے، وہ حق دیکھتا ہے، حق کہتا ہے اور حق باتوں کی خبر اس کے ذریعہ دی گئی ہے، وہ قطعی اور یقینی ہے۔

(۱۸) علاء الدین ابوالحسن ابن النفیس القرشی

علاء الدین ابوالحسن ابن النفیس القرشی دمشق میں پیدا ہوا، ابتدائی تعلیم کے بعد ابن الدخوار جو علم حدیث اور فن طب میں باکمال سمجھا جاتا تھا، اس کے حلقۂ درس میں شامل ہو کر تعلیم مکمل کی، یہ فن طب میں علم تشریح الاجسام کا ماہر، امراضِ چشم کا باکمال طبیب، جسم میں خون کے بارے میں تحقیق کرنے والا، دورانِ خون کو ثابت کرنے والا۔

علمی خدمات اور کارنامے

علم طب میں ابن النفیس کا نام دنیا کے ممتاز طبیبوں کی فہرست میں ذکر کیا جاتا ہے، تعلیم سے فراغت کے بعد ابن النفیس مصر پہنچا اور قاہرہ کے ایک بڑے شفاخانے میں افسر اعلیٰ کی حیثیت سے بہت دنوں تک خدمات انجام دیتا رہا۔

(۱) الحکیم لاہور، اکتوبر ۱۹۵۹ء

امراضِ چشم پراس نے بڑی تحقیق اور تجربے کئے، اورفن کے اس خاص شعبہ میں کمال پیدا کیا، ابن النفیس ایک محقق تھا، اس نے شیخ بوعلی سینا کی مشہور کتاب القانون پر اچھی بحث کی، وہ بعض مقامات پر شیخ سے اختلاف بھی کرتا ہے۔ انہوں نے ابن سینا کی کتابوں کی شرحیں لکھیں، ''ابن سینا'' ثانی کہلائے، نیز انہوں نے بقراط کی کتاب کی شرح ''شرح ابیذیمیا البقراط'' کے عنوان سے تصنیف کی اور حنین بن اسحاق کی تصنیف ''مسائل فی الطب'' کی شرح لکھی، جس کا عنوان ''شرح مسائل جنین'' ہے، امراض چشم پر ابن النفیس کی کتاب ''المهذب فی الکحل'' کے نام سے مشہور ہے، حکماء کے حوالے کے لئے انہوں نے ''بغیة الطالبین وحجة المطببین'' کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی جو اطباء کے لئے بڑی کارآمد ہے، ابن النفیس طب کے موضوع پر ''کتاب الشامل فی الصناع الطبیة'' کے عنوان سے ایک کتاب تحریر کی، جو تین سو جلدوں پر محیط ہوئی مگر وہ صرف اس کی اسی جلدیں مرتب کرسکے، انہوں نے ''شرح تشریح القانون'' کے نام ''القانون'' کی شرح لکھی جو بیسویں صدی میں ان کی شہرت کا باعث ہوئی۔

دورانِ خون (Circulation of blood) کی تحقیق کرنے والا پہلا شخص تھا۔

لیکن ابن النفیس کا سب سے بڑا کارنامہ جس نے اسے زندہ جاوید بنادیا، یہ ہے کہ وہ انسانی جسم کے نظام پر ایک نئے زاویہ سے غور کرتا ہے، وہ تجربے کے بعد ثابت کرتا ہے کہ انسان کے جسم میں خون رواں دواں رہتا ہے، وہ پورے اعتماد سے کہتا ہے کہ خون وردیدی شریان (Veinousartery) سے ہوکر گذرتا ہے اور پھر پھیپڑوں میں پہنچ کرتازہ ہوا سے ملتا ہے، اور پھر صاف ہوکر پورے جسم میں دورہ کرتا ہے، اس طرح خون پورے جسم کے ہر حصہ میں پہنچتا رہتا ہے۔

آج عام طور پر دورانِ خون کا نظریہ سرفتیس (Servetus) نامی ایک پرتگالی سائنسداں کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، یہ غلط ہے، امریکی پروفیسر فلپ نے اس خیال کی سخت تردید کی ہے، پروفیسر فلپ کہتا ہے:

Its dean Abu-al- Hassan Ali Ibn-al-nafis, who studied in damascus where he later died (1288-9(conteibuted in his sharh Tashrih al- Qanun a clear conception of the pgumonary cerculation of the blood two and half centuries before the spanish servtus credited with this discocery(۱)

''سرفتیس سولھویں صدی کا سائنسداں ہے، اس سے کوئی تین سو برس پہلے دورانِ خون کے اس نظریئے کو ایک مسلم طبیب اور سائنسداں نے دریافت کیا تھا، وہ ابن القرشی ہے، اس مسلم سائنسداں نے دورانِ خون کے نظرئے کو واضح طور پر دنیا کے سامنے پیش کیا'' ولیم ہاروے (Wiliam harvey) کو بھی دورانِ خون کا محقق کہا جاتا ہے، لیکن ولیم ہاروے ۱۶۸۷ء کا دانشور ہے، ابن النفیس اس سے کئی برس پہلے (کوئی تین سو برس سے اوپر) دورانِ خون کے بارے میں اپنا نظریہ پیش کرچکا تھا اور اپنی کتاب میں تفصیل سے بحث کرچکا تھا''۔

یورپ کے دانشور دورانِ خون کی دریافت کا سہرا ولیم ہاروے (۱۶۸۷ء) کے سر باندھنا چاہتے تھے، اس کے لئے طبی کانگریس کے اجلاس کے جلسے میں اعلان ہونے والا تھا، لیکن دس جون ۱۹۵۷ء کو دنیا کی مشہور خبر رساں ایجنسی (rellterlondon) کے ذریعہ یہ تحقیقی خبر ساری دنیا میں پہنچ گئی کہ دورانِ خون کے نظریہ کو دریافت کرنے والا ایک مسلم سائنسداں ابن النفیس القرشی تھا جو قاھرہ (مصر) کا ماہر طبیب تھا۔ چنانچہ انسائیکلو پیڈیا برناٹیکا کے حالیہ ایڈیشن ان کی دریافت کا اعتراف کرتی ہے۔

اس کی ولادت ۱۲۰۱ء میں ہوئی اور وفات ۱۲۸۹ء بعمر: ۸۸ سال۔

(۱) History of the arabs.p.685

(۱۹) لسان الدین ابن الخطیب

لسان الدین ابن الخطیب اندلس کا مایہ ناز طبیب اور محقق گذرا ہے، پورا نام ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ ہے، لسان الدین لقب تھا، ابی الخطیب یا ابن الخطیب سلمانی کے نام سے شہرت حاصل کی، ۲۵/رجب المرجب ۷۱۳ھ مطابق رنومبر ۱۳۱۳ء غرناطہ کے پاس المرج کے مغربی سرے پر دریائے شبیل کے قریب واقع مقام لوشنہ میں ولادت ہوئی۔

بڑے اہم خانوادے کا فرزند تھا، اس کا خاندان بنوزیر کے نام سے بڑی شہرت کا مالک تھا، پہلے شام سے ہجرت کر کے قرطبہ آیا، پھر طلیلہ سے غرناطہ میں مقیم رہا۔

اس کے ابتدائی عہد کے حالات نہیں ملتے، اتنا ملتا ہے کہ جوانی کے دن اپنے والد کے ساتھ غرناطہ میں گذارے، یہاں اس کا باپ بنونصر کے دربار میں نہایت جلیل القدر عہدہ پر فائز تھا، یہیں سے ابن الخطیب کو بڑے بڑے علماء اور فضلاء سے علم حاصل کرنے کا شرف حاصل ہوا

۱۳۴۰ء میں اپنے والد کے انتقال کے بعد وزیر علی بن حباب کے یہاں ملازمت کر لی، لیکن قسمت نے زیادہ دنوں تک ساتھ نہیں دیا، اور ۱۳۴۹ء میں علی بن حباب بھی دنیا سے چل بسے، اس کے بعد سلطان ابوالحجاج یوسف بن خطیب پر توجہ کی، یہ توجہ کچھ گراں ہوئی، چنانچہ یوسف کے قتل کے بعد اس پر عتاب کا دور شروع ہوا اور اسے مراکش جانا پڑا جہاں اس نے ۱۳۶۲ء تک گوشہ نشینی کی زندگی گذاری، اسی سال جب محمد خمیس دوبارہ تخت نشیں ہوا ۱۳۷۱ء میں اس کے دشمنوں نے سازش کر کے اس کو قتل کر دیا۔(۱)

علمی خدمات اور کارنامے

لسان الدین ابن الخطیب ایک جامع شخصیت کا مالک تھا، یہ ایک اچھا شاعر، مؤرخ، جغرافیہ داں، اور فلسفی تھا، لیکن وہ ایک طبیب اور محقق کی حیثیت سے زیادہ مشہور

(۱) تاریخ الخلفاء: حکیم غلام جیلانی

ہوا، اس نے مختلف عنوانات کے تحت بہت سی کتابیں لکھی ہیں، مؤرخین اس کی کتابوں کی کل تعداد ساٹھ بتاتے ہیں، ان میں سے صرف ایک تہائی کتابیں محفوظ رہ گئی ہیں۔

عالی دماغ ابن الخطیب کا سب سے بڑا کارنامہ جس نے اس کو زندہ جاوید کر دیا، اس کا یہ پتہ لگانا ہے کہ بعض امراض پھیل جاتے ہیں اور ایک دوسرے کو لگ جاتے ہیں اور بعض امراض نہیں پھیلتے، پھیلنے والے امراض وبائی صورت اختیار کر لیتے ہیں، اور گھر کے گھر صاف کر دیتے ہیں، ان امراض کو متعدی امراض کہتے ہیں۔

امراض متعدی کی دریافت کے بعد ابن الخطیب نے یہ پتہ چلایا کہ متعدی امراض پھیلتے کیوں ہیں، اس نے بڑے جدوجہد اور کاوش کے بعد یہ پتہ چلایا کہ یہ امراض باہر سے آ کر لگ جاتے اور اس کے پھیلنے کے اسباب وہ نہایت باریک کیڑے ہوتے ہیں جو نظر نہیں آتے، مگر وہ مرض کے کیڑے ہیں، ان لگنے والے کیڑوں کا نام اس ہوش مند محقق نے جراثیم (germs) رکھا۔

جراثیم کی دریافت اس طبیب کا عظیم کارنامہ ہے، جس نے آئندہ چل کر طبی دنیا میں زبردست انقلاب پیدا کر دیا، ابن الخطیب کی اس دریافت کو یورپ کے دانشوروں نے تسلیم کیا۔

(۲۰) اسحاق بن عمران بغدادی

اسحاق بن عمران بغداد کا رہنے والا تھا، خلیفہ معتمد (۸۷۰-۸۹۲) کے عہد میں موجود تھا، ابن جلجل کا کہنا ہے کہ یہ شخص مسلمان تھا، یہ پہلا طبیب تھا جس نے سب سے پہلے یوروپ میں جا کر طب کی اشاعت کے فرائض انجام دیئے، ابتدائی حالات کتابوں میں نہیں ملتے، زیادہ بن اغلب التمیمی نے اسے قیروان بلایا تھا، اس نے تین شرطوں پر رضامندی کا اظہار کیا تھا کہ اول ایک ہزار دینار، دوم اس کی ذاتی سواری، سوم یہ کہ جب بغداد جانا چاہے تو وہ واپس چلا جائے۔

چنانچہ وہ یہاں لوگوں کو اپنی صلاحیتوں سے مستفید کرتا رہا، اسی دوران اس نے

رقادہ میں قائم شدہ بیت الحکمت میں بھی خدمات انجام دیں، اس کے بعد وہ ابراہیم ثانی کے بیٹے عبداللہ ثانی کے دربار سے وابستہ ہوگیا، آخر میں زیاداللہ ثالث (۹۰۳۔۹۰۹ء) کے دربار میں بھی رہا، اس دربار میں اس کے اچھے دن نہیں تھے، ابن ابی صبیعہ نے لکھا ہے کہ: چونکہ زیادۃ اللہ نے اسحاق کی جملہ شرائط پوری نہیں کی تھیں، اس لئے وہ اس سے بدظن تھا، دوسری وجہ یہ لکھی ہے کہ اسحاق اسے بہت سی چیزیں کھانے سے منع کرتا تھا، اس طرح کی باتوں سے غلط فہمی اتنی بڑھی کہ زیادۃ اللہ نے ۲۹۴ھ=۹۰۷ء میں نہایت تکلیف دے کر اسے قتل کردیا، اوراس کی نعش پھانسی کے پھندے پر لٹکادی، اورخشک ہونے کے بعد اس میں شکرے نے گھونسلہ بنایا۔ جس روز اس کو قتل کیا گیا، اس دن اس نے زیادۃ اللہ سے کہا کہ: تم اپنے آپ کو عرب کا سردار کہتے ہو، مگرتم میں ایسی کوئی خوبی نہیں ہے، میں نے بہت دن پہلے تم کو ایک زہر دیا ہے جو تمہیں جلد ہی بری موت مار ڈالے گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا، جو وقت اسحاق نے بتایا تھا، اسی وقت زیادۃ اللہ نہایت بری موت سے مرا یعنی پہلے وہ پاگل ہوا، اور پھر کچھ دنوں کے بعد اسی عالم میں دنیا سے رخصت ہوگیا۔(۱)

علمی خدمات اور کارنامے

قیروان کے دوران قیام ایک روایت یہ بھی ہے کہ وہ دربار سے علاحدگی کے بعد کامیاب مطب کرتا رہا، علاج کے سلسلے میں متقدمین کے طرز پر اخلاط کو بڑی اہمیت دیتا تھا، تشخیص کے لئے نبض وبول وبراز کا معائنہ اسکے مطب کی خاص شناخت تھی، وہ اپنے مطب میں طب کی تعلیم کا درس بھی دیتا تھا، چنانچہ علی بن اسحاق، زیاد بن خلفوان، اسحاق بن سلیمان اسرائیلی اور ابوبکر محمد بن جراح کے نام اس کے شاگرد کی حیثیت سے لئے جاتے ہیں۔

اس کی اہم طبی تصنیفات میں "کتاب الأدویة المفردة"، "کتاب العنصر والتمام فی الطب" شامل ہیں۔

طبی مہارت وحذاقت کے واقعات

آفریقہ کا حاکم زیادۃ اللہ اغلبی (۹۰۳۔۹۰۷ء) دمہ کا پرانا مریض تھا، ایک

(۱) طبی ڈائجسٹ، حیدرآباد، مئی ۱۹۶۱ء

دن اس نے خالص دہی پی لیا، اس کے پینے کے تھوڑی دیر بعد ہی زیادۃ اللہ کو سانس کی تنگی کا دورہ پڑا اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ سانس اکھڑنے لگی، زیادۃ اللہ نے اپنے طبیب اسحاق بن عمران کے منع کرنے کے باوجود دہی پیا تھا، اور دربار میں ایک دوسرے طبیب نے جو جو یہودی تھا، دہی پینے کے لئے ترغیب دی تھی، دراصل یہ یہودی طبیب اسحاق بن عمران سے پیشہ وارانہ بغض رکھتا تھا۔

اس لئے اس نے اسحاق کو نیچا دکھانے کے لئے اوراس کی عداوت میں زیادۃ اللہ کو دہی استعمال کرنے کی ہدایت دی تھی، لیکن جب حاکم کی یہ حالت دیکھی تو یہودی طبیب بھی گھبرا گیا۔

سب لوگ اسحاق بن عمران کی طرف رجوع ہوئے، اسحاق نے علاج کرنے سے انکار کردیا، اور کہا کہ: اب تم اس یہودی طبیب سے ہی علاج کرواؤ جس نے دہی استعمال کرنے کی اجازت دی ہے، لیکن خوشامد کر کے اس کو کسی نہ کسی طرح راضی کرلیا گیا، اسحاق نے علاج شروع کیا اور بہت سی برف منگوا کر زیادۃ اللہ کو کھلائی اور پھر قئی کرائی، اس ترکیب سے تمام دہی جو برف کی ٹھنڈک پا کر بستہ ہوگیا تھا قئی کے ذریعہ باہر نکل آیا۔

(۲۱) اِبنِ وَافِد

ابو المطرف عبدالرحمن بن محمد بن عبدالکبیر یحیی بن وافد بن ہند اللخمی اندلس کا نہایت مشہور طبیب تھا، شہرِ طلیلہ میں ۳۸۷ھ=۹۹۷ء میں پیدا ہوا، وہ بڑے علمی اور باعزت خانوادے سے تعلق رکھتا تھا، اس سے زیادہ اس کے حالاتِ زندگی نہیں ملتے، تعلیم کے سلسلے میں کتابوں میں مذکور ہے کہ اس نے ارسطو اور دیگر فلاسفر کی کتابوں سے پڑھنا شروع کیا، اس کے بعد اس نے جالینوس اور دیسقوریدس کی طبی کتابوں کا مطالعہ کیا، مفرد ادویہ اس کا خاص موضوع تھا، تمام مفردات کی کتابوں کا اس نے بالاستیعاب مطالعہ کر کے اس میں منفرد حیثیت حاصل کرلی۔

خاص طور سے دیسقوریدس کی "کتاب الحشائش" اور جالینوس کی

"الادویۃ المفردۃ" کا عربی متن اسے زبانی یاد ہو گیا۔

علمی خدمات اور کارنامے

عمر بھر مفردات کی تحقیق میں لگا رہا، ۲؍سال لگاتار محنت کے بعد علم الأدویۃ پر نہایت شاندار کتاب تصنیف کی۔

ابن ابی صبیعہ اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ: اس کتاب کی ترتیب نہایت عمدہ تھی، اس میں ابن وفد نے ادویہ مفردہ کی تمام خاصیتوں اوران کے درجات کو بہت خوبصورتی سے جمع کرلیا تھا، ۲۰؍سال کی محنت کے بعد یہ کتاب اس قدر جامع ہوئی تھی کہ کوئی بات ایسی نہیں تھی جو اس میں درج نہ ہو۔

علاج کے سلسلے میں اس کا اپنا منفرد انداز تھا، وہ ممکن حد تک مرض کا علاج غذا سے کرتا تھا، اگر وہ دوا کا استعمال ضروری ہو تو پہلے مفردات سے علاج کیا جائے اس کے بعد مرکب دواؤں کا استعمال کیا جائے

اس نے درج ذیل کتابیں یادگار چھوڑیں۔

۱- کتاب الادویۃ المفردۃ: یہ کتاب اپنے موضوع پر جامع کتاب ہے، ابن بیطار نے اپنی کتاب "الجامع المفردات الادویۃ والأغذیۃ" میں اس کے حوالے بکثرت لکھے ہیں، ادویہ کی ماہیت کے تضاد کے سلسلے میں اس کی رائے اکثر فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے۔

۲- کتاب الوساد فی الطب۔

۳- مجربات فی الطب۔

۴- کتاب تدقیق النظر فی علل حاسّۃ البصر۔

(۲۲) ابن زہر

پورا نام ابومروان عبدالملک بن ابی العلاء زہر بن ابی العلاء زہر بن ابی مروان عبد الملک بن محمد بن مروان بن زہر ہے، یورپ میں avenzor کے نام سے مشہور ہے،

اشبیلہ میں پیدا ہوا، اس کی تاریخ پیدائش مختلف فیہ ہے، زیادہ قرینِ قیاس یہی ہے کہ وہ ۱۰۹۱ء میں پیدا ہوا۔

ابن زہر کے نام سے تاریخ کی کتابوں میں کئی ایک نام ملتے ہیں، یہ طبیب کتاب التیسیر کا مصنف تھا، یہ نہایت ذی علم خاندان کا شخص تھا، ابن زہر شروع عمر جوانی میں مغرب کے فرماں بردار خاندان رابطین کا شاہی طبیب اور ابراہیم بن یوسف بن تاشفین اس خاندان کے آخری بادشاہ کا طبیب خاص رہا، خلیفہ عبدالمومن کے دربار میں بھی ابومروان ابن زہر کو شاہی طبیب کی خدمات حاصل رہیں، بعد میں وزارتِ عظمی کا قلم دان بھی اس کے سپرد کیا گیا۔

علمی خدمات اور کارنامے

ابن ابی صبیعہ نے لکھا ہے کہ: عبدالمومن اس پر بے حد اعتماد کرتا تھا، ابن زہر نے اس کے لئے تریاق سبعی کا مرکب تیار کیا تھا جو بعد میں سات دواؤں کے مرکب کی شکل میں تریاقِ انتلہ کے نام سے مشہور ہوا۔

ابن زہر کا مرتبہ بحیثیتِ معالج بہت بلند تھا، اپنی حذاقت اور طبابت کی بدولت تمام عمر خلفاء کے دربار میں نہایت عزت واکرام کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا۔

منور جہاں رشید نہ ول ڈیوراں کے حوالہ سے لکھا ہے کہ: ابن زہر جالینوس کے بعد سب سے بڑا طبیب تھا، طب کے علاوہ علم الجراحت میں دسترس رکھتا تھا، گردے کی پتھری، قصبۃ الریہ کی جراحت اور نزول الماء کے علاوہ اور بہت سی حالتوں کی حاجت میں وہ زبردست مہارت رکھتا تھا۔

Ibn zuher's forte was clinical description, he left classical analysis of mediasterial tumors, pericarditis intetimal tuber culosis and pharyngeal paralysis tranlations of the tasir into Hebrew and latin

deeplyinfuenced European medicine (the age of faith p.330)

اس کی معالجانہ مہارت اور تشخیصی مہارت کے سلسلہ میں درج ذیل واقعات دلچسپ معلومات فراہم کرتے ہیں۔

مشہور ہے کہ خلیفہ عبدالمؤمن مسہل دواؤں سے بہت گھبراتا تھا، چنانچہ ابن زاہر نے یہ تدابیر اختیار کی کہ شاہی باغ میں انگور کی بیل کو مسہل ادویہ کے خیسپاندہ سے سیراب کرنا شروع کیا، یہ سلسلہ چلتا رہا، جب پھل آئے تو عبدالمومن کو وہی انگور کھلائے، اس طرح اسے دوسرے مسہلات کے استعمال سے نجات مل گئی۔

دوسرا واقعہ یوں ہے کہ خلیفہ کے جانے کے راستہ میں ابن زہر کو ایک مریض دکھائی دیتا تھا، اس کا پیٹ پھول گیا تھا، اوراس کا بدن زرد پڑ گیا تھا، اس مریض نے جب ابن زہر سے علاج کرانا چاہا تو ابن زہر نے مریض سے اس کے سرہانے رکھے ہوئے گھڑے کو توڑنے کی ہدایت دی، چنانچہ جب گھڑا توڑا گیا تو اس سے ایک مینڈک نکلا، ابن زہر نے کہا: تیری بیماری کا یہی سبب تھا، بعد میں مریض تندرست ہوگیا

ابن زہر نے اپنی ''کتاب التیسیر'' میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ اشبیلیہ کے حاکم کے دل میں یہ وسوسہ پیدا ہوا کہ اسے موت آگئی ہے اوراس کے اندر قوتِ گویائی وقوتِ حرکت ختم ہوگئی ہے، میں نے اسکی نبض دیکھی، لیکن اس میں ان سب چیزوں کی علامت نہیں تھی، البتہ نبض سے مزاج کی گرمی یا معدہ میں کسی گرم خلط کی موجودگی کا پتہ چلتا تھا، میں نے بہت سی دوائیں دیں، مگر کسی سے بھی فائدہ نہیں ہوا، دوسرے اطباء نے بھی اس کا علاج کیا، مگران کی دوا نے بھی کوئی کام نہیں کیا، میں اسبابِ مرض پر برابر غور کرتا رہا، اور آخراس نتیجہ پر پہنچا کہ اس کا سبب کوئی اندرونی شئی ہے جو باہر سے جسم میں داخل ہوئی ہے، میں نے مریض کے تیمارداروں سے اس کے پینے کے پانی کو منگوایا، جیسے ہی میں نے اس پانی کو منہ سے لگایا تو مجھ کو ایک ناگوار بو محسوس ہوئی، بعد میں میں نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ پانی کے برتن میں غلیظ اور سڑا ہوا گوشت پڑا ہوا ہے، اوراس میں

کیڑے پیدا ہوگئے ہیں، اس متعفن گوشت سے بخارات پیدا ہوکر دماغ کی طرف چڑھ رہے تھے، جس سے وسوسہ کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی، میں نے مریض کے تیمارداروں سے بتایا کہ مریض جو پانی استعمال کررہا ہے، یہی اس کے مرض کا سبب ہے جس کے دور کرنے پر مرض بھی ختم ہوگیا۔

بحیثیتِ مصنف ابن زہر نے مشرق ومغرب میں کافی شہرت حاصل کی ہے، خاص طور سے اس کی تصنیف ’’کتاب التیسیر‘‘ نمایاں اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں تیس رسالے ہیں، یہ کتاب انہوں نے ابن رشد کی فرمائش پر تحریر کی ہے، ابن زہر نے بعض ایسی بیماریوں کی تفصیل بیان کی جو اس سے پہلے اطباء کو معلوم نہیں تھیں، مثلا ''التہاب حجاب'' پردہ شکم کے اوپر پھیپھڑوں کے درمیان خالی جگہ میں رسولی کا پیدا ہونا، دل کے بیرونی غلاف پر پھوڑوں کا نمودار ہونا، حلق کا فالج، خارش، کان کے درمیانی حصہ کے متورم ہونا اورانتڑیوں کا گھلنا وغیرہ، انہوں نے بعض ایسی رسولیوں کا ذکر سب سے پہلے کیا جن پر ان سے پہلے کسی نے بحث نہیں کی تھی، ابن زہر نے نرخرے کے ذریعے مصنوعی طور پر غذا کی ترسیل کے عمل کی وضاحت کی اور طبیعت وآب وہوا کی معالجاتی اہمیت کی طرف توجہ دلائی، انہوں نے ٹوٹی ہوئی ہڈی کو جوڑنے اوراکھڑی ہوئی ہڈی کو جوڑنے کے طریقے ایجاد کئے، انکا کہنا تھا کہ شہد اور چینی کے ساتھ دوا لی جائے تو وہ جگر تک پہنچتی ہے؛ جہاں جگران چیزوں کے ساتھ عمل کرتا ہے۔

مذہبی رنگ اوردینی مزاج

ابن زہر امورِ شرعیہ کا سخت پابند اور دینی مزاج کا مکمل پرتو اور خیر وبھلائی کو پسند کرنے والا واقع ہوا تھا۔

(۲۳) صَالِحُ بنُ بَہْلَہ

سرزمین عرب پر پہلا کامیاب ترین ہندوستانی طبیب صالح بن بہلہ کے نام کے سلسلے میں مورخین میں اختلاف پایا جاتا ہے، کچھ نے صالح بن بہلہ اور کچھ نے ابن سہل

لکھا ہے، ڈاکٹر زبیر صدیقی کا خیال ہے کہ یہ لفظ صالے تھا، جو عربی زبان میں کثیر الاستعمال ہوکر صالح ہوگیا، موصوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ ممکن ہے کہ وہ مسلمان ہوگیا ہو، اوراس کے بعد اس کا نام صالح رکھا گیا ہو، یہ بات زیادہ درست معلوم ہوتی ہے؛ کیونکہ قاضی اطہر مبارک پوری نے ہندوستانی اطباء کی فہرست میں ایک طبیب کا نام حسن بن صالح بن بہلہ لکھا ہے، قرینِ قیاس یہ ہے کہ اسلام لانے کے بعد اس کے لڑکے کا مسلمان نام رکھا گیا ہو۔(۱)

علمی خدمات اور کارنامے

یہ شخص ویدک علاج کا بڑا ماہر تھا صحت اور ہلاکت کے متعلق پیشن گوئی میں مہارت رکھتا تھا، اس کی تصنیفی حیثیت مؤرخین تسلیم نہیں کرتے، البتہ ایک کامیاب معالج کی حیثیت سے ابن ابی صبیعہ کے حوالے سے درج ذیل واقعہ تقریباً تمام مصنفین نے لکھا ہے۔

ایک مرتبہ ہارون رشید کا چچا زاد بھائی بہت زیادہ بیمار ہوگیا، درباری اطباء کے علاج سے کوئی فائدہ نہ ہوا، معاملہ جندی نیشاپوری طبیب جبریل بن بختیشوع کے بھی بس کا نہ رہا، مسئلہ خلیفۂ وقت ہارون رشید کے پاس پہنچا، اس نے اپنے مشیر کاروں سے مشورہ طلب کیا تو جعفر بن یحی برمکی جو ہندوستانی اطباء کو بہت پسند کرتا تھا، اس نے کہا: جبریل رومی طب کا ماہر ہے، اس کی ناکامی کے بعد طبیب صالح بن بہلہ سے علاج کرایا جائے، ہارون رشید کے حکم سے صالح بن بہلہ نے علاج کیا، لیکن علاج کے کچھ دنوں کے بعد اس کی اطلاع ہارون رشید کو پہنچی تو اس صالح بن بہلہ کو سخت لعنت ملامت کی اس پر صالح بن بہلہ اپنی بات پر اٹل رہا اور اس نے دوسری دوائیں استعمال کرائیں بالآخر وہ اس مرض سے شفایاب ہوا اور کافی دنوں زندہ رہا۔(۲)

(۱) خلافتِ عباسیہ اور ہندوستان: ۳۸۴

(۲) عیون الانباء فی طبقات الاطباء: ۲/ ۳۳

(۲۴) ابن بیطار

اس کا پورا نام ابو محمد عبداللہ بن احمد المالقی النباتی تھا، اسی نسبت سے اسے مالقی اور اندلسی بھی کہتے ہیں، لیکن ابن بیطار کے نام سے مشہور رہا، ۱۱۹۷ء میں بمقام ملاگا پیدا ہوا، یہ اپنے زمانے کا سب سے بڑا نباتاتی طبیب تھا، اور ملک الکامل کا درباری طبیب تھا، اس نے ادویہ کی شکل وصورت، جائے پیدائش، افعال وخواص کا پتہ لگایا، ابن بیطار میں بچپن ہی سے نباتی پودوں سے دلچسپی تھی۔

علمی خدمات اور کارنامے: علمِ نباتات کے سلسلے میں ابن بیطار عمر بھر سفر کرتا رہا، چنانچہ تاریخی حوالوں میں مذکور ہے کہ ۲۰/ سال کی عمر میں وہ مراکش، الجزائر کا سفر کرتے ہوئے ۱۲۲۴ء میں تونس وارد ہوا، اس سلسلہ میں مصر پہنچا، یہاں اس کی ملاقات ایوبی خاندان کے مشہور بادشاہ الملک الکامل سے ہوئی، ملک الکامل ابن بیطار کے نباتی ذوق وتجسس کو دیکھ کر بہت متأثر ہوا اور اس کے کام دیکھ کر اپنے یہاں "رئیس العشاب" نباتات کا افسرِ اعلیٰ مقرر کیا، اس کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے ملک صالح نجم الدین کے دور میں بھی ابن بیطار کو عزت واکرام سے نوازا جاتا رہا۔

ابن بیطار ساری عمر نباتات کی تحقیق کے لئے مشرق ومغرب کے ممالک کا سفر کرتا رہا، بالآخر ۱۲۴۸ء میں بہ مقام دمشق وفات پائی۔

ابن البیطار کی درج ذیل کتابوں کا تذکرہ حوالوں میں ملتا ہے(۱) کتاب الجامع لادویۃ المفردۃ والأغذیۃ، (۲) الابانۃ والاعلام (۳) کتاب المعنی فی العلاج بالادویۃ المفردۃ

ابن بیطار کی طبی حذاقت ومہارت

ایک مرتبہ ایک شخص نے ایک بوٹی بادشاہ کو دی اور کہا کہ: ابن بیطار نے اپنے آپ کو بہت قابل سمجھتا ہے، اس کو یہ بوٹی سونگھنے کے لئے دیں تا کہ اندازہ ہوسکے کہ اس کے اندر کتنی قابلیت ہے، چنانچہ بادشاہ کے حکم سے ابن بیطار نے بوٹی کو ایک طرف سے سونگھا،

سونگھتے ہی ناک سے خون جاری ہوگیا، یہ دیکھ کر سبھی لوگ حیرت زدہ ہوگئے، مگر فوراً ہی اس نے بوٹی کو دوسری طرف سے سونگھا تو ایکدم خون کا بہنا بند ہوگیا، ابن بیطار نے کہا کہ: اب یہ بوٹی کو خود وہ شخص بھی سونگھے جو اس کو لایا ہے، تا کہ اس کی قابلیت کا بھی اندازہ ہو سکے، ورنہ اس کو جاہل سمجھا جائے گا، بادشاہ کے حکم سے اس شخص نے بھی بوٹی کو ایک طرف سے سونگھا، سونگھتے ہی اس کی ناک سے بھی خون جاری ہوگیا، لیکن اس کو یہ نہیں معلوم تھا کہ بوٹی کو دوسری طرف سونگھنے سے خون بند ہوتا ہے، چنانچہ وہ شخص خون بند کرنے میں ناکام رہا، اور اس کی ناک سے کافی خون بہہ گیا جس سے اس کی حالت خراب ہوگئی، اور خون زیادہ نکل جانے کی وجہ سے وہ قریب المرگ ہوگیا، بادشاہ کو تشویش ہوئی اس نے بوٹی کو دوسرے رخ سے سونگھنے کو کہا، جیسے ہی اس شخص نے سونگھا نکسیر فوراً بند ہوگئی۔

(۲۵) ابن جلجل (م ۹۹۴ء)

ابن جلجل کا پورا نام ابوداؤد سلیمان بن حسان ابن جلجل تھا ان کی پیدائش ۹۴۴ء میں قرطبہ میں پیدا ہوا،، وہ طبیب بھی تھا، اور ماہر علم الادویہ بھی، اس کا شمار اپنے وقت کے عظیم اطباء میں ہوتا تھا، اسی وجہ سے وہ خلیفہ ہشام مؤید اللہ دور حکومت (۹۷۶=۱۰۰۹ء) کا ذاتی معالج بھی بنا، اس نے طب کی تعلیم نکولاس (Nicolas) نامی مشہور عیسائی طبیب کی سرپرستی اور ابن نشا پرست نامی ایک یہودی طبیب کی صدارت میں قام ء، دس اطباء کی مجلس کے ارکان سے حاصل کی، ابن جلجل کے زمانے میں علم الادویہ پر دیوسقوریدوس (Dioscorides) کی کتاب بہت معلوماتی، معتبر اور متداول مانی جاتی تھی، اس کے مطالعہ کے بغیر علم الأدویہ کے بارے میں طبیب کا علم ناقص رہتا تھا، ابن جلجل نے اس کتاب کا مطالعہ تو کیا ہی اور اس کی تشریح بھی لکھی جو تفسیر **اسماء الأدویہ المفردۃ من** کتاب دیویقوریدوس کہلاتی ہے، یہ کتاب ۹۸۲ء میں مکمل ہوئی۔

ابن جلجل کی ایک اور تصنیف طبقات الأطباء والحکماء بہت مشہور ہوئی، اس مس اس نے ستاون (۵۷) عظیم اطباء کے حالاتِ زندگی اوران کی طبی خدمات کا احاطہ کیا ہے،

ان میں یونان اور اس کے مشرق میں واقع ممالک سے تعلق رکھنے والے اطباء بھی تھے اور یونان کے مغرب میں واقع ممالک کے اطباء بھی، اول الذکر علاقے کے اطباء وحکماء میں بقراط، دیوسقوریدوس، افلاطون، ارسطو، جالینوس، بطلیموس، اقلیدس، یعقوب الکندی، حنین ابن اسحاق اور زکریا رازی وغیرہ شامل ہیں، مغربی اطباء ان کے مقابلے میں کم معروف ہیں۔

اس کتاب میں ابن جلجل نے حضرت عمر بن عبد العزیز (دور حکومت ۷۱۷ تا ۷۱۹ء) کے بارے میں ایک بہت معلومات افزا بات لکھی ہے کہ گو کہ وہ ظہور اسلام کے بہت ابتدائی دور کے فرماں روا رہے تھے، پھر بھی انہیں یونانی حکماء کی کتابیں عربی میں منتقل کرانے کا بہت شوق تھا، اس لئے انہوں نے اسکندریہ کے محقق اہرن بن اعین کی تصانیف کا سریانی سے عربی میں ترجمہ کرانے کا حکم دیا تھا۔

ابن جلجل نے ایک مقالہ تریاقوں پر بھی لکھا جس کا نام "**مقالہ فی أدویۃ الترياق**" ہے۔

ابن جلجل پیدائشی اندلسی ہے، پھر بھی اس کی تصانیف عربی زبان میں ہیں، یہ صورتِ حال اس بات کی دلالت کرتی ہے کہ عربی زبان اندلس تک سائنس کی زبان بن چکی تھی، ابن جلجل نے ۹۹۴ء میں وفات پائی۔

(۲۶) تمیمی

ابن الجزار کے بعد شمالی افریقہ میں چند برسوں کے وقفے میں مزید تین عظیم اطباء پیدا ہوئے، وہ طب کی تاریخ میں تمیمی، موصلی اور ابن رضوان کے نام سے مشہور ہوئے۔

تمیمی کا پورا نام ابوعبداللہ محمد بن احمد بن ساعد تمیمی المقدسی تھا؛ کیوں کہ ان کی پیدائش فلسطین میں ہوئی تھی، ۹۷۰ء کے لگ بھگ وہ مصر منتقل ہوئے، شہرت انہوں نے مصر منتقل ہونے کے بعد ہی حاصل کی، ان کے مصر منتقل ہونے کی وجہ یہ تھی کہ وہاں فاطمی حکمراں معز باللہ بہت علم دوست انسان تھا، وہ علماء اطباء کو بہت پرکشش تنخواہیں دیا کرتا تھا،

اس لئے فاطمی حکومت کی حدود کے باہر سے بھی اہل اپنا مولد ومسکن چھوڑ کر چلے آتے تھے۔

تمیمی بہت اعلیٰ پائے کا طبیب بھی تھا اور بہت اعلیٰ پائے کا ماہر علم الادویہ بھی، جب وہ فلسطین سے مصر آیا تو اس نے مصر کے قدیم شہر فسطاط میں جہاں پر آج کل قاہرہ واقع ہے، طبابت شروع کی۔

علم الادویۃ میں اس کی مہارت کا ثبوت اس کی طبی تصنیفات اور اس کے نسخے ہیں، تاریخ طب کے مسلم الثبوت منصف سامی حمارنا لکھتے ہیں کہ اس نے تریاق پر بھی ایک کتاب لکھی جو اس موضوع پر لکھی جانے والی تمام کتابوں پر سبقت لے گئی، زہر خورانی کے علاج پر وہ دنیا بھر میں لکھی جانے والی تمام کتابوں پر فائق تھی، وہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی کہ تمیمی نے اس کے مزید دو طرح کے نسخے تیار کئے تھے، ایک درمیانی درجہ کا اور دوسرا مختصر قسم کا کیوں کہ اصل نسخہ بہت ضخیم تھا، اس نے ایک تریاق بھی تیار کیا تھا جو ہر قسم کے زہر کا توڑ کرنے کارگر تھا، اس کا نام اس نے مخلص النفوس رکھا تھا۔

اس نے ایک نادر معجون بھی تیار کیا تھا جس کا نام اس نے مفتاح السرور رکھا تھا، اس معجون کی تاثیر یہ تھی کہ وہ انسان کو تفکرات اور درد سے نجات دیتا اور روح کو سرور بخشتا۔

تمیمی کے ان سب کاموں سے بھی بڑا کام سامی حمارنا کے بقول اس کی تصنیف بعنوان **المرشد إليجواهر الأغذية وقوى المفردات من الأدوية** ہے، اس میں اس نے قدرتی پیداواروں کی خصوصیات اوران کے استعمالات کو بیان کیا ہے، یہ اتنی اعلی پائے کی تصنیف تھی کہ اس نے علی بن رضوان (م ۱۰۶۸ء) سے بھی خراج تحسین حاصل کیا۔

تمیمی کا قیام مصر میں ۳۷۰ھ/۹۸۰ء تک ضرور تھا، اس کی وفات کی تاریخ قطعیت کے ساتھ معلوم نہیں۔

(۲۷)ابن رضوان(۱۰۰۷-۱۰۶۸ء)

عمار موصلی کے چند ہی برس بعد ۳۹۷، ۱۰۰۷ میں ایک اور مایہ ناز طبیب ابن

رضوان قاہرہ کے قریب واقع غزہ (Giza) نامی شہر میں پیدا ہوا، واضح رہے: ہ جارج سارٹن نے اس کا سنہ ولادت ۹۹۸ء لکھا ہے، اس کا پورا نام ابوالحسن علی بن رضوان مصری تھا، اس کا باپ ایک نانبائی کے یہاں ملازم تھا؛ مگر اس ملازم کے بیٹے نے اپنی محنت شاقہ سے جیسا عروج حاصل کیا، ویسے عروج کی مثالیں کم ہی ملتی ہیں، اوائل عمر میں ابن رضوان ایک نجومی تھا اور قسمت کا حال بتانے کے لئے اپنے شہر کی ایک گلی کے نکڑ پر بیٹھا کرتا تھا، وہی شخص اپنی صلاحیتوں کے مناسب استعمال سے طب میں اتنے اعلی مقام پر پہنچا کہ اپنے عہد کے عظیم ترین اطباء میں شمار ہونے لگے۔

اس نے تعلیم تو کئی مضامین میں حاصل کی جن میں فطری علوم منطق، فلکیات، مابعد الطبعیات بھی شامل ہیں، مگر اسے زیادہ دلچسپی طب سے رہی، اسی وجہ سے اس نے اس میں بڑا اعلی مقام حاصل کیا، طبابت کے پیشے میں اسے پہلی ملازمت ۳۴ سال کی عمر میں ۱۰۴۱ء میں ایک اسپتال میں معاون طبیب کی ملی، اس پیشے میں داخل ہونے کے بعد اس نے بہت تیزی سے ترقی کرنی شروع کی، وہ خود لکھتا ہے کہ صرف سات سال کے اندر اندر اسے اس قدر اعزازات اور مادی فوائد حاصل ہوئے کہ انہیں اس نے خواب وخیال بھی اپنے لئے ممکن الحصول نہیں سمجھا تھا، اپنی آمدنی سے اس نے بڑی جائداد بنائی اور بہت سا سونا چاندی خریدا، ۱۰۶۶ء میں وہ مصر کے حکمراں مستنصر کا شاہی طبیب بن گیا۔

ابن رضوان نے طبی اخلاقیات کے سات زریں اصول وضع کئے تھے جن کا تذکرہ آئندہ صفحات میں کیا جارہا ہے، تاہم ابن صبیعہ کا کہنا ہے کہ یہ سات اصول بقراط سے ماخوذ تھے۔

طب پر ابن رضوان کی گہری نظر تھی اور اس نے قدما میں سے تقریبا سب کی تصانیف پڑھ رکھی تھیں، جن میں بقراط، دیوسقوریدوس (Dioscorides) جالینوس، ایفیسس کا روفس (Rufus of Eph Ephesus) ابن ربن طبری، زکریا رازی، ابن الجزار اور ابن سینا وغیرہ شامل ہیں، اس نے جالینوس کی کتاب (Ars

parva) کی شرح لکھی، اس کے علاوہ اس نے خود بھی کتابیں لکھیں، اس کی اہم تصانیف کے نام درج ذیل ہیں: فی شرف الطب، جالینوس کی الفراق کی تشریح، حل شکوك الرازی علی کتب جالینوس، الأصول فی الطب پر تبصرہ، المتطارق بالطب إلى الصاعدة، النافع فی کفائت تعلیم صناعة الطب، طبیب فاضل، صیدنات الطب، کفائت الطب۔

ابن رضوان مصری نے ۴۶۰ھ مطابق ۱۰۶۸ء میں قاہرہ میں وفات پائی، اس کی وفات کی ابن ابی صبیعہ کی دی ہوئی تاریخ ۴۵۳ھ مطابق ۱۰۶۱ء درست نظر نہیں آتی، کیوں کہ شاہی طبیب کے منصب پر اس کی تقرری سامی حمارنا کے مطابق ۴۵۹ھ مطابق ۱۰۶۶ء کو عمل میں آئی تھی۔

(۲۸) ابن عین زربی

ابن عین زربی ایک عربی النسل طبیب تھا، وہ ایشیائے کوچک میں پیدا ہوا، ابن رضوان کی ہی طرح سے اسے ابتداء میں طب سے زیادہ دلچسپی نجوم سے تھی اور اسی کی طرح وہ کسبِ معاش کے لئے بغداد کی ایک گلی کے نکڑ پر بیٹھا کرتا تھا، فاطمی حکمرانوں کی علم نوازی نے اسے بھی کھینچ کر قاہرہ پہنچا دیا جہاں اس کے ایک قدر شناس نے اس کا تعارف قاہرہ کے چند قدر دانوں سے کرا دیا، اس وقت سے اس کی قسمت کا تارہ چمک اٹھا کیوں کہ پھر فاطمی حکمراں ظافر کے عہدِ حکومت میں (۱۱۴۹ء=۱۱۵۴ء) اس کی رسائی دربار تک ہوئی۔

نجوم کا پیشہ ترک کر کے جب اس نے طبابت کا پیشہ اختیار کیا تو اس نے بہت نام پیدا کیا، اس نے طب پر چھ عدد کتابیں بھی تصنیف کیں، ان میں طب کے بارے میں اپنے ذاتی تجربات، مشاہدات اور نظریات پیش کئے، اپنی ایک تصنیف الکافی فی صناعة الطب میں اس نے صحت مند زندگی گزارنے کے لئے چند اصول پیش کئے تھے، صاف ستھری ہوا، کام کاج میں اور کھانے پینے میں اعتدال پسندی، جذبات میں

توازن اور جسمانی ورزش، بیماروں کے علاج میں اس نے اولا غذا پھر دوا اور بالآخر آپریشن کی ترتیب مقرر کی۔

ابن عین زربی کے بارے میں ایک اور خاص بات یہ ہے کہ اس نے بیماریوں کے بارے میں پیش آگہی حاصل کرنے پر زور دیا؛ تاکہ ایسے احتیاطی اقدامات کئے جائیں کہ بیماری سے واسطہ ہی نہ پڑے، نجومی ہونے کی بناء پر پیش آگہی حاصل کرنے کے لئے اس نے علم نجوم کو استعمال کرنے کی سفارش کی۔

اس نے ۱۱۵۳ء میں قاہرہ میں وفات پائی۔

(۲۹) حکیم علی گیلانی

حکیم علی گیلانی عہدِ اکبری کا نہایت نامور طبیب تھا، مشہور زمانہ علمی مرکز گیلان کا باشندہ تھا، ۹۶۲ھ/۱۵۵۴ء میں پیدا ہوا، اس کے اہم متعلقین میں اس کے ماموں حکیم الملک شمس الدین گیلانی اور حکیم فتح اللہ شیرازی کے نام خاص طور قابلِ ذکر ہیں۔

علومِ عقلیہ کی تعلیم شیخ عبد النبی بن شیخ احمد گنگوہی سے حاصل کی، طب حکیم فتح اللہ شیرازی سے سیکھا، بے حد پریشان حال اور مفلسی کے حالات میں ہندوستان آیا، کچھ دن دکن میں قیام کر کے دہلی آنا ہوا جہاں خوش قسمتی سے شاہی ملازمت ملنے سے حالات بہتر ہوئے، مذہب کے لحاظ سے شیعہ تھا، بے حد خلیق اور شریف انسان تھا، حالات سنبھلتے ہی اس نے اپنی جیب سے ۶/ہزار روپے سالانہ غریبوں کے لئے وقف کر دیا۔

طبیب اور مصنف ہونے کے علاوہ اسے تعمیرات سے بھی گہری دلچسپی تھی، لاہور کا عجیب وغریب حوض بھی اس کی فن تعمیر کا شاہکار ہے۔

حذاقت اور طبی مہارت

حکیم علی گیلانی نے ایک مرتبہ رمضان المبارک میں عین افطار کے وقت مچھلی کھالی، جس سے شدید پیاس لگی، اور اس کے ازالہ کے لئے انہوں نے بہت زیادہ پانی پی لیا، اور کئی کٹورے خالی کر دئے، اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ پیٹ پھول گیا اور سانس لینے میں تنگی

ہونے لگی، پیٹ کا تناؤ اتنا بڑھ گیا کہ معلوم ہوتا تھا کہ پیٹ پھٹ جائے گا، حکیم نے اپنے مرض پر غور کیا، اور نتیجہ یہ نکالا کہ یہ سب مچھلی کا فساد ہے، جس سے غلیظ رطوبت پیدا ہوگئی ہے، جب تک یہ جسم سے باہر نہیں نکلے گی تکلیف دور نہ ہوگی، چنانچہ انہوں نے دارچینی کو پانی میں جوش دے کر پی لیا جس سے فوراً قئی شروع ہوگئی اور مادۂ غلیظہ قئے کے ذریعہ خارج ہوگیا، اور تمام شکایات رفع ہوگئیں۔(۱)

مشہور ہے کہ ان کی حذاقت کے امتحان کے لئے شہنشاہِ اکبر نے حکیم علی کے سامنے مریض، صحت مند گائے اور گدھے کے قارورے پیش کئے، حکیم علی نے تجربہ اور قیاس کی بناء پر فوراً تینوں کی علاحدہ شناخت کرادی، ان کی اس حذاقت سے اکبر بادشاہ (۱۶۹۶ء) میں بہت خوش ہوئے اور ان کو اپنے دربار میں نہایت اہم مقام عطا فرمایا۔(۲)

(۳۰) حکیم محمد ہاشم علوی خاں

ان کا اصلی نام سید محمد ہاشم بن حکیم محمد ہادی بن مظفر الدین علوی تھا، رمضان ۱۰۸۰ھ = ۱۶۷۰ھ میں دار العلم شیراز میں پیدا ہوئے، ۱۶۹۹ء میں ہند پاکستان آئے اور عالمگیر بادشاہ کی خدمت میں خلعت ومنصب سے سرفراز ہوئے، محمد اعظم شاہ کی خدمت پر بھی متعین ہوئے، شاہ عالم بہادر شاہ کے عہد میں علوی خطاب ملا، اس کے علاوہ منصب میں بھی اضافہ ہوا اور جاگیر ملی، محمد شاہ بادشاہ کا بہت کامیاب علاج کیا، بادشاہِ موصوف نے چاندی میں تلوایا، شش ہزار منصب، تین ہزار روپیہ ماہوار ملا، اور معتمد الملک کے خطاب سے نوازا گیا، نادر شاہ بہت اعزاز کے ساتھ اپنے ہمراہ لے گیا، وہاں سے حج بیت اللہ کو گئے، ۱۷۴۳ء میں دہلی واپس ہوئے، ان کی تصانیف میں "**جامع الجوامع**"، قرابادین، مطب حکیم علوی خاں، حاشیہ شرح اسباب وعلامات، شرح موجز القانون، احوال اعضاء النفس اور خلاصہ اور قوانین علاج وغیرہ ہیں، ان میں سے سب سے مشہور "**جامع الجوامع**" ہے جو اسم بامسمی ہے، ۱۵/رجب ۱۱۱۶ھ/ ۱۷۴۹ء میں

(۱) حکایات الاولیاء:۴۹ (۲) اخبارِ کراچی: اپریل:۱۹۹۵ء

مرضِ استسقاء میں وفات ہوئی اور وصیت کے مطابق حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کے قریب میں دفن کیا گیا۔(۱)

(۳۱) حکیم محمد شریف خاں

حکیم محمد شریف خاں ۱۷۱۴ء میں بعہدِ محمد شاہ (م ۱۷۴۸ء) پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم دہلی کے مشہور محدث اور عالم حضرت شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کے مدرسہ میں ہوئی، حکیم عابد سرہندی اور حکیم اچھے صاحب سے طب کی تعلیم حاصل کی، اپنے والد حکیم اجمل خان سے مطب سیکھا، بہت کامیاب مطب رہا، مغل بادشاہ کے درباری طبیب بھی رہے ہیں، آپ کو اشرف الحکماء کا لقب دیا گیا تھا۔

علمی اور طبی خدمات

زبردست حذاقت کی بناء پر حکیم شریف خاں نے بہت جلد شہرت حاصل کر لی، آپ کا مطب دہلی میں مرجع الخلائق تھا، صبح ہی سے بھیڑ لگ جاتی تھی، مطب کے بعد آپ کے اہم شاگردوں میں موری گیٹ کے مرزا محمد کامل عرف پنجہ نے بہت دنوں تک نمایاں خدمات انجام دیں، اسکے علاوہ بہت سے شاگرد ہند و پاک میں طبی خدمات انجام دیتے رہے ہیں، طبی مہارت کی وجہ سے حکیم صاحب کو شاہی طبیب مقرر کیا گیا تھا اور ضلع پانی پت میں ۲۵ ہزار کی جاگیر عطا کی گئی تھی، دربار سے آپ کو اشرف الحکماء کا لقب بھی دیا گیا تھا۔

سر سید احمد خاں اپنی مشہور کتاب آثار الصنادید میں حکیم شریف خاں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ اپنے عصر میں سرآمد حکماء اور سر حلقۂ اطباء تھے، آج تک ان کے کمالات کا شہرہ ازبس بلند ہے، جالینوس اور ارسطو کا فلسفہ ان کے سامنے ایسا ہی ہے جیسے طوطی کی آواز نقار خانے میں۔

ان کے تصانیف میں "علاج الامراض"، "عجالۂ نافعہ"، "میزان الطب"، "حدود

(۱) طبی مقالات:۳۸۶

الأمراض''،''قواعدِ شریفیہ''،''حاشیہ کلیاتِ نفیسی''،''حاشیہ شرح اسباب''،''تحفۂ عالم شاہی''، ''شرح حمیات قانون''،''دستور الفصد''، ''تالیفِ شریفی''،''رسالہ خواص الجواہر''،''رسالۂ چوبِ چینی'' یہ سب شامل ہیں ۱۸۹۷ء میں دہلی میں وفات پائی تھی اور درگاہ قطب صاحب مہرولی میں دفن ہوئے۔

آپ نے مشکوۃ شریف کا فارسی ترجمہ ''کاشف المشکوۃ'' کے نام سے کیا ہے، اس کے علاوہ شاہ عالم ثانی کے حکم سے قرآن شریف کا اردو ترجمہ بھی کیا تھا۔

(۳۲) حکیم مومن خان

حکیم مومن خان مومن بن حکیم غلام نبی خاں (۱۲۴۱ھ) بن حکیم نامدار خان کوچۂ جیلان دہلی میں پیدا ہوئے، تعلیم کا آغاز گھر سے ہوا، پھر ابتدائی تعلیم شاہ عبد العزیز صاحب رحمہ اللہ کے مدرسہ میں شروع ہوئی، اس کے بعد شاہ عبد القادر رحمہ اللہ سے شرفِ تلمذ حاصل کیا اور انہیں سے عربی، فارسی، حدیث، فقہ اور منطق وغیرہ کی تعلیم حاصل کی، طب کی تعلیم اپنے چچا حکیم غلام حیدر خان اور والد حکیم نبی خان سے حاصل کی، آپ ایک بلند پایہ شاعر بھی تھے، اس کے علاوہ علم نجوم اور فن موسیقی میں بھی دسترس رکھتے تھے، آپ ایک اچھے عامل بھی تھے، ۱۸۵۱ء میں دہلی میں وفات پائی۔

طبی حذاقت اور کارنامے

ایک مرتبہ حکیم مومن خان مطب میں مریضوں کا معائنہ کررہے تھے، ایک شخص آیا اور اس نے اپنی نبض حکیم صاحب کی طرف بڑھائی، حکیم صاحب نے نبض دیکھ کر نسخہ لکھ دیا اور کہا کہ: ان دواؤں کو عطار سے خریدلیں، کچھ روز بعد وہ شخص حکیم صاحب کے پاس آیا، حکیم صاحب نے نبض دیکھ کر اس سے نسخہ مانگا، اس پر مریض تعجب کے انداز میں کہنے لگا کہ: اس نسخہ کو تو میں برابر دو دن سے ابال کر پی رہا ہوں اور مجھے کافی فائدہ ہے اور میرا مرض اب تقریباً ختم ہوگیا ہے، آپ وہی نسخہ پھر مجھے لکھ کردیں، تاکہ رہا سہا مرض بھی ختم ہوجائے، حکیم صاحب نے بجائے ناراض ہونے یا تعجب کرنے کے مریض کی فرمائش پر

وہی نسخہ پھر لکھ دیا اور شاگردوں سے کہا کہ: مریض کو اس نسخہ پر اعتماد ہوگیا ہے، اسلئے اگر میں ٹوکتا اور اس کی غلطی بتاتا تو پھر اس کو مزید فائدہ نہیں ہوسکتا تھا، اسلئے میں نے مریض کے اعتقاد کو مجروح نہیں کیا۔(۱)

(۳۳) حکیم شیر علی بن حکیم محی الدین

حکیم شیر علی بن حکیم محی الدین صدیقی نے علم طب کی درسی کتابیں اپنے والد ماجد سے پڑھیں، اس کے بعد لکھنو میں حکیم امام بخش کی سرپرستی میں مطب شروع کیا اور پھر طبیب حاذق ہوکر نواب آصف الدولۃ بہادر کے دورِ حکومت میں تحصیل داری اور فوجداری کی؛ لیکن بڑھاپے میں گوشہ نشیں ہوگئے، نہایت متقی وصوم وصلوۃ کے پابند تھے، ہروقت ذکرواذکار میں مشغول رہتے تھے، آپ کے نسخے میں دوا کے اجزاء بہت کم ہوتے تھے، مریض کو دیکھنے گھر نہیں جاتے تھے، مطب سے جو آمدنی ہوتی اسے غرباء میں تقسیم کردیتے تھے۔

۱۸۴۰ء میں بخار واسہال کے عارضے میں چندروز مبتلا رہ کر ۷۵ رسال کی عمر میں وفات پائی، سات بیٹے اور پانچ بیٹیاں یادگار چھوڑیں، بیٹوں میں ہر ایک طبیب حاذق تھا۔

طبی خدمات اور حذاقت

ایک مرتبہ لوگ ایک بچے کو حکیم شیر علی احمد آبادی کے پاس لائے، یہ بچہ کان کے درد کی وجہ سے بے ہوش تھا اور جب ہوش آیا تو کہتا تھا کہ کوئی چیز میرے کان میں کاٹ رہی ہے، حکیم صاحب نے فرمایا کہ: حقہ کی نلکی لائی جائے تو اس کو انہوں نے اس کو قلم کی طرح چھری سے تراشا جو ان کے قلم دان میں تھی، اور اس بیمار بچہ میں لگادی، اور دوسری طرف جلتا ہوا ایک فتیلہ رکھ دیا، ذرا دیر نہ ہوئی تھی کہ بچہ کا درد رفع ہوگیا، جب نلکی کو زمین پر مارا تو اس میں ایک ہزار پایہ جسے کھن کھجورہ کہتے ہیں باہر نکلا جسے دیکھ کرلوگ حیران رہ گئے۔

(۱) ہندوستان کے مشہور اطباء: ۷۴

(۳۴)حکیم کفایت اللہ(ولادت ۱۸۰۰ء)

حکیم کفایت اللہ ولد حکیم علیم اللہ امروہہ ضلع مرادآباد کے محلہ کوٹ میں ۱۸۰۰ء میں پیدا ہوئے ،عربی علوم وفنون مفتی شرف الدین رامپوری سے اور طب اپنے والد سے پڑھی، تشخیص میں گویا الہام ہوتا تھا، معالجہ میں یکتائے زمانہ تھے،نسخہ اکثر قلیل الاجزاء لکھتے اورغرباء کے لئے دوائیں مفت دیتے تھے،بعض کتبِ درسیہ پر حواشی بھی لکھے، مگر کوئی تصنیف طبع نہیں ہوئی، جملہ والیان ملک ان کی صحبت چاہتے تھے،اور رؤساء ضلع باادب گفتگو کرتے تھے، زیرِ علاج مریضوں کے قیام وطعام کا انتظام بھی کرتے تھے، ان کے والد حکیم علیم اللہ بھی طب میں امامِ وقت تھے اورانہوں نے حکیم جلال الدین امروہوی سے طب کی تعلیم حاصل کی اور حکیم جلال الدین، حکیم علوی خان دہلوی کے ارشد تلامذۃ میں سے تھے، حکیم علیم اللہ نواب ین رامپور سے متعلق رہ کر زیادہ تر رامپور میں ہی رہے، اور بہت نیک نامی وشہرت پائی، حکیم اعظم خان ان کی علمی وعملی شخصیت سے بہت متاثر رہے،''قرابادین اعظم''میں گیارہ مقامات پر ان کے معمولات کا بطورِ خاص ذکر کیا ہے، حکیم کفایت اللہ مرحوم نے دوفرزند حکیم حکمت اللہ اور حکیم رفعت اللہ یادگار کے طور پر چھوڑے۔(۱)

طبی حذاقت ومہارت کے واقعات

رامپور میں عبد النبی ولد جنگی خان دق میں مبتلا ہو کر حکیم محمد کفایت اللہ خان (۱۸۰۰-۱۸۵۴ء) کے علاج میں آیا اور آپ کے علاج سے مکمل طور پر صحت یاب ہوا مگر حکیم صاحب نے ہدایت فرمائی کہ اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو جماع سے پرہیز ضروری ہے، ایک شب پیمانۂ صبر لبریز ہوا اور ہدایت پر عمل جاری نہ رہ سکا، رات ہی میں سخت طبیعت خراب ہوئی، صبح قارورہ لے کر حکیم صاحب کے پاس بھیجا گیا، آپ نے قارورہ دیکھا اور نسخہ لکھ دیا، نسخہ عطار کے پاس پہنچا، عطار حیران تھا کہ دوا کیا دے، اس میں تو کفن ودفن کا سامان لکھا ہے، اعزہ گھر آئے تو مریض سفرِ آخرت پر روانہ ہو چکا تھا۔(۲)

(۱) تذکرۂ کاملان رامپور:۳۳۶ (۲) آئینۂ عباسی امروہہ:۲۹-۳۰

(۳۵) حکیم محمود خان دہلوی

حکیم محمود خان بن حکیم صادق علی خان بن حکیم شریف خان ۱۸۱۶ء میں اکبر شاہِ ثانی (۱۸۰۶ء-۱۸۳۷ء) کے عہد میں دہلی میں پیدا ہوئے، طب کی ابتدائی تعلیم اپنے بڑے بھائی حکیم غلام محمد اور اپنے والد حکیم صادق علی خان سے حاصل کی، آپ نہایت حاذق طبیب اور ماہر جنسیات تھے، آپ کا مطب مرجعِ خلائق تھا، دن رات مریضوں کا ہجوم رہتا ہے، باوضع بزرگ، اور غرباء پرور تھے، مطب میں امیر وغریب کی کوئی تفریق نہیں تھی، آپ کے مزاج میں کافی غصہ تھا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ نہایت عابد وزاہد متقی وتہجد گذار بھی تھے، جنسی مسائل پر آپ نے بہت تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، اس سلسلے میں آپ کی دو مشہور تصنیفات بھی ہیں، ''ضیاء الأبصار فی حدة الباة'' اور کارنامۂ عشرت'' حکیم محمود خان نے ۱۸۵۷ء کا پرآشوب زمانہ بھی دیکھا تھا، اور قید وبند کی صعوبتیں بھی برداشت کی تھیں، آپ نے ۱۳۰۹/۱۸۹۱ اور بقولِ بعض ۱۹۰۰ء میں دہلی میں وفات پائی، ان کی ایک کتاب ''مطب محمود خان'' کے نام سے بھی ہے۔

طبی حذاقت ومہارت کے واقعات

حکیم محمود خان صاحب کے پاس ایک مریض آیا، اس کے سر میں شدید درد تھا، اور وہ کافی پرانا ہو چکا تھا، کسی بھی علاج سے دور نہیں ہوتا تھا، حکیم صاحب نے تشخیصِ مرض کے لئے مریض سے مختلف سوالات کئے، مریض نے بتایا کہ درس سے پہلے ناک سے خون آیا تھا، حکیم صاحب سمجھ گئے کہ سر کی رگوں میں خون منجمد ہو گیا ہے، اور اسی وجہ سے یہ شکایت ہے، آپ نے بہدانہ بھگو کر اور اس میں مصری ڈال کر بوقتِ صبح استعمال کرنے کو کہا، دو تین روز تک استعمال کرنے کے بعد مریض کی ناک سے خون کے جمے ہوئے لوتھڑے خارج ہوئے، جب تمام خون خارج ہو گیا تو مریض کو کافی سکون محسوس ہوا اور اس کا برسوں کا دردِ سر دور ہوا۔

(۳۶) حکیم عبدالولی بن حکیم عبدالعلی لکھنوی

یہ ۱۸۷۱ء میں بمقام لکھنو پیدا ہوئے، حفظِ قرآن کے بعد مولوی سید مقیم رائے بریلوی سے ابتدائی تعلیم حاصل کی، اعلیٰ تعلیم مولوی افہام اللہ فرنگی محلی رحمہ اللہ سے حاصل کی، اور طب کی تعلیم اپنے والد حکیم عبدالعلی رحمہ اللہ اور چچا عبدالعزیز رحمہ اللہ سے حاصل کی، اس کے بعد درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا، عام روش سے ہٹ کر حکیم صاحب نے اپنے درس میں عبارت کے بجائے مسائل طبیہ پر روشنی ڈالنے اور ان پر بحث وگفتگو کرنے کو اپنا شعار بنایا تھا، آپ کے شاگردوں میں بہت مشہور علماء بھی شامل تھے مثلاً: امام اہل سنت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی رحمہ اللہ، حکیم عبدالحی حسنی رحمہ اللہ، مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی رحمہ اللہ، اور حکیم عبدالحسیب دریابادی رحمہ اللہ وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں، حکیم صاحب کے ساتھ بہت تعاون کیا، آپ انتہائی خلیق، ملنسار اور مہمان نواز تھے، کل ۴۱ رسال عمر پائی اور ۱۹۱۴ء میں استسقاء میں مبتلا ہو کر وفات پائی اور لکھنو میں دفن ہوئے۔(۱)

طبی حذاقت ومہارت

حکیم عبدالولی صاحب کی طبی حذاقت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ حکیم عبدالولی کے مطب کے سامنے روزانہ ایک غیر مسلم بزرگ گذرتے، اسی راستہ سے گومتی ندی میں اشنان کے لئے جاتے تھے، اور واپسی میں حکیم صاحب کو تعظیماً سلام ضرور کرتے تھے، ایک دن وہ اپنے بھائی کے ساتھ اسی طرح سلام کرتے ہوئے گذرے تو حکیم صاحب انہیں دیکھ کر چونک پڑے اور ارے .... کہہ کر ایک دم خاموش ہو گئے، گھر پہنچنے کے بعد ان صاحب کا انتقال ہو گیا، انکے بعد ان صاحب کے بھائی حکیم صاحب کے پاس آئے اور کہا کہ: جب اس دن ہم آپ کے سامنے گذرے تھے آپ چونک کیوں گئے، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کچھ کہنا چاہتے ہیں، اس کی کیا وجہ تھی؟ اور میرا بھائی کا اس وقت گھر جا کر انتقال بھی ہو گیا، حکیم صاحب نے فرمایا کہ:

(۱) تذکرہ خاندانِ عزیزی

آپ کے بھائی کے ماتھے پر چندن کا ٹیکہ لگا تھا اور وہ بالکل گیلا تھا، حالانکہ ندی سے آنے میں اسے خشک ہونا چاہئے تھا، میرے دماغ میں فوراً یہ بات آئی کہ ان صاحب کی حرارت غزیریہ بالکل فنا ہو چکی ہے اور اس کے باوجود وہ زندہ ہیں، لیکن یہ بات ظاہر کرنا مناسب نہیں تھا اور حرارتِ غزیریہ کے اس قدر گر جانے کے بعد اس کا علاج بھی ممکن نہیں، اسلئے میں خاموش رہا۔(۱)

(۳۷) شفاء الملک حکیم حبیب الرحمن خان آخوندزادہ

شفاء الملک حکیم حبیب الرحمن خان آخوندزادہ ۲۳ رمارچ ۱۸۸۱ء کو ڈھاکہ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی، صرف ونحو کی تعلیم حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ سے پڑھی، زیادہ تر درسیات وتعلیم مولانا محمد اسحاق بردوانی رحمہ اللہ، مولانا احمد حسن کانپوری رحمہ اللہ، اور مولانا عبدالوہاب بہاری رحمہ اللہ سے پڑھیں، حدیث مولانا مفتی لطف اللہ علی گڑھی رحمہ اللہ سے اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ کے ایک شاگرد سے پڑھی، طب کی تعلیم مدرسہ طبیّہ دہلی میں حکیم عبدالمجید خان دہلوی رحمہ اللہ (م۱۹۰۱ء) سے حاصل کی، آپ ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے جوائنٹ سکریٹری بنائے گئے، ۱۹۳۰ء میں حبیبیہ طبی کالج کے نام سے ایک کالج کرایہ کی عمارت میں قائم کیا، حکومتِ ہند نے آپ کو اپنی خدمات کی بناء پر ۱۹۳۹ء میں شفاء الملک کا خطاب دیا ۱۹۴۷ء میں آپ کا وصال ہوا۔

طبی خدمات ومہارت

ایک مرتبہ ایک شخص نے شفاء الملک حکیم حبیب الرحمن خان آخوندزادہ کو دکھایا پھر وہ مریض دہلی گیا اور وہاں جا کر اپنے مرض کے سلسلے میں مسیح الملک حکیم اجمل خان صاحب سے رجوع کیا، حکیم صاحب نے اس مریض سے پوچھا کہ: آپ کہاں سے آئے ہیں، اس نے کہا کہ: ڈھاکہ سے، اس پر حکیم اجمل خان نے فرمایا کہ کیا وہاں حکیم حبیب

(۱) تذکرہ خاندانِ عزیزی:۲۱۸

الرحمن خان نہیں ہیں، پھر آپ نے نسخہ لکھ دیا اس نسخہ اور حکیم صاحب حبیب الرحمن خان کے نسخہ میں ذرہ برابر فرق نہیں تھا۔(۱)

اسی طرح ۱۹۴۴ء میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ علیل ہوئے، اوران کی کیفیت مولانا ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ کے ذریعہ حکیم حبیب الرحمن خان رحمہ اللہ کو بتائی گئی، حکیم صاحب نے نسخہ لکھ دیا، لیکن کچھ دنوں کے بعد اطلاع آئی کہ حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ کا مرض بہت بڑھ گیا ہے، حکیم صاحب نے سنکر فرمایا کہ: اب دوا بیکار ہے؛ کیونکہ وقت آخر آپہنچا، چنانچہ حکیم صاحب کے کہنے کے مطابق کچھ دنوں کے بعد مولانا کا انتقال ہوگیا۔

علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ (۱۸۸۴-۱۹۵۳ء) مصنف سیرۃ النبی نے ایک مرتبہ ریڈیو پر تقریر کی، حکیم حبیب الرحمن خان نے ڈھاکہ میں وہ تقریر سنی اور سید صاحب کے پاس خط لکھ کر بھیجا کہ میں نے آپ کی آواز سنی جس سے ضعفِ قلب کا اظہار ہورہا تھا، آپ جلد ہی اس کی طرف توجہ کریں، چنانچہ چندروز کے بعد علامہ ندوی کو ضعفِ قلب کا عارضہ ہوا؛ لیکن اللہ عزوجل نے شفاء عطا فرمائی۔(۲)

(۳۸) حکیم عبدالمجید خاں

آپ حکیم محمود خان کے صاحبزادے اور حکیم اجمل خان کے بڑے بھائی تھے، اور دہلی کے مدرسہ طبیبہ کے بانی تھے، آپ کا انتقال ۱۹۰۱ء میں ہوا اور درگاہ حضرت سید حسن رسول نما کے احاطے میں دفن ہوئے، آپ اپنے وقت کے بڑے عالم وفاضل ہوئے ہیں، والد بزرگوار سے فن طب کی تعلیم حاصل کی، اور انہیں کے زیر نگرانی مطب بھی کیا، آپ ہر معاملہ میں اپنے والد محترم کے نقشِ قدم پر چلے، مطب میں کافی مریض جمع رہتے تھے، آپ دہلی والوں کا بہت خیال رکھتے تھے، آپ کی طبی خدمات کے صلہ میں حکومتِ برطانیہ نے حاذق الملک کے خطاب سے نوازا تھا، آپ نے ۱۸۸۲ء میں مدرسہ طبیبہ کی بنیاد ڈالی جو آج یونانی اینڈ آیورویدک کالج کے نام سے مشہور ہے، آپ اس

(۱) ہندوستان کے مشہور اطباء: ۱۸۱-۱۸۲ (۲) ہندوستان کے مشہور اطباء: ۱۸۲

مدرسہ طبیہ میں قانون کا درس دیا کرتے تھے۔

طبی حذاقت ومہارت

حکیم عبدالمجید خان کے پاس ان کے امتحان کے لئے ایک بار بھینس کا پیشاب لایا گیا اوران سے کہا گیا کہ: یہ ایک عورت کا قارورہ ہے جو دہلی سے باہر رہتی ہے، اور علاج کے لئے آپ کے پاس نہیں آسکتی، آپ براہِ کرم قارورہ دیکھ کر کوئی مناسب نسخہ تجویز فرمادیں:

"کھلی دوسیر، بنولہ ایک سیر، بھوسا بقدرِ ضرورت ہمہ درآب آمیختہ حل کردہ بخورانندہ، اس نسخہ کو دیکھ کر وہ شخص جو قارورہ لایا تھا، چونکا کہ یہ کیا نسخہ ہے، حکیم صاحب نے بغیر کسی ناگواری کے فرمایا کہ: آپ نے مجھے قارورہ دکھایا ہے، اس کے مزاج کے مطابق یہی نسخہ مناسب ہے، یہ سن کر وہ شخص شرمندہ ہوا، اور واپس چلا گیا۔(۱)

(۳۹) مسیح الملک حکیم محمد اجمل خان

خاندان شریفی کے چشم وچراغ ۱۷ رشوال ۱۲۸۴ھ/ ۱۸۶۴ء میں بمقام شریف منزل دہلی ۱۸۶۴ء میں پیدا ہوئے، پہلے قرآن مجید حفظ کیا، پھر فارسی اور عربی کی طرف مائل ہوئے، آپ کے اساتذہ میں صدیق احمد دہلوی رحمہ اللہ، مولوی عبدالحق صاحب تفسیر حقانی رحمہ اللہ، مولوی عبدالرشید رحمہ اللہ، اور مرزا عبداللہ بیگ رحمہ اللہ کے نام کتابوں میں ملتے ہیں، طب کی ابتدائی کتابیں اپنے والد حکیم محمود خان سے اور برادر معظم سے اونچی کتابیں پڑھیں، اور دونوں ہی سے مطب سیکھا، اپنے اخلاق، جذبۂ خدمت خلق، وضع داری اور متحمل مزاجی کی وجہ سے مرجعِ خلائق تھے، پنڈت نہرو انہیں دلی کا بے تاج بادشاہ کہا کرتے تھے، اور لارڈ میگنٹ آف انڈیا کا خطاب دیا گیا تھا، انگریزوں کی طرف سے حاذق الملک اور قوم کی طرف مسیح الملک کے خطاب سے نوازا گیا تھا۔

حکیم شریف دہلوی (۱۱۳۹ھ-۱۲۲۲ء) سے لے کر مسیح الملک حکیم اجمل خان

(۱) ہمدرد طبی کالج میگزین: ۱۹۸۳ء

تک اطباء کاملین کا بے حد خوب صورت سلسلہ بن گیا ہے، یوں تو اس خاندان کے ہر فرد نے طبابت اور تصنیفی وتالیفی کام کے ذریعہ نمایاں خدمات پیش کی ہیں، لیکن محمد شریف خان کے بعد مدرسہ طبیہ دہلی کے بانی حکیم عبدالمجید دہلوی اوران کے برادرِ معظم حاذق الملک کی طبی خدمات زیادہ اہم ہیں، ان کے بعد حکیم محمود خان اور حکیم واصل خان نے اپنے آباء کے ذریعہ ڈالی گئی طبی ارتقاء کی بنیاد کو عمارت کی شکل دینے میں بے نظیر کارنامے انجام دئے خاص طور سے حکیم محمود خان کا تعاون قابل ذکر ہے، مسیح الملک حکیم اجمل خان انہیں محمود خان کے ہونہار فرزند تھے۔

مطب

حکیم اجمل خان رحمہ اللہ کا مطب اپنے دور کا بہت مشہور مطب تھا، سستی اور مفید دوائیں آپ کے نسخہ کا جزو ہوتی تھیں، اپنی مقبولیت کی وجہ سے حکیم صاحب کا مطب ہمیشہ مریضوں سے بھرا رہتا تھا، نبض اور قارورہ سے تمام امراض نہایت کامیابی سے تشخیص کرتے تھے۔(۱)

طبی حذاقت کے واقعات

ایک مریضہ بلگرام سے دہلی آئیں، ان کے پتہ میں پتھری ہوگئی تھی، حالت یہ تھی کہ تمام بدن پر پھوڑے نکل آئے تھے، بدن کا رنگ سیاہی مائل ہوگیا تھا، آنکھوں میں تیرگی تھی اور پیشاب بھی سیاہ ہوتا تھا، لکھنو میڈیکل کالج میں اور دوسرے ڈاکٹروں اور طبیبوں کا مدت تک علاج کرایا گیا، لیکن ذرا بھی فائدہ نہیں ہوا، ڈاکٹروں نے بالاتفاق آپریشن کی رائے دی اور کہا کہ: اس کے علاوہ علاج کی کوئی صورت نہیں ہے، لیکن مریضہ کمزور ہے اس کے لئے آپریشن خطرناک ہوگا، کوئی ذمہ داری نہیں لی جاسکتی، مریضہ سب طرف سے مایوس ہوکر دہلی چلی گئیں، اور ۲/ماہ تک مسیح الملک حکیم اجمل خان مرحوم کے زیر علاج رہیں اور کامل تندرست ہوکر واپس گئیں، واپسی پر لکھنو میں سول سرجن کو دکھایا گیا تو ان کو کسی طرح یقین نہیں آتا تھا کہ ایسا مرض بغیر آپریشن کے کیسے دور ہوگیا؟(۲)

(۱) تذکرۃ الاطباء: ۲/۱۱۷، حکیم سید سرفراز حسین (۲) طبی ڈائجسٹ، اجمل نمبر، حیدرآباد

۱۹۲۴ء میں ایبٹ آباد کے قیام کے دوران وہاں کے فوجی اسپتال کے سرجن حکیم اجمل خان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی، اور نہایت تزک واحتشام کے ساتھ استقبال کیا، حکیم صاحب کو ہسپتال کے تمام شعبوں کا معائنہ کروایا، سرجن صاحب نے تین مریضوں کو حکیم صاحب کے سامنے بغرضِ تشخیص پیش کیا، حکیم صاحب نے نبض دیکھی اور بغیر حال سنے یکے بعد دیگرے ہر مریض کے متعلق اپنی رائے ظاہر کردی، ان میں ایک سلی کا مریض تھا، دوسرا کینسر کا اور تیسرا ٹائیفڈ کا، پہلے دو مریضوں کے سلسلے میں کہا کہ: یہ لاعلاج ہیں اور تیسرے کے بابت صحت یابی کی امید ظاہر کی، سرجن نے حیرت واستعجاب سے حکیم صاحب کی آراء کو سنا، اور معلوم کیا کہ آپ نے یہ حالات کیسے دریافت کئے، چنانچہ حکیم صاحب دو گھنٹے تک نبض کے تمام اصول اور اپنے تجربات بیان کئے، جس پر سرجن مسرت اور تعجب کے ملے جلے جذبات کے ساتھ فرمانے لگے کہ طب یونانی کا یہ حصہ واقعی نہایت دلچسپ اور مفید ہے، ہم ڈاکٹروں کو بھی چاہئے کہ اس فن میں دسترس حاصل کریں۔(۱)

آپ کی تشخیص میں مہارت کا اندازہ اس واقعہ سے بھی لگایا جاسکتا ہے جسے ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے تاریخ کی کتب میں لکھا ہے، یہ حیرنک اسپتال لندن میں ہاؤس سرجن تھے تو حکیم صاحب نے اسپتال کا معائنہ کیا اور آپ کی ملاقات سینئر سرجن ڈاکٹر اسلیلے سے ہوئی، انہوں نے حکیم صاحب کو دوسرے دن اسپتال آنے کی دعوت دی، حکیم صاحب جب پہنچے تو ڈاکٹر صاحب طالب علموں کے سامنے ایک مریض کو لٹا کر اسے مرارہ کے ورم کا مریض بنا کر درس دے رہے تھے، حکیم صاحب نے مریض کو دیکھ کر یہ تشخیص کی کہ اس کے آنتوں کے ابتدائی حصہ میں زخم ہیں۔

ڈاکٹر نے ہنس کر کہا: کل آپریشن کے وقت آپ بھی آئیں گے، اسی وقت یونانی اور ایلوپیتھک کا مقابلہ ہوجائے گا، آپریشن کے بعد حکیم صاحب کی تشخیص درست نکلی، ڈاکٹر نے حکیم صاحب کو اس کامیابی پر بہت مبارک باد دی۔(۲)

(۱) طبی ڈائجسٹ اجمل نمبر، حیدرآباد (۲) حکیم اجمل خاں دری ورسٹائل جنسی: ۱۴۰، از حکیم عبدالرزاق

طبی وسیاسی خدمات

آپ نے طب کی فلاح وارتقاء کے لئے بے حد کوششیں کیں، اوراسی مقصد سے یورپ کا سفر بھی کیا، حکیم صاحب نے مدرسہ طبیہ دہلی کوجس کوان کے بڑے بھائی نے قائم کیا تھا، مزید ترقی عطا کی، نصابِ تعلیم میں تجدید کی اوراس میں آیورویدک تعلیم بھی شروع کی، سیاسی رہنماؤں اورحکومتِ وقت کے تعاون سے قرولباغ دہلی میں کالج کے لئے وسیع وعریض عمارت تعمیر کی، حکیم صاحب ویدوں اور حکیموں کے اتحاد کے لئے ایک مشترکہ پلیٹ فارم قائم کرنا چاہتے تھے، یونانی ادویہ کی تیاری کے لئے آپ نے ایک یونانی دواخانہ قائم کیا تھا، حکیم صاحب نے ہندوستان کی جنگِ آزادی میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اسی سلسلہ میں گاندھی جی، راج گوپال، آچاریہ، بی آر آنند، ڈاکٹر مختاراحمد انصاری اوردوسری اہم شخصیتوں سے بھی تعلقات تھے۔

حکیم صاحب کوشعروشاعری سے بھی کافی دلچسپی تھی، اوررشید تخلص تھا، آپ کا کلام بڑا جاندار اورادبی معلومات سے بہت بلند ہوتا تھا، آپ کی تصانیف اردو، عربی اور فارسی میں متعدد تھیں اور ملک میں معیاری رسائل میں آپ کے مضامین شائع ہوتے تھے، ''دکن ہوہو'' میں بوعلی سینا پر آپ کے مقالات شائع ہوچکے ہیں، آپ کے معالجانہ نسخوں پر مشتمل کئے مجموعے شائع ہوچکے ہیں، جن میں ''افاداتِ مسیح الملک'' اور ''حاذق'' کے نام سے کتاب کافی مقبول ہوچکی تھی۔ ۶۴؍سال کی عمر میں دسمبر ۱۹۲۷ء میں آپ کی وفات ہوئی اوردرگاہ حضرت رسول نما دہلی میں دفن ہوئے۔

(۴۰) حکیم عبدالوہاب انصاری عرف نابینا

حکیم نابینا مرحوم مشرقی یوپی کے ضلع غازی پور قصبہ یوسف پور میں ۱۸۶۸ء میں پیدا ہوئے، آپ کا سلسلۂ نسب حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے، آپ کے والد حکیم عبدالرحمن انصاری رحمہ اللہ بھی بہت مشہوراورصاحبِ کمال عالم تھے، حکیم نابینا بچپن سے ہی چیچک نکل آنے کی وجہ سے بینائی سے محروم ہوگئے تھے، دس سال کی عمر میں قرآن شریف

حفظ کیا، ابتدائی صرف ونحو کی تعلیم اپنے وطن میں پائی ۱۸۸۲ء میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت پائی، عربی ادب مولانا فیض الحسن سہارنپوری رحمہ اللہ اورمولانا ذوالفقارعلی دیوبندی رحمہ اللہ سے پڑھا اورطب کی تعلیم حکیم عبدالمجید خان دہلوی رحمہ اللہ (م ۱۹۰۱) سے حاصل کی، حکیم عبدالرزاق اورہندوستان کے مشہور سیاسی رہنما ڈاکٹر مختاراحمد انصاری بھی آپ کے بھائی تھے تعلیم سے فراغت پاکر حضرت مولانا رشیداحمد گنگوہی رحمہ اللہ (۱۸۲۸ء-۱۹۰۵ء) کی خدمت میں حاضر ہوکر بیعت کی، آپ تینوں بھائیوں کوشیخ الہند مولانا محمودالحسن رحمہ اللہ (م ۱۹۲۰ء) سے بھی بہت تعلق تھا، آپ سابق نظام حیدرآباد کے معالجِ خصوصی رہے، حیدرآباد اور دہلی کے امراء ورؤساء کے آپ خاص معالج تھے، خواجہ حسن نظامی نے لقمان الملک کا خطاب دیا، ربیع الثانی ۱۳۶۰ھ بمطابق ۱۹۱۴: میں دہلی میں وفات پائی وصیت کے مطابق جنازہ دہلی سے گنگوہ لے جایا گیا اورحضرت گنگوہی رحمہ اللہ کے مزار کے قریب دفن کیا گیا۔

حکیم نابینا صاحب کی نباضی میں مہارت

حکیم عبدالوہاب انصاری عرف حکیم نابینا باوجود نابینا ہونے کے نباضی میں بہت ماہر تھے، ایک صاحب کے چچا مرضِ استسقاء میں مبتلا تھے، اورمرادآباد میں رہتے تھے، حکیم صاحب نے بذریعہ خط مریض کی حالت اور وہاں کے اطباء کی تشخیص معلوم کی، اوران کے بھتیجے جو دہلی میں رہتے تھے کی نبض دیکھ کران کے چچا کی مزاجی کیفیت معلوم کرلی اوراسی کے مطابق نسخہ بھی تجویز کردیا، کچھ دنوں کے بعد یہ دوائیں استعمال کرکے ان کے چچا اس مرض سے چھٹکارا پاگئے۔(۱)

علامہ اقبال حکیم نابینا کی معالجانہ سوجھ بوجھ کے بہت معتقد تھے، ایک مرتبہ ان کے گردے میں پتھری ہوگئی، ڈاکٹر نے آپریشن کی رائے دی اورکہا کہ یہ آپریشن اگر ویانا میں ہوتو زیادہ بہتر ہے، دوستوں کے مشورے سے حکیم نابینا صاحب کا علاج شروع کیا، حکیم صاحب نے پتھری کی مخصوص یونانی دوائیں علامہ اقبال کو استعمال کروائیں اوراپنے مخصوص دواؤں کے صندوقچہ سے کشتہ حجرالیہود نکال کردیا اوراسے استعمال کرایا،

(۱) ہمدرد طبی کالج میگزین: ۸۴، ۱۹۸۳ء

ان دواؤں کے استعمال سے علامہ کی تکلیف دور ہوگئی، اور دوبارہ اکسیرے کرانے پر پتھری کا نام ونشان بھی نہیں دکھائی دیا۔(۱)

دینی رنگ اور مذھبی مزاج

حکیم نابینا مرحوم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ سے بیعت تھے، اور انہوں نے مرشد کی صحبت میں رہ کر باطنی کمال بھی حاصل کیا ہوا تھا، ان کا بیان ہے:

''ایک مرتبہ میں حضرت گنگوہی رحمہ اللہ سے عرض کیا کہ: اگرچہ میں نے ذریعۂ معاش کے لئے طب پڑھ لی ہے، لیکن اطباء نبض کے علاوہ مریض کا چہرہ، قارورہ اور دوسرے مشاہدات کی مدد سے مرض کی تشخیص کرتے ہیں اور میں بوجۂ عدمِ بصارت اس سے محروم ہوں، میرے لئے دعاء فرمادیجئے کہ اللہ تعالیٰ میری اس مشکل کو آسان فرمادے''

اس پر حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ تمہیں نباضی کی مہارت عطا فرمائے گا جس سے تم مریض کے امراض پر مطلع ہوجاؤ گے جن کو دوسرے اطباء مشاہدات سے معلوم کرتے ہیں''۔

حکیم صاحب کا بیان ہے کہ:

میں شیخ کی اس کرامت کا روزانہ مشاہدہ کرتا ہوں، نبض پر ہاتھ رکھتے ہی مجھ کو مریض اور مرض کی تمام کیفیتیں منکشف ہوجاتی ہیں''(۲)

حکیم نابینا صاحب کو اپنے پیر حضرت گنگوہی رحمہ اللہ سے اتنا تعلق تھا کہ وہ دیوبند، گنگوہ، اور یوسف پور کے کسی بھی مریض سے چاہے وہ ہندو ہو یا مسلمان، کبھی بھی قیمتی دواؤں کی قیمت نہیں لیتے تھے، اس طرح علماء وصوفیاء سے بھی آپ نے کبھی قیمت نہیں لی، مطب میں ہر وقت مریض ذکر اللہ میں مشغول رہتے تھے، (۳) دینداری اور عبادت

(۱) اطباء اوران کی مسیحائی: ۱۸۸-۱۸۹

(۲) تاریخِ دارالعلوم: ۶۲ (۳) تاریخِ دارالعلوم: ۶۲

گذاری کا یہ عالم تھا کہ اکثر چلہ میں بیٹھ جاتے اور تین تین دن یا سات دن مطب سے کنارہ کش ہوکر اللہ کی عبادت میں مشغول ہوجاتے، ان کی غیر موجودگی میں آپ کے صاحبزادگان مریضوں کو دیکھتے، جب حکیم صاحب عبادت سے فارغ ہوجاتے اور صاحبزادوں سے مریضوں کا حال پوچھتے اور جب معلوم ہوتا کہ کسی کو فائدہ نہیں ہوا ہے تو نسخہ اپنے ہاتھ میں لے کر فرماتے کہ: یہی نسخہ دوبارہ استعمال کرو اس سے فائدہ ہوگا، چنانچہ اسی نسخہ سے مریضوں کو فائدہ ہوتا۔(۱)

سچ تو یہ ہے کہ جو زبان ہر وقت لا الہ الاّ اللہ کہتے کہتے سوکھتی نہ ہو اس سے نکلا ہوا کوئی جملہ یا جن ہاتھوں سے روزانہ تسبیح پر درود شریف اور اللہ کا ذکر ہزاروں مرتبہ کیا جاتا ہو اس ہاتھ سے لکھا ہوا کوئی نسخہ اپنے اندر کیوں نہ اثر رکھے۔

(۴۱) حکیم عبدالعزیز

آپ لکھنو کے نامور اطباء میں سے تھے، ان کو شیخ الرئیس ہند بھی کہا جاتا ہے، یہ حکیم محمد اسماعیل کے بڑے صاحبزادے تھے، علمِ طب اپنے دادا حکیم محمد یعقوب رحمہ اللہ اور چچا حکیم محمد ابراہیم رحمہ اللہ سے پڑھا، ۱۹۰۲ء میں آپ نے مدرسۃ تکمیل الطب کی بنیاد ڈالی جو آج تکمیل الطب کالج میں تبدیل ہوچکا ہے، زمانہ کے بدلتے تیور دیکھ کر حکیم عبد العزیز نے طب یونانی کو دورِ حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لئے اس مدرسہ کا قیام عمل میں لایا، حکیم صاحب اپنے دورِ طالبِ علمی ہی سے علمِ تشریح کے ساتھ سرجری کی ضرورت کو شدت سے محسوس کررہے تھے، اسی ضرورت کے پیشِ نظر آپ نے اپنے دونوں لڑکوں حکیم عبدالرشید اور حکیم عبدالمعید کو سرجری میں کمال حاصل کرایا، ظاہر ہے کہ دو چار اطباء سے اتنے بڑے ملک کی ضرورت پوری نہیں ہوسکتی تھی، اسی خیال سے حکیم صاحب نے جولائی ۱۹۰۲ء میں جھوائی ٹولہ لکھنو کے اپنے آبائی مقام میں تکمیل الطب کے نام سے ایک طبی درسگاہ قائم کی، شروع میں صرف خاندان کے اطباء ہی اس کا نظم

(۱) محدث گنگوہی: ۳۴-۳۵

ونسق وتدریسی کام انجام دیتے رہے، بعد میں یہ سلسلہ وسیع ہوگیا، اور باہر کے اساتذہ کی خدمات حاصل کی گئیں، آج کل یہ کالج حکومت اتر پردیش کی تحویل میں سرگرمِ عمل ہے۔

حکیم صاحب کا طبی درس بھی کافی مقبول تھا، ہندوستان کے علاوہ بیرونِ ملک افغانستان، بخارا، اور حجاز کے اطباء بھی شریک ہوتے تھے، آپ کے درس کی مقبولیت اورافادیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ، مولانا محمد فاروق چریاکوٹی رحمہ اللہ، مولانا لطف اللہ علی گڑھی رحمہ اللہ، مولانا عبدالحق خیرآبادی رحمہ اللہ جیسی بڑی شخصیتیں پابندی سے درس میں شریک رہتی تھیں۔

طبی حذاقت ومہارت

آپ کے معالجانہ تجربات سے متعلق متعدد واقعات کتابوں میں ملتے ہیں، ایک واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ لکھنو کے نواب زادہ کو چیچک نکلی جس میں حالت بہت خراب ہوئی، اطباء اور ڈاکٹروں کا جمگھٹ تھا، کئی اطباء نے نسخے لکھے، حکیم عبدالعزیز نے نسخہ دے کر کافور کا اضافہ کردیا، اطباء کو بڑی حیرت ہوئی، بعض نے مضر بتاتے ہوئے کافور کی سخت مخالفت کی، حکیم صاحب نے مدلل طور سے فرمایا کہ: بخار کی شدت کی وجہ سے سمیت پیدا ہوگئی ہے، لہذا تریاق کی حیثیت سے کافور کی ضرورت ہے، چنانچہ دوسرے ہی دن سے فائدہ شروع ہوگیا۔(۱)

ایک دوسرا واقعہ یوں ہے کہ حکیم صاحب کے مطب میں ایک لڑکا آیا، ساتھ ہی لوگوں نے یہ بتایا کہ یہ بغیر دستہ کے چاقو نگل گیا ہے، ممکنہ علاج کے بعد ڈاکٹروں نے آپریشن تجویز کیا تھا، مگر لڑکے کے والدین آپریشن کے لئے تیار نہیں ہوئے تھے، حکیم صاحب کی رائے لی گئی، آپ نے ایک چھٹانک پارہ دودھ میں پلوایا اور آدھے گھنٹے تک اس سے چہل قدمی کروائی، تھوڑی دیر کے بعد اس نے ناف کے درد کی شکایت کی تو آپ نے حقنہ کرایا، تیسری دفعہ حقنہ کرانے کے بعد پہلے چاقو کا پھل نکل آیا، پھر پارہ نکل آیا۔

(۱) رموز الاطباء: ۲۴۴، حکیم فیروزالدین صاحب

طبی مناقشہ

حکیم صاحب کے زمانے میں دہلی اور لکھنو دو اہم طبی اسکول تھے، جو اہم سمجھے جاتے تھے، ان دونوں میں اکثر فنی امور میں مناقشہ چلتے رہتے تھے، حکیم صاحب اور حکیم عبدالمجید خان کے درمیان مخّ دماغ کی جس کے متعلق کافی دنوں تک بحث چلتی رہی، دونوں طرف سے متعدد رسائل شائع ہوئے، اس کے علاوہ طب کی تعلیمی زبان، کشتوں کا جواز وعدمِ جواز، حکیموں کے ساتھ ویدوں کی شمولیت جیسے بہت سے معاملات میں اختلاف پایا جاتا تھا، لکھنو والے حکیموں کے ساتھ آیورویدک والوں کی شمولیت کے مخالف تھے، چنانچہ طبی اینڈ آیورویدک کانفرس کا اکثر بائیکاٹ کرتے تھے، اس طرح طب کے کے ساتھ طبّ جدید کی تعلیم کے تسلط کو بھی لکھنو کے اطباء کے لئے خطرہ سمجھتے تھے، مفردات کے وزن کے سلسلہ میں لکھنو اور دہلی میں اختلافِ رائے پایا جاتا تھا۔

(۴۲) ڈاکٹر مقبول علی حیدرآبادی (م: ۱۹۵۴ء)

انگلستان کے فارغ (نلگنڈہ میں سول سرجن رہے) بیوی (ویسٹ انڈیز) بھی سول سرجن، وظیفہ کے بعد مجرد گاہ معظم جاہی مارکٹ میں مطب کرتے، جہاں اس وقت کے دانشور روزانہ جمع ہوا کرتے، مغرب کا وقت ہوتا تو امام کے لئے مجھے آگے کردیتے یہ کہہ کر طالب علم کا درجہ اونچا ہے، رمضان میں دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب نے صرف نمک سے روزہ کھولا، نماز پڑھی اور مطب میں آبیٹھے، ایام بیض کے بھی روزے رکھتے تھے، (اگرچہ فل سوٹ پہنتے اور کلین شیو رہتے) ماتحتین کو بھی سلام میں خود پیش قدمی کرتے، غریب مریضوں کی رقمی امداد کرتے۔ (پروفیسر میر محفوظ علی صدیقی۔ایران)

موسم سرما میں سخت سردی میں دونوں میاں بیوی فٹ پاتھ پر سونے والے فقیروں پر کمبل اڑھا دیتے۔

(۴۳) ڈاکٹر عبدالمنان حیدرآبادی (م: ۱۷/۷/۲۰۰۹ء)

وہ غریبوں کی نہ صرف مفت تشخیص کرتے ہیں؛ بلکہ (اپنے گھر کے قریب کی)

میڈیکل شاپ کواشارہ بھی دیتے ہیں کہ دوا کی قیمت میرے ذاتی حساب میں شامل کردی جائے ،ہم نے ان کی قیام گاہ پر یہ بھی دیکھا کہ پرانے شہر (حیدرآباد) سے کوئی مریض ان کے پاس آیا ہے اور وہ اس سے پوچھ رہے ہیں کہ دوا مہنگی ہے کیا خرید سکو گے؟ اور وہ مریض پھٹی پھٹی آنکھوں سے عرض حال کرتا ہے کہ میں آپ کے بنگلے تک ہی قرض لے کے آیا ہوں تو اس بات پر ڈاکٹر صاحب دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ میڈیکل شاپ کو اشارہ دیتے ہیں کہ، ہم نے بسا اوقات یہ بھی دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب مریض کو آمد ورفت کا خرچ بھی دے رہے ہیں (روزنامہ سیاست، جہاں دارافسر) ۔(۱)

نامور طبیبات

علوم وفنون کی نشر واشاعت اور ترویج وارتقاء میں خواتین نے مردوں کے دوش بدوش گراں قدر خدمات انجام دی ہیں، کوئی بھی میدان ہو، اس میں ان کے کارنامے قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، ٹھیک اسی طرح علمِ طب بھی ان کی خدمات سے محروم نہیں ہے۔

تاریخ میں طبیبات کا تذکرہ بہت کم ملتا ہے، لیکن اس کا سبب خواتین کی نااہلی نہیں بلکہ مواقع کا عدم حصول ہے، عورتوں کا دائرہ کار عام طور پر گھر کی چہار دیواری ہوتی ہے، پہلے کے ادوار میں کہیں بھی تحصیلِ علم کے مواقع حاصل نہیں ہوتے تھے، اسلئے کہ تحصیلِ علم کے لئے دور دراز کے اسفار کرنے پڑتے تھے، اور اگر کسی ماہرِ فن کی صحبت نصیب بھی ہوجاتی تو اس کے بعد خدمت کے مواقع بہت کم ملتے تھے، لیکن اس کے باوجود تاریخ طب کے تقریباً ہر دور میں طبیبات کا تذکرہ ملتا ہے، اور طبی میدان میں ان کی خدمات پر روشنی پڑتی ہے۔

تاریخِ طب کی ابتداء اسقلیبوس اول سے کی جاتی ہے ، اسقلیبوس کو شیروں (chiron) کا شاگرد بتایا گیا ہے، شیرون (۱۱۴۳ ق م) نے صحت کے کچھ اہم اصول بیان کئے تھے، اسی وجہ سے اہلِ یونان اسے صحت کا دیوتا اپولوں کا بیٹا کہتے ہیں۔

(۱) سب کے لئے، مؤلف ابن غوری: ۹۶۔۹۷، آئی جی، پبلیشرس، حیدرآباد

اسقلیبوس کے ساتھ یونانیوں کے یہاں صحت کی دیویوں کے نام بھی ملتے ہیں، ایک ہائجیا اور دوسری پاناسا یہاں ایک بات قابلِ ذکر ہے اہلِ یونان بعض انسانوں کے کارناموں کی بنیاد پر انہیں دیوتا یا دیوتا کا بیٹا قرار دیتے تھے، اسلئے عین ممکن ہے کہ ان دونوں خواتین نے طب وصحت کے رہنما اصول دیئے ہوں، جس کی بنیاد پر انہیں صحت کے دیویاں قرار دیا گیا ہو۔

طب اسلامی کے فروغ میں مسلم خواتین کا کردار بھی تاریخ طب کا روشن ورق ہے، عہدِ رسالت میں صحابیات میدانِ جنگ میں زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے کا فریضہ انجام دیتی تھیں، حضرت ام سلیم، ام متاع، ام عطیہ اور لیلی کو مرہم پٹی کرنے میں خاص مہارت تھی، حضرت ابوبکر کی صاحبزادی حضرت اسماء علاج ومعالجے میں مشہور تھیں، حضرت رفیدہ الانصاریہ جراحی میں ماہر تھیں، مسجد نبوی کے صحن میں ان کے لئے خیمہ نصب کیا گیا تھا، جس میں جراحی آلات اور سامان رکھے گئے تھے، خلافت بنی امیہ میں ایک خاتون طب بالخصوص امراض چشم کی ماہر تھیں، اندلس میں حفید ابوبکر کی ہمشیرہ اور بھانجی کو طب میں خاص کر معالجہ نسوانی میں کمال حاصل تھا، دونوں خلیفہ کے حرم میں علاج کیا کرتی تھیں، اندلس ہی میں قاضی ابوجعفر کی بیٹی ام الحسن بہت اچھی طبیبہ تھیں، مغل حکمراں شاہجہاں کے عہد سلطنت میں ستی النساء کو علاج ومعالجے میں یدطولی حاصل تھا، قرطبہ میں عورتیں باقاعدہ مطب کیا کرتی تھیں، قرون وسطی کے بعض مسلم شفاخانوں میں نرسوں کو بھی تعینات کیا جاتا تھا۔

طب میں مسلمانوں کے نمایاں اور امتیازی کارنامے:

(۱) طب قدیم میں مسلمانوں نے جو اضافے کئے ہیں، ان کی فہرست طویل ہے، حکمائے یونان کو بعض بیماریوں کے بارے میں کوئی علم نہ تھا، اطبائے اسلام نے نہ صرف ان امراض کا پتہ چلایا؛ بلکہ ان پر سائنسی انداز میں بحث کی ، چیچک اور خسرہ کے بارے میں ابوبکر رازی نے سب سے پہلے بحث کا آغاز کیا، ان کے بعد قیروان کے مسلم طبیب ابن الجزار نے زاد المسافر میں اس مرض کی تفصیل

بیان کی، طاعون کے متعلق حکمائے یونان نے خاموشی اختیار کی تھی، لسان الدین ابن الخطیب (۷۱۳=۷۷۶/۱۳۱۳=۱۳۷۴ء) نے طاعون کے بارے میں وضاحت کی کہ اس مرض کے تعدیہ کا وجود تجربے، مطالعے اور حواس کی شہادت سے قطعی طور پر ثابت ہو چکا ہے، نیز معتبر اطلاعات سے ثابت ہے کہ یہ مرض بیماروں کے کپڑوں، برتنوں اور کانوں کی آویزوں کے استعمال اور ایک گھر کے آدمیوں سے دوسرے مقامات پر پھیل گیا، مزید برآں طاعون زدہ علاقے سے آئے لوگ جب غیر متاثرہ بندرگاہ پر پہنچے تو وہاں بھی بیماری پھیل گئی، اسپین کے ابن خاتمہ (المتوفی: ۷۷۱ھ/۱۳۶۹ء) نے طاعون کے موضوع پر اپنے رسالے میں (جسے میکس میر ہاف نے یورپ کے ان تمام رسالوں سے حد درجہ فائق کہا ہے جو اس موضوع پر چودھویں اور سولھویں صدی کے درمیان تحریر کئے گئے) واضح الفاظ میں کہا کہ میرے طویل تجربے کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی طاعون زدہ مریض کے ساتھ ربط رکھے تو اسے فوراً طاعون لاحق ہوجاتا ہے اور اس میں بھی وہی علامات ظاہر ہوجاتی ہیں، جو پہلے مریض میں ہوتی ہیں۔

(۲) مسلمانوں نے تخمین وقیاس کو رد کر کے مشاہدے کی اہمیت کو واضح کیا، ابوبکر رازی نے جالینوس کی متعدد غلطیوں کی نشاندہی کی اور کہا کہ جالینوس کی غلطیوں کی بنیاد یہ ہے کہ انہوں نے تجربے کے بجائے ریاضی پر بھروسہ کیا ہے، جالینوس نے بیان کیا ہے کہ عظیم العجز چھ ہڈیوں سے مرکب ہے، عبد اللطیف بغدادی (۵۵۷=۱۲۳۱ء) نے انسانی ڈھانچوں کا معاینہ کیا تو کئی دفعہ پتہ چلا کہ عظم العجز میں صرف ایک ہڈی ہوتی ہے، چنانچہ انہوں نے اپنی تصنیف "کتاب الإفادة والاعتبار" میں صاف صاف کہا کہ سنی ہوئی باتوں کے مقابلے میں مشاہدہ زیادہ قوی دلیل ہے، جالینوس کی فنی قابلیت مسلم مگر مشاہدہ زیادہ صحیح ہوتا ہے۔

(۳) علاج ومعالجے میں مسلمانوں نے یونانی طبیبوں کے برخلاف بعض نئے

اور کامیاب طریقے دریافت کئے، مثلاً ابن وافد نے علاج بالغذاء کی اہمیت پر زور دیا، "اوحد الزمان ابو البرکات" (۴۷۰=۵۶۰/۱۰۷۷=۱۱۶۵) نے ایک وبائی بیماری میں قطع انامل کا علاج ایجاد کیا، "ابو المنصور صاعد بن بشیر بن عبدوس" نے یونانیوں کے برعکس امراض باردہ فالج، لقوہ اور استرخاء میں ادویہ باردہ، اور منعِ غذا کا علاج اختراع کیا، نیز یہ مسلمان ہی تھے جنہوں نے جراحی میں داغ دینے کا آغاز اور یرقان کا علاج دریافت کیا، جنون کے علاج میں سب سے پہلے افیون کا استعمال کیا اور سر پر ٹھنڈے پانی کے گرانے کی ابتداء کی، معدے سے ردی فضلات کے اخراج کے لئے سب سے پہلے مسلمانوں نے ہی انبوب معدہ (stomach tube) سے کام لیا، جس کا آغاز بانس کی نالی سے کیا گیا، موتیابند کے لئے آپریشن کرنا بھی عربوں نے ایجاد کیا اور جراحت کے آپریشن بھی مسلمانوں نے ہی اختراع کیا، ول دوران کے مطابق ان دنوں یورپ والوں کے نزدیک جراحی آپریشنوں کے لئے قرطبہ پسندیدہ مقام تھا، سب سے پہلے چیچک کا ٹیکہ مسلمانوں نے رائج کیا، ۱۶۶۹ء میں ترکی میں چیچک کی تلقیح کا طریقہ عام تھا، ڈریپر کے مطابق ۱۷۱۲ء میں یورپ کی لیڈی میری وارٹلی ماٹیک قسطنطنیہ آئی تو اس نے ٹیکہ لگانے کا طریقہ سیکھا، مگر جب وطن واپس گئی تو وہاں کے پادری برافروختہ ہوگئے۔

(۴) حکمائے اسلام نے ادویات کی طرف بھی توجہ کی اور یونان کے ذخیرۂ ادویات میں سینکڑوں نئی دواؤں کا اضافہ کیا، انہوں نے چین، جزائر شرق الہند، ملایا اور ہندوستان سے جڑی بوٹیوں حاصل کر کے یونانی علم ادویہ کا دامن وسیع کیا، بیخ ریوند، کافور اور سنا کے افعال وخواص دریافت کئے اور علاج میں بھنگ کے استعمال کی ابتداء کی، کیمیاوی مرکبات تیار کر کے انہیں طب میں استعمال کرنے کا سہرا بھی مسلمانوں کے سر جاتا ہے، علاوہ ازیں یہ مسلمان ہی تھے، جنہوں نے مرکب ادویہ کی تیاری میں سب سے پہلے شکر کا استعمال کیا، شکر سازی کے معمل

تیار کئے اور شکر بنائی۔ ول دوران طب میں مسلمانوں کے کارنامے کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ادویات کے قدیم ذخیرے میں صحرانشیں عربوں نے عنبر، کافور، تج، لونگ، پارہ، سنا اور لوبان جیسی اشیاء کا اضافہ کیا، دواسازی میں نئے مرکبات شربت اور جلاب متعارف کرائے، مشرق قریب کے ساتھ اطالوی تجارت کی ایک اہم خصوصیت عربی ادویات کی درآمد تھی، سب سے پہلے مسلمانوں نے عطار کی دوکانیں اور دواخانے کھولے، عہد وسطی میں دواسازی کا اولین مدرسہ قائم کیا گیا اور فن ادویہ سازی کے موضوع پر شاندار کتابیں لکھیں، مسلم اطباء غسل بالخصوص حمیات میں اور وہ بھی بھاپ کے غسل پر جوش وکیل تھے، چیچک اور خسرے کے علاج کے لئے ان ہدایات میں لئے آج بھی اضافہ کرنا مشکل ہے، بعض جراحی آپریشنوں میں تنفس کے ذریعے بیہوش کرتے تھے، گہری نیند کے لئے حشیش اور دوسری ادویات کا استعمال کیا جاتا۔(۱)

طب میں اطبائے اسلام کے چند امتیازات:

۱۔ نئی نئی جڑی بوٹیوں کی تلاش میں بہت سے اطباء سرگرداں رہے، ان لوگوں نے دور دور کے سفر کئے اور نئی نئی جڑی بوٹیاں تلاش کیں، ایسے لوگوں میں سب سے زیادہ ممتاز ضیاء الدین ابن بیطار (م ۱۲۴۸) کا ہے، یہ مسلم اسپین کا باشندہ تھا، نئی جڑی بوٹیوں کی تلاش میں یہ اپنے وطن سے باہر نکلا اور مصر اور ایشیا کو چک بشمول ترکی اور شام کے دورے کر کے نئے نئے پودے جمع کئے جن کی تعداد چودہ تھی، اس زمانے میں جب کہ سفر بہت دشوار گذار ہوا کرتا تھا، یہ بہت مشقت آمیز اور بے مثل کام تھا، اسی وجہ سے ابن بیطار کو دنیائے طب کا عظیم ترین ماہر الادویۃ مانا جاتا ہے۔

(۱) 246-the age of faith.pp.245

نئے نئے ادویاتی عناصر جو دریافت کئے گئے اور دواسازی میں آج بھی مستعمل ہیں ان میں سے چند خاص اجزاء درج ذیل ہیں:

کافور، ریوند چینی، مشک، گوند، املتاس، جائفل، سنا، بھنگ، میٹھا تیل، اور صندل کی لکڑی۔

۲۔ امراض کی تشخیص کے چار اہم ذرائع: نبض شناسی، قارورہ بینی، آنکھوں کی رنگت یونانی اطباء کے وضع کردہ تھے، نبض شناسی ہندوستان اور چین میں بھی رائج تھی، اس زمانے میں ان کے علاوہ مزید طریقے وضع کرنا ممکن نہیں تھا، اس لئے اطبائے اسلام نے بھی ان ہی چاروں ذرائع پر تکیہ کیا، البتہ ان طریقوں میں طبیبانہ مہارت کو ان لوگوں نے درجۂ کمال تک پہنچا دیا، ان کی مہارت کے بہت سے واقعات تاریخ طب کی کتابوں میں بیان کئے گئے ہیں، ہم ان میں سے چند مثالوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔

☆ قارورہ کی رنگت اور اس کا قوام دیکھ کر بعض اطباء یہاں تک بتا دیا کرتے تھے کہ وہ مرد کا ہے یا عورت کا، عورت کا ہے تو وہ عورت حاملہ ہے یا غیر حاملہ، حاملہ ہے تو اس کے پیٹ میں پرورش پانے والا بچہ لڑکا ہے یا لڑکی، طبقات الاطباء کا مصنف ابن ابی صبیعہ لکھتا ہے کہ ایک بار عباسی خلیفہ مہدی کی کنیز خیزران نے اپنا قارورہ اپنے وقت کے طبیب عیسی المعروف ابوقریش کو معائنے کئے لئے بھیجا، ابوقریش نے قارورے کا معائنہ کر کے یہ تشخیص کی کہ خیزران حاملہ ہے، اور اس کے شکم میں نمو پانے والا بچہ لڑکا ہے، ولادت کے بعد طبیب کی تشخیص صحیح نکلی، بچہ مہدی کی معروف اولاد موسی کہلایا۔

خیزران جب اگلی بار حاملہ ہوئی تو پھر اس نے اپنا قارورہ ابوقریش کے معائنے کے لئے بھیجا، ابوقریش نے قارورہ دیکھ کر تشخیص کی کہ خیزران کے پیٹ میں نمو پانے والا بچہ لڑکا ہے، اس کی یہ تشخیص بھی صحیح نکلی، وہی بچہ ہارون الرشید کہلایا اور خلافت عباسیہ کا نامور خلیفہ ثابت ہوا۔

☆ قارورہ شناسی کا ایک واقعہ ساتویں صدی ہجری کے ایک مصری طبیب مہذب الدین عبدالرحیم بن علی کا ہے، وہ مصر کے سلطان ملک العادل کے شاہی طبیبوں میں سے تھا، ابن صبیعہ نے وہ واقعہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

ایک دن طبیب مہذب الدین عبدالرحیم بن علی سلطان الملک العادل کے دروازے پہ موجود تھے کہ ایک خادم کسی کنیز کا قارورہ دکھانے آیا، کچھ درد کی شکایت تھی، اطباء نے قارورے کا معائنہ کر کے نسخہ لکھ دیا، مگر طبیب مہذب الدین نے قارورہ دیکھ کر کہا کہ کنیز کو جو درد ہو رہا ہے اس میں قارورہ کا یہ رنگ نہیں ہونا چاہئے، ہوسکتا ہے کہ یہ رنگ مہندی کا ہو (یعنی مہندی کا رنگین پانی قارورہ میں ملا دیا گیا ہو) خادم نے بالآخر مہندی کے پانی کی ملاوٹ کا اعتراف کرلیا اور وہ طبیب مہذب الدین کی قارورہ شناسی پر بے حد متحیر ہوا، ملک العادل کو جب اس واقعہ کا علم ہوا تو طبیب پر اس کا اعتقاد اور بھی بڑھ گیا۔

ابن ابی صبیعہ نے ابن اصم نامی ایک اندلسی طبیب کی قارورہ شناسی کے بارے میں لکھتا ہے کہ وہ محض قارورہ دیکھ کر مریض کا حال، اس کی تکلیف اور اس نے کیا غذا لی ہے سب کچھ بتا دیا کرتا تھا۔

نبض شناسی کی اسی اہمیت کی بناء پر ابن سینا نے بھی نبض کی اقسام کو القانون میں بہت ہی شرح اور بسط سے بیان کیا ہے اور نبض شناسی پر اس کا بیان ۱۰۳ صفحات پر محیط ہے۔

☆ بہت سے سلاطین اپنے دربار میں طبیب مقرر کرنے سے پہلے اس کی مہارت کا امتحان اس کی نبض کے ذریعہ لیا کرتے تھے، اسی قسم کے ایک امتحان کا واقعہ یہ ہے کہ مصر کے سلطان ملک الکامل نے اپنے ایک طبیب رشید الدین ابوحلیقہ کی نبض شناسی کا امتحان لینے کا ارادہ کیا اور اس غرض سے وہ طبیب کے مطب میں مستورات کے پردے کے پیچھے جا کر بیٹھ گیا، باری آنے پر سلطان نے اپنا ہاتھ پردے کی اوٹ سے باہر نکالا تو طبیب نے نبض دیکھ کر یہ بھی پہچان لیا کہ یہ

سلطان ملک الکامل کی نبض ہے، اور کہا کہ: ''سلطان بحمد اللہ تندرست ہیں'' یہ سن کر سلطان کو بہت حیرت ہوئی۔

اس سے پتہ چلا کہ نبض شناسی ایک ایسا علم ہے جس سے نہ صرف مرض کی بلکہ مریض کی شناخت بھی کی جاسکتی ہے۔

☆ نبض شناسی عوارض کے علاوہ نفسیاتی عوارض کی تشخیص میں بھی بہت کام آتی ہے، نفسیاتی عوارض میں اس کی افادیت کا اندازہ ایک اس واقعہ سے کیا جاسکتا ہے کہ ان حکیم رشید الدین ابوحلیقہ کے ہی مطب میں ایک عورت اپنے بیٹے کی لا معلوم بیماری کا علاج کرانے آئی، حکیم صاحب نے لڑکے کی نبض پر ہاتھ رکھا اور دفعتہ اپنے ملازم کو آواز دی کہ ذرا میری فرجیہ دے، تاکہ میں پہن لوں فرجیہ ایک قسم کی قبا کو کہتے ہیں اور یہ نسوانی نام بھی ہے، حکیم صاحب نے دیکھا کہ فرجیہ کا لفظ سنتے ہی لڑکے کی نبض یکا یک بے حد متغیر ہوگئی اسے حکیم صاحب نے قیاس کرلیا کہ ہو نہ ہو یہ لڑکا فرجیہ نا کی کسی لڑکی کے عشق میں مبتلا ہے، حکیم صاحب نے اپنی تشخیص سے لڑکے کی ماں کو آگاہ کیا تو اس نے تصدیق کی کہ یہ لڑکا فرجیہ نامی ایک لڑکی کے عشق میں گرفتار ہے۔

حکیم عبدالوہاب انصاری معروف بہ حکیم نانیا بھی نبض شناسی میں خوب مہارت رکھتے تھے، وہ دور کے رشتہ دار کی نبض دیکھ کر بھی مریض کے احوال اور بیماری کا پتہ دیتے تھے جیسا کہ ان کے احوال میں مذکور ہوا۔

نباضی نے مسلم طب میں اتنی ترقی کر لی تھی کہ مختلف اطباء نے اس پر کتابیں لکھیں، ان میں سے امام فخر الدین رازی کی کتاب "فی النبض" بہت مشہور ہے۔

☆ امراض کی تشخیص میں قارورہ شناسی یا نباضی کام نہ آتی تو ذہانت کو کام میں لانے کی کوشش کرتے تھے، ذہانت کے ذریعہ مرض کی تشخیص کے متعدد واقعات تاریخ طب کی کتابوں میں ملتے ہیں۔

ابن اصم نامی اندلسی طبیب، اس کے مطب میں ایک مریض لایا گیا جس کے سوتے میں ایک سانپ پیٹ میں گھس گیا تھا اور دھڑ کا کچھ حصہ باہر نکلا رہ گیا تھا، مریض ہول میں مبتلا تھا کہ سانپ نے اگر اسے ڈس لیا تو وہ ہلاک ہوجائے گا، تیمارداروں نے سانپ کے دھڑ میں رسی باندھ دی تھی تا کہ سانپ مریض کے پیٹ میں پورے کا پورا داخل نہ ہوجائے، ابن اصم نے رسی کاٹ دی جس سے پورا سانپ مریض کے پیٹ میں داخل ہوگیا پھر اس نے کچھ جڑی بوٹیوں کو پانی میں ابالا اور گرم گرم مریض کو پلایا، اس کے پینے سے سانپ مرگیا، اس کے بعد ابن اصم نے کچھ دوسری دوائیں ابال کر پلائیں اور کہا کہ ہضم معدہ کے ساتھ ان دواؤں سے سانپ پک جائے گا، دو گھنٹے تک وہ انتظار کرتا رہا، اس کے بعد قئے آور دوا یہ پلائیں جس سے مریض کو قئی ہوئی، سانپ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر باہر آگیا اور مریض صحت یاب ہوگیا۔

☆ ۱۹۵۱ء میں مغربی بنگال کے گورنر کے یہاں ایک بڑی دعوت دی، گورنر کے جواں سال بیٹے مہمانوں سے گپ شپ کر رہے تھے کہ دفعتاً ان کی زبان منہ سے باہر نکل آئی اور پھر کسی طرح بھی اندر نہیں گئی، گورنر نے کلکتہ کے بڑے سے بڑے ڈاکٹر کو بلوایا مگر وہ سب کے سب ناکام رہے، ناچار گورنر نے عام منادی کرادی کہ جو کوئی طبیب علاج کرانے کی تدبیر رکھتا ہو وہ فون پر اطلاع دے، اس کے لئے فوراً گاڑی بھیج دی جائے گی، یہ اعلان سن کر کلکتہ کے ایک ضعیف العمر مسلمان حکیم نے گورنر ہاؤس فون کر کے مریض کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی، گورنر صاحب نے فوراً گاڑی بھیج دی، حکیم صاحب نے گورنر ہاؤس جاتے ہوئے راستے میں دو عدد لیموں خریدے، گورنر ہاؤس پہنچ کر انہوں نے مریض کے کمرے سے تمام لوگوں کو باہر بلایا، پھر ایک لیموں کی دو قاشیں کر کے ایک قاش گورنر کے لڑکے کی زبان پر نچوڑ دی، پھر دوسری قاش نچوڑ دی، پھر دوسرے لیموں کی قاشیں نچوڑیں، لڑکے نے لیموں کی ترشی کی شدت سے بے اختیار زبان اندر کھینچ لی، اس

کامیابی پر گورنر بہت خوش ہوئے اور انہیں ایک مکان تحفے میں دیا، اس واقعہ پر حکیم صاحب کی شہرت کی دھوم مچ گئی۔

☆ نبض شناسی سے بھی شاید بڑھ کے یہ امر ہے کہ اس عہد کے اطباء امراض کی پیش بینی کر لیا کرتے تھے، امراض کی پیش بینی یا پیش آگہی میں ایک نہیں متعدد اطباء نے شہرت حاصل کی۔

پیش آگہی کا ایک واقعہ ابن ابی صبیعہ نے بیان کیا ہے کہ بغداد میں قصر خلافت کے ایک افسر مہمانداری کو ایک بار بہت بڑی دعوت کا انتظام سپرد ہوا، دعوت دو روز پہلے اس کا ایک بہت محنتی ملازم بیمار پڑ گیا، افسر مہمانداری نے بغداد کے مشہور طبیب ابوالحسن حرانی کو طلب کیا اور کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ دعوت سے پہلے پہلے ملازم شفایاب ہو کے ڈیوٹی پر آجائے، اگر دو دن کے اندر وہ شفایاب ہوگیا تو طبیب کو انعام واکرام دیا جائے گا، طبیب نے یہ سن کر کہا کہ بہتر ہے کہ مریض کو بیماری کے ایام پورے کرنے دیئے جائیں،، اگر وقت سے پہلے اسے شفایاب کرانے کی کوشش کی گئی تو مریض سال بھر کے بعد پھر بیمار پڑ جائے گا، اس وقت کوئی دوا کام نہ کرے گی، یہ انتباہ سن کر بھی افسر مہمانداری کی اپنی فرمائش پر قائم رہا، ناچار طبیب نے ملازم کا علاج شروع کیا جس سے وہ دو دن کے اندر اندر شفایاب ہو کر ڈیوٹی پر آگیا، افسر مہمانداری بہت خوش ہوا اور طبیب کو خوب انعام واکرام سے نوازا، مگر ٹھیک سال بھر بعد ملازم پھر بیمار پڑا، طبیب کی پیش آگہی کے عین مطابق کوئی دوا کام نہ آئی اور ملازم انتقال کر گیا، اس معجز نما آگہی کو دیکھ کر لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔

☆ پیش آگہی کا ایک اور واقعہ عباسی خلیفہ منصور کے طبیب خاص ابن الجلاج کے بارے میں مشہور ہے، اس نے خلیفہ کے مکہ معظّمہ کے سفر کے دوران خلیفہ کے بارے میں ذمہ داروں کو مطلع کر دیا تھا کہ خلیفہ کی یبوست بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے، وہ بہت جلد دماغ کی خشکی کے مرض میں مبتلا ہوگا، اس سفر کے دوران وہ

جب فہد کے مقام تک پہنچے گا تو حالت مرض میں مبتلا ہوگا اور مکہ معظّمہ پہنچے گا تو اس کا انتقال ہوجائے گا حقیقتاً ایسا ہی ہوا۔

☆ پیش آ گاہی کے سلسلہ میں یہ واقعہ خلیفہ ہارون الرشید کے عہد کا ہے کہ اس کی ایک بہن بانو بیمار پڑی، اس نے عیسائی طبیب ماسویہ ابو یوحنا کو طلب کیا، اس نے مریضہ کا معائنہ کرنے کے بعد خلیفہ کو بتایا کہ مریضہ پرسوں، تین گھڑی سے نصب شب تک کے دوران انتقال کرجائے گی۔

دنیائے اسلام میں اور بھی بہت سے اطباء گذرے ہیں جو پیش آ گہی میں معروف ہوئے ، ابن ابی صیبعہ نے اندلس کے طبیب ابن عبدربہ، مصر کے ابن عین زربی، اورشام کے مہذب الدین عبدالرحیم بن علی کے تذکرے کئے ہیں۔

☆ پیش آ گہی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ قارورہ شناسی کا ایک اور واقعہ یہ ہے کہ ایک بار موصل کے ایک امیر حسام الدین نے جبرئیل بن بختشیوع کو اپنے علاج کے لئے طلب کیا اور جب شفا یاب ہوگیا تو ایک خاتون کو علاج کے لئے دکھلایا جو کسی خطرناک مرض میں مبتلا تھی، جبرئیل نے مریضہ کا قارورہ دیکھ کر پیش گوئی کی کہ وہ تین دن میں صحت یاب ہوجائے گی، وہ حقیقتاً تین دن میں صحت یاب ہوگئی۔

جالینوس نے اس موضوع پر ایک کتاب لکھی جو عربی میں ترجمہ ہوئی جس کا نام "نوادر تقدمة المعرفة" تھا۔

۳۔ اطبائے اسلام اس بات کا پوری طرح شعور رکھتے تھے کہ صحت مند رہنے کے لئے عمدہ آب وہوا اور صفائی وستھرائی بہت ضروری ہے ، اسی وجہ سے شہروں میں بڑے بڑے حمام ہوا کرتے تھے تا کہ عوام الناس کونہانے کی سہولت دستیاب ہو، اسپتال کی تعمیر کے لئے جگہ کا انتخاب کرنے میں عمدہ آب وہوا کا خاص رکھا جاتا تھا، اس سلسلے میں عباسی خلیفہ مقتدر باللہ کے زمانے کا بہت مشہور واقعہ ہے اور ابن ابی صیبعہ نے بیان کیا ہے

خلیفہ نے بغداد میں شفاخانے کی نئی عمارت تعمیر کرانے کا ارادہ کیا تو آب

وہوا کے لحاظ سے موزوں جگہ کا انتخاب کرنے کے لئے رازی سے مشورہ طلب کیا ،موزوں جگہ معلوم کرنے کے لئے رازی نے بغداد کے مختلف علاقوں میں تازہ گوشت کے ٹکڑے کھمبوں پر آویزاں کرادیئے، چند دنوں بعد یہ سب ٹکڑے اتارے گئے ،جس علاقے کے گوشت میں سب سے کم سرانڈ پیدا ہوئی تھی اس جگہ کوزکریا رازی نے شفاخانے کی تعمیر کے لئے تجویز کیا، پھراسی جگہ شفاخانے کی نئی عمارت تعمیر ہوئی۔

۴۔ اطبائے اسلام نے طب اور دواسازی کو ایک دوسرے سے علاحدہ کردیا تھا، طبیب کا کام صرف امراض کی تشخیص اورنسخہ نویسی رہا، دوا تیار کرنا باقاعدہ طور پر ایک جداگانہ پیشہ بن گیا، اس کی شروعات بغداد سے ہوئیں، پھر دوسرے بڑے شہروں میں بھی دواخانے ہونے لگے۔

قیروان کے مشہور طبیب احمد ابن الجزار کے یہاں بھی طب ودواسازی علاحدہ علاحدہ ہوا کرتی تھی، وہ صرف نسخہ تجویز کرتے ، مریض کو دوا دینے کے لئے عطار سے رجوع کرنا پڑتا تھا۔

۵۔ دواسازوں کے اوپر محتسب (Inspectors) مقرر کئے گئے، وہ دواسازی کی معیار بندی کیا کرتے تھے، حکیم محمد سعید Cyril Elgood کے حوالے سے رقم طراز ہیں کہ محتسب دواخانوں کو پہنچ کر یہ دیکھا کرتے تھے کہ دواساز اپنے فن سے اچھی طرح واقف ہیں یا نہیں، وہ دواسازی کے برتنوں کا بھی معائنہ کیا کرتے ، برتن اگر بہت پرانے یا بدبودار ہوتے تو وہ انہیں تلف کردیا کرتے تھے، بعض اوقات وہ خود کھڑے ہوکر دواسازی کی نگرانی کرتے ،عطاروں ے لئے لازمی ہوتا تھا کہ وہ کسی مستند ماہر ادویہ مخزن الادویہ میں تجویز کئے ہوئے نسخوں سے ہی دوا تیار کیا کریں، جس زمانے میں محتسب مقرر ہوئے اس زمانے میں صبور بن سہل اور ابن البیان کے مخزن الادویہ مستند مانے جاتے تھے۔

۶۔ طبابت کے لئے اطباء کی سند یافتگی بھی لازمی تھی، اسے عباسی عہدِ خلافت میں

لازمی قرار دیا گیا، سند یافتگی کے ضابطے کے نفاذ کا سبب ابن ابی صبیعہ نے یہ بیان کیا کہ خلیفہ مقتدر باللہ کے عہد حکومت ۳۱۹ھ/۹۲۱ء میں خلیفہ کو اطلاع ملی کہ شفاخانہ مقتدری میں داخل ایک مریض اطباء کی غلطی سے ہلاک ہو گیا ہے، یہ اطلاع سن کر خلیفہ نے بغداد کے بڑے طبیب سنان بن ثابت کو ہدایت دی کہ وہ اطباء کا امتحان لیں، اور طبابت کی اجازت صرف ایسے اطباء کو دیں جو امتحان میں کامیابی حاصل کر لیں، خلیفہ نے شفاخانہ مقتدری کے حکام کو بھی احکام بھیجے کہ آئندہ سے صرف ایسے اطباء کو اس میں ملازم رکھا جائے جنہوں نے امتحان میں کامیابی کی سند حاصل کر لی ہو، اس حکم کی تعمیل میں سنان بن ثابت نے اطباء کے امتحان لیئے اور کامیاب ہونے والے آٹھ سو اطباء کو اسناد عطا کیں۔

۷۔ امراض کے تخصص (specialization) کی بنیاد ڈالی گئی، ابتداء میں بچوں کے امراض اور مستورات کے پوشیدہ امراض کے تخصصات قائم کئے گئے اور ان پر علاحدہ علاحدہ کتابیں لکھی گئیں، امراض چشم کو بھی تخصص کی حیثیت دی گئی، بہت سے حکماء نے پوری عمر صرف امراض چشم کے علاج کے لئے خود کو مختص کئے رکھا اور اس پر کتابیں لکھی۔

۸۔ جراحت کو بھی بہت ترقی دی گئی اور ایسے امراض کی جراحت کے طریقے ایجاد ہوئے جن میں قدماء کو کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔ پہلے جراحی کا پیشہ حجاموں کا کام اور حقیر اور نیچ سمجھا جاتا تھا، مسلم اطباء نے اسے اونچا پیشہ بنا دیا، مسلمان اطباء سے پہلے ایک شخص پال آف ایجانئا نظر آتا ہے جس نے طبیب کی حیثیت سے اس فن کی طرف توجہ دی، مسلمان اطباء میں ابو القاسم زہراوی، عمار موصلی نے اسے بہت ترقی دی، ان دونوں نے ایسے امراض کی جراحت کی ابتداء کی جن کا علاج دوا کے بجائے صرف آپریشن کے ذریعے ممکن تھا مگر جو فن جراحی کی پسماندگی کی وجہ سے نا قابل علاج بنے ہوئے تھے۔

آپریشن کے ذریعے جن امراض کا علاج کیا گیا وہ یہ ہیں:

بچوں کے سر میں جمع ہونے والے پانی کو نکالنے کئے لئے، ناک کے اندر بڑھے ہوئے گوشت کو کاٹنے کے لئے، ناک کے ناسور کے لئے، مسوں کے لئے، بڑھے ہوئے لوزتین کے لئے، پتھری نکالنے کے لئے، وضع حمل کے لئے، ناور کے لئے، آنکھ کے کئی اور امراض کے لئے، کان کے ناسور کے لئے، استسقاء کے مریض کے پیٹ کا پانی نکالنے کئے لئے، گردے کی پتھری نکالنے کے لئے اور مثانہ کے زخم کے لئے۔

سرجری میں زہراوی کے امتیازی کارناموں میں سے ایک بھی ہے کہ اس نے گرم لوہے سے داغ کر (By Cauterization) چھپن قسم کے زخموں کا علاج تجویز کیا، ان میں ناسور چشم، ورم جگر، امراض طحال، بواسیر، امراض رحم، عرق النساء، درد پشت، نقرس، جذام اور سرطان شامل ہیں۔

آپریشنوں کے لئے اس نے جراحی کے آلات بھی ڈیزائن کئے، ان کی تعداد ۲۰۹ بیان کی جاتی ہے، خاص خاص آلات میں مختلف قسم کی قینچیاں، چمٹے (Forceps) چاقو، نشتر (scalpels) اور آنکڑے (Hooks) وغیرہ شامل ہیں، قینچی کے بارے میں کہا جاتا ہے جراحت میں پہلی بار اسے زہراوی نے ہی استعمال کیا۔

۹۔ حفاظتی ٹیکوں کی ایجاد کے بارے میں قطعیت کے ساتھ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ کہاں ہوئی، ایک روایت یہ ہے کہ اس کی ایجاد ہندوستان میں ہوئی، مگر ڈاکٹر ایس صابر علی لکھتے ہیں:

چیچک کا ٹیکہ ۱۶۷۹ء کے لگ بھگ ایک ترک مسلمان کی دریافت ہے، وہاں سے ترکی میں مقیم برطانوی سفیر کی بیگم کے ذریعہ اٹھارہویں صدی میں یورپ میں متعارف ہوئی، یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں ملکوں میں جدا جدا طور پر دریافت ہوا، ایک روایت یہ ہے کہ اس کام میں اولیت ہندوستان کو ہی حاصل ہے، مگر وہاں ٹیکے ایجاد نہیں ہوئے تھے؛ بلکہ چیچک کے مریض کی کھرنڈ صحت مند انسان کے جسم پر مل دی جاتی تھی جس اس میں مامونیت پیدا ہو جاتی تھی۔

۱۰۔ اطبائے اسلام نے طب میں حسن اخلاق کو غیر معمولی اہمیت دی، ماضی میں اس کی نظیر قابل ذکر طور پر بقراط کے یہاں ملتی ہے جس نے فارغ التحصیل ہونے والے اطباء کے لئے ایک عہد نامہ مرتب کیا تھا جو آج بھی مشہور ہے، اطبائے اسلام نے حسن اخلاق کے معیار کو بہتر بنایا، اس کام کے سلسلے میں فاطمی عہد حکومت کے مشہور طبیب علی بن رضوان (م ۴۵۳ھ ۱۰۶۱ء) کو بڑا امتیاز حاصل ہے، اس نے طبی اخلاقیات کے سات زریں اصول وضع کئے۔

علی بن رضوان کے مرتب کردہ ضوابط اخلاق درج ذیل ہیں:

☆ طبیب جسمانی ساخت میں کامل، صحیح الاعضاء، ذہین، خوش فکر، دانشور، یادداشت میں عمدہ اور خیر پسند ہو۔

☆ لباس اور خوشبو عمدہ ہوں۔

☆ مریضوں کے رازوں کو بالکل پوشیدہ رکھے، ان کی بیماری کی کوئی بات ظاہر نہ کرے۔

☆ مریضوں کی صحت یابی کی خواہش حصول زر کی خواہش سے زیادہ اور فقراء کے علاج میں دلچسپی امراء کے علاج کے مقابلے میں زیادہ رکھتا ہو۔

☆ تعلیم کا شیدا اور لوگوں کے مفاد میں زیادہ سوچتا ہو۔

☆ سلیم القلب، پاک نظر، صادق الکلام ہو، عورتوں کا اور بڑے لوگوں کے گھروں میں دولت کا انبار دیکھ کر اس کا خیال تک دل میں نہ لائے، چہ جائے کہ ان میں سے کسی شی ء سے تعرض کرے۔

☆ امین ہو، جان و مال کے حق میں معتمد ہو، کوئی مہلک دوا تجویز نہ کرے، نہ اس کی خبر دے، اسقاط حمل کے لئے نسخہ تجویز نہ کرے، دوست کی طرح دشمن کا علاج بھی سچی نیت سے کرے۔

۱۱۔ پوری دنیائے اسلام میں شفاخانوں کا جال بچھا دیا گیا، جیسا کہ اس کا ذکر آگے آرہا ہے۔

۱۲۔ بعض خوردنی اشیاء مثلاً چربی، کلیجی اور نمک وغیرہ کے مضر صحت اثرات سے واقف کرایا۔

۱۳۔ متعدد لا معلوم امراض کی پہلی بار شناخت کی۔

۱۴۔ تشریحات (اناٹومی) اور فعلیات (فزیالوجی) میں مفید معلومات کا اضافہ کیا۔

اطبائے اسلام قلب اور دورانِ خون کے امراض اور ان کی وجوہات کے بارے میں گہری واقفیت رکھتے تھے، انسانی جسم کے اعضاء کی تشریحات (اناٹومی) میں ان اعضاء کے علاوہ شریانوں، وریدوں اور شعریوں (capillaries) کا علم بھی رکھتے تھے، خون کی ساخت کے بارے میں بھی کافی حد تک واقف تھے، فشار الدم (بلڈ پریشر) اور اس کے نقصانات سے بھی آگہی رکھتے تھے، پتلے خون اور گاڑھے خون کے فرق اور ان کے نقصانات سے بھی کافی حد تک واقف تھے، فشار الدم (بلڈ پریشر) اور اس کے نقصانات سے بھی آگہی رکھتے تھے کہ یہ مہلک ہوسکتا ہے، فشار الدم ان کی اصطلاح میں امتلاء دموی کہلاتا تھا، یعنی جسم میں خون کا زیادہ ہونا، آنکھوں کی سرخی اس مرض کی ایک عام پہچان تھی، اس کا علاج یونانی زمانے سے فصد کھول کر خون کی کچھ مقدار خارج کرنا تھا۔

خلیفہ ہارون کے عہدِ حکومت میں ان کے فرزند مامون الرشید کے خون کا دباؤ بہت بڑھ گیا جس کی وجہ سے ان پر غشی طاری ہوگئی، اور وہ قریب المرگ ہوگئے، دربار خلافت کے عیسائی طبیب جبرئیل بختیشوع نے فوراً فصد کھول کر خون کی کچھ مقدار خارج کی جس سے مامون صحت یاب ہوگئے۔

☆ کلیجی اور نمک کے کثرت استعمال سے ہونے والے نقصانات کا تجزیہ اب جب کہ موجودہ اطباء نے کیا ہے جس کو قدیم اطباء نویں صدی عیسوی سے ہی جانتے تھے، خون کے گاڑھے پن سے پیدا ہونے والے اس ظاہری موت کو طب کی اصطلاح میں سکتہ دمویہ کا نام دیا گیا، یعنی وہ جو خون کی وجہ سے طاری ہوا، سکتہ دمویہ اور مریض کی ''حیات نو'' کے کئے واقعات طب کی کتابوں میں منقول ہیں:

ابن ابی صبیعہ نے بیان کیا ہے کہ طبیب ابوالحسن ثابت بن ابراہیم حرانی اوران کے رفیق طبیب سنان بن ثابت راستے سے گذر رہے تھے کہ ایک شخص کو تقریباً روزانہ کلیجی بھونتے دیکھتے جسے وہ شخص کھاتا رہتا تھا، ایک دن یہ دونوں گذرے تو وہ نظر نہیں آیا معلوم ہوا کہ رات اس کا انتقال ہوگیا، یہ دونوں اطباء یہ سن کر رک گئے اوراس کے گھر جا کر اہل خانہ سے درخواست کی کہ وہ اس کی تجہیز وتکفین کے انتظامات تھوڑی دیر کے لئے روک دیں، پھران دونوں نے اس کی فصد کھولی، اس سے نہایت یعنی گاڑھا خون نکلنے سے مریض اٹھ کر بیٹھ گیا۔

☆ خون کے پتلا ہونے کی وجہ سے پیدا ہونے والی امراض سے بھی قدیم اطباء واقف تھے اوراس کا علاج کرنا بھی جانتے تھے، ان میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ خلیفہ مستقی باللہ (م ۵۷۵ھ) کے دربار کے ایک طبیب امین الدولہ بن تلمیذ کے پاس جو شفاخانہ عضدی میں بڑے عہدے پر فائز تھے، ایک مریض لایا گیا، اسے خون کا پسینہ آرہا تھا، امین الدولۃ نے اس بیماری کی یہ وجہ تشخیص کی کہ مریض کا خون پتلا ہوگیا ہے اس لئے وہ جلد مسامات کے ذریعہ باہر نکل آرہا ہے، اس نے اس کا علاج یہ تجویز کیا کہ مریض کو بھنے ہوئے بیگن کے ساتھ جو کی روٹی کھلائی جائے، اس سے مریض شفایاب ہوگیا۔

غیر مسلم اطباء کے ساتھ فراخ دلانہ برتاؤ

مسلم طب کی تاریخ کا بیان نامکمل رہے گا اگر اس امر کا جائزہ پیش نہ کیا جائے کہ اسلامی حکومتوں کا اور دیگر اہل اسلام کا رویہ غیر مسلم اطباء کے ساتھ کس قسم کا تھا، ان کے رویہ سے غیر مسلم اطباء کی پیشہ وارانہ سرگرمیوں کو آیا سہولتیں حاصل ہوئیں یا ان کی حوصلہ شکنی ہوئی۔

طب میں ان اطباء کے ساتھ اہل اسلام کا میل جول اور ربط وضبط پہلی صدی ہجری میں ہی شروع ہوگیا تھا، اس کا ثبوت ابوداؤد کی ایک حدیث میں ہے: آنحضرت ﷺ نے ایک بار حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو اپنی بیماری پر مدینہ کے عیسائی طبیب

حارث بن کلدہ سے علاج کرانے کا مشورہ دیا تھا، کیوں کہ وہ مدینے کا سب سے بڑا طبیب تھا اوراس نے طب کی تعلیم ایران کے شہر جندیشاپور کے طبی مدرسے سے حاصل کی تھی۔

غیر مسلم اطباء اور علماء کے رابطے کی دوسری صورت ان سے مروجہ علوم کی کتابیں، ان کی زبانوں سے عربی میں ترجمہ کرانے کی شکل میں نکلی۔

اولین غیر مسلم اطباء سے جن اطباء سے مسلمان خلفاء اور سلاطین نے علاج ومعالجے کے لئے رجوع کیا وہ تیاذوق، اور جورجس بن جبرئیل تھے، تیاذوق کو حجاج بن یوسف نے اپنے علاج کے لئے طلب کیا تھا اوراس کے علاج سے شفا پائی تھی اس لئے اسے مستقلاً اپنے دربار میں رکھ لیا اوراس کے لئے بھاری مشاہرہ مقرر کیا۔

جورجس بن جبرئیل کو اپنے علاج کے لئے دوم عباسی خلیفہ منصور (۹۵ءتا۱۵۸ء) نے بغداد طلب کیا تھا، اس وقت وہ جندی شاپور کے شفاخانے کا رئیس الاطباء تھے، اس کے علاج سے منصور شفایاب ہوگیا، جورجس ایک مدت تک خلیفہ کے دربار میں رہا اور جب مرض الموت میں مبتلا ہوجانے کی وجہ سے جندشاپور واپس گیا تو اپنے پیچھے اپنے عیسائی شاگرد عیسی بن شہلا چھوڑ گیا، عیسی بن شہلا کو اس کے لالچی پن کی وجہ سے خلیفہ نے واپس ایران بھیج دیا اور جورجس کے بیٹے بختیشوع کو بلا کر درباری طبیب مقرر کیا، وہ زمانہ خلیفہ ہارون الرشید کا تھا، بختیشوع کے بعد اس کے بیٹے جبرئیل کو عباسی خلافت میں درباری طبیب مقرر کیا گیا کیوں کہ وہ اپنے والد سے بھی زیادہ بڑا طبیب تھا اور ۲۳ سال ہارون کی وفات تک درباری طبیب رہا۔

ان طبیبوں کو دربار میں اتنا گراں قدر مشاہرہ دیا جاتا تھا کہ وہ اس کا تصور بھی نہیں کرسکتے تھے، ابن ابی صبیعہ لکھتا ہے کہ جبرئیل کا سالانہ مشاہرہ ایک لاکھ بیس ہزار درہم تھا۔

جبرائیل کی وفات کے بعد بختیشوع بن جبرئیل دربار خلافت کا طبیب ہوا، وہ زمانہ خلیفہ مامون الرشید کا تھا اسے بھی گرانقدر مشاہرہ ملتا تھا، اس لئے وہ اپنے گھر میں

خلیفہ متوکل کے معیار کے قالین بچھا تا تھا۔

بختیشوع بن جبرئیل کے بعد جبرئیل بن عبید اللہ بختیشوع درباری طبیب ہوا، وہ زمانہ خلیفہ مقتدر باللہ کا تھا،غرضیکہ عیسائی اطباء یکے بعد دیگرے عباسی خلفاء کے دربار میں مقرر ہوتے اور بھاری تنخواہیں پاتے۔

غیر مسلم اطباء کے ساتھ ایسی فراخدلی اموی اور عباسی دور کے خلفاء کے یہاں ہی روا نہیں رکھی گئی تھی بلکہ دنیائے اسلام میں مختلف النوع حکومتیں اندلس، تیونس اور مصر وغیرہ میں جو قائم ہوتی رہی ہیں ان میں بھی ویسی ہی فراخدلی روا رکھی جاتی رہی، ان کا فراخدلانہ طرز عمل اس امر کی دلالت کرتا ہے کہ علم پروری کی مساعی میں بھی اور معاشرے میں اپنی صلاحیت کے لحاظ سے اپنا اپنا مقام حاصل کرنے کے معاملے میں اسلام میں تعصب پسندی جائز نہیں رکھی گئی، عباسی عہد خلافت کا زمانہ ساڑھے پانچ صدیوں پر محیط ہے، اور دور حکومت کی اتنی غیر معمولی طوالت حکمران خاندانوں کے ذہن، خیالات اور انداز فکر کو کچھ سے کچھ کر دیتی ہے مگر علمی بے تعصبی کے معاملے میں زمانے کی طوالت ذرا اثر انداز فکر کو کچھ سے کچھ کر دیتی ہے مگر علمی بے تعصبی کے معاملے میں زمانے کی طوالت ذرا اثر انداز نہ ہو سکی، ثابت ابن قرہ کو عباسی دربار میں اتنا قرب حاصل ہوا کہ لوگ اسے بھی مسلمان سمجھنے لگے، اور شاید یہ حکمرانوں کی بے تعصبی کا اثر تھا کہ ثابت ابن قرہ کی اولادیں سنان بن ثابت، ابراہیم بن سنان بن ثابت وغیرہ مشرف باسلام ہوگئیں۔

تیونس میں خاندانِ اغالبہ کی حکومت قائم ہوئی تو اس کے عہدِ حکومت میں ایک یہودی طبیب اسحاق بن سلیمان نے اپنا وطن چھوڑ کر تیونس میں سکونت اختیار کر لی، وہاں سلطان زیادۃ اللہ کے دربار میں رسائی حاصل کی، اس نے طب کی تعلیم بھی ایک مسلمان طبیب اسحاق بن عمران سے حاصل کی تھی، اس نے طب کچھ کتابیں بھی لکھیں جن میں سے ایک کتاب "الحمیات" (بخاروں کے موضوع پر) کے بارے میں بلند پایہ مسلمان طبیب علی بن رضوان مصری نے بہت تعریفی تبصرہ کیا۔

ایک اور یہودی طبیب ابوالخیر سلامہ بن مبارک نے مبشر ابن فاتک سے طب کی تعلیم حاصل کی۔

عبیدیوں کے عہد (۹۰۹ء تا ۱۱۷۱ء) میں بھی جو فاطمین مصر کے نام سے مشہور ہیں مسلمان اور غیر مسلم اطباء کے درمیان رواداری اور عدم امتیاز کی پالیسی قائم رہی، عیسی اور سعید نامی عیسائی اطباء عبیدی حکمرانوں کے درباری طبیب تھے، یوسف نصرانی (م ۹۸۴ء) بھی عبیدی عہد حکومت میں ابھرا، یعقوب بن اسحاق نامی ایک یہودی طبیب عبیدی حکمرانوں کا درباری طبیب تھا، ابو کشیار افرائیم بن الحسن اسرائیلی ایک عبیدی حکمران مستنصر کا درباری طبیب بنا، اس نے بھی طب کی تعلیم علی بن رضوان سے حاصل کی تھی۔

ان مثالوں سے امر کا اندازہ ہوتا ہے کہ گویا عیسائیت اور یہودیت دونوں اسلام کے سب سے بڑے حریف تھے اس کے باوجود علم پروری کے شعبے میں بلاد اسلامیہ میں عیسائیوں اور یہودیوں دونوں مذاہب کے لوگوں کو پھلنے پھولنے کے پورے پورے مواقع حاصل تھے۔

مذہبی بے تعصبی کی وجہ سے مسلمان اطباء نے غیر مسلم اطباء کی شاگردی اختیار کرنے میں بھی پس و پیش نہیں کیا، مثلاً فلسطینی مسلمان طبیب ابو عبداللہ محمد بن احمد بن ساعد تمیمی نے طب کی تعلیم بیت المقدس کے ایک قبطی راہب ابن زکریا بن ثواب سے حاصل کی، ایسا ہی اندازہ سامی حمارنا کی ایک تحریر سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ جس میں اس نے لکھا ہے کہ ابن ربن طبری کی کتاب فردوس الحکمت زکریا رازی کی کتابیں الحاوی اور المنصوری اور ابن سینا کی القانون کے اہم مآخذ یونانی اطباء کی وہ کتابیں ہیں جو اسکندریہ میں مرتب ہو کر شائع ہوئیں اور نویں صدی عیسوی میں عربی زبان میں ترجمہ کی گئی تھیں۔

مسلمان اطباء نے ہندوستانی اطباء سے بڑی فراخدلی سے استفادہ کیا اور ان سے فلسفہ اور نجوم وغیرہ کے علاوہ طب کا علم بھی حاصل کیا، خلیفہ ہارون رشید کے زمانے میں

دربار خلافت میں ہندوستانی اطباء میں سے ایسے ایسے ماہر اطباء بھی تھے جن کا مقابلہ یونانی اطباء کرنے سے عاجز تھے، مثلاً ہارون الرشید کا چچازاد بھائی ابراہیم بن صالح کسی مہلک بیماری میں مبتلا ہوا، دربار کے مشہور یونانی طبیب جبرئیل بن بختیشوع نے جواب دیا اورخلیفہ کو بتایا کہ کہ اب وہ چند لمحوں کا مہمان رہ گیا ہے، مگر ایک ہندی طبیب صالح بن بہلہ نے اس کا شرطیہ علاج کیا، اس نے کہا اگر مریض صحت یاب نہ ہوتو اس کی بیوی اوراس کی قیمتی املاک اس سے چھین لی جائیں، پھراس نے علاج شروع کیا اورتھوڑی دیر میں مرض اٹھ کے بیٹھ گیا۔

اس کے علاوہ بیمارستانوں میں ہندوستان ہندو اطباء تھے جن کا تذکرہ ابن ابی صبیعہ نے کیا ہے۔

سائنس وطب میں دنیائے اسلام اورہم عصر اقوام کا موازنہ
(نویں صدی تا تیرہویں صدی)

دنیائے اسلام میں سائنس کے عروج وکمال کی قدر ومنزلت بہتر طور پر اس وقت سمجھی جاسکتی ہے جب مسلمانوں کی سائنسی ترقیات کا ان ہم عصر اقوام کے ساتھ موازنہ کیا جائے، مسلمانوں کی پرجوش سائنسی سرگرمیوں کا زمانہ نویں صدی عیسوی سے تیرہویں صدی عیسوی تک کا ہے؛ لہٰذا ہم نے ان پانچ صدیوں کا موازنہ مرتب کیا ہے، یہ موازنہ مقداری نہیں بلکہ اعدادی ہے، مسلمان حکماء کی تعداد اوران کا ہم عصر اقوام کے ساتھ موازنہ بین طور پر اس امر کا مظہر ہے کہ ان پانچ صدیوں میں مسلمان حکماء سائنس کے میدان میں تمام اقوام پر فائق تھے اوران کا تفوق بہت بلند درجہ کا تھا، اس کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ تاریخ سائنس کے مصنفین کے ایک جائزے کے مطابق مذکورہ بالا پانچ صدیوں میں جتنے نامور سائنس داں پیدا ہوئے ان میں سے مسلمان حکماء کو مطلق اکثریت حاصل تھی، گویا سائنس میں وہ قوت فائقہ تھے، ان کے برعکس دیگر اقوام کے سائنسدانوں کی مجموعی تعداد ان سے کافی کم تھی۔

پھر مسلم حکماء کی تعداد کا موازنہ اگر یونانی حکماء سے کیا جائے توان کے مقابلے پر

بھی مسلمان فائق نظر آئیں گے، یونان میں ۶۲۵ ق م سے جب پہلا یونانی سائنس داں یا فلسفی پیدا ہوا، ۳۵۰ء تک جب وہاں کا آخری سائنس داں Dio[hantus of Alexadria سرگرم عمل تھا، ساڑھے آٹھ پونے نوصدیوں میں جتنی تعداد میں نامور سائنسداں پیدا ہوئے، ان سے کہیں زیادہ سائنسدان دنیائے اسلام نے صرف پانچ صدیوں میں پیدا کیں۔

موازنے کے لئے ان اعداد وشمار کا ماخذ امریکی مصنفین کی مرتب کردہ پندرہ جلدوں پر پھیلی ہوئی کتاب A Dictionary of Scientific biography ہے، یہ کتاب تاریخ سائنس کے تمام ماخذات کے درمیان سب سے جامع، معیاری اورقابل اعتماد ہے، اس میں یونانی عہد سے لے کر انیسویں صدی تک دنیا کی تمام اقوام میں پیدا ہونے والے نامور سائنسدانوں کے تذکرے لغات کے اصول پر انگریزی حروف تہجی کی ترتیب کے ساتھ مرتب کئے گئے ہیں، اس کتاب کے بالاستیعاب مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ محولہ بالا پانچ صدیوں میں سائنس کی سرگرمیاں دنیائے اسلام کے علاوہ یورپ، ہندوستان اورچین میں جاری تھی، بقیہ ممالک پر سناٹا طاری تھا، مذکورہ کتاب کی مدد سے ان ملکوں میں سائنس دانوں کی جو تعداد معلوم کی گئی وہ درج ذیل ہے:

دنیائے اسلام	۱۰۶	سائنسداں
یورپ	۷۰	سائنسداں
ہندوستان	۸	....
چین	۵	....
میزان	۱۸۹	

شرح فیصدی میں مسلمان حکماء ۵۵ فیصد تھے، ان کے مقابلے میں دیگر اقوام صرف ۴۵ فیصد، ان دیگر اقوام میں سے یورپی ۳۷ فیصد تھے، ہندی ۴ء۳ فیصد اورچینی ۲ء۶ فیصد۔

مذکورہ بالا اعداد وشمار اس امر کی دلالت کرتے ہیں کہ مسلمان حکماء پانچ صدیوں

تک سائنس کے میدان میں مطلق اکثریت کے حامل تھے۔

دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ یورپ میں ۷۰ فیصد حکماء جو پیدا ہوئے ان میں سے ۴۹ یعنی ستر فیصد سائنسدانوں کو یہ رتبہ مسلمان حکماء کی کتابوں سے استفادے سے ذریعہ حاصل ہوا۔

دنیائے اسلام کے اطباء کا ہم عصر اقوام سے ایک موازنہ

طب کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بھی مسلمان حکماء نے گہری دلچسپی لی، طب کی یونانی تخلیقات کو سیکھا، اسے عربی قالب میں ڈھالا اور پھر تین چار صدیوں تک اس میں طبع زاد اضافے کئے، اس مجموعی سرمائے سے آگے چل کر یورپ نے استفادہ کیا؛ بلکہ یہ سرمایہ صدیوں تک یورپ کے طبی مدارس کا سب سے اہم ماخذ رہا۔

یہ نتیجہ جارج سارٹن کی تصنیف An Intriduction to the History of Science سے اخذ کیا گیا ہے، جو اس موضوع پر سب سے معتبر اور مبسوط کتاب ہے۔

مسلمان اطباء کی قدر شناسی جارج سارٹن کی اس تصنیف سے دو طرح سے جھلکتی ہے، ایک اس طرح سے کہ اس نے تاریخ سائنس کو پچاس پچاس سال کے ادوار میں جو تقسیم کیا ہے ان میں سے دس ادوار کو اس نے مسلمان سائنسدانوں کے نام سے منسوب کیا ہے، مثلاً آٹھویں صدی کے نصف آخر کو جابر بن حیان کے نام سے، نویں صدی کے نصف اول کو خوارزمی کے نام سے، اسی صدی کے نصف آخر کو زکریا کے نام سے اور علی ہذا القیاس، ان میں سے پانچ کو اس نے مسلمان اطباء کے ناموں سے منسوب کیا ہے، وہ پانچ ہستیاں زکریا رازی، البیرونی، ابن زہر، ابن رشد اور ابن بیطار ہیں جب کہ بقیہ پانچ کو غیر مسلم سائنسدانوں کے نام سے۔

طب میں مسلمان اور غیر مسلم اطباء کا ایک تقابلی مطالعہ کرنے پر جارج سارٹن کی رائے درست معلوم ہوتی ہے، سارٹن نے اپنی کتاب میں سائنس کے دیگر مضامین کے ساتھ طب کی تاریخ کا بھی جائزہ لیا ہے اور نویں صدی قبل مسیح سے لے کر چودھویں صدی

کے واخر تک دنیا بھر میں پیدا ہونے والے نامور وممتاز اطباء کے احوال بیان کئے ہیں۔

عیسائی اطباء	۵۱
مسلمان	۴۱
یہودی	۱۱
چینی	۷
جاپانی	۵
ہندوستانی	۴
میزان	۱۱۹

اس جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام گو کہ یہودیت اور چینی، جاپانی اور ہندوستانی اقوام سے بہت کم عمر ہے، پھر بھی مسلمان اطباء تعداد میں ان سب سے زیادہ ہیں، نویں صدی کے وسط سے لے کر تیرہویں صدی کے وسط تک دنیائے اسلام میں پیدا ہونے والے نامور اطباء کی تعداد میں یہودیوں، چینیوں، جاپانیوں اور ہندوستانیوں سے زیادہ تھے، عددی لحاظ سے مسلمانوں پر برتری صرف عیسائی اقوام کو حاصل ہے، اس کی دو بڑی وجوہات ہیں، ایک یہ کہ عیسائی اطباء نے طب کا ورثہ دو خاص ذرائع سے حاصل کیا ہے، یونانی اطباء سے اور مسلمان اطباء سے جب کہ مسلمان اطباء کو طب صرف ایک ذریعہ سے حاصل ہوئی، وہ ذریعہ یونانی اطباء تھے، مسلمانوں نے ہندی اور ایرانی اطباء سے جو استفادہ کیا وہ قابل لحاظ نہیں، کیوں کہ ان دونوں ملکوں کے اطباء سے استفادہ کرنے کی مدت بہت مختصر ہے، بمشکل ۵۷ سال، خلیفہ ہارون الرشید کے عہد خلافت ۷۸۶ء تا ۸۱۳ء سے لے خلیفہ متوکل کی وفات بہ سال ۸۶۱ء تک۔(۱)

مسلمانوں کے شفاخانے

بیمارستان/شفاخانے: مسلمانوں پر کی طبی خدمات کا یہ تذکرہ اس وقت تک نامکمل رہے گا جب تک ان شفاخانوں پر گفتگو نہ کی جائے جو قرون وسطی کے دوران اسلامی بلادو

(۱) ان اطباء کی مکمل فہرست دیکھنے کے لئے رجوع کیجئے "دنیائے اسلام، سائنس وطب کا عروج، ڈاکٹر حفیظ الرحمن صدیقی

امصار میں قائم کئے گئے تھے مورخین نے عہد وسطٰی کے شفاخانے کے لئے ''بیمارستان'' کا لفظ استعمال کیا ہے، جو دولفظوں (بیمار'' اورستان (جگہ) سے مل کر بنا ہے، یوں فارسی زبان کی اس ترکیب ''بیمارستان'' کے معنی ''بیمار کی جگہ'' ہے، عربوں کے یہاں اس کے استعمال کی وجہ یہ ہے کہ ایران کے صوبہ خورستان کے شہر جندی شاپور میں ساسانی حکمرانوں نے ایک مدرسہ قائم کیا تھا، جہاں طب کی تعلیم دی جاتی تھی، مدرسے میں ایک بیمارستان بھی تھا، اس مدرسے نے مسلم طب پر پر گہرے اثرات مرتب کیے، ایرانی اثرات ہی کا نتیجہ تھا کہ عربوں نے شفاخانے کے لئے فارسی ترکیب ''بیمارستان'' لی اوراسے اپنے یہاں رائج کیا، بیمارستان کا لفظ آگے چل کر ''مارستان'' بن گیا، اکثر طبی تصانیف میں مارستان ہی استعمال ہوا ہے۔ساتویں صدی ہجری ۸/۷ صدی عیسوی اوراس کے بعد سے بلنسیہ کی مقامی بولی میں ہسپتال کا ترجمہ مرستان اور ''ملنستان'' رائج ہے، ہسپانوی بولیوں میں اور گیارھویں صدی ہجری کے قاہرہ میں بھی مرستان کا لفظ رائج ہوا، آجکل قاہرہ میں اس کا لفظ ''مرستان'' ہے المغرب کی جدید بولیوں میں مورصطانی اور بعض جگہ ''موصطران'' استعمال ہوتا ہے اور پورے المغرب میں اس کے معنی خطرناک پاگلوں کا قید خانہ ہے دیکھئے اردو دائرہ معارف اسلامیہ عربی میں آجکل شفاخانے کے لئے ''مستشفی'' کا لفظ آتا ہے، مسرتان یا مرستانی پاگل خانے کیلئے مروج ہے)۔

اسلام میں سب سے پہلا شفاخانہ خلیفہ ولید بن عبدالملک (۸۶/۹۶ھ/ ۷۰۵۔ ۷۱۵ء) نے دمشق میں بنوایا۔(۸۸ھ/۷۰۷ء) میں خلیفہ نے اپنے ہاتھوں سے اس کا سنگ بنیاد رکھا، اسلامی دنیا کا یہ اولین شفاخانہ جذامیوں کے لئے مخصوص تھا، خلیفہ نے مریضوں کی دیکھ بھال کے لئے اطباء تعینات کیے اوران کے لئے تنخواہیں مقرر کردیں۔ بیماروں کے لئے معاش اور طعام وقیام کا انتظام شفاخانے ہی میں کیا گیا، انھیں ہدایت تھی کہ وہ باہر آکر تندرست لوگوں سے میل جول نہ رکھیں۔

خلافت عباسیہ میں خلیفہ ہارون الرشید نے جندی شاپور کے مدرسہ طب سے تحریک پاکر عیسائی طبیب جبرئیل بن بختیشوع کو بغداد میں شفاخانہ کھولنے کا حکم دیا،

شفاخانہ قائم ہوا تو جندی شاپور کے بیمارستان سے ایک ماہر دواساز ماسویہ کو بغداد لایا گیا، بعد میں ماسویہ کا بیٹا یحی بیمارستان کا نگران مقرر ہوا، ہارون الرشید کے عہد میں بغداد میں متعدد ہسپتال بنوائے گئے، ان کے وزیر یحیٰ بن خالد برمکی نے اپنے خرچ سے ''بیمارستان برامکہ'' تعمیر کیا، جس کا نگران ایک ہندوستانی طبیب ابن دھن مقرر تھا، اس کے بعد بغداد میں خلیفہ المعتضد (۲۷۹۔۲۸۹ھ/ ۸۹۲۔۹۰۲ء) کے وزیر ابوالحسن علی بن عیسیٰ نے (۳۰۲ھ/ ۹۱۴ء) میں ایک وقف مقرر کیا، محرم (۳۰۶ھ) جون ۹۱۸ء میں سنان بن ثابت نے بغداد کے بازار سوق یحیٰ میں خلیفہ المقتدر کے حکم سے بیمارستان السیدہ بنوایا، جس کا ماہوار خرچ چھ سو دینار کے قریب تھا، اسی سال خلیفہ نے سنان کے مشورے پر بغداد کے باب الشام میں اپنے نام پر ایک شفاخانہ تعمیر کروایا جو'' بیمارستان المقتدری'' کے نام سے مشہور ہوا، اس کا ماہانہ خرچ دوسو دینار تھا، جو خلیفہ اپنی حبیب خاص سے دیتے تھے، عباسی عہد کے مشہور وزیر ابن الفرات نے اپنے نام پر بغداد میں بیمارستان ابن الفرات قائم کیا، یہ شفاخانہ محلہ ''درب المفضل'' میں واقع تھا، چوتھی صدی ہجری/ دسوی صدی عیسوی میں خلافت اسلامیہ کا سب سے شاندار ہسپتال عضدالدولہ تھا میں بنوایا، بیمارستان عضدی کے نام سے مشہور ہوا، بیمارستان عضدی نہ صرف بغداد؛ بلکہ عالم اسلام کا بہترین شفاخانہ تھا۔

چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی کے آغاز میں مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ میں شفاخانے کھولے گئے اسی زمانے میں رے اور نیشاپور میں کئی بیمارستان بنوائے گئے، رے کا بیمارستان بہت بڑا تھا۔

مصر میں سب سے پہلے خلیفہ متوکل کے وزیر فتح بن خاقان نے ہسپتال بنوایا، جو بیمارستان مغافر کے نام سے مشہور تھا، بعد ازاں احمد ابن طولون (المتوفی ۲۷۰ھ/ ۸۸۴ء) جب مصر کے والی ہوئے تو انھوں نے اپنے نام پر ایک بڑا بیمارستان بنوایا، جو بیمارستان احمد بن طولون کہلایا، یہ بیمارستان (۲۸۹/ ۸۷۲ء) میں بنا مصر کا ایک اور بیمارستان۔ بیمارستان کافوری کے نام سے مشہور تھا۔

اسلامی مملکت کا سب سے شاندار شفاخانہ بغداد کا بیمارستان عضدی تھا، جس کی تقلید میں مختلف شہروں میں بڑے بڑے بیمارستان بننے لگے، چھٹی صدی ہجری میں نورالدین زنگی (۵۴۱ـ۵۶۹/۱۱۴۶ـ۱۱۷۵ء) نے دمشق میں ایک بڑا شفاخانہ تعمیر کروایا جو بیمارستان کبیر دمشق کہلایا، اسی صدی میں سلطان صلاح الدین ایوبی نے قاہرہ کے شاہی ایوان میں بیمارستان صلاح الدین غازی بنوایا، شفاخانے کی دیواروں پر مکمل قرآن مجید لکھا ہوا تھا، سسکندریہ میں بھی ایک ہسپتال تعمیر کروایا، جس کا تذکرہ مورخین نے کیا ہے، بغداد کے بیمارستان عضدی اور دمشق کے بیمارستان کبیر کے بعد سلطان منصور قلاؤن نے قاہرہ میں ایک بہت بڑا ہسپتال بنوایا۔

یہ شفاخانہ انھوں نے ایک بڑے محل میں قائم کیا، ملک منصور نے محل کی عمارت کے علاوہ متعدد عمارات بنوائیں جن کی تعمیر میں مصر کے تمام مزدور اور تین سو قیدی ہر روز کام کرتے تھے۔ بادشاہ خود بھی روزانہ عمارات کے ملاحظہ کے لئے آتا تھا، گیارہ ماہ لگاتار کام کے بعد (۶۸۳ھ/ ۱۲۸۴ء) میں یہ عظیم الشان ہسپتال پایہ تکمیل کو پہنچا، جس محل میں یہ بیمارستان کھولا گیا، اس کا احاطہ (۱۰۶۰۰) گز تھا۔ عمارت کے ستون سنگ مرمر اور سنگ رخام سے تیار کرائے گئے تھے، یہ ہسپتال ''مارستان المنصور'' کے نام سے مشہور ہوا، ول دوران کے بقول یہ قرون وسطیٰ کا سب سے بڑا ہسپتال تھا۔(۱)

مصر کے علاوہ افریقہ کے دوسرے اسلامی خطوں میں بھی ہسپتال قائم کیے، سلطان یعقوب المنصور الموحدی، (۵۸۰ـ۵۹۵ھ/ ۱۱۸۴ـ۱۱۹۹ء) نے مراکش میں ایک بڑا بیمارستان بنوایا، مرینی سلاطین نے یعقوب المنصور کے شفاخانوں کو نہ صرف باقی رکھا؛ بلکہ خود بھی متعدد شفاخانے تعمیر کرائے، سلطان عبد الغالب مائسہ السعدی (۹۶۵/ ۹۸۱ھ/ ۱۵۵۷ـ ۱۵۷۴ء) نے مرکش میں ایک ہسپتال تعمیر کروایا۔(۲)

ترکی کے سلاطین نے بھی شفاخانوں کے قیام کی طرف خاص توجہ دی، ان کے

(۱) اردو دائرہ معارف اسلامیہ ۵/ ۸۸/ ۲۰۳، بذیل مادہ بیمارستان از

(۲) اردو دائرہ معارف اسلامیہ ۵/ ۸۰۳ـ ۲۰۷، بذیل مادہ ''بیمارستان'' از

یہاں ہسپتال کے لئے بیمارستان اور مارستان کے علاوہ دارالشفا، دارالعافیہ اور تیمارخانہ کے الفاظ بھی استعمال ہوتے رہے ہیں، سب سے پہلا سلجوقی دارالشفا (۶۰۲ھ/ ۱۲۰۶ء) میں قیصری میں قائم ہوا۔ بعد ازاں دوسرے مقامات سیواس، دیورھری، چانکیری، قسطمونی، قوینہ توقاد، ارزروم، ارزنجان، ماردین اور آماسیہ میں شفاخانے کھولے گئے، عثمانی سلاطین نے سب سے پہلا ہسپتال دارالشفائے یلدرم کے نام سے بروسہ میں (۸۰۲ھ/ ۱۳۹۹ء) کھولا، اس کے بعد (۸۷۵ھ/ ۱۴۷۰ء) میں محمد دوم الفاتح (۸۸۵ـ۸۸۶ھ/ ۱۴۵۱ـ۱۴۸۱ء) نے داراشفائے فتح تعمیر کیا، نویں صدی ہجری ہی کے آخر میں ادرنہ میں دریا کے کنارے ایک عمارت نبوائی اور اس کے ایک حصے میں دارالشفا کھولا، اس کی تعمیر آٹھ برسوں میں مکمل ہوئی، دسویں صدی ہجری/ سولھویں صدی عیسوی کے دوران استانبول میں تین بڑے ہسپتال کھولے گئے، ان میں سلیمان اعظم کی بیوی خرم سلطان کے نام پر بیمار خانہ (۹۴۶ھ/ ۱۵۳۹ء) میں تعمیر ہوا۔ (۹۶۳ھ/ ۱۵۵۵ء) سلیمان کے نام پر ایک دارالشفا اور مدرسہ طب وجود میں آئے، سلطان مراد ثالث کی والدہ نور بانو سلطان کے نام پر توپ طاشی کا بیمارخانہ (۹۹۱ھ/ ۱۵۸۳ء) میں بنوایا گیا، جو ۱۹۲۷ء تک چلتا رہا، منیہ میں حافظ سلطان کی والدہ کے نام پر بھی ۹۴۶ھ ۱۵۳۹ء میں ایک بڑا ہسپتال تعمیر کیا گیا۔ اگلی صدی کے دوران ۱۰۲۵ھ ۱۶۱۶ء میں استانبول میں ایک اور ہسپتال قائم ہوا، خلافت عثمانیہ کے آخری دور کے شفاخانوں میں استانبول میں بچوں کا ششلی (شیشہ دار) شفاخانہ بھی قابل ذکر ہے، جسے سلطان عبدالحمید ثانی نے ۱۳۱۶ھ/ ۱۸۹۸ء میں بنوایا۔ بڑے ہسپتالوں کے علاوہ سلطنت ترکی کے دوسرے مقامات پر بھی شفاخانے کھولے گئے تھے۔(۱)

مسلم اسپین میں بھی شفاخانوں کے قیام میں خلفاء نے خاص دلچسپی لی۔ قرطبہ میں ایک بڑا ہسپتال کھولا گیا، جس کے چیف سرجن ابوالقاسم زھروای تھے، غرناطہ اوررردوسرے شہروں میں بھی متعدد شفاخانے بنوائے گئے، ہسپتالوں میں مسلمانوں کی

(۱) اردو دائرہ معارف اسلامیہ بذیل مادہ ''بیمارستان'' از ۵ ۳۱۱ـ۳۰۹:bede n seshvaroglu

دلچسپی کا اندازہ اسسے لگایا جاسکتا ہے کہ صرف قرطبہ میں تین درجن سے زائد شفاخانے موجود تھے۔

ہسپتالوں کے قیام میں برصغیر ہندوپاک کے مسلم سلاطین بھی اپنے ہم مذہبوں سے پیچھے نہیں رہے، محمد تغلق (۷۲۵۔۷۵۲ھ/ ۱۳۲۵۔۱۳۵۱ء) کے عہد حکومت میں بارہ سو اطباء سرکاری ملازم تھے، صرف پایۂ تخت دہلی میں چھوٹے بڑے شفاخانوں کی تعداد ستر تھی، ان کے جانشین فیروز شاہ تغلق (۷۵۲۔۷۹۰ھ/ ۱۳۵۱۔۱۳۸۸ء) نے مزید پانچ شفاخانوں کا اضافہ کیا۔ فیروز شاہ تغلق نے تخت نشین ہونے کے بعد ایک فرمان جاری کیا، جس میں ایک سو شفاخانے قائم کرنے کا حکم بھی شامل تھا، مغل حکمرانوں میں جلال الدین محمد اکبر (۹۶۳۔۱۰۱۴ھ/ ۱۵۴۲۔۱۶۰۵ء) نے متعدد دارالشفا قائم کرائے، جن میں کئی اکبرآباد میں تھے، جہانگیر نے ۱۰۱۴ھ/ ۱۶۰۵ء میں تخت نشین ہونے کے ساتھ ہی حکم دیا کہ بڑے شہروں میں شفاخانے کھولے جائیں اور بیماروں کے علاج کے لئے اطباء مقرر کئے جائیں، جن کے اخراجات سرکاری خزانہ سے دیے جائیں، شاہ جہاں، اورنگ زیب اوران کے بعد کے حکمرانوں نے بھی بڑے بڑے شہروں میں شفاخانے قائم کئے۔(۱) جنہیں بخوف طوالت یہاں نظرانداز کیا جاتا ہے۔

قرون وسطیٰ کے دوران خلافت اسلامیہ کے مختلف شہروں میں شفاخانوں کا جال پھیلایا گیا تھا، خراسان، موصل، حلب، اسکندریہ وغیرہ میں ان گنت شفاخانے قائم تھے، مورخوں اورسیاحوں نے جو چشم دید حالات بیان کئے ہیں، ان کے مطابق بغداد میں ساٹھ شفاخانے تھے، قرطبہ کے شفاخانوں کی تعداد پچاس تھی، اکیلے استانبول میں ترکوں نے پانچ صدیوں کے اندر ستر شفاخانے قائم کیے، قاہرہ، دمشق اوردوسرے بڑے کا حال اس سے مختلف نہ تھا، میکس میرہاف کا بیان ہے:

''ہسپتال شروع ہی میں قائم کیے گئے، اور یہ غالباً قدیم اورمشہور مدرسہ جندی شاپور کے نمونے پر بنوائے گئے جس میں ایک بیمارستان بھی تھا،

(۱) طب العرب: ۴۹۰۔۴۹۳

اسلامی دنیا میں اسی سے ہسپتال کے لئے بیمارستان کی اصطلاح اخذ کی گئی ہے، ہمارے پاس کم ازکم چونتیس اداروں کے بارے میں مستند معلومات موجود ہیں، جو ایران سے مراکش اورشمالی شام سے مصر تک پھیلے ہوئے تھے''۔

یہ امرملحوظ رہے کہ میکس میرہاف کا یہ بیان عہدزریں یعنی ۱۹۰۰ء۔۱۱۰۰ تک کے ہسپتالوں تک محدود ہے اوراس میں بھی مسلم اسپین شامل نہیں ہے۔

مسلم شفاخانوں کی یہ زریں تاریخ یہیں ختم نہیں ہوتی اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ ولید نے جو پہلا شفاخانہ قائم کیا وہ جذامیوں کے لئے مخصوص تھا، یہ بدنصیب طبقہ ہردور میں دردمند مسلم حکمرانوں کے لئے باعث توجہ رہا ہے۔ مسلمانوں نے نہ صرف جذامیوں بلکہ اندھوں، یتیموں اوراپاہج عورتوں کے لئے بھی مناسب انتظام کیا۔

خلیفہ ولید بن عبدالملک نے ہراپاہج کے لئے ایک خادم اور ہراندھے کے لئے ایک عصاکش مقرر کیا تھا، اس کے بعد خلیفہ منصور نے نابینا انسانوں، یتیموں اوراپاہج عوتوں کے لئے ایک دارالاقامہ (ہوسٹل) بنوایا، موحدین میں سلطان یعقوب المنصور الموحدی اپنی سلطنت کے الگ الگ حصوں میں پاگلوں، کوڑھیوں اوراندھوں کے لئے شفاخانے بنوائے، ترک سلاطین نے سیواس قسطمونی اورقیصری میں کوڑھی خانے تعمیر کیے، جن میں کوڑھ کے مریضوں کا علاج ہوتا تھا۔

نویں صدی ہجری میں سلطان مراددوم (۸۲۴۔۸۵۵ھ/ ۱۴۲۱۔۱۴۵۵ء) نے اورنہ میں ایک کوڑھی خانہ بنوایا جودوسوسال جاری رہا۔

کوڑھ کے مریضوں کو جذامی کے بجائے مرضی کہا جاتا تھا، یہ نام انھیں حسن تعبیر کے طور پر دیا گیا تھا، عام طور پرانہیں شہر سے الگ ایک بستی میں بسایا جاتا تھا، شہرقرطبہ کا ایک پورمحلہ ''ربض المرضی'' بیماروں کی بستی کی حیثیت سے معروف تھا، فاس میں کوڑھیوں کو پہلے باب الخوخہ سے باہر تلمسان جانے والی سڑک پر بسایا گیا، پھر ساتویں صدی ہجری میں انھیں باب الشریعہ کے باہر غاروں میں رکھا گیا، ۔۶۵۸ھ میں انھیں باب

الشریعہ کے باہر دوسرے غاروں میں بسایا گیا۔کوڑھیوں کی اس بستی کو''الحارہ'' کہا جاتا تھا، اکثر مسلم شہروں میں ''الحارہ'' ضرور ہوتے تھے؛لیکن ضرورت اورحالات کے پیش نظر الحارہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا تھا۔(۱)شفاخانوں کی طرح مسلمانوں نے پاگلوں کے لئے''دارالمجنین' کے نام سے پاگل خانے تعمیر کرائے،اسلام میں سب سے پہلا پاگل خانہ خلیفہ منصور نے بنوایا،جس ے دارالمجانین کہتے تھے۔تیسری ہجری میں واسط اور بغداد کے درمیان دیر یکل کے مقام پر ایک پاگل خانہ تھا،چھٹی صدی ہجری میں دمشق میں ایک پاگل خانہ بنوایا گیا جس میں پاگلوں کا علاج کیا جاتا تھا،اسی صدی میں سلطان یعقوب المنصور الموحدی نے اپنی سلطنت میں پاگل خانے قائم کیے،مستقل پاگل خانوں کے علاوہ ہسپتالوں میں بھی پاگلوں کے لئے علیحدہ وارڈ تھے۔(۲) قاہرہ میں بیمارستان احمد ابن طولون میں پاگلوں کے لئے مخصوص وارڈ تھے،قاہرہ ہی میں صلاح الدین ایوبی کے بنائے ہوئے بیمارستان میں پاگلوں کے علاج کے لئے الگ الگ مکانات تھے، جو ایک علیحدہ وسیع احاطے میں تھے، دریچوں میں لوہے کی جالیاں لگی تھیں۔(۳)

ول دوران قرون وسطیٰ کے مسلم شفاخانوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دیوانوں کے لئے تمام بڑے مسلم شہروں میں پاگل خانے تھے''(۴)

قرون وسطیٰ کے مسلم شفاخانوں میں بعض غیرملکیوں ، پردیسیوں، غریبوں، اور بیمار مسلمانوں ہی کے لئے مخصوص ہوتے تھے،سلطان یعقوب المنصور الموحدی نے اپنے دارالسلطنت میں ایک شاندار ہسپتال بنوایا،جس میں ان لوگوں کا علاج کی جاتا تھا جو غریب الدیار یا پردیسی ہوتے تھے،ساتویں صدی ہجری میں بنونصر کے سلطان محمد پنجم نے غرناطہ میں ایک شاندار شفاخانہ کھولا،جس کی عمارت ۷۶۸ھ/۱۳۶۷ء میں مکمل ہوئی،اس میں صرف بیمار اورغریب مسلمانوں کا علاج ہوتا تھا،سلطان ابوفارس الحفصی

(۱) اردو دائرہ معارف اسلامیہ ۵/۳۰۷۔۳۰۸ (۲) اردو دائرہ معارف اسلامیہ ۵/۳۰۷۔۳۰۸

(۳) طب العرب:۴۸۵ (۴) the age of faeth p 331

نے''مفلس''،غریب الدیار اور بیمار مسلمانوں کے لئے ایک شفاخانے کی بنیاد ڈالی،جو ۸۲۳ھ/۱۴۲۰ء میں مکمل ہوا اسلامی قلمرو کے دوسرے شہروں میں بھی اس طرح کے ادارے قائم ہوئے،مغرب کے مسلم حکمرانوں نے شفاخانوں کے علاوہ مسافروں کے لئے شہروں کے باہر منزل بھی بنائے جہاں مسافر قیام کرتے تھے، انھیں تروایہ کہتے تھے۔(۱)

مسلمانوں نے چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی ہی میں جیل خانوں میں قیدیوں کے علاج معالجے کا بندوبست کیا تھا، المقتدر کے وزیر ابوالحسن علی بن عیسیٰ نے افسر الاطباء سنان بن ثابت کوحکم دیا کہ اطباء کی اکی جماعت مقرر کی جائے جو روزانہ جیلوں میں جاکر بیمار قیدیوں کا علاج کرے،سنان نے حکم کی تعمیل کی اوراطباء کا عملہ مقرر کیا، یہ لوگ روزانہ ہرجیل میں جاکر معینہ کرتے تھے، بیمار قیدیوں کا علاج کیا جاتا اورحسب ضرورت ان کے لئے ایسی غذا تیار کرواتے تھے جس میں گوشت نہیں ہوتا تھا؛ بلکہ دھنیا وغیرہ ڈال کر بیماروں کے لئے پکتا تھا،اسے''مزورات'' کہتے تھے۔(۲)

گشتی ہسپتالوں کا قیام بھی اسی وزیر کی یادگار رہے،انھوں نے سنان بن ثابت کوحکم دیا کہ اطباء کی ایک جماعت ادویات اورسامان ساتھ لے دیہات میں گشت کرے؛ چنانچہ سنان نے تجربہ کار ڈاکٹروں کا ایک عملہ تیار کیا، یہ لوگ دیہات میں گشت لگا کر ہر گاؤں میں پہنچ جاتے تھے،ان کے ساتھ گشتی دواخانہ اورضروری سامان ہوتا تھا، بقدر ضرورت ہرگاؤں میں قیام کر کے کسانوں اورنادارلوگوں کا علاج کرتے تھے، وزیر کی طرف سے ہدایت تھی کہ علاج میں مسلم اورغیر مسلم میں فرق نہ کیا جائے؛البتہ حیوان سے پہلے انسان اورغیر مسلم سے پہلے مسلم کا علاج کیا جائے۔(۳)

ول دوران نے ان اقدامات کے علاوہ پاگلوں کے علاج کا تذکرہ بھی کیا ہے:

''وزیر علی بن عیسیٰ جوطبیب بھی تھے؛انہوں نے ڈاکٹروں کا عملہ تربیت

(۱) اردو دائرہ معارف اسلامیہ ۵ص ص:۳۰۷۔۳۰۹

(۲) اردو دائرہ معارف اسلامیہ ۵ص:۳۰۵ (۳) اردو دائرہ معارف اسلامیہ ۵/۳۰۵

دیا تاکہ وہ جگہ جگہ جا کر بیماروں کا علاج کرے، اطباء کی ایک جماعت روزانہ جیلوں میں جا کر معاینہ کرتی تھی، پاگلوں کا علاج خاص ہمدردی سے کیا جاتا تھا‘‘(۱)

گشتی ہسپتال کی روایت کا آغاز ۳۱۹ھ/۹۳۱ء میں ہوا، ایک صدی کے اندر گشتی ہسپتال رائج ہو گئے تھے، میکس میر ہاف کا بیان ہے:

’’گشتی شفاخانے گیارھویں صدی عیسوی میں معروف تھے‘‘(۲)

فوج کی طبی ضروریات پوری کرنے کے لئے ایسے شفاخانے کئے گئے، جو سفر وحضر میں فوج کے ساتھ ہوتے تھے، سلطان محمود سلجوقی کا لشکر جب چلتا تو ان کا شفاخانہ چالیس اونٹوں پر لدا ہوتا تھا، جس کی حفاظت کے لئے ایک فوجی دستہ متعین تھا، فوج کے ساتھ جو اطباء ہوتے تھے، وہ نہایت تجربہ کار اور باصلاحیت ہوتے تھے۔

مسلم شفاخانوں کے انتظام کے متعلق مورخوں نے مکمل تفصیلات فراہم کی ہیں، میکس میر ہاف لکھتے ہیں۔

’’اسلامی تاریخوں میں ان اداروں کے انتظام کے بارے میں بہت ہی درست معلومات دی گئی ہیں‘‘(۳)

ہم نہ صرف ان اداروں کے ذرائع آمدنی سے باخبر ہیں؛ بلکہ اطباء ماہرین امراض چشم اور ملازموں کی تنخواہیں بھی معلوم ہو جاتی ہیں۔

مسلم بیمارستانوں کے مصارف کے لئے سرکار یا بعض اوقات امراء کی طرف سے اوقاف مقرر ہوتے تھے، جن کی سالانہ آمدنی سے ہسپتال کا خرچہ چلتا تھا، اوقاف متولی یا مہتمم کے زیر نگرانی ہوتے تھے، وہی شفاخانے کی ضروریات کے لئے رقم مہیا کرتا تھا، بغداد کے بیمارستان عضدی کے لئے عضد الدولہ نے ساڑھے سات لاکھ درہم سالانہ کی جاگیر وقف کر رکھی تھی، ملک منصور قلاوونی نے قاہرہ میں بیمارستان الکبیر المنصوری بنوایا تو

(۱) the age of faith p 246
(۲) the legacy of islam p 3
(۳) the legacy of islam p 336

اخراجات کے لئے دس لاکھ درہم سالانہ کے اوقاف مقرر کیے۔

عہد وسطیٰ کے ان طبی اداروں کا نظم ونسق چلانے کے لئے ایک مکمل انتظامیہ موجود تھا، ہر شفاخانے کی نگرانی ایک بڑے طبیب کے ذمہ ہوتی تھی جسے ساعور کہتے تھے، حکومت اپنی طرف سے اس شخص کو ساعور مقرر کرتی تھی جو اعلیٰ درجے کا طبیب ہوتا تھا، ہسپتال کا عملہ ساعور کی نگرانی میں کام کرتا تھا، یہ عہدہ سب سے پہلے بختیشوع کو ملا تھا، بغداد کے بیمارستان رشیدی میں یوحنا ابن ماسویہ رئیس الاطباء (ساعور) تھے، جندی شاپور کے بیمارستان میں یہ عہدہ مشہور طبیب سابور بن سہل کو ملا تھا، رے کے ہسپتال میں ابوبکر رازی ساعور کے عہدے پر فائز تھے۔

بعد میں جب وہ بغداد چلے آئے تو انھیں ایک سو سے زائد اطباء میں سے منتخب کر کے بڑے ہسپتال کا ساعور بنایا گیا، مختلف زمانوں میں جبرئیل بن عبیداللہ، ثابت بن سنان بن ثابت (المتوفی ۳۳۱ھ) اور ابن التلمذ (المتوفی ۵۶۰ھ) جیسے اطباء بغداد کے شفاخانے کے ساعور رہے۔قاہرہ میں مہذب الدین عبدالرحیم ابن علی الدخوار مملوک عہد حکومت میں رئیس الاطباء کے عہدے پر فائز تھے’’ بیمارستان الکبیر المنصوری میں بھی انھیں رئیس الاطباء مقرر کیا گیا تھا، ان کے نامور شاگرد ابن النفیس بیبرس کے دور سلطنت میں رئیس الاطباء تھے، عہد عباسی میں ہسپتالوں کی نگرانی کے لئے ایک ایک منتظم عمومی کا تقرر کیا گیا، خلیفہ المقتدر کے وزیر ابوالحسن علی بن عیسیٰ نے ۳۰۲ھ/۹۱۵ء میں بغداد مکہ اور مدینے کے شفاخانوں کی نگرانی کا کام ابوعثمان سعید بن یعقوب الدمشقی کو تفویض کیا۔

introduction to the history of science)
(vol.p)۔ (۱)

منتظم عمومی کی حیثیت سے یہ غالباً پہلے شخص تھے، ان کے انتقال کے بعد سنان بن ثابت کو طبی اداروں کے نظم ونسق سنبھالنے کا کام تفویض ہوا، سنان شاہی طبیب تھے، مگر انھیں منتظم عمومی کی حیثیت سے زیادہ شہرت ملی، جیسا کہ جارج سارٹن کہتے ہیں:

(۱) introduction to the history of science volp 641

''ان کی شہرت کی سب سے بڑی بغداد کے شفاخانوں کا انتظام اور طبی پیشہ کا معیار بہتر بنانے کے اقدامات ہیں''۔(۱)

سنان بن ثابت کی اصلاحات اور انتظامی اقدامات نے طب کے وقار میں چار چاند لگائے۔ ۳۱۹ھ/ ۹۳۱، ۹۳۲ء میں خلیفہ مقتدر کو شکایت پہنچی کہ کسی نیم حکیم کے غلط علاج سے ایک شخص جان سے ہاتھ دھو بیٹھا، خلیفہ نے شہر کے محتسب کو حکم دیا کہ جب تک سنان بن ثابت کے دستخط سے اطباء کے پاس اجازت نامے نہ ہوں، انھیں مطب کرنے سے روکدیا جائے، خلیفہ کے حکم پر سنان نے اطباء کا امتحان لینے کا طریقہ رائج کیا۔ سارٹن کا بیان ہے:

''۹۳۱ء/ ۹۳۲ء میں بغداد کے اطباء کو اس وقت تک مطب کرنے سے روکدیا گیا جب تک ان کا امتحان نہ لیا جائے، اور وہ سرکاری سند حاصل نہ کریں، سنان، جن کے ذمہ یہ کام تھا، نے آٹھ سو سے زائد اطباء کا امتحان لیا''۔

امتحان سے شاہی اطباء اور مسلمہ صلاحیت کے معالج مستثنٰی کئے گئے تھے، بغداد کے غیر معروف اطباء کی تعداد تقریباً ایک ہزار تھی، سنان بن ثابت نے انکا امتحان لیا اور جو طبیب جس فن میں ماہر پایا گیا، اسے صرف اسی فن میں علاج کرنے کی سند دی گئی، امتحان میں ایک ہزار اطباء میں سے صرف سات سو امیدوار کامیاب ہوئے، ناکام امیدواروں کو مطب کرنے سے روک دیا گیا۔ سنان بن ثابت کے اس طریقہ کار کا نتیجہ یہ ہوا کہ مطب کرنے کے لئے یا علاج کرنے کے لئے سرکاری سند لازمی ہوگئی۔ ول دوران کا بیان ہے۔

''کوئی شخص امتحان میں کامیاب ہوئے بنا اور سرکاری سند حاصل کئے بغیر قانونی طور پر مطب نہیں کرسکتا تھا، اسی طرح دوا فروش، حجام اور ماہرین امراض اطفال بھی سرکاری قواعد اور معاینہ کرانے کے پابند تھے''۔(۲)

(۱) introducion to the history of science vol lp
(۲) the age of faith p 246

اطباء کے امتحان کا طریقہ دوسرے ادوار وممالک میں بھی جاری رہا، چھٹی صدی ہجری میں ابن التلمیذ نے اطباء کا امتحان لیا اور صرف ان لوگ وں کو علاج کرنے کی اجازت دی، جو اس کے اہل پائے گئے، مصر اور شام کے رئیس الاطباء یا منتظم عمومی مہذب الدین الدخوار تھے، انہوں نے ملک العادل کے حکم پر ایک مرتبہ مصر کے کحالوں (ماہرین امراض چشم) کا امتحان لیا اور صرف ان کحالوں کو علاج معالجے کی اجازت دی، جو امتحان میں کامیاب ہوئے تھے۔(۱)

جن اطباء کو مطب کرنے کی اجازت ملی تھی ان کے نام رجسٹر میں درج ہوتے تھے، ممتحن مقرر کئے جانے کے وقت خیال رکھا جاتا تھا کہ وہ دیندار، ماہر فن اور دیانتدار ہوں۔

اطباء سے امتحان میں پوچھے جانے والے سوالات کی جھلک عبدالعزیز مطبب کی تصنیف امتحان الاطباء سے سامنے آتی ہے، جس میں کحال سے پوچھا گیا ہے کہ ایک ایک کے دو دو کیوں نظر آتے ہیں؟ یا شب کوری کے اسباب کیا ہیں؟ مجبر (ہڑی بٹھانے والے) سے سوال کیا گیا ہے کہ خلع اور میل کی علامات کیا ہیں؟ جرح سے دریافت کیا جاتا ہے کہ انسان کے بدن میں کتنی ہڑیاں ہیں؟ عصاب اور عضلات کتنے ہیں؟ رگیں کتنی ہیں اور کہاں کہاں ہیں؟ حکیم نبر واسطٰی صاحب کے بیان کے مطابق ابوسعید یمامی نے اطبا کے امتحان کے لئے ایک کتاب تیار کی تھی)

عہد اسلامی میں دوافروشوں کی نگرانی کا اہتمام بھی کیا گیا تھا، ترک سپہ سالار افشین نے زگریا طیفوری کو دوافروشوں کی فہرست تیار کرنے حکم دیا اور ان دوافروشوں کو چھاونی سے نکال دیا جو دھوکہ باز تھے، دیانتدار دوافروشوں کو خلیفہ کے پاس بھیجدیا، نجی دواخانوں کے علاوہ خود حکومت کی اپنے ڈسپنسریاں ہوتی تھیں، دواخانوں کے مالکوں کا امتحان لیا جاتا تھا اور صرف انھیں لوگوں کو ڈسپنسری چلانے ملتا تھا جو امتحان میں کامیاب ہوتے تھے، دوا کی کیفیت اور قیمت پر سرکار کی طرف سے نگرانی کی جاتی تھی۔

(۱) طب العرب حصہ تشریحات وتنقیدات:۲۸۸

ازمنہ وسطیٰ کے مسلم شفاخانوں میں اطباء متعین ہوتے مجھے بیمارستان عضدی میں چوبیس اطباء خدمات انجام دیتے تھے، ہسپتال میں ماہرین خصوصی کی مختلف جماعتیں کام کرتی تھیں جن میں طبائیعیون (ماہرین عضویات) کحالون (ماہرین امراض چشم) جراحون (سرجن) اورمجبرون (ہڑی بٹھانے والے) تھے، تبریز کے ربع رشیدی شفاخانے میں مختلف ممالک کے پچاس اطباء رہتے تھے، جارح کحال اور مجبر اس کے علاوہ تھے، بعض شفاخانوں میں اس سے زائد اطباء کام کرتے تھے، مسلم حکمرانوں کے پاس درباری اطباء بھی ہوتے، سیف الدولہ جب دسترخوان پر بیٹھتے تھے تو چوبیس ڈاکٹر موجود رہتے تھے، خلیفہ متوکل کے پاس مسلمان ڈاکٹروں کے علاوہ چھپن عیسائی اطباء تھے درباری اطباء کو مختلف خدمتوں کے عوض دودو تین تین تنخواہیں ملتی تھیں، اطباء میں ہمارے زمانے کے اسپشلسٹوں کی طرح مختلف امراض کے ماہرین خصوصی ہوا کرتے تھے، ان میں بعض فصاد، کچھ کحال اور کچھ انسانی ہوتے تھے، بعض اطباء صرف عورتوں کے علاج کے ماہر تھے اور صرف یہی خدمت انجام دیتے تھے، مصر میں اکثر کحال تھے کیوں کہ وہاں آنکھوں کی بیماری عام تھی، یہ لوگ قدح عین کے ذریعے موتیا بند کا اس طرح علاج کرتے تھے، جس طرح آج اس آپریشن کیا جاتا ہے، بیمارستان عضدی میں دوشنبہ اور جمعرات کے دنوں میں بغداد کے بڑے بڑے اطباء آتے اور پیچیدہ امراض کی تشخیص وامراض میں متعین اطباء کی مدد کرتے تھے، رئیس الاطباء کے کام کرنے کے ایام اوراوقات مقرر تھے، جبرئیل بن عبیداللہ ہفتے میں دوروز اوردوشب کام کرتے تھے، انہیں ماہانہ تین سو درہم تنخواہ ملتی تھی، ساعور کی حیثیت سے رازی شفاخانے میں خود بھی کام کرتے تھے، سنان بن ثابت بھی دیگر اطباء کے ہسپتال میں کام کرتے تھے، بیمارستان اسکندریہ میں سرکار کی طرف سے ان لوگوں کے لئے علحدہ اطباء اور جراح تعینات تھے، جو ہسپتال میں رہ کر علاج کرانا نہیں چاہتے تھے، یہ اطباء اور جراح بیماروں کے گھروں میں جا کر ان کا علاج کرتے تھے۔(۱)

(۱) طب العرب:۴۸۶

ہسپتالوں میں لائبریریاں ہوتی تھیں، بڑے بڑے اطباء ہسپتالوں ہی میں طب کا درس دیتے تھے، عضدی ہسپتال میں لیکچر دیتے تھے۔ قاہرہ کے بیمارستان الکبیر المنصوری میں درس وتقریر کے لئے علاحدہ کمرے مخصوص تھے، شفاخانے میں متعین ممتاز طبیب کے لئے روزانہ معمول تھا کہ وہ بیماروں میں گشت لگا کر معاینہ کرے اوران کا حال پوچھے، ہر بیمار کے لئے نسخے اور ہدایات تجویز کرے نجی بیماروں کا معاینہ کرے شام کو واپس ہسپتال آکر الایوان الکبیر (بڑے ہال) میں بیٹھ کر جہاں کتب خانہ بھی تھا، اطباء اور طلبہ کی جماعت کے ساتھ تین گھنٹے تک طبی مباحث اور درس میں مشغول رہتے اور کتابوں کا مطالعہ کرے۔(۱) تبریز کے ربع رشیدی شفاخانے میں پچاس اطباء تھے، جن میں سے ہرایک کے ذمہ ہسپتال کے فرائض کے علاوہ دس طلبہ کو تعلیم دینا تھا، ان کے علاوہ بیمارستان میں جو جراح کحال اور مجبر تھے ان ہرایک مے ذمہ پانچ طلبہ کو عملی تعلیم دینا تھا۔(۲)

مسلم شفاخانوں میں الگ الگ وارڈ ہوتے تھے، بغداد کے بڑے دارالشفاء میں متعدد وارڈ ہر وارڈ شاہی محلہ معلوم ہوتا تھا، قاہرہ میں منصوری ہسپتال محل میں قائم کیا گیا تھا، جس کے چار بڑے ایوان تھے، بادشاہ نے بہت سی نئی عمارات بنوائیں، ہسپتال میں مختلف وارڈ تھے، قدیم چار ایوان نجار (حمیات) کے مریضوں کے لئے مخصوص تھے، آشوب چشم والوں کے لئے علیحدہ وارڈ تھا، موارد عمل جراحی (surgical cases) کے لئے اپنا الگ وارڈ اور امراض بطن یا اسہال کے بیماروں کے لئے علیحدہ وارڈ تھا، بیمار خواتین کے لئے زنانہ وارڈ علاحدہ تھے، جن کی تیمارداری اور خدمت کے لئے نرسیں تعینات تھیں، مردوں کے لئے جداگانہ وارڈ تھے، جن کے خدام اور تیماردار مرد ہوتے تھے، جرجی زیدان کے بقول مسلم شفاخانوں میں ہرمرض کے لئے علاحدہ وارڈ تھا یا مخصوص وارڈ بنائے گئے تھے، وارڈ کے لئے جو طبیب متعین ہوتا تھا وہ اس میں چکر لگاتا تھا۔ اس کے آگے وہ تیماردار اور خدام ہوتے تھے، جو اس کام کے لئے مقرر ہوتے تھے، طبیب بیماروں کو تشفی دیتا، دوائیں تجویز کرتا اور ہرمرض کے لئے دوائیں لکھتا تھا۔ میکس

(۱) طب العرب:۴۸۶ (۲) ۱۱۰۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ۔ ۳۰۶/۵

میر ہاف کا بیان ہے:

’’شفاخانے دوحصوں میں منقسم ہوتے تھے، ایک حصہ مردوں اوردوسراعورتوں کے لئے مخصوص ہوتا، ہرحصے میں اپنا وارڈ اورایک دواخانہ ہوتا تھا‘‘۔(۱)

ہسپتالوں میں ادویات وافر مقدار میں موجود ہوتی تھیں، یہ دوائی دور دراز ممالک یا شہروں سے منگائی جاتی تھیں، ربع رشیدی میں طبی افسر نے مختلف قسم کے روغنوں کی فوری ضرورت محسوس کی تو رشیدالدین نے علاء الدین ھندو کو خط لکھا کہ یہ روغن مہیا کئے جائیں، خط میں بکمال صحت واحتیاط بتایا گیا ہے کہ یہ روغن کس مقدار میں کہاں سے حاصل کئے جائیں، ہرایک روغن کی مقدار ایک سے تین سومن تک لکھی گئی ہے اور ہدایت کی گئی ہے کہ شیراز سے چھ بصرہ سے سات، ایشیائے کوچک سے چھ، بغداد سے نو، شام سے تین اور حلہ سے تین قسموں کے روغن فراہم کیے جائیں، ہرایک مقام پرالگ الگ ہرکارہ بھیجا جائے؛ تاکہ تاخیر نہ ہو، اسی شفاخانے کے لئے رشیدالدین نے اپنے بیٹے جلال الدین جو ایشیائے کوچک کا حاکم تھا، اسے ایک خط میں مطالبہ کیا کہ وہ ہرسال غاریقوں، بادیان، مصطگی، اسطوخودوس، افتیمون اور کمیلہ ارسال کرے، ہردوا کی مقدار پچاس سے سومن تک ہو، خود رشیدالدین کے پاس شربت کی ایک ہزار صراحیاں تھیں، یہ صراحیاں بے حد خوبصورت تھیں، ہرصراحی پر اس شربت کا نام درج ہے، جس کے لئے وہ بنائی گئی تھی، علاوہ ازیں معجونوں اور لحوقوں کے لئے چینی ڈبے تھے، رشیدالدین طبیب نے سلطان علاء الدین کے عہد میں ہند کا دورہ کیا، جس کا ایک مقصد یہ تھا کہ ہندوستان سے وہ مفردات فراہم کیے جائیں، جو فارس میں دستیاب نہ تھے؛ چنانچہ علاء الدین نے رشیدالدین طبیب کو جو تحائف بصرے کی بندرگاہ کے راستے سے بھیجے، ان میں بائیس دوائیں شامل تھیں، بیمارستان منصوری میں روزانہ خرچ ہونے والی معمولی دواؤں کو چھوڑ کر خاص دواؤں میں صرف شربت انار کے پانسو رطل خرچ ہوتے تھے۔(۲)

(۱) the legacy of islam p 336

(۲) طب العرب ص:۴۸۸

ادویہ سازی میں ماہر دواساز ملازم رکھے جاتے تھے، بیمارستان رشیدی کے لئے جندی شاپور کے ہسپتال سے ماسویہ جیسے ماہر دواساز کو لایا گیا تھا، ابن البزوخ دواسازی وعطر سازی میں مشہور تھے، احمد تمیمی اور احمد وعمر ابنائے یونس کو ادویہ سازی اور ترکیب نسخہ جات میں خصوصی مہارت حاصل تھی، شفاخانوں میں ادویہ سازی کے لئے مخصوص مہارت حاصل تھی، شفاخانوں میں ادویہ سازی کے لئے مخصوص کمرے اور گودام ہوتے تھے، نسخے تیار کرنے کے لئے الگ کمرے تھے، اسپین کے ایک طبیب نے ادویہ سازی میں درکار نادر پودوں کی کاشت کے لئے ایک نباتاتی باغ لگوایا تھا، یہ پودے وہ دوران سفر دوسری جگہوں سے لائے تھے۔(۱)

ادویہ سازی پر سابور بن سھل کی تصنیف قراباذیں شفاخانوں میں رائج تھی، صیادلہ کی دوکانوں پر بھی یہی استعمال ہوتی تھی، بغد میں ابن التلمیذ نے موجز بیمارستانی تصنیف کی تو شفاخانوں میں اس کا بھی رواج ہوا، بیمارستانوں میں استعمال ہونے والی دواؤں کے بارے میں انہوں نے ایک اور رسالہ مقالۃ امینیہ فی الادویۃ البیمارستانیہ تحریر کیا تھا۔

مسلم شفاخانوں میں وسیع انتظامی عملہ ہوتا تھا، ان میں دوائیں کوٹنے والے، نسخے تیار کرنے والے، مرہم پٹی کرنے والے، کھانا پکانے والے، خدام، منشی اور طبی افسر ہوتے تھے، شفاخانوں میں رہائشی مکانات بھی ہوتے تھے، جہاں طبی افسر اور انتظامی عملے قیام کرتے تھے۔

قاہرہ کے بیمارستان منصوری میں بیماروں کے کپڑے دھونے، مریضوں کو غسل کرانے، کمروں اور بستروں کی صفائی اور دوسری خدمتوں کے لئے نوکر اور نرسیں مقرر تھیں، خدمت کے لئے ہر مریض کو دو محافظ اور نگراں میسر تھے، مختلف قسم کی ادویات، تیل اور فتیلے، پیالے اور دوسری چیزیں تقسیم کرنے کے لئے ملازم مقرر تھے، جن کی ڈیوٹی یہ تھی کہ وہ مطبخ میں اپنی نگرانی میں مریضوں کے لئے مقوی کھانے، مرغ چوزے اور گوشت

(۱) the legacyofislam p336

تیار کروائیں اور ہر بیمار کے لئے مجوزہ طعام ایک الگ اور خاص تھالی میں اس کے سامنے پیش کریں، جس میں کوئی دوسرا مریض شریک نہ ہوگا، ملازمین کو حکم تھا کہ وہ کھانا ڈھانپ کر بیماروں تک پہنچائیں اور تب تک ڈیوٹی انجام دیتے رہیں، جب تک تمام مریضوں کو کھانا فراہم نہیں کیا جاتا۔

بیمارستان منصوری میں بے خوابی کے مریضوں کے لئے علیحدہ وارڈ کا انتظام تھا، جہاں گوّیے اور داستان گو ملازم رکھے گے تھے، یہ لوگ موسیقی اور دلچسپ قصوں سے بیماروں کو خوش کرتے تھے، مریضوں کو مطالعے کے لئے تاریخ کی کتابیں فراہم کی جاتی تھیں، کمزور مریضوں کے لئے ایسی ایکٹنگ کی جاتی تھی، جس سے وہ خوش ہو کر ہنس پڑیں، انہوں خوش کرنے کے لئے دیہاتی ناچ پیش کیے جاتے تھے، شفاخانے کے نزدیک جو مسجدیں واقع تھیں، ان کے مؤذنوں کو حکم تھا کہ وہ صبح سے تقریباً دو گھنٹے پہلے اذان دے دیا کریں، اور اچھے لحن کے ساتھ اشعار پڑھیں تاکہ بیمار خوش ہو جائیں؛ کیوں کہ بے خوابی اور طویل رات ان کے لئے تکلیف کا باعث ہوتی ہے، بیمارستان میں رو بہ صحت مریضوں کی فوری شفایابی کے لئے بھی موسیقی کا انتظام تھا، جس کے لئے گوّیے ملازم رکھے گئے تھے، انسانی ہمدردی کے یہ خوبصورت نظارے کسی ایک ہسپتال کی چار دیواری تک محدود نہ تھے۔ قرون وسطی کے دوسرے مسلم ہسپتال بھی یہی روح پرور سماں پیش کررہے تھے، اور نہ کے شفاخانے میں دس موسیقار تعینات تھے، جو ساز بجا کر مریضوں کی دل بہلائی کا فرض انجام دیتے تھے، ازمنہ وسطی کے مسلم شفاخانوں میں بیماروں کے درمیان کوئی امتیاز نہیں برتا جاتا تھا، بیمارستان منصوری میں عام اجازت تھی کہ اس میں بلاتفریق مذہب وملت، رنگ ونسل ہر مریض داخل ہوسکتا ہے، اس کے وقف نامے میں کہا گیا تھا کہ یہ ہسپتال امراء وغرباء، مرد وزن، مقامی وغیر مقامی، بچوں اور بوڑھوں، لڑکے اور لڑکیوں، اجنبی ورشتہ داروں، مقیم ومسافر، قوی وضعیف، عام وخاص اعلی وادنی، افسر وماتحت، بینا ونابینا، افضل وکمتر، مشہور وگمنام، ذی قدر و بے قدر، مالک ومملوک چاہے ان کا تعلق کسی رنگ ونسل سے ہو، ان کے امراض جسمانی ہوں

یا روحانی یا اعصابی، کم ہوں یا زیادہ، ایک جیسے ہوں یا مختلف، ظاہری ہوں یا باطنی سب کے لئے وقف ہے، سب کا علاج بلامعاوضہ ہوگا جس پر کوئی اعتراض نہیں کرسکتا، یہ علاج محض خدا کے لئے اور آخرت کا اجر حاصل کرنے کی غرض سے اور اس کے احسان عام کی وجہ سے ہوگا؛ کیونکہ اللہ کا حکم ہے کہ مریض کی بھلائی پر خرچ کیا جائے اور ان لوگوں پر جو بیماروں کی دیکھ بھال کرتے ہیں، وقف نامے میں کہا گیا ہے کہ غریب بیمار چاہے وہ مرد ہوں یا عورتیں مکمل صحت یابی تک شفاخانے کے اندر داخل رہیں گے، جہاں علاج کی تمام سہولیات ان پر صرف کی جائیں گی اور تمام لوگوں کی ضروریات پوری کی جائیں گی، اس ہسپتال میں علاج کی کوئی مدت مقرر نہ تھی، مریض شفایاب ہونے یا مرنے کے بعد ہسپتال سے نکلتا تھا، دمشق، قاہرہ، بغداد اور دوسرے شہروں کے شفاخانوں کے دروازے ہر قسم کے مریضوں کے لئے کھلے تھے، ہندوستان میں فیروز شاہ تغلق کے بنائے ہوئے بڑے شفاخانے میں بلالحاظ رنگ ونسل، مذہب وملت تمام بیماروں کا علاج یکساں طور پر کیا جاتا تھا۔

عہد وسطی کے مسلم شفاخانوں میں مریضوں کو جو سہولیات میسر تھیں، وہ دجدید دور کے بڑے بڑے ہسپتالوں میں بھی فراہم نہیں ہوتیں، شفاخانوں میں کوئی فیس وصول نہیں کی جاتی تھی، علاج معالجے کا سارا خرچ اوقاف سے پورا کیا جاتا تھا، ہسپتال کے بیرونی حصے میں نو وارد مریض کا سب سے پہلے گہرا معاینہ کیا جاتا تھا، مرض اگر ہلکا ہوتا تو اسے نسخہ لکھ کر دیتے اور وہ شفاخانے کی ڈسپنسری سے دوا لے کر چلا جاتا، بیماری زیادہ ہوتی تو مریض کا نام و پتہ درج کیا جاتا۔ حمام میں اس کے کپڑے اتروا کر ایک مخصوص گودام میں جمع کیے جاتے پھر اسے شفاخانے کے کپڑے پہنا کر متعلقہ وارڈ میں پہنچا دیا جاتا، جہاں پاک وصاف بستر والا پلنگ الاٹ ہوتا، اس کے بعد ڈاکٹر اس کا علاج شروع کرتے تھے، دوا اور غذا تجویز ہوتی تھی، کھانے میں بکری، گائے، تیتر، مرغ، اور دوسرے پرندوں کا گوشت فراہم کیا جاتا تھا، رو بہ صحت مریض جب مقررہ روٹی اور سالم مرغ ایک دفعہ کھاتا اور اسے ہضم کر جاتا تو اسے تندرست مانا جاتا بیمارستان احمد ابن طولون میں مریض جب

مرغ کا شوربا اور ہلکے کھانے لگتا تب اسے گھر جانے کی رخصت ملتی تھی، بیمارستان کبیر دمشق میں مریضوں کے اخراجات کی تفصیل درج ہوتی تھی، بیمارستان صلاح الدین ایوبی میں مریضوں کے لیے شاندار کمرے تھے، ہر کمرے میں پلنگ اوراس پر سلیقہ مندی سے بچھونے اور تکیے رکھے ہوتے تھے۔شفاخانوں میں بیماروں کو جاڑوں میں گرم کپڑے، کمبل اور کوئلہ فراہم کیا جاتا تھا، منصوری شفاخانے میں ناظم وقت کو حکم تھا کہ وہ بیماروں کے لئے کھانے پینے کی چیزیں، آنکھوں کے استعمال کی اشیاء، دیگچیا، برتن، معجون، مختلف مرہم، تیل مشروبات، ادویات، فرش، بستر اور ضروری آلات وقف کی آمدنی سے پوری کرے، بیماروں کی عام ضروریات بھی شفاخانے ہی کی طرف سے پوری کی جاتی تھیں، مریض کے لئے روزانہ جلانے کی خوشبو، کھانے پینے کے لئے رکابیاں، شیشے کے پیالے اور گلاس فراہم کیے جاتے تھے، مٹی کی صراحیاں کوزے اور دیئے، جلانے کے تیل ،کھانے پینے میں استعمال کے لئے دریائے نیل کا پانی، مریض کے کھانے کو ڈھانپنے کا سامان اور گرمی میں کھجور کے پتوں کے بنے ہوئے پنکھے بھی وقف کی طرف سے ملتے تھے، مراکش کے شفاخانے میں بھی مریضوں کو کم سہولیات میسر نہ تھیں، یہاں اون، کتان، ریشم اور چمڑے سے بہترین بستر تیار کرائے گئے تھے، بیماروں کے لئے جاڑوں اور گرمیوں میں دن اور رات کے لئے الگ الگ کپڑوں کا انتظام تھا، مملکت کے کسی حصے میں بھی کوئی بھی پردیسی اوراجنبی بیمار ہوتا اسے لاکر ہسپتال میں داخل کردیا جاتا، بیمارستان عضدی بغداد میں کمزور اور فقیر مریض کشتیوں میں لائے جاتے تھے، جہاں ڈاکٹر صبح وشام ان کا علاج کرتے تھے ڈاکٹر مصطفےٰ سباعی نے طرابلس کے ایک عجیب وقف کا ذکر کیا ہے، اس وقف کی آمدنی ایسے دو آدمیوں کے لئے مخصوص ہے، جو ہر روز شفاخانوں میں جائیں اور بیماورں کے پاس میں سرگوشی کے انداز میں اس طرح باتیں کریں کہ مریض سن لے اور وہ ان کی باتوں سے یہ اثر لے کہ اب اس کی حالت بہت اچھی ہورہی ہے، اس کا چہرہ سرخ معلوم ہوتا ہے اور آنکھوں میں چمک ہے۔(۱)

(۱) ۱۱۵۔ ڈاکٹر مصطفےٰ سباعی۔اسلامی تہذیب کے چند درخشاں پہلو، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی: ۱۹۸۲: ۲۲۹

ہندوستان میں داخل مریضوں کے لئے انواع واقسام کے لذیذ کھانے، بہترین میوے اور پھل، قسم قسم کے مشروبات میسر ہوتے تھے، جنہیں دیکھ کر کوئی بھی تندرست آدمی بیمار بن جاتا۔۸۳۱ھ/۱۴۳۷ء میں ایک سیاح دمشق کے شفاخانے میں لذیذ کھانے دیکھ کر بیمار بن گیا اوراپنا نام مریضوں کے رجسٹر میں درج کرالیا، طبی افسر نے لذیذ کھانے، گوشت، مرغ، مٹھائیاں، اور بہترین پھل تجویز کیے؛ لیکن انھیں سیاح کی ’’اصل بیماری‘‘ معلوم ہوگئی تھی، تین روز بعد رقعہ لکھ کر بھیجا کہ مہمان صرف تین روز ٹھہر سکتا ہے۔

بیمارستان منصوری پوری دنیا میں قرون وسطی کا سب سے بڑا ہسپتال تھا، جس کا احاطہ دہلی کے لال قلعے کے احاطے سے تین گنا بڑا تھا، اس میں بیماروں کے لئے آٹھ ہزار بستروں کی گنجائش تھی، روزانہ چار ہزار سے زائد مریضوں کا علاج کیا جاتا تھا، اتنے بڑے ہسپتال میں بھی ناظم وقف کے فرائض میں ایک فرض میں یہ تھا کہ جو لوگ ہسپتال میں تندرست ہوجائیں، انھیں حسب حال اوسط درجے کا لباس فراہم کیا جائے، اوراس کے ساتھ نقدی رقم دی جائے؛ تا کہ باہر جاکر وہ دوسروں کے محتاج اور دست نگر نہ ہوجائیں، دوسرے مسلم شفاخانوں میں بھی دستور تھا کہ مریض جب شفایاب ہونے کے بعد ہسپتال سے چھٹی پاتا تو اسے گھر جانے کے لئے کرایہ اور سفر خرچہ دیا جاتا تھا، جسے زادالسلام کہتے تھے، اس کے علاوہ اسے اتنی رقم دی جاتی تھی، جس میں وہ اپنے گھر پر رہ کر بیماری کے بعد کے کمزوری کے ایام بےفکری سے گزار سکے تاکہ معاشی مجبوری کے تحت اسے فوری طوری پر کام کرنا نہ پڑے، جس سے وہ دوبارہ بیمار ہوجائے، لباس اور نقدی رقم امیر وغریب سب کو ملتی تھی؛ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس قدر نقدی فراہم کی جاتی تھی، جس پر وہ اس وقت تک گزارہ کرسکتے تھے، جب تک انھیں روزگار دوبارہ نہ مل جاتا، مراکش کا ہسپتال اس معاملے میں سب سے آگے تھا، یہاں ہسپتال سے رخصت ہوتے وقت اغنیاء اور فقراء سب کو رقم ملتی تھی، البتہ غرباء کو اس رقم کے علاوہ اتنا سرمایہ دیا جاتا تھا، جس سے وہ اپنا کاروبار شروع کرسکتے تھے۔ پردیسیوں کے لئے جو شفاخانے مخصوص تھے، ان میں

بھی یہی سہولیات میسر تھیں۔

مسلم بیمارستانوں میں اگر کسی مریض کی موت واقع ہوجاتی تو اسکی تجہیز وتکفین پورے اسلامی آداب کے ساتھ شفاخانے کی طرف سے ہوتی تھی، غسل دینے، حنوط لگانے، کفن کے اخراجات اور قبر کھودنے کی اجرت شفاخانے کے وقف سے ادا کی جاتی تھی، میت کو سنت نبوی کے مطابق باعزت طور دفن کیا جاتا تھا، قاہرہ کا بیمارستان منصوری تمام مسلم شفاخانوں کے لئے انسانی ہمدردی کی قابل رشک مثال پیش کررہا تھا، اس ہسپتال میں خارجی بیماروں کے لئے بھی بڑے پیمانے پر سہولیات فراہم تھیں، اس کے وقف نامے میں ناظم اوقاف کو ہدایت کی گئی تھی کہ جو آدمی اپنے گھر میں بیمار ہو اور ہسپتال میں علاج کرانے سے لاچار ہوں اسے جس دوا، شربت یا معجون کی ضرورت ہو وہ اس کے گھر پہنچادے، اگر کوئی ایسا خارجی مریض اپنے گھر میں مرجائے تو ناظم اہل میت کے شایان شان اس کی تجہیز وتکفین کے اخراجات، غسل دینے، قبر کھودنے اور قبرستان تک پہنچانے کی اجرت شفاخانے کے وقف سے ادا کرے، یہ وہ ہدایات تھیں، جن سے سرموانحراف نہیں ہوتا تھا؛ بلکہ اگر ناظم اوقاف چاہتے تو سہولیات کا دائرہ بڑھا سکتے تھے، یہ اس کی صوابدید پر منحصر تھا، وقف نامے میں کہا گیا تھا کہ ناظم کا فرض ہے کہ ظاہری اور باطنی حالات میں اللہ سے ڈرے، کسی بڑے آدمی کے ساتھ نچلے طبقے کے آدمی سے بہتر سلوک نہ کرے، نہ اپنے ملک کے باشندے کو غیر ملکی پردیسی پر ترجیح دے؛ بلکہ خرچ میں ثواب اور اللہ کے قرب کا لحاظ رکھے جو رب الارباب ہے۔(۱)

بیمارستانوں میں نفیس آلات اور عمدہ ساز وسامان ہوتا تھا، بیماروں میں کوئی امتیاز نہیں برتا جاتا تھا، بیمارستان منصوری میں مردوں کی طرح عورتیں بھی داخل کی جاتی تھی، امیر وغریب، مسلم وغیر مسلم، آزاد وغلام کی کوئی قید نہ تھی، بیمارستان کبیر دمشق، بیمارستان احمد بن طولون قاہرہ اور دوسرے بڑے شفاخانوں کے دروازے سب کے لئے کھلے ہوتے تھے، فیروز شاہ تغلق کے بنائے ہوئے بڑے شفاخانے میں امیر وغریب، مقامی

(۱) پوری تفصیل کے لیے دیکھئے: احمد عیسی بک تاریخ البیمارستانیات فی الاسلام دمشق: ۱۹۳۹ء

ومسافر، شریف ورذیل، آزاد وغلام سب کا علاج یکساں ہوتا تھا، بیمارستان منصوری میں ہر انسان کے لئے اذن عام تھا، اس کے وقف نامے میں اجازت تھی کہ جو لوگ اس میں نہ آسکیں، وہ بھی اس کی نایاب دوائیں استعمال کرسکتے ہیں، اس ہسپتال میں کسی کو رد نہیں کیا جاتا تھا، اور نہ ہی علاج کی مدت کی کوئی حد تھی، ہسپتال میں آٹھ ہزار مریضوں کے لئے جگہ تھی روزانہ کئی ہزار مریض علاج کرواتے تھے، بیمارستان کبیر دمشق میں مریضوں کے نام اور پتے رجسٹروں میں درج ہوتے تھے، ان میں مریضوں کے اخراجات کی تفصیل بھی لکھی جاتی تھی، بیمارستان احمد ابن طولون میں مریض کے کپڑے اتر واکر اسے ہسپتال کے کپڑے دیے جاتے تھے، اسے بستر ملتا تھا، صبح وشام اطباء وجراح اس کے پاس آتے تھے، جب وہ مرغ کا شوربا اور پھلکے کھانے لگتا تب اسے گھر جانے کی رخصت ملتی تھی، بیمارستان صلاح الدین ایوبی میں بیماروں کے لئے شاندار کمرے تھے، ہر کمرے میں پلنگ اور اس پر سلیقہ مندی سے بچھونے اور تکیے رکھے ہوتے تھے، شفاخانو ں میں مریضوں کو جاڑوں میں گرم کپڑے، کمبل اور کوئلہ فراہم کیا جاتا تھا، دوا اور غذا مفت ملتی تھی، یہ تمام سہولیات شاہی مصارف سے ملتی تھیں، بیماروں سے کوئی فیس نہیں لی جاتی تھی، بیمارستانوں میں انواع اقسام کے کھانے میسر ہوتے تھے۔

قاہرہ کے بیمارستان میں روبہ صحت بیماروں کی فوری شفایابی کے لئے موسیقی کا انتظام تھا اور اس مقصد کے لئے گویّے ملازم رکھے گئے تھے، اورنہ کے شفاخانے میں دس موسیقاروں کا عملہ تعینات تھا جو ساز بجاکر مریضوں کی دل بہلائی کا فرض انجام دیتا تھا، مسلم ہسپتالوں میں جو مریض بے خوابی کے شکار ہوتے تھے، ان کے لئے ہلکی موسیقی کا انتظام موجود تھا ان کے لئے داستان گو تعینات ہوتے تھے، جو انھیں قصے سناتے تھے، ایسے مریضوں کو مطالعے کے لئے تاریخ کی کتابیں فراہم کی جاتی تھیں، بیمارستانوں میں نہ صرف مریض کو علاج، کھانا اور اشیاء ضروریہ مفت ملتی تھیں؛ بلکہ شفایاب ہونے کے بعد وقت رخصت گھر جانے کے لئے اسے شفاخانے کی طرف زاد اسلام (کرایہ اور سفر خرچہ) دیا جاتا تھا، نیز اسے ہسپتال سے رخصت ہونے کے وقت اتنی رقم دی جاتی تھی کہ

بیماری کے بعد گھر میں اپنی کمزوری کے ایام بےفکری سے گزار سکے؛ تاکہ معاشی مجبوری کے تحت اسے فوری طور پر کام کرنا نہ پڑے جس سے دوبارہ بیمار ہوجائے، مراکش کے شفاخانے میں مفت علاج وطعام کے علاوہ مفلس مریض کو شفاخانے سے گھر جاتے اتنی رقم ملتی تھی جس میں وہ کمزوری کی مدت آرام سے گزار سکے، مکمل صحتیابی کے بعد بھی یہ رسم اس وقت تک کے لئے شفاخانے کی طرف سے فراہم کی جاتی تھی، جب تک اسے دوبارہ روزگار نہ مل جاتا۔

ہسپتالوں میں اگر کسی کا انتقال ہوتا تو شفاخانے کی طرف سے تجہیز وتکفین کر کے اسے دفن کیا جاتا تھا۔

وِل دوران نے قرون وسطیٰ کے مسلم شفاخانوں کے حسن انتظام کو اس طرح خراج تحسین ادا کیا۔(۱)

اسلام نے شفاخانوں کے آلات اور حسن انتظام کے معاملے میں بھی دنیا کی رہنمائی کی ہے، دمشق کا ایک ہسپتال جس کی بنیاد نورالدین زنگی نے ۱۱۶۰ء میں ڈالی تھی، تین صدیوں تک مفت علاج اور دوا فراہم کرتا رہا، بتایا جاتا ہے کہ اس کے چولھے کی آگ دوسوتر سٹھ سال تک کبھی نہیں بجھی، ۱۱۸۴ء میں ابن جنید بغداد پہنچے تو بیمارستان عضدی دیکھ کر دنگ رہ گئے تھے، ہسپتال کیا تھا، دجلہ کے کنارے گویا شاہی محل تھا، یہاں مریضوں کو دوا اور غذا مفت ملتی تھی، قاہرہ میں ۱۲۸۵ء میں سلطان قلاؤن نے ایک وسیع چہار گوشہ احاطے میں قرون وسطیٰ کا سب سے بڑا ہسپتال، بیمارستان المنصوری قائم کیا، وسیع صحن کے گرد چار عمارتیں کھڑی تھیں، صحن محراب دار راستوں سے آراستہ اور فواروں ونہروں سے ٹھنڈا تھا، شفاخانے مختلف بیماریوں کے لئے الگ الگ وارڈ تھے، افاقہ یاب بیماروں اور لیبارٹریوں کے لئے مخصوص کمرے تھے، نیز اس میں دواخانہ بیرونی مریضوں کے لئے مطب، باورچی خانے، حمام، کتب خانہ، عبادت خانہ، لیکچر ہال اور خاص کر پاگلوں کے لئے عمدہ رہائش کا انتظام تھا، مرد یا عورت، امیر وغریب، غلام

(۱) 331-the age of faith pp 330

وآزاد سب کا علاج مفت ہوتا تھا، روبہ صحت مریض کو رخصت ہوتے وقت رقم دیجاتی تھی؛ تاکہ فی الفور کام کرنے کی ضرورت نہ پڑے، بےخواب مریضوں کے لئے ہلکی موسیقی یا پیشہ ورقصہ گولوگوں اور تاریخ کی کتابوں کا بندوبست تھا، دیوانوں کے لئے تمام اسلامی شہروں میں پاگل خانے تھے۔



چند سیاستداں، قلم کاراور مصلحین امت

ڈاکٹر سید محمود

یہ ضلع غازیپور کے ایک قصبہ سید پور بھتری کے رہنے والے ہیں، یہ ہندوستان کے وزیر برائے امور خارجہ رہ چکے ہیں، یہ دارالمصنفین کے رکن رکین، انہوں نے تاریخ میں ڈاکٹریت کی ڈگری کی ہوئی تھی اور یہ بہار کے وزیر تعلیم بھی رہ چکے تھے، ان کو اسلامیات سے گہرا شغف تھا، وہ اپنی موروثی وفطری اسلامیت اور اپنے ذوقی وعملی نیشنلزم اور حب الوطنی میں مطابقت وہم آہنگی کے متمنی تھے، آپ کے دادا قاضی فرزن علی صاحب کو حضرت سید احمد شہید رحمہ اللہ سے بیعت وارادات کا تعلق تھا، اس لئے ڈاکٹر صاحب کو سید احمد شہید تحریک جہاد سے کافی لگاؤ تھا جو کہ آزادی ہند کے لئے انگریزوں سے لڑی گئی تھی، وہ نہایت سچے محب وطن اور ہندو مسلم اتحاد کے علم بردار تھے، وہ مابعد آزادی ہند ہندوستان میں ہندواحیائیت کی تحریک، مسلمانوں کی تہذیب وکلچر سے نفرت اور مسلم حکومتوں کے مظالم اور ہندوکشی کی مبالغہ آرائی پر مشتمل داستانوں اور اس میں رنگ آمیزی کی وجہ سے جو فرقہ وارانہ منافرت کی مہم شروع ہوگئی تھی اس سے خائف تھے، وہ یہ چاہتے تھے کہ ملک کے ان دو عظیم فرقوں کے درمیان زیادہ سے زیادہ اتحاد واعتماد کی فضاء پیدا ہو، اختلاف سے زیادہ اتفاق کے لفظوں کو نمایاں کیا جائے، چنانچہ انہوں نے اپنے اس مدعا کی تحریک دینے کے لئے ۸/۹ اگست کو ۱۹۶۴ء کو کل ہند مسلم مشاورتی اجتماع کے نام دار العلوم ندوۃ العلماء میں ایک اجلاس بلایا، دسمبر ۱۹۶۳ء اور جنوری ۱۹۶۴ میں کلکتہ میں بڑے پیمانے پر فرقہ وارانہ فساد ہوا، پھر مارچ اور اپریل ۱۹۶۴ء میں مشروقی ہندوستان کی صنعتی پٹی جس میں، رانچی، جمشید پور اور راوڑکیلا واقع وہیں سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت فرقہ وارنہ فساد کی لہر چلی، ڈاکٹر صاحب چاہتے تھے یہ فرقہ وارانہ

منافرت کی مسموم فضا کا خاتمہ ہو، وہ یہ سمجھتے تھے کہ ہندو مسلم اتحاد اس ملک عظیم ضرورت ہے، چنانچہ ان کی اس تحریک سے مولانا سید ابوالحسن علی الندوی رحمہ اللہ، مولانا منظور نعمانی رحمہ اللہ، مولانا ابواللیث رحمہ اللہ وغیرہ منسلک ہوگئے، چنانچہ انہوں نے ندوہ میں ہندوستان کی مؤقر تنظیموں کے نمائندوں کے اجلاس کو طلب کیا جس میں ہندوستان کی چار موقر تنظیموں جمیعۃ العلماء، جماعت اسلامی، مسلم لیگ اور خلافت کمیٹی کے سربراہ اور صدور وسکریٹری موجود تھے، اور اس وقت کے ممبران پارلیمنٹ جن میں بمبئی کے محمد یاسین نوری صاحب بیرسٹر، حیدرآباد کے محمد یونس سلیم (جو بعد میں مرکزی حکومت میں وزیر قانون ہوئے) مدراس کے این، ایم انور ممبر پارلیمنٹ، بہار کے سابق ایم پی سید مظہر امام صاحب، لکھنؤ کے ڈاکٹر محمد عبدالجلیل اور مولوی سید کلب صاحب صدر شیعہ کانفرس وغیرہ شریک تھے، چنانچہ مجلس مشاورت نے ڈاکٹر سید محمود صاحب کی معیت میں اولا فساد زدہ علاقوں کا دورہ کیا وہاں کی سیاسی، سماجی اور ہندو مسلم مذہبی شخصیات کو مدعو کیا، ہندو مسلم اتحاد کی اہمیت پر زور دیا گیا؛ چنانچہ، بہار، پٹنہ، رانچی، جمشید پور وغیرہ کے دورے ہوئے، کافی سے زیادہ اس قافلے اور اس کے کاز کی پذیرائی ہوئی، بڑے بڑے اجتماعات ہوئے، ہندو مسلم دونوں فرقوں کے لوگوں نے لاکھوں کی تعداد میں شرکت کی، ڈاکٹر محمود صاحب کے ان اجلاسوں میں چستی، پھرتی، مستعدی قابل دید تھی، نومبر ۱۹۶۴ء میں اس وفد نے مہاراسٹرا کا دورہ کیا، وہاں بھی مجلس کا شایانِ شان استقبال ہوا، بمبئی، مالیگاؤں، اورنگ آباد، شولہ پور میں جلسے منعقد ہوئے، پھر اس طرح مجلس کی شاخیں متعدد جگہ قائم ہوئیں، پھر مجلس نے گجرات کا سفر کیا، سفر میں پنڈت سندر لال بھی شریک تھے، پالن پور، احمد آباد، گودھرا، بڑودھ، بھڑوچ وغیرہ کے سفر ہوئے، کافی سے زائد اس وفد کا استقبال ہوا، بلا لحاظ مذہب وملت کے ہر قسم کی سیاسی، سماجی، شخصیات نے اس وفد کے پروگراموں میں شرکت کی، ہر علاقہ کے معتبر، ذی وقار، صاحب حیثیت لوگوں نے مجلس کے کام کی پذیرائی کی، اس کے علاوہ حیدرآباد، میسور وغیرہ کے بھی دورے ہوئے، میسور کے دورہ میں مجلس نے نہایت منظم، مربوط، طویل ووسیع اور موثر دورہ کیا، تقریبا ساڑھے چھ ہزار میل کی مسافت طئے

کی مجلس مشاورت کی مقبولیت اور اس کے کاز کی اہمیت کی وجہ سے ہر شخص خائف تھا، چنانچہ سب سے پہلے جمعیۃ علماء ہند نے اس سے علاحدہ کی اختیار کی، پھر حکومت نے اس کے اثرات کو کم کرنے میں رول ادا، بہرحال مجلس نے کانگریس کی اثر کو کم کرنے کے لئے انتخابات میں حصہ لیا، بہرحال مجلس کو نظر بد لگ گئی اور اس کا شیرازہ بکھر گیا اور مجلس کے شیرازہ کے منتشر ہونے سے ڈاکٹر صاحب نہایت بدل ہوگئے، ویسے ان کی قوی بھی جواب دے گئیں تھیں، گرچہ اس مجلس مشاروت کے اثرات بعد میں برقرار رہے، لیکن جس جدوجہد اور جانفشانی اور تگ ودو سے ڈاکٹر صاحب نے مجلس کو آگے بڑھانے کی کوشش کی اوران کی تحریک کو جو وسعت اور ہمہ گیری اور جامعیت نصیب ہوئی وہ واقعۃ ان کی دردو کسک اور مسلمان ہند کے تئیں ان کے خدشات اوران کے جان واملاک اوران کی عزت وآبرو کے تحفظ اور خود اپنے ملک میں ان کے شان سے جینے کے لئے راہ ہموار کرنے کوشش تھی۔ وہ ۱۸ر ستمبر ۱۹۷۱ء اس دنیائے فانی عالم جاودانی کی طرف کوچ کر گئے۔(۱)

ڈاکٹر محمد آصف قدوائی

ڈاکٹر آصف قدوائی ڈاکٹر زین العابدین کے فرزند ارجمند تھے، جو ہیومیو پھیتک کے ایک کامیاب معالج تھے، آصف قدوائی ۱۹۴۶ء سے ایک مرض وعلاج کے نتیجے میں مستقل صاحب فریش ہو چکے تھے، لیکن وہ اسی حالت میں لکھنے پڑھنے کا کام کرتے تھے، واصف صاحب اوران اکے والد محترم نے حضرت عبد القادر رائے پوری رحمہ اللہ سے بیعت وارادت کا تعلق قائم کرلیا تھا۔

یہ انگریزی بڑے ماہر تھے، اوراس کے اہل قلم اور ادیبوں میں ان کا شمار ہوتا تھا، انہوں نے جو پی ایچ ڈی کا مقالہ لندن یونیورسٹی سے لکھا تھا یونیورسٹی کے مشہور نقاد ومحقق استاذ سیاسیات پروفیسر لاسکی نے اس کو دیکھا اور اس پر اظہار اطمینان اور تعریفی نوٹ لکھے تھے، اس کے ساتھ وہ اردو کے مایہ ناز قلم کار تھے، ان کا تاریخ وسیرت اور دینیات پر

(۱) پرانے چراغ: ۱/۳۵۹-۴۲۶

مطالعہ پر گہرا تھا، ۱۹۵۹ء میں جب دار العلوم ندوۃ العلماء کے احاطے میں ”مجلس تحقیقات ونشریات اسلام“ کا قیام عمل میں آیا تو اس نے اپنی نشریات ومطبوعات کا آغاز انہیں کی کتاب ”مقالاتِ سیرت“ سے کیا، یہ کتاب ۱۹۶۰ء میں طبع ہوئی اور اہل نظر اس کو پسند کیا۔

انہوں نے اس کے علاوہ مولانا سید ابوالحسن الندوی کی مشہور زمانہ کتاب ”انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر“ (جو ان کی سب سے مشہور ومقبول کتاب ”ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین“ کا ترجمہ ہے اور جس کی عربی میں تقریبا سینکڑوں ایڈیشن نکل چکے ہیں) کا انگریزی میں ترجمہ بنام (Islam and the world) سے کیا، جس سے ان کا ہندوستان اور ہندوستان کے باہر تعارف ہوا، اس ترجمہ کے تعلق انگریزی کے ایک مسلمان اہل قلم (ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری) نے جو خود انگریزی کتاب کے اچھے لکھنے والے اور اور مترجمین میں سے تھے، انہوں حضرت سید مولانا ابوالحسن ندوی رحمہ اللہ سے کہا تھا: مولانا آپ یقین کیجئے کہ کسی غیر انگریزی کتاب کا بھی اب تک انگریزی میں اس کتاب سے بہتر ترجمہ نہیں ہوا“ مشہور ایرانی فاضل اور اسلامیات پر لکھنے والے ڈاکٹر نصر لکھنؤ آئے تو ان سے ملنے آئے، اس کے علاوہ مولانا کے ۱۹۷۲-۷۳ میں رابطہ کے وفد کے ساتھ مختلف اسلامی ممالک کے سفر کے دوران جب وہ ایران گئے تو ڈاکٹر حسن نصر سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے آصف صاحب کے بارے میں پوچھا۔

اس کے علاوہ انہوں نے حضرت مولانا منظور نعمانی رحمہ اللہ کی کئی کتابوں کا کامیاب ترجمہ کیا، انہوں نے صرف ازراہ تعلق اور جذبہ دینی کے تحت اس معذوری کی حالت میں بھی جب کہ وہ کروٹ بھی نہیں لے سکتے تھے (اٹھ کر بیٹھنا تو درکنار) وہ کوئی بھاری کتاب اپنے سینے پر نہیں رکھ سکتے تھے، وہ اس کی جلد توڑتے اور تھوڑے تھوڑے اوراق سامنے رکھ کر ترجمہ کرتے، انہوں نے کسی لکھنے والے یا ٹائپسٹ کے انتظام کرنے کو کہا گیا تو منظور نہیں کیا، اس طرح انہوں نے تیرہ کتابوں کے انگریزی میں ترجمہ کئے،

ان میں مولانا منظور صاحب نعمانی کی ''معارف القرآن''(۱۔۴) ابوالحسن علی ندویؒ کی ''ارکان اربعہ'' نقوش اقبال (Glory of Iqbal)، کاروان مدینہ شامل ہیں، بقول مولانا علی میاں ندوی کے: ''انہوں نے انگریزی میں اسلامیات کا ایک قیمتی ومتنوع ''مکتبہ'' تیار کردیا، جس کی نظیر میرے محدود علم میں اس برصغیر میں نہیں، انگریزی بولنے اور لکھنے ملکوں میں بھی مشکل سے ملے گی۔

ان کو نقل وحرکت کی اس معذوری ومجبوری کے علاوہ متعدد اندرونی تکلیفوں سے بھی سابقہ پڑا، انہوں نے فرائض کی پابندی، ذکر وشکر، تحریری مشغولیت اور علاج ومعالجہ کی خدمت کو جاری رکھا، کبھی زبان سے حرفِ شکایت نہیں سنا گیا، ۲۰؍فروری ۱۹۸۹ء کو اس دارفانی سے کوچ فرماگئے۔حضرت مولانا منظور صاحب نعمانی نمازِ جنازہ پڑھائی۔(۱)



(۱) پرانے چراغ: ۳؍۶۹۔۷۶، مکتبہ فردوس لکھنو

مسلم سائنس یورپ میں

دنیائے اسلام بالخصوص اندلس (مسلم اسپین) میں سائنس کے عملی فوائد دیکھ کر اہل یورپ اس کی طرف تیزی سے کھنچنے لگے، قرطبہ میں پختہ سڑکوں کی تعمیر، صاف پانی کی بہم رسائی اور گندے پانی کی نکاسی کے لئے زیر زمین نلکوں کی جال دار، سڑکوں اور گلیوں میں قندیلوں کی تنصیب اور عالیشان عمارات کی تعمیر نے قرطبہ کو صرف یورپ کا نہیں؛ بلکہ دنیا کا سب سے خوبصورت شہر بنادیا تھا، قسطنطنیۃ (موجود استنبول) کی جو صدیوں سے خوبصورت شہر ماناجاتا تھا، خوبصورتی اس کے آگے ماند پڑگئی تھی، غالبا یہی ایک شہر تھا جو رات کو بھی روشن رہنے لگا تھا، اس کی آبادی دس لاکھ تک پہنچ گئی تھی، صنعت میں بھی یہ شہر سب سے آگے نکل گیا تھا۔

Thomas Arnold legacy of Islam نامی وقیع کتاب کا مدیر sir لکھتا ہے کہ قرطبہ دسویں عیسوی میں یورپ کا سب سے متمدن شہر تھا، یہ دنیا بھر کے لئے یکے از عجائبات اور تحسین آور تھا، یہ بلقان کی ریاستوں کا ویانا (Vienna) تھا، یہاں ستر (۷۰) لائبریریاں اور ۹۰۰ عوامی غسل خانے تھے۔

آرنلڈ مزید لکھتا ہے جس زمانے میں یورپ مادی اور روحانی حیثیتوں سے اکثر وبیشتر زبوں حالی اور انحطاط میں مبتلا تھا، اسپین کے مسلمانوں نے ایک عظیم الشان تہذیب اور ایک منظم معاشی زندگی تخلیق کی، مسلم اسپین نے فنون، سائنس، فلسفہ اور شاعری کو فروغ دینے میں فیصلہ کن کردار ادا کیا اور اس کے اثرات تیرہویں صدی کی عیسائی فکر بلند ترین چوٹیوں تک پہنچے، وہ اعلیٰ ترین چوٹیاں Theomas Hquinas اور Dante کی شخصیتیں تھیں، یورپ کے لئے جو ملک مینارہ نور کی حیثیت کا حامل بناوہ اسپین تھا۔

اندلس میں گھر گھر کاغذ سازی کی صنعتیں قائم ہوگئی تھیں، اس سے پہلے تک

کھالوں اور جھلیوں پر لکھائی ہوا کرتی تھی، مسلمان حکمرانوں نے یہاں سوتی کپڑوں کی صنعت متعارف کرائی، قالین سازی کی صنعت نے بھی رواج پایا، نئی نئی قسم کے برتن بنائے جانے لگے، بارود کو جو چین کی ایجاد تھا آتشیں اسلحہ بنانے کے لئے استعمال کیا جانے لگا، مسلمان ملاح اپنی کشتیوں میں قطب نما استعمال کرنے لگے۔

یہاں نئے نئے پھلوں کے باغات لگائے گئے، تعمیرات کے فن کو اتنی ترقی دی گئی کہ وہ یورپ کے لئے معیار بن گئی، عربی ہندسوں نے جو مسلمانوں نے اہل ہند سے سیکھے تھے، ریاضی کی بے پناہ ترقی کا دروازہ کھول دیا، اتنی ترقی رومن ہندسوں کے ذریعہ ممکن نہ تھی، اس کے فائدے دیکھ کر اہلِ یورپ نے اپنے ہندسے چھوڑ کر عربی ہندسے اختیار کر لیئے، ریاضی کی بنیادی شاخوں میں سے الجبرا اور مثلثیات (Trigonometry) میں مسلمانوں کی بے مثل ترقی نے بھی اہلِ یورپ میں اسلامی سائنس کے لئے زبردست کشش پیدا کر دی، مثلثیات پر نصیر الدین طوسی کی کتاب المشکل القطع (Bond of the Sector) یورپ کی شہ پارہ کہلائی، ایسی ہی ان لوگوں نے طب میں بھی محسوس کیا کہ ڈنلپ کے بقول مسلم طب اتنی ترقی یافتہ تھی کہ یورپی طب پر غالب آگئی تھی۔

مختصر یہ کہ جس طرح آج کے میں ترقی پذیر ممالک مغربی ممالک کی سائنسی ترقیوں کو دیکھ کر سائنس کی جانب راغب ہورہے تھے اسی طرح سے قرون وسطی کے اہل یورپ دنیائے اسلام کی سائنسی ترقیوں کو دیکھ کر سائنس کی طرف راغب ہونے لگے تھے۔

جس طرح ریاضی ترقی کی کلید عربی ہندسے تھے، اسی طرح سے دیگر علوم کی ترقی کی کلید عربی زبان تھی، اس کی وجہ سے مروجہ علوم فلکیات، جغرافیہ، طبیعیات، کیمیا، حیاتیات اور طب وغیرہ سیکھنے کے لئے عربی جاننا ضروری ہوگیا، اس لئے قرونِ وسطی میں اہلِ یورپ میں سے جن لوگوں نے ان علوم کو سیکھنا چاہا، ان لوگوں نے عربی سیکھی، اس پالیسی کی وجہ سے عربی زبان صرف مسلمانوں تک محدود نہیں رہی؛ بلکہ یورپ کی پوری عیسائی دنیا میں بھی عام ہوگئی۔

لاطینی یا کسی بھی یورپی زبان پر عربی زبان کی فوقیت کا ایک ثبوت یہ ہے کہ یورپ

کے اہلِ کلیسا، مسلمان امراء وسلاطین سے خط وکتابت عربی زبان میں کیا کرتے تھے، اسکوریل لائبریری (Escorial library) اسپین میں کچھ خطوط عربی زبان میں موجود ہیں جو فرانس کے کسی نامعلوم راہب نے ساراگوزا (Saragossa) کے فرماں روا المقتدر بن ہود کو لکھتے تھے۔ بہت سے پادریوں نے عربی زبان میں اس قدر مہارت حاصل کر لی تھی کہ وہ عربی میں شاعری بھی کیا کرتے تھے۔ اس سے مسلمانوں اوران کی علمی دھاک اور تفوق کا پتہ چلتا ہے زمانہ کے ہم آہنگ ہونے کے لئے ان کے لئے اس وقت علمی زبان عربی سیکھنے کی ضرورت پڑتی تھی۔

دسویں صدی میں لکھے جانے والے خط میں عربی سے لاطینی میں ترجمہ شدہ کوئی کتاب طلب کرنا اس امر کی دلالت کرتا ہے کہ کتابوں کے تراجم کا کام دسویں صدی میں شروع ہو چکا تھا، شروع شروع میں فلکیات اور ریاضی کی کتابیں ترجمہ کی گئیں؛ کیوں کہ ان دونوں علوم میں مسلمان بہت قابل قدر خدمات انجام دے چکے تھے، فلکیاتی مشاہدات کے لئے ابراہیم حبیب الفرازی نے دنیائے اسلام میں پہلی بار اصطرلاب بنایا اور پھر عمدہ سے عمدہ اصطرلاب بناتے چلے گئے، ان کے ذریعہ ستاروں کی بلندیوں اوران کے زاویوں کا تعین کیا جاتا تھا۔

ڈنلپ نے Haskins کے حوالہ سے لکھا ہے کہ لارین (lorraine) کے کلیسا کے ایک شخص نے جس کا نام والچر تھا، ایک عربی اصطرلاب کی مدد سے ۱۸ اکتوبر ۱۰۹۲ء کو ایک چاند گرہن کا مشاہدہ کیا۔

ریاضی اور فلکیات کے علاوہ اہل یورب نے جغرافیہ کی کتابوں کے ترجمے بھی کئے کیوں کہ مسلمانوں نے اس مضمون میں بھی کافی کام کیا تھا، اس مضمون پر نویں صدی میں ہی بغداد میں کام شروع ہو چکا تھا، بغداد کے علاوہ اندلس میں بھی کام ہوا، وہاں ابراہیم بن یعقوب طرطوش نامی ایک بلند پایہ جغرافیہ داں تھا، اس سے الاُذری نامی ایک مسلمان جغرافیہ داں نے اندلس کے شہروں کو ملانے والے راستوں کے بارے میں معلومات حاصل کر کے ۱۰۵۸ء میں ایک کتاب تصنیف کی تھی، یہ مشہور جغرافیہ داں الادریسی سے

بھی تقریباً ایک صدی پہلے ہوا کرتا تھا، الادریسی کی تصنیف قریباً ۱۱۵۴ء میں منظر عام پر آئی۔

طب کی تصانیف کے تراجم کا آغاز گیارہویں صدی میں ہوا، طب کی کتابوں کے اولین مترجمین میں Constantinus Africanus کا نام مشہور ہے جس نے طب پر کوئی ایک آدھ نہیں ؛ بلکہ کئی کتابوں کے ترجمے لاطینی میں کئے، ان کے نام اس باب کے گوشوارہ میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

ڈنلپ مزید رقم طراز ہیں: ریاضی، فلکیات، کیمیا اور طب پر تراجم کا سلسلہ جاری تھا کہ بارہویں صدی عیسوی میں یورپی مترجمین نے فلسفے کی کتابوں کی طرف توجہ مبذول کی، فلسفے پر پہلی مسلم تصنیف کا لاطینی ترجمہ Dominicus Gundisalvi نامی ایک مترجم کے قلم سے ۱۱۵۰ء میں منظر عام پر آیا، تراجم کا سلسلہ دسویں صدی میں شروع ہوا تھا، تیرہویں صدی یعنی تین صدیوں تک جاری رہا، یاں تک کہ بقول ڈنلپ جو کتابیں قابلِ قدر نظر آئیں ان سب کے لاطینی میں ترجمے کرڈالے گئے۔

تراجم کا کام زیادہ تر اسپین، سسلی اور اٹلی میں ہوا، اسپین تراجم کا ایک اہم مرکز اس وجہ سے بنا کہ وہاں کی مسلم حکومت کے اضمحلال کی وجہ سے عیسائیوں نے وہاں کے متعدد شہروں پر قبضہ کرلیا تھا اور وہاں اپنی شہری حکومتیں قائم کرلیں تھی، اسلام کے خلاف ان کے دلوں میں بے اندازہ عداوت سہی، مسلمانوں کی علم دوستی انہیں بہت بھاگئی تھی، ان کے مقابلہ پر خود براعظم یورپ میں اشاعت علم پر ۵۲۹ء میں، رومی شہنشاہ جسٹین (Justian) کی عائد کردہ قدغن کے عواقب بھی وہ خوب خوب دیکھ چکے تھے۔

ان شہروں میں تراجم کے لئے عیسائی حکمرانوں کی طرف سے باقاعدہ طور پر شاہی فرمان جاری کئے گئے تھے، جن کے ذریعہ سرکاری خرچ پر دارالترجمے قائم کئے گئے، پہلا دارالترجمہ طلیطلہ (Toledo) کے بادشاہ ریمنڈل (Raymond) کے حکم سے ۱۱۳۵ء میں طلیطلہ میں قائم ہوا، اس میں ڈیڑھ سوسال تک تراجم کا کام ہوتا رہا۔(۱)

(۱) Irvin.T.B p.88.

john of Seville, Adelard of Bath, Alfred Sergshal, Dominicus gundisalvi, Daniel of Morly, Gearard of cremona, Michael scot (d, 1235)

ان میں سے جراڈ آف کریمونا نے جو اٹلی کے شہر کریمونا کا رہنے والا تھا، سب سے زیادہ ستر تا نوے کتابوں کے ترجمے کئے، ابن سینا، زکریا رازی اور ابوالقاسم زہراوی کی تصنیفات کے ترجمے بھی اسی نے کئے تھے۔

مائیکل اسکاٹ لکھتا ہے کہ اس نے طلیلہ کے علاوہ سسلی اور اٹلی میں بھی رہ کر تراجم کا کام کیا، اس کے تراجم میں فلکیات پر البتروجی کی کتاب بھی شامل ہے، جو طلیلہ میں ۱۲۱۷ء میں مکمل ہوئی اور انگریزی میں On the Sphere کہلاتی ہے۔

دوسرا دارالترجمہ کستالیہ (Castalia) اور لیون (leon) کے بادشاہ الفانسو دہم (Alphonso x) نے ۱۲۵۲ء میں اشبیلہ (Seville) میں قائم کروایا، اشبیلہ کے ممتاز مترجمین یہ تھے۔

Aratham of Toledo. Issac Bin sid, juda Bin Moses, Samuel Ha levi ete) living p.88)

تیسرا دارالترجمہ اٹلی کے شہر سالرنو (Salerno) میں قائم ہوا، سالرنو کے دارالترجمہ میں زیادہ تر مسلم طب کی کتابیں ترجمہ کی جاتی تھیں، کیوں کہ وہاں ایک اسکول جو ۶۰۰ء سے چلا آرہا تھا، اسے بعد میں میڈیکل اسکول بنادیا گیا، اس لئے مسلمان حکماء کی طبی کتابیں جو خود ان کی اپنی کتابوں سے زیادہ معلوماتی ہوتیں ترجمے کراکے سالرنو کے میڈیکل اسکول میں داخل نصاب کرادی جاتیں، ابن سینا کی القانون، زکریا رازی کی الحادی، ابوالقاسم زہراوی کی التصریف، ابن رشد کی کلیات، ابن زہر کی التیسیر اور ابن الہیثم کی کتاب المناظر یہاں داخل نصاب رہی۔

سالرنو کے ممتاز مترجمین کے نام یہ تھے:

Constantinus Africanus, Adelard of Bath.
john petrus Alfonso. stephan of Pisa and
moses Farachi(d. 1185)

سالرنو میڈیکل اسکول کے بارے میں یہ بات جاننے کے لائق ہے کہ وہاں کافی دنوں تک لاطینی کے پہلو بہ پہلو عربی زبان بھی ذریعہ تعلیم رہی، اس کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ ابتداء میں مسلمان کی کتابیں داخلِ نصاب تو کر لی گئیں مگر لاطینی زبان میں ان کے ترجمے کرانا دقت طلب کام تھا، اس لئے تراجم کی تکمیل کے انتظار کرنے کے بجائے یہ بہتر سمجھا گیا کہ عربی زبان میں ہی ان کتابوں کی تدریس شروع کرادی جائے، مسلم طب سالرنو کے میڈیکل اسکول کے ہی ذریعہ یورپ میں پھیلی، وہاں کے ایک مترجم (Petrus Alfonso) جو انگلستان کے بادشاہ ہنری اول کا طبیب بھی تھا، عربی طب کو یورپ میں پھیلانے میں بہت اہم حصہ لیا۔

تراجم کا کام اسپین کے ہمسایہ ملک پرتگال میں بھی کرایا گیا، اس لئے کہ وہاں کے باشاہ (Diniz the Liberal) نے باقاعدہ ایک شاہی فرمان جاری کیا تھا، پرتگال کے علاوہ Island of Malloria میں بھی ۱۲۷۶ء میں Arabic college of Miramer قائم کیا گیا، عربی کالج وہاں کے باشاہ جیمز دو (James 11) کے حکم سے قائم ہوا تھا۔

اس کے صرف پندرہ برس بعد ۱۲۹۱ء میں fray De puigrentos نے اسپین کے شہر ویلینشیا (valencia) میں بھی لاطینی کے ساتھ عربی ذریعہ تعلیم کا نظم کیا تھا۔

مندرجہ بالا دار التراجم میں عیسائیوں کے علاوہ یہودیوں نے بہت ذوق وشوق سے کام کیا تھا، کیوں کہ وہ ان علوم سے خود اپنی قوم کو بھی روشناس کرانا چاہتے تھے، اس غرض سے ان لوگوں نے اپنی زبان عبرانی میں بھی ترجمے کرائے۔، یہودی مترجمین میں

سے خاص خاص کے نام یہ ہیں:

Abraham Bar Hiyya, Abrham ben Erza,
Joseph Bin Issac(d,1170 (Judah Ben
Tibban(d,1150(and Benjamin of toledo

تراجمے طلیلہ، اشبیلیہ، سالونراور پرتگال کے علاوہ کچھ اور مراکز میں بھی ہوئے، مگر ان کی قدر و قیمت سے کم لوگ واقف ہیں، ان مراکز میں سے ایک Lotharingir تھا، اس کے بارے میں Mary catherine Welborn نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ یہ شہر گیارہویں صدی میں عربی زبان اور سائنس کا مرکز تھا۔

اصطلاحات کے سلسلے میں ایک اہم کام یہ کیا گیا کہ عربی سے لاطینی میں ایک لغت مرتب کی گئی، یہ لغت croningen university کے ایک ولندیزی پروفیسر (1612-1666) نے مرتب کی، Deusing نے اس لغت کے علاوہ عربی گرامر پر بھی ایک کتاب تصنیف کی جو مشرح تھی۔

مندرجہ بالا دار التراجموں کے علاوہ جو عربی کتابوں لاطینی تراجم کے لئے ہی قائم کئے گئے تھے، یورپ کی متعدد یونیورسیٹوں میں بھی وہاں کے اساتذہ نے مسلمان حکماء کی تصنیفات کے تراجم کئے اور پھر انہیں اپنے یہاں نصاب داخلِ نصاب بھی کیا، ان میں بولونا (B o l o g n a)، ماونٹ پلیر (Mount pellir) اور سلمانکا (salmancs) کی یونیورسٹیاں قابل ذکر ہیں، ان یونیورسٹیوں کے ڈاکٹر اساتذہ نے ابن سینا اور ابن رشد کی کتابوں کے اور ان کی شرحوں کے اور جالینوس کی کتابوں کی عربی شرحوں کے ترجمے کئے، ان سب یونیورسٹیوں کے درمیان سب سے بڑا علمی مرکز پیڈوا یونیورسٹی (Padua University) بنی، یہاں فلسفے میں ابن سینا رشد کو اتنی عظمت حاصل ہوئی کہ ارسطو کا نام پسِ پشت چلا گیا، حالانکہ ابن رشد کو فلسفے میں جو مقام ملا تھا وہ ارسطو کی تصنیفات کا شارح ہونے کی بناء پر ہی ملا تھا، پیڈوا یونیورسٹی میں فلسفے کا خلاصہ صرف ایک لفظ میں بیان کیا جاتا ہے، اور وہ لفظ ہے ''ابن رشد'' وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ

تیرہویں صدی کے دوران پیرس میں بھی ابن رشدیت (Averrooins) فلسفے کا فیشن تھی۔

مسلم فلسفہ کی طرح سے مسلم طب کی جڑیں بھی پیڈوار یونیورسٹی میں بڑی گہری تھیں، طب میں وہاں ابن سینا کو امام کی حیثیت حاصل تھی، اور عربی طب کو ہی معیار مانا جاتا تھا، ڈاکٹر اوسلر (Osler) کے بقول القانون یورپ میں طب کا بائیبل کہلائی۔

اٹانومی کا مشہور پروفیسر ویزالیئس (Vesalius) بھی ۱۵۳۶ء میں اسی یونیورسٹی سے وابستہ ہوگیا تھا، وہ بھی مسلم طب سے بہت متاثر تھا اور کہا جاتا ہے کہ اس نے رازی کی کتاب المنصوری کے دس ابواب کے لاطینی ترجمے کئے تھے۔

ویزالئیس کے علاوہ پیڈوا یونیورسٹی کے اور بھی متعدد ڈاکٹر مسلم طب کے پیروکار تھے، انگلستان میں بھی عربی طب کا اثر موجود تھا، وہاں کے ایسے طباء میں سے ڈنلپ نے Greenhill.W.A کا نام بیان کیا ہے۔

ان تراجم کو اہل یورپ نے اپنی درسگاہوں میں داخلِ نصاب کیا جس کی وجہ سے پندرہویں صدی کے وسط میں چھاپاخانہ ایجاد ہونے کے بعد سے یہ تراجم بار بار طبع ہونے لگے، مثال کے طور پر ابن سینا کی القانون (قانون الطب) یورپ میں پچاس بار طبع ہوئی۔

جابر بن حیان کی کیمیا کی تصانیف کے تراجم بھی یورپ میں بار بار طبع ہوئے جس کی وجہ سے اس کی ذات یورپ میں اس قدر معروف ہوئی اور اس کے کام نے اتنی قوت وقعت حاصل کی کہ اپنے اختراعی کارناموں کی وجہ سے یورپ میں بابائے کیمیا کہلایا، اسی طرح سے ابن الہیثم کی ''کتاب المناظر'' (The book of Optics) کا ترجمہ منظر عام پر آیا تو بصریات پر اس کے تخلیقی کاموں کی وجہ سے اہلِ یورپ نے اسے بابائے بصریات کا لقب سے ملقب کیا۔

تراجم کے بعد پھر ان میں سے بہت سی کتابوں کی شرحیں بھی لکھی جانے لگیں، کتابوں کی شرحیں کئی کئی مصنفین نے لکھیں، ڈاکٹر اے۔آر۔قدوائی نے بعض شرحوں کی

تعداد بھی پیش کی ہے، زکریا رازی کی کتاب المنصوری کی نو شرحیں لکھی گئیں، القانون کی بارہ اور علی ہذا القیاس۔

ان ترجموں اور شرحوں نے یورپ میں بڑے بڑے سائنس داں پیدا کئے، K.Z.Zabo نامی ایک مغربی مصنف لکھتا ہے ابن الہیثم ڈیکارٹ (Descarte)، نیوٹن (Newton) اور ہیوجنس (Huygens) کا پیش رو تھا۔

البتروجی بھی ایک بڑا مسلمان سائنس داں تھا، جس کی فلکیات پر تصنیفات یورپ میں بہت مقبول ہوئیں، اس کی ایک کتاب (مبینہ) تصنیف کتاب الہیات کا ترجمہ مائیکل اسکاٹ نے کیا، اس کتاب میں البتروجی نے بطلیموس کے مشہور فلکیاتی نظریوں پر جو Eccentrics اور Epicycles کے نام سے مشہور ہیں اور جو اجرام سماوی کی چال کی توجیہ کرتے ہیں، تنقید کی تھی اور ارسطو Homocentric Spheres کے نظریئے کی اصلاح تھی۔

قرائن سے بین طور پر واضح ہوتا ہے کہ جن برسوں اور صدیوں میں یورپ میں مسلمان حکماء کی کتابوں کے ترجمے کئے جا رہے تھے، ان برسوں اور صدیوں میں اہلِ یورپ کے پاس علوم کا سب سے بڑا ماخذ مسلمان حکماء کی کتابیں تھیں، ایک قرینہ تو یہی ہے کہ یورپ میں جن لوگوں نے خود کتابیں لکھنی شروع کیں انہوں نے زیادہ تر عربی ماخذات سے استفادہ کیا، مثلاً Albertus Magnus نے حیوانات کے موضوع پر سولہ سو (۱۶۰۰) صفحات پر پھیلی ہوئی نہایت ضخیم کتاب De Anamilibus نامی جو لکھی ہے اس بارے میں ایک یورپی مصنف لکھتا ہے کہ اس کے مواد تین چوتھائی کے لگ بھگ حصہ عربی ماخذات سے حاصل کیا گیا تھا۔

ان عربی ماخذات میں سے ایک ماخذ ابن سینا کا قانون تھا جس کا جیرارڈ آف کریمونا نے لاطینی میں ترجمہ کیا تھا، دوسرا ماخذ مائیکل اسکاٹ کی عربی سے لاطینی میں ترجمہ کردہ کتاب (Historia Animalium) تھی، تیسرا ماخذ ابن جلجل کی ایک کتاب تھی۔

اسی طرح سے نباتیات پر Albertus کی کتاب De Vegetabilibus کے بارے میں ڈنلپ لکھتا ہے کہ اس میں بھی عربی ماخذات استعمال کئے گئے ہیں، ان عربی ماخذات میں ایک بار پھر قانون کا تذکرہ کرتا ہے، یہ دو مثالیں صرف نمونے کی طور پر ہیں ورنہ ایسی عربی کتابوں کی تعداد بہت زیادہ ہے، جنہیں قرونِ وسطی کے یورپ مصنفین نے ماخذات (source Books) کے طور پر استعمال کیا۔

اس ضمن میں یہ بات نہایت قابلِ ذکر نظر آتی ہے کہ یورپی مصنفین نے یونانی مصنفین کی کتابوں سے بھی اکثر و بیشتر ان کے تراجم کے ذریعہ استفادہ کیا کیوں کہ اکثر یونانی نسخے مدتوں پہلے تلف ہو چکے تھے، صرف عربی تراجم کی صورت میں باقی رہ گئے تھے، ایسی کتابوں میں مشہور فلکیات داں بطلیموس کی گراں قدر تصنیف The megale Syntaxis بھی تھی جو عربی میں المجسطی کے نام سے ترجمہ ہوئی تھی۔

اہلِ یورپ کے لئے جب اس کتاب سے استفادہ کا وقت آیا تو ان لوگوں نے المجسطی کے ذریعہ اس سے استفادہ کیا، اسی طرح سے ارسطو، اقلیدس (Euclid) بقراط اور تھیوفراسٹس (Theopharastus) وغیرہ کی کتابوں کے عربی تراجم کے ذریعہ ان سے استفادہ کیا، ایک اور مثال ارسطو کی کتاب (Decoelo) ہے جس کی ابن رشد نے عربی میں شرح لکھی تھی، اس کے شرح کے ذریعہ Decoelo سے استفادہ کی صورت نکلی۔

اس ترجے کے ذریعہ اہلِ یورپ نے ارسطو کی تصنیف سے اپنی تصنیفات میں استفادہ کیا، حیوانات پر ارسطو کی کتاب Historia Animalius بھی عربی ترجے کے ذریعہ اہل یورپ کو دستیاب ہوئی کیوں کہ ابن رشد نے اس کی بھی شرح لکھی تھی، مائیکل اسکاٹ نے اس عربی متن De Anima کے نام سے ترجمہ کیا۔

ارسطو کی کئی اور تصانیف کے جن کے مائیکل اسکاٹ نے عربی تراجم سے لاطینی میں ترجمے کئے، لاطینی نام درج ذیل ہیں:

1- De Generations Et corruptione

2 - Book IV of the meteore

3- the sensu

4- The First Treatises of the Parva Naturalia

5- Physics

6- Metaphysics

7- Ethics

ڈنلپ لکھتا ہے کہ ارسطو کی کتابوں کے عربی تراجم کے لاطینی تراجم نے جو مائیکل اسکاٹ نے کئے یورپ میں ارسطو کے مطالعے کا دروزاہ وا کر دیا۔

مگر یونانی کتابوں کی تعداد، مسلمان حکماء کی تصانیف کے مقابلے میں بہت تھوڑی تھی، اس لئے یہ بات شرح صدر کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ یورپ میں علم کا احیاء جو ہوا وہ یونانی حکماء مقابلے بدر جہا مسلمان حکماء کی تصنیفات کے مرہون منت تھا، قریب قریب اسی قسم رائے آرنلڈ کی بھی ہے وہ لکھتا ہے کہ اسپین پر عیسائیوں کی فتوحات کے بعد مسلم تہذیب اسپین سے نکل کر پورے یورپ میں پھیل گئی اور جوں جوں اسپین کے شہروں طلیلہ (سقوط بہ سال ۱۰۸۵ء) قرطبہ (سقوط بہ سال ۱۲۳۶ء) اور اشبیلہ (سقوط بہ سال ۱۲۴۸ء) کا سقوط ہوتا گیا، یورپ میں علوم وفنون اور کاریگری وغیرہ تیزی سے پھیلتی گئی۔

پھر یہ کہ طلیلہ، اشبیلہ، سالرنو، پیڈوا اور دیگر بلاد یورپ میں دسویں سے تیرہویں صدیوں تک مسلمان حکماء کی کتابوں کے تراجم کا جاری رہنا اس امر کی بہت قوی دلیل ہے کہ یورپ میں علم کی روشنی ان کتابوں کے ذریعہ ہی پھیلی، اس کے علی الرغم اس کے لئے نشاۃ ثانیہ (Renaessance) کی اصطلاح جو اہل یورپ نے استعمال کی وہ نہایت متعصّبانہ بلکہ گمراہ کن ہے، نشاۃ ثانیہ کی اصطلاح کا استعمال ان کے اس ادعا کا غماز ہے کہ یورپ میں علم خود ان کے اپنے براعظم کے ملک یونان کے حکماء کی تصنیفات کو پھر سے زندہ کرنے سے پھیلا، حالانکہ شواہد جن کے کچھ نمونے سطور بالا میں پیش کئے گئے اس ادعا کی صریح نفی کرتے ہیں، یورپ میں مندرجہ بالا جو دارالترجمے قائم ہوئے ان میں سے ایک بھی یونانی کتابوں کے تراجم کے لئے قائم نہیں کیا گیا تھا، بلکہ وہ سب کے سب

عربی کتابوں کے تراجم کے لئے قائم کئے گئے تھے، اس غرض سے ان مترجمین نے عربی سیکھی تھی کیوں کہ Island of Mlloria کے باشاہ جیمز دوئم نے عربی سیکھنے کا فرمان جاری کر رکھا تھا، بالفرض یونانی حکماء کے تراجم کے لئے یہ دار الترجمے قائم کئے گئے ہوتے تو انہیں ڈیڑھ تا تین صدیوں کی مدت درکار نہ ہوتی ؛ کیوں کہ یونانی حکماء کی چھوڑی ہوئی کتابیں اتنی تعداد میں باقی نہیں رہ گئی تھیں کہ مندرجہ بالا پانچ دار الترجمے اس کام کی تکمیل کے لئے صدیوں کی مدت کے طلب گار ہوتے، ایک اور بات محل نظر یہ ہے کہ یہ مسلمان حکماء کی تصنیفات کی تعداد کے تازہ ترین جائزے کے مطابق جو Islamic Hertige Foundation London کی شائع کردہ کتاب یہ چار مجلدات نے شائع کی ہیں، دنیا بھر میں مسلمان حکماء وفضلاء کی کتابیں آج بھی پندرہ سولہ لاکھ کی تعداد میں موجود ہیں، جس صدیوں میں یورپ میں انکے ترجمے ہو رہے تھے بعض دسویں تا تیرہویں صدی کے دوران کی تعداد ان سے زیادہ ہی رہی ہوگی۔

علامہ اقبال فرماتے ہیں:

گنوادی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسمان نے ہم کو دے مارا
مگر وہ علم کے موتی ، کتابیں اپنے آباء کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارہ




مسلم قضاۃ کے
عادلانہ فیصلے

حضرت عمرؓ کے مبنی بر عدل فیصلے

☆ حضرت عمر بن الخطاب ؓ کے زمانہ خلافت میں جبلہ جو ملک غسان میں تھا مسلمان ہوا اور موسم حج میں خانہ کعبہ کا طواف کررہا تھا، ایک دوسرا غریب آدمی بھی ساتھ ساتھ طواف کررہا تھا، اتفاق سے اس غریب آدمی کے پیروں تلے اس کی ازار کا کنارہ روندا گیا، جبلہ جب آگے بڑھا تو اس کی لنگی اٹک گئی اور برہنہ ہوگیا، چونکہ وہ اپنے کو بہت بڑا آدمی سمجھتا تھا اور یہ دوسرا شخص نہایت غریب آدمی تھا، لہٰذا اس کو بہت غصہ آیا اور ایک طمانچہ اس زور سے مارا کہ اس کا ایک دانت ٹوٹ گیا، وہ غریب حضرت عمرؓ کی خدمت میں پہنچا اور عرض کیا کہ: اے امیر المؤمنین! جبلہ نے میرا دانت توڑ دیا، حضرت عمرؓ نے فرمایا: جبلہ کو میرے پاس لاؤ، چنانچہ جبلہ کو لایا گیا، حضرت عمرؓ نے واقعہ دریافت فرماکر اس غریب آدمی کو اجازت دی کہ وہ جبلہ سے اپنا بدلہ لے، جبلہ نے جب یہ سنا تو طیش میں آکر یہ کہا کہ: امیر المؤمنین مجھ کو اور ایک غریب آدمی کو کس چیز نے برابر کردیا ہے، حضرت عمرؓ نے فرمایا: کہ اسلام نے، اس میں امیر غریب سب برابر ہیں، تم نے اس کا دانت توڑا اور تمہارا دانت ضرور توڑا جائے گا، جبلہ نے کہا: کیا مجھے ایک دن کی مہلت مل سکتی ہے، حضرت عمرؓ نے فرمای: مل سکتی ہے اگر یہ شخص مہلت دے، صاحب حق سے پوچھا گیا تو وہ بیچارا نیک دل تھا، اس نے اجازت دے دی، جبلہ موقع پاکر رات کو اٹھ کر کھڑا ہوا اور رومیوں سے جاملا اور بدستورِ سابق نصرانی ہوگیا۔(۱)

☆ کوفہ کے ایک صاحب بیان کرتے ہیں کہ: حضرت عمرؓ نے ایک لشکر بھیجا

(۱) الوفاء بتعریف المصطفیٰ: ۱/۶۷۴، دارالمعرفۃ، بیروت

اور اس کے امیر کو لکھا کہ مجھے پتہ چلا ہے کہ تمہارے کچھ ساتھی کبھی موٹے تازے کافر کا پیچھا کرتے ہیں، جس کے نتیجے میں وہ کافر دوڑ کر پہاڑ پر چڑھ جاتا ہے اور خود کو محفوظ کرلیتا ہے، اس سے تمہارے ساتھی فارسی میں مترس (مت ڈر) کہہ کر اسے امان دیتے ہیں اور وہ کافر خود کو مسلمان کے حوالہ کردیتا ہے، پھر یہ مسلمان اس کافر کو پکڑ کر قتل کردیتے ہیں، یہ قتل دھوکہ دے کر کیا گیا ہے، اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے آئندہ اگر مجھے کسی کے بارے میں یہ پتہ چلا کہ اس نے ایسا کیا ہے تو میں اس کی گردن اڑادوں گا، حضرت ابوسلمہ ؓ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، اگر تم میں سے کسی نے آسمان کی جانب اشارہ کرکے کسی کو امان دی اور وہ مشرک اس وجہ سے مسلمان کے پاس آگیا پھر مسلمان نے اس کو قتل کردیا تو میں اس مسلمان کو ضرور قتل کروں گا۔(۱)

☆ حضرت انس ؓ فرماتے ہیں کہ: ہم نے تستر کا محاصرہ کیا، (آخر محاصرہ اور جنگ سے تنگ آکر تستر کے حاکم) ہرمزان نے اپنے حق میں حضرت عمرؓ کے فیصلہ پر اترنا قبول کیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا، جب ہم حضرت عمرؓ کی خدمت میں پہنچے تو آپ نے اس سے کہا: کہو کیا بات ہے؟ اس نے کہا زندہ رہنے والوں کی طرح بات کروں یا مرنے والوں کی طرح بات کروں؟ حضرت عمرؓ نے کہا: "لا بأس" یعنی تم اپنے آپ میں مت ڈرو، بات کرو، ہرمزان نے کہا: اے قوم عرب! جب تک تمہارے ساتھ نہ تھا؛ بلکہ اللہ نے معاملہ ہمارے اور تمہارے درمیان چھوڑ رکھا تھا، اس وقت تک تو ہم تم کو غلام بناتے اور تمہیں قتل کرتے تھے اور سارا مال تم سے چھین لیتے تھے؛ لیکن جب سے اللہ تمہارے ساتھ ہوگیا، اس وقت سے ہم میں تم سے مقابلہ کرنے کی طاقت نہ رہی، حضرت عمرؓ نے کہا: اے انس! تم کیا کہتے ہو؟ میں نے کہا:

(۱) حیاۃ الصحابۃ: کتاب عمر إلی أمیر جیش فی منع قتل: ۲/۴۴۳

امیر المؤمنین اس نے اپنے پیچھے بڑی تعداد میں دشمن اور دبدبہ چھوڑ کر آیا ہو، اگر آپ اسے قتل کر دیں گے تو اس کی قوم اپنی زندگی سے ناامید ہو کر مسلمانوں سے لڑنے میں زیادہ زور لگائے گی، اس لئے آپ اسے قتل نہ کریں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں براء بن عازت اور حجز بن ثور کے قاتل کو کیسے زندہ چھوڑ دو، حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ: جب مجھے خطرہ ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسے قتل کر دیں گے تو میں نے کہا: آپ رضی اللہ عنہ سے "لا بأس" مت ڈرا اور بات کہہ چکے ہیں اور "لا بأس" کہنے سے جان کی امان ملتی ہے، لہٰذا آپ تو اسے امان دے چکے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: معلوم ہوتا ہے کہ تم نے اس سے کوئی رشوت لی ہے اور اس سے کوئی مفاد حاصل کیا ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ کہا کہ اللہ کی قسم میں نے نہ رشوت لی ہے اور نہ کوئی مفاد، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: تم اپنے دعوی "لا باس" کی تصدیق کرنے والا کوئی گواہ اپنے علاوہ لاؤ ورنہ میں تم سے سزا کی ابتداء کروں گا، مجھ کو حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ ملے، میں ان کو لے کر آیا اور انہوں نے میری بات کی تصدیق کی جس کی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہرمزان کے قتل سے رک گئے اور ہرمزان مسلمان ہو گیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے لئے بیت المال سے وظیفہ مقرر کیا۔(۱)

☆ حضرت ایاس بن سلمہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ: ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بازار سے گذرے، ان کے ہاتھ میں کوڑا تھا، انہوں نے آہستہ سے وہ کوڑا مجھے مارا جو میرے کپڑے کے کنارے پر لگا اور فرمایا کہ: تمہارا حج کا ارادہ ہے؟ میں نے کہا: جی ہاں، پھر میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لے گئے اور مجھ کو چھ سو درہم دیئے اور کہا کہ: انہیں اپنے سفر حج میں کام میں لانا اور یہ اس ہلکے سے کوڑے کے بدلہ میں ہے جو میں نے تم کو مارا تھا، میں نے کہا: اے امیر المؤمنین! مجھے تو وہ کوڑا یاد بھی نہ رہا، فرمایا: لیکن میں تو اسے نہیں بھولا۔(۲)

(۱) حیاۃ الصحابۃ: کتاب عمر إلی أمیر جیش فی منع قتل: ۲/۴۴۵، موسسۃ الرسالۃ، بیروت
(۲) حیاۃ الصحابۃ: قصۃ عمر وإیاس بن سلمہ: ۲/۴۴۳

☆ حضرت شعبی کہتے ہیں کہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے درمیان (کھجور کے ایک درخت کے بارے میں) جھگڑا ہو گیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: آؤ ہم آپس میں فیصلہ کر کے کسی کو ثالث مقرر کرتے ہیں، یہ دونوں حضرات حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے پاس گئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہم آپ کے پاس اس لئے آئے ہیں؛ تاکہ آپ ہمارے درمیان فیصلہ کریں، جب یہ دونوں حضرات حضرت زید رضی اللہ عنہ کے ہاں داخل ہوئے تو حضرت زید رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنے بستر کے سرہانے بٹھانا چاہا، اور یوں کہا: امیر المؤمنین! یہاں تشریف رکھیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا: یہ پہلا ظلم ہے جو آپ نے اپنے فیصلہ میں کیا، میں اپنے فریق مخالف کے ساتھ بیٹھوں گا، حضرت ابن بن کعب رضی اللہ عنہ نے اپنا دعوی پیش کیا جس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انکار کیا، حضرت زید رضی اللہ عنہ نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آپ امیر المؤمنین کو قسم کھانے کی زحمت نہ دیں اور میں امیر المؤمنین کے علاوہ کسی اور سے یہ درخواست نہیں کر سکتا؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قسم کھائی اور قسم کھا کر فرمایا کہ: حضرت زید رضی اللہ عنہ تب ہی قاضی بن سکتے ہیں جب ان کے نزدیک امیر المؤمنین اور ایک عام آدمی دونوں برابر ہوں۔(۱)

☆ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: مصر سے ایک آدمی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا: ائے امیر المؤمنین! مجھ پر ظلم ہوا ہے میں آپ سے پناہ لینا چاہتا ہوں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ہاں، تم میری مضبوط پناہ گاہ میں ہو، اس نے کہا: میں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے بیٹے محمد سے دوڑنے میں مقابلہ کیا تو اس سے آگے نکل گیا وہ مجھے کوڑے مارنے لگے اور کہنے لگے کہ میں بڑے کریم لوگوں کی اولاد میں سے ہوں، اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو خط لکھا کہ وہ خود بھی مدینہ آئیں اور ساتھ میں اپنے بیٹے کو بھی

(۱) حیاۃ الصحابۃ: عدل عمر الفاروق رضی اللہ عنہ: ۲/۳۳۳

لائیں، چنانچہ حضرت عمرو بن العاص ؓ مدینہ آئے تو حضرت عمر ؓ نے کہا: وہ شکایت کرنے والا مصری کہاں ہے؟ کوڑا لو اور اسے مارو، وہ مصری کوڑے مارتے جارہا تھا، حضرت عمر ؓ کہتے جارہے تھے: کمینے کے بیٹے کو مارو، اس مصری نے حضرت عمرو بن العاص ؓ کے بیٹے کو خوب پیٹا اور ہم چاہتے تھے کہ وہ خوب پیٹے اور اس نے مارنا تب چھوڑا جب ہم کو تقاضہ ہوا کہ وہ اب نہ مارے یعنی اس نے مارنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی، پھر حضرت عمر ؓ نے اس مصری سے فرمایا: حضرت عمرو بن عاص ؓ کو چند کوڑے مارے، اس نے کہا: امیر المؤمنین! مجھ کو تو ان کے بیٹے نے مارا تھا، میں نے بدلہ لیا، اس پر حضرت عمر ؓ نے حضرت عمرو بن العاص ؓ سے فرمایا کہ: کب سے تم نے لوگوں کو غلام بنائے رکھا ہے؟ حالانکہ ان کو ان کی ماؤں نے آزاد جنا ہے، حضرت عمرو بن العاص ؓ نے کہا: مجھے اس قصہ کا بالکل پتہ نہ چلا اور نہ مصری میری پاس شکایت لے کر آیا ہے ورنہ میں اپنے بیٹے کو خود سزا دیتا۔(۱)

☆ حضرت حسن کہتے ہیں کہ: ایک عورت کا شوہر غائب تھا، اس کے پاس کسی کی آمد ورفت تھی، حضرت عمر ؓ کو اس سے کھٹک ہوئی، حضرت عمر ؓ نے بلانے کے لئے اس کے پاس آدمی بھیجا، اس آدمی نے اس عورت سے کہا کہ: حضرت عمر ؓ کے پاس چلو، حضرت عمر ؓ تمہیں بلا رہے ہیں، اس نے کہا: ہائے میری ہلاکت مجھے عمر سے کیا واسطہ؟ وہ گھر سے چلی، وہ حاملہ تھی، ابھی وہ راستہ میں ہی تھی کہ وہ گھبرا گئی اور اسے دردزہ شروع ہوگیا، وہ ایک گھر میں چلی جہاں اس کا بچہ پیدا ہوا، بچہ دو دفعہ رویا اور مرگیا، حضرت عمر ؓ نے صحابہ سے مشورہ کیا کہ میرے ڈر کی وجہ سے تو وہ عورت گھبرا گئی، اس وجہ سے بچہ قبل از وقت پیدا ہوا، اس وجہ سے بچہ مرگیا، کیا اس بچہ کے اس طرح مرنے کی وجہ سے مجھ پر کوئی چیز شرعا لازم ہوتی ہے، بعض صحابہ نے کہا: آپ پر کچھ لازم نہیں آتا؛ کیوں کہ آپ

(۱) حیاۃ الصحابہ، ما کان یعملہ عمر فی الموسم للعدل بین الناس: ۲/ ۸۳۳

مسلمانوں کے والی ہیں اور آپ کے ذمہ ان کو ادب سکھانا ہے، کوئی کمی دیکھے تو انہیں بلا کر تنبیہ کریں، حضرت علی ؓ خاموش تھے، حضرت عمر ؓ نے ان کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا کہ اس بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟ حضرت علی ؓ نے کہا: اگر ان لوگوں نے یہ بات بغیر دلیل کے محض اپنی رائے سے کہی تو غلط ہے، اگر ان لوگوں نے آپ کو خوش کرنے کے لئے یہ بات کہی ہے تو انہوں نے آپ کے ساتھ خیر خواہی نہیں کی، میری رائے یہ ہے کہ اس بچہ کی دیت یعنی خون بہا آپ کو دینا پڑے گا؛ کیوں کہ آپ کے بلانے کی وجہ سے وہ عورت گھبرا گئی؛ اس لئے یوں بچہ کا قبل از وقت پیدا ہونے کا سبب آپ ہی ہیں، اس پر حضرت عمر ؓ نے حضرت علی ؓ کو حکم دیا کہ اس بچہ کا خون بہا سارے قریش سے وصول کریں؛ اس لئے کہ یہ قتل ان سے خطاء کے طور پر صادر ہوا ہے "فَأَمَرَ عَلِيًّا أَنْ يُّقَسِّمَ عَقْلَهُ عَلَى قُرَيْشٍ" (۱)

☆ حضرت جریر کہتے ہیں کہ حضرت ابو موسی اشعری ؓ کے ساتھ جہاد میں ایک آدمی تھا، اس لڑائی میں مسلمانوں کو بہت مال غنیمت حاصل ہوا، حضرت ابو موسی ؓ نے اس کو مال غنیمت سے حصہ دیا؛ لیکن پورا نہ دیا، اس نے کہا: لوں گا تو پورا لوں گا، حضرت ابو موسی اشعری ؓ نے اس کو بیس کوڑے مارے اور سر مونڈا، وہ اپنے بالوں کو جمع کر کے حضرت عمر ؓ کے پاس لے گیا، وہاں جاکر اس نے اپنے جیب سے بال نکالے اور حضرت عمر ؓ کے سینے پر دے مارا، حضرت عمر ؓ نے پوچھا تمہیں کیا ہوا؟ اس نے سارا قصہ سنایا، حضرت عمر ؓ نے ابو موسی کو خط لکھا "سلام علیك" اما بعد! فلاں بن فلاں نے مجھے سارا قصہ اس اس طرح سنایا میں تمہیں قسم دے کر کہتا ہوں کہ اگر یہ کام آپ نے اس کے ساتھ بھرے مجمع کے سامنے کیا ہے تو آپ اس کے لئے بھرے مجمع میں

(۱) مصنف عبد الرزاق: باب من أفزعه السلطان، حدیث: ۱۸۰۱۰، حیاۃ الصحابۃ: ۲/ ۳۳۶، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت

اس کے سامنے بیٹھ جائیں، اگر آپ نے اس کے ساتھ یہ کام تنہائی میں کیا ہے تو آپ اس کے لئے تنہائی میں بیٹھ جائیں ؛ تاکہ وہ آپ سے اپنا بدلہ لے، "أُقْسِمُ عَلَيْكَ إِنْ كُنْتَ فَعَلْتَ مَا فَعَلْتَ فِيْ مَلأٍ مِنَ النَّاسِ جَلَسْتُ لَهُ فِيْ مَلأٍ مِنَ النَّاسِ فَاَقْتَصُّ مِنْكَ وَإِنْ كُنْتَ فَعَلْتَ مَا فَعَلْتَ فِيْ خَلاَءٍ فَاَقْعُدُ لَهُ فِيْ خَلاَءٍ فَلْيَقْتَصُّ مِنْكَ"۔ چنانچہ جب حضرت ابوموسی ؓ کو یہ خط پہنچا تو بدلہ دینے کے لئے اس آدمی کے سامنے بیٹھ گئے، اس آدمی نے کہا: میں نے اللہ کے لئے معاف کر دیا ہے(۱)

☆ حضرت عبداللہ بن عمر ؓ کہتے ہیں کہ: حضرت عمر ؓ کے زمانہ خلافت میں مصر میں میرے بھائی عبدالرحمن اور ان کے ساتھ ابوسِروعہ نے نبیذ پی جس سے انہیں نشہ ہوگیا، صبح کو جب یہ دونوں مصر کے امیر حضرت عمرو بن عاص ؓ کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ: ہمیں پاک کر دیں؛ کیوں کہ ہم نے ایک مشروب پیا تھا جس سے ہمیں نشہ ہوگیا تھا، حضرت عبداللہ ؓ فرماتے ہیں کہ: مجھے میرے بھائی نے کہا: مجھے نشہ ہوگیا تھا، میں نے ان سے کہا: گھر چلو میں تمہیں پاک کر دوں گا، مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ یہ دونوں حضرت عمر ؓ کے پاس جا چکے تھے، پھر میرے بھائی نے مجھ سے کہا کہ امیر مصر کو یہ بات بتا چکے ہیں تو میں نے کہا: تم گھر چلو تمہارا سر مونڈوں؛ تاکہ تمام لوگوں کے سامنے تمہارا سر نہ مونڈا جائے، اس زمانہ کا دستور تھا کہ حد لگانے کے ساتھ سر بھی مونڈھا جاتا تھا، چنانچہ وہ دونوں گھر چلے اور میں نے اپنے بھائی کا اپنے ہاتھوں سر مونڈھا، پھر حضرت عمرو بن العاص ؓ نے ان پر شراب کی حد لگائی، حضرت عمر ؓ پتہ چلا تو انہوں نے حضرت عمرو بن العاص ؓ کو لکھا کہ میرے پاس عبدالرحمن ؓ کو بغیر کجاوے کے اونٹ پر سوار کر کے بھیج دو، چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا، جب وہ حضرت عمر ؓ کے پاس پہنچے تو انہوں نے کوڑے لگائے اور اپنا بیٹا ہونے کی

(۱) السنن الکبری للبیہقی: باب ما جاء فی قتل الإمام وجرحه، حدیث:۱۵۸۰۶

وجہ سے اسے سزا دی، پھر چھوڑ دیا،" فَلَمَّا قَدِمَ عَلٰی عُمَرَ ؓ جَلَدَهُ وَعَاقَبَهُ لِمَكَانِهِ مِنْهُ" اس کے بعد وہ ایک مہینہ تک ٹھیک رہے، پھر تقدیر الٰہی غالب آ گئی اور ان کا انتقال ہوگیا۔(۱)

☆ حضرت یزید بن منصور کہتے ہیں کہ حضرت عمر ؓ کو یہ خبر ملی کہ بحرین میں ان کے مقرر کردہ گورنر حضرت ابن جارود کے پاس ایک شخص لایا گیا جس کا نام ادریاس تھا، اس نے مسلمانوں کے دشمنوں کے ساتھ خفیہ خط و کتابت رکھی تھی اور ان دشمنوں کے ساتھ مل جانے کا ارادہ بھی کر رکھا تھا، اس کے ان جرائم پر گواہ بھی موجود تھے، اس پر اس گورنر نے اسے قتل کر دیا اور وہ شخص قتل ہوتے ہوئے کہہ رہا تھا: اے عمر! میں مظلوم ہوں، میری مدد کو آئیں، حضرت عمر ؓ نے اس گورنر کو خط لکھا کہ میرے پاس آؤ، چنانچہ وہ حاضر ہوئے، حضرت عمر ان کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا نیزہ تھا، جب وہ حضرت عمر ؓ کے پاس اندر داخل ہوئے تو حضرت عمر ؓ نے اس چھوٹے نیزے سے ان کے جبڑوں پر مارنا چاہا، حضرت عمر ؓ کہے جا رہے تھے: اے ادریاس! میں تیری مدد کے لئے حاضر ہوں، اے ادریاس میں تیری مدد کے لئے حاضر ہوں، حضرت ابن جارود کہنے لگے: اے امیر المؤمنین! اس نے مسلمانوں کی خفیہ باتیں دشمنوں کو لکھی ہیں اور دشمنوں سے جا ملنے کا ارادہ بھی کر رکھا ہے، حضرت عمر ؓ نے فرمایا: تم نے صرف برائی کے ارادہ پر ہی قتل کر دیا، ہم میں سے کون ایسا ہے جس کے دل میں برے ارادے نہ آتے ہو، اگر گورنروں کے قتل کا مستقل دستور بن جانے کا خطرہ نہ ہوتا تو میں تمہیں ضرور قتل کر دیتا۔" لَوْلَا أَنْ تَكُوْنَ سُنَّةً لَقَتَلْتُكَ بِهِ" (۱)

حضرت عمر ؓ کا عدل وانصاف

☆ حضرت حرمازی فرماتے ہیں کہ: حضرت عمر ؓ نے حضرت فیروز دیلمی کو یہ خط

(۱) حیاۃ الصحابۃ: عدل عمر الفاروق:۲/۳۳۵ (۱) حیاۃ الصحابۃ: مواخذۃ عمر عاملہ علی البحرین:۲/۳۳۸

لکھا، اما بعد! مجھے اطلاع ملی ہے کہ آپ میدے کی روٹی شہد کے ساتھ کھانے میں مشغول ہو گئے ہو، لہٰذا جب آپ کا پاس میرا خط پہنچے تو آپ اللہ کا نام لے کر میرے پاس آجائیں اور اللہ کے راستہ میں جہاد کریں، چنانچہ حضرت فیروز خط ملتے ہی مدینہ پہنچے اور حضرت عمر ؓ کے پاس اندر آنے کی اجازت مانگی، حضرت عمر ؓ نے اجازت دے دی، وہ اندر جانے لگے تو ایک قریشی نوجوان بھی اندر جانے لگا جس سے راستہ تنگ ہو گیا، انہوں نے اس قریشی کی ناک پر اس زور سے تھپڑ مارا کہ خون نکل آیا، وہ قریشی اسی حال میں حضرت عمر ؓ کے پاس اندر چلا گیا اور اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا، حضرت عمر ؓ نے اس نوجوان سے پوچھا کہ تمہارے ساتھ یہ سلوک کس نے کیا ہے؟ اس نے جواب دیا: حضرت فیروز نے اور وہ اس وقت دروازے پر ٹھہرے ہوئے ہیں، حضرت عمر ؓ نے حضرت فیروز کو اندر آنے کی اجازت دی، وہ اندر گئے، حضرت عمر ؓ نے کہا: اے فیروز یہ کیا ہے؟ حضرت فیروز نے کہا: اے امیر المؤمنین! ہم نے کچھ عرصہ پہلے ہی بادشاہت چھوڑی ہے (جس کا اثر ہماری طبیعت میں باقی ہے) یہ بات ہوئی کہ آپ نے مجھے خط بھیج کر بلایا، اسے آپ نے خط نہیں لکھا اور نہ اجازت مانگنے پر آپ نے اندر آنے کی اجازت دی، اس نے قاعدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بلا اجازت مجھ سے پہلے میری اجازت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اندر داخل ہوا، اس پر مجھے غصہ آیا، اس لئے مجھ سے یہ حرکت سرزد ہوئی، حضرت عمر ؓ نے کہا: آپ کو بدلہ دینا پڑے گا، حضرت فیروز نے کہا: کیا بدلہ دینا پڑے گا؟ حضرت عمر ؓ نے کہا: ہاں بدلہ ضرور دینا پڑے گا، چنانچہ حضرت فیروز گھٹنے کے بل بدلہ دینے کے لئے بیٹھ گئے اور وہ نوجوان بدلہ لینے کے لئے کھڑا ہوا، حضرت عمر ؓ نے اس سے کہا: اے نوجوان! ذرا ٹھہر! میں تجھے وہ بات بتاتا ہوں جو میں نے حضور اکرم ﷺ سے سنی ہے، ایک دن صبح کے وقت میں حضور اکرم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جھوٹے نبی اسود عنسی کو آج

قتل کر دیا گیا ہے اور اس کو اللہ کے نیک بندے فیروز دیلمی نے قتل کیا ہے، جب تو نے ان کے بارے میں یہ حدیث سنی تو کیا تو اس کے بعد بھی بدلہ لینا چاہتا ہے، اس نوجوان نے کہا: جب آپ نے ان کے بارے میں حضور اکرم ﷺ کی یہ حدیث سنائی تو میں نے ان کو معاف کر دیا، اس کے بعد میں اپنی غلطی پر اللہ کے پکڑ سے بچ جاؤں گا؟ حضرت عمر ؓ نے کہا: ہاں اس پر حضرت فیروز نے کہا: آپ کو گواہ بناتا ہوں کہ میری تلوار میرا گھوڑا اور میرے مال میں سے تیس ہزار درہم اس نوجوان کو ہدیہ ہیں، حضرت عمر ؓ نے کہا: اے قریشی! تم نے معاف کر کے ثواب بھی لیا اور تم کو اتنا مال بھی مل گیا۔ "فَعَفَوْتَ مَاجُوْرًا أَخَا قُرَيْشٍ، وَأَخَذْتَ مَالاً" (۱)

☆ حضرت عطاء ؒ کہتے ہیں کہ حضرت عمر ؓ اپنے گورنروں کو حکم دیا کرتے تھے کہ وہ حج کے موقع پر ان کے پاس آیا کریں، جب سارے گورنر آجاتے تو آپ عام مسلمانوں کو جمع کر کے فرماتے: اے لوگو! میں نے اپنے گورنر تمہارے یہاں اس لئے نہیں بھیجا ہے کہ وہ تمہاری کھال ادھیڑیں یا تمہارے مال پر قبضہ کریں یا تمہیں بے عزت کریں؛ بلکہ میں نے صرف اس لئے بھیجا ہے کہ تمہیں ایک دوسرے پر ظلم نہ کرنے دیں اور تمہارے درمیان مال غنیمت تقسیم کریں، لہٰذا جس کے ساتھ اس کے خلاف کیا گیا ہو وہ کھڑا ہو جائے، چنانچہ انہوں نے ایک مرتبہ گورنروں کو جمع کر کے اعلان کیا تو صرف ایک آدمی کھڑا ہوا اور کہا: اے امیر المؤمنین! آپ کے فلاں گورنر نے مجھے ظلماً سو کوڑے مارے ہیں، حضرت عمر ؓ نے اس گورنر سے کہا: تم نے اسے کیوں مارا؟ حضرت عمر ؓ نے اس گورنر سے کہا: تم نے اسے کیوں مارا؟ اور اس آدمی سے کہا: اٹھ اس گورنر سے بدلہ لے، اس پر حضرت عمرو بن العاص ؓ نے کہا: اگر آپ اس طرح گورنروں سے بدلہ دلانا شروع کر دیں تو پھر آپ کے پاس بہت زیادہ شکایتیں

(۱) حیاۃ الصحابہ: مواخذۃ عمر عاملہ علی البحرین: ۲/ ۳۴۰

آنے لگ جائیں گے اور یہ گورنروں سے بدلہ لینا ایسا دستور بن جائے گا کہ جو بھی آپ کے بعد آئے گا اسے اختیار کرنا پڑے گا، حضرت عمر ؓ نے فرمایا: میں نے حضور اکرم ﷺ کو اپنی ذات سے بدلہ دلوانے کے لئے تیار رہتے ہوئے دیکھا تو میں نے اپنے گورنروں سے کیوں نہ بدلہ دلواؤں؟ حضرت عمرو بن العاص ؓ نے کہا: آپ ہمیں اس آدمی کو راضی کرنے کا موقع دیں، حضرت ؓ نے کہا: اچھا چلو تم اسے راضی کرلو؛ چنانچہ اس گورنر نے ہر کوڑے کے بدلہ میں دو دینار کے حساب سے دو سو دینار اس آدمی کو بدلہ میں دے دیئے" فَافْتَدَى مِنْهُ بِمِائَتَيْ دِيْنَارٍ عَنْ كُلِّ سَوْطٍ بِدِيْنَارَيْنِ"(۱)

☆ حضرت زید بن اسلم رضی اللہ کہتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ایک گھر مدینہ منورہ کی مسجد کے بالکل متصل تھا، حضرت عمر ؓ نے اسے مسجد میں شامل کرنا چاہا، حضرت عباس ؓ سے کہا کہ آپ یہ گھر میرے ہاتھ بیچ دیں، حضرت ابن عباس ؓ نے انکار کردیا، حضرت عمر ؓ نے کہا: آپ مجھے ہدیہ ہی کردیں، وہ یہ بھی نہ مانے تو حضرت عمر ؓ نے کہا: آپ یہ گھر خود ہی مسجد میں شامل کردیں، انہوں نے اسے بھی انکار کردیا، تو حضرت عمر ؓ نے کہا: آپ کو تین کاموں میں سے کسی ایک کو کرنا ہوگا؛ لیکن حضرت عباس ؓ پھر بھی تیار نہ ہوئے تو حضرت عمر ؓ نے کہا: اچھا آپ کسی ثالث کو مقرر کردیں جو ہمارا فیصلہ کردے، انہوں نے حضرت ابی بن کعب ؓ کو مقرر کیا، یہ دونوں حضرات اپنا مقدمہ ان کے پاس لے گئے، حضرت ابی بن کعب ؓ نے حضرت عمر ؓ سے کہا: میرا فیصلہ ہے کہ آپ ان کا گھر ان کی مرضی کے بغیر نہیں لے سکتے، حضرت عمر ؓ نے ان سے پوچھا: کیا آپ کو یہ فیصلہ قرآن میں ملا ہے یا حدیث میں؟ انہوں نے کہا: میں نے حضور اکرم ﷺ ک کو فرماتے ہوئے سنا: سلیمان بن داود بیت المقدس کی تعمیر کے دوران جب بھی کوئی دیوار بناتے تو

(۱) حیاۃ الصحابۃ: ما کان یعملہ عمر فی الموسم: ۲/ ۳۳۷

صبح وہ گری ہوئی ہوتی، آخر اللہ تعالی نے ان کی طرف یہ وحی بھیجی کہ اگر آپ کسی کی زمین میں بنانا چاہتے ہوں تو پہلے انہیں راضی کرلیں، یہ سن کر حضرت عمر ؓ نے حضرت عباس ؓ کو چھوڑ دیا، بعد میں حضرت عباس ؓ نے اپنی خوشی سے اس گھر کو مسجد می شامل کردیا۔ "فَوَسَّعَهَا الْعَبَّاسُ بَعْدَ ذٰلِكَ فِيْ الْمَسْجِدِ"(۱)

☆ حضرت زید بن وہیب کہتے ہیں کہ حضرت عمر ؓ ایک مرتبہ اپنے دونوں کانوں میں انگلیاں ڈالے ہوئے باہر نکلے اور کہہ رہے تھے، "یالبیك" میں حاضر ہو، میں، مدد کو حاضر ہوں، لوگوں نے ان سے پوچھا کہ انہیں کیا بات پیش آئی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: ان کے مقرر کردہ ایک امیر کی جانب سے ایک آدمی یہ خبر لایا ہے کہ ان کے علاقہ میں مسلمانوں کے راستہ میں ایک نہر پڑتی ہے جسے پار کرنے کے لئے مسلمانوں کو کشتی نہ ملی تو ان کے امیر نے کہا کہ کسی ایسے آدمی کا پتہ لگاؤ جو نہر کی گہرائی کو معلوم کرنا چاہتا ہوں، چنانچہ ان کے پاس ایک بوڑھے کو لایا گیا، اس بوڑھے نے کہا: مجھے سردی سے ڈر لگتا ہے اور وہ موسم سردی کا تھا، لیکن اس امیر نے مجبور کرکے اسے نہر میں داخل کردیا، تھوڑی ہی دیر میں اس پر سردی کا اثر ہوا اور وہ بہت زور زور سے پکارنے لگا، اے عمر! میری مدد کو آؤ، اور وہ بوڑھا ڈوب گیا، اس بوڑھے کی فریاد کے جواب میں حضرت عمر ؓ کانوں میں انگلیاں ڈالے ہوئے "یالبیک" کہتے ہوئے نکلے تھے، چنانچہ حضرت عمر ؓ نے اس امیر کو خط لکھا جس پر وہ مدینہ آگئے اور ان کے آئے ہوئے کئی دن گذر گئے؛ لیکن حضرت عمر ؓ نے ان کی طرف کوئی توجہ مبذول نہ فرمائی، حضرت عمر ؓ کی عادت شریفہ تھی کہ جب کسی پر غصہ آتا تو اس سے اعراض فرماتے تھے، پھر اس امیر سے کہا: جس آدمی کو تم نے مار ڈالا ہے اس کا کیا بنا؟ امیر نے کہا: ارادہ اس آدمی کو قتل کرنے کا نہ تھا، ہمیں نہر پار کرنے کے لئے

(۱) حیاۃ الصحابۃ: عدل عمر الفاروق رضی اللہ عنہ: ۲/ ۳۳۳

کوئی چیز نہیں مل رہی تھی، ہم تو صرف یہ چاہتے تھے کہ نہر کی گہرائی معلوم کریں، پھر بعد میں ہم نے اللہ کے فضل سے فلاں فلاں علاقے فتح کئے ہیں، اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم جو کچھ فتوحات کی خبر لے آئے ہو مجھے ایک مسلمان اس سے زیادہ محبوب ہے، اگر مستقل دستور بن جانے کا خطرہ نہ ہوتا تو میں تمہاری گردن اڑا دیتا، تم ان کے رشتہ داروں کو خون بہا دو اور میرے پاس سے چلے جاؤ، پھر آئندہ کبھی نہ دیکھوں:

"لَوْلَا أَنْ تَكُوْنَ سُنَّةً لَضَرَبْتُ عُنُقَكَ اِذْهَبْ فَاعْطِ أَهْلَهُ دِيَّتَهُ وَأَخْرُجْ فَلَا آرَاكَ"(۱)

☆ حضرت ابن عباس ؓ فرماتے ہیں کہ: ایک باندی نے حضرت عمر ؓ کی خدمت میں آ کر کہا کہ میرے آقا نے مجھ پر تہمت لگائی، پھر مجھے آگ پر بٹھایا جس سے میری شرمگاہ جل گئی، حضرت عمر ؓ نے کہا: تم کو تمہارا آقا نے وہ برا کام کرتے ہوئے دیکھا تھا، اس باندی نے کہا: نہیں، حضرت عمر ؓ نے فرمایا: تم نے اس کے سامنے کسی برائی کا اقرار کیا تھا؟ اس باندی نے کہا: نہیں، حضرت عمر ؓ نے فرمایا: اسے میرے پاس لاؤ، چنانچہ وہ آدمی حاضر ہوا، حضرت عمر ؓ نے اس آدمی کو دیکھا تو فرمایا: تم انسانوں کو وہ عذاب دیتے ہو جو اللہ کے ساتھ خاص ہے، اس آدمی نے کہا: اے امیر المؤمنین! مجھے اس پر شبہ ہوا تھا، حضرت عمر ؓ نے اس سے پوچھا: کیا تم نے تمہارے سامنے اس جرم کا اعتراف کیا تھا؟ اس نے کہا: نہیں، حضرت عمر ؓ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، اگر میں حضور ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے نہ سنا ہوتا کہ مالک سے اس کے غلام کو اور والد سے اس کے لڑکے کو بدلہ نہیں دلوایا جائے گا تو میں تمہیں اس باندی سے ضرور بدلہ دلواتا اور پھر حضرت عمر ؓ نے اس آدمی کو سو کوڑے مارے، پھر اس باندی سے کہا: تو جا آزاد ہے،

(۱) السنن الکبری للبیہقی: باب السلطان یکرہ رجلاً أن یدخل نہراً، حدیث: ۱۷۳۳۳

اس لئے کہ میں نے حضور اکرم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جسے آگ میں جلایا جائے گا یا جس کی شکل آگ سے جلانے کی بناء پر بگڑ گئی ہو وہ آزاد ہے، وہ اللہ اور اس کے رسول کا آزاد کردہ ہے "اِذْهَبِيْ لِوَجْهِ اللهِ وَأَنْتِ مَوْلَاةُ اللهِ وَرَسُوْلِهِ"(۱)

حضرت علی ؓ کے فیصلے

حضرت علی ؓ کہتے ہیں کہ (جب) رسول کریم ﷺ نے مجھے قاضی بنا کر بھیجنے کا ارادہ کیا تو میں نے عرض کیا کہ آپ مجھ نوجوان کو (قاضی بنا کر) بھیج رہے ہیں (جو کم عمری کی وجہ سے ناتجربہ کار بھی ہے اور (جس کو) منصب قضا کی ذمہ داریوں کا پوری طرح علم بھی نہیں ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا (تم اس بارے میں فکر نہ کرو) اللہ تعالی تمہارے دل کو فہم و فراست کی ہدایت عطا کرے گا اور تمہاری زبان کو صحیح اور برحق حکم و فیصلہ کرنے پر (ثابت رکھے گا)، پھر آنحضرت ﷺ نے منصب قضا کی ذمہ داریوں کی انجام دہی کے سلسلہ میں یہ تعلیم و ہدایت دی کہ جب تمہارے پاس دو آدمی اپنا قضیہ لے کر آئیں تو تم پہلے آدمی (یعنی مدعا علیہ) کا بیان سن لو کیونکہ یہ (مدعا علیہ کا بیان تمہیں) صحیح حکم و فیصلہ دینے میں اچھی مدد دے گا، حضرت علی ؓ کہتے ہیں کہ (آنحضرت ﷺ کی) اس مبارک دعا کی برکت سے اور آپ ﷺ کی اس ہدایت و تعلیم پر عمل کرنے کے بعد میں کسی بھی قضیہ کا حکم اور فیصلہ کرنے میں مذبذب نہیں ہوا "فَمَا شَكَكْتُ فِيْ قَضِيَّةٍ بَعْدُ"(۲)

حضرت زید ؓ سے مروی ہے کہ جب حضرت علی ؓ یمن میں تھے تو ان کے پاس ایک عورت کو لایا گیا جس سے ایک ہی طہر میں تین آدمیوں نے بدکاری کی تھی انہوں نے ان میں سے دو آدمیوں سے پوچھا کہ کیا تم اس شخص کے لئے بچے کا اقرار کرتے ہو؟ انہوں نے اقرار نہیں کیا اسی طرح ایک ایک کے ساتھ دوسرے کو ملا کر سوال کرتے رہے یہاں تک کہ اس مرحلے سے فارغ ہو گئے اور کسی نے بھی بچے کا اقرار نہیں کیا پھر انہوں نے

(۱) المستدرک، کتاب الحدود: حدیث: ۸۱۰۱

(۲) حلیۃ الأولیاء: سعید بن فیروز ابو البختری: ۳۸۲/۴، دار الکتاب العربی، بیروت

ان کے درمیان قرعہ اندازی کی اور قرعہ میں جس کا نام نکل آیا بچہ اس کا قرار دے دیا اور اس پر دو تہائی دیت مقرر کر دی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں یہ مسئلہ پیش ہوا تو نبی کریم ﷺ اتنے مسکرائے کہ دندان مبارک ظاہر ہو گئے ”فَضَحِكَ حَتّٰى بَدَتْ نَوَاجِذُهٗ“۔(۱)

حنش کنانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: یمن میں ایک قوم نے شیر کو شکار کرنے کے لئے ایک گڑھا کھود کر اسے ڈھانپ رکھا تھا شیر اس میں گر پڑا اچانک ایک آدمی بھی اس گڑھے میں گر پڑا، اس کے پیچھے دوسرا، تیسرا حتی کہ چار آدمی گر پڑے، اس گڑھے میں موجود شیر نے ان سب کو زخمی کر دیا، یہ دیکھ کر ایک آدمی نے جلدی سے نیزہ پکڑا اور شیر کو دے مارا، چنانچہ شیر ہلاک ہو گیا اور وہ چاروں آدمی بھی اپنے اپنے زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے دنیا سے چل بسے۔ مقتولین کے اولیا اسلحہ نکال کر جنگ کے لئے ایک دوسرے کے آمنے سامنے آ گئے، اتنی دیر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ آ پہنچے اور کہنے لگے کیا تم چار آدمیوں کے بدلے دوسو آدمیوں کو قتل کرنا چاہتے ہو؟ میں تمہارے درمیان فیصلہ کرتا ہوں، اگر تم اس پر راضی ہو گئے تو سمجھو کہ فیصلہ ہو گیا، فیصلہ یہ ہے کہ جو شخص پہلے گر کر گڑھے میں شیر کے ہاتھوں زخمی ہوا، اس کے ورثا کو چوتھائی دیت دے دو اور چوتھے کو مکمل دیت دے دو، دوسرے کو تہائی اور تیسرے کو نصف دیت دے دو، ان لوگوں نے یہ فیصلہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا (کیونکہ ان کی سمجھ میں ہی نہیں آیا) چنانچہ وہ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، نبی ﷺ نے فرمایا میں تمہارے درمیان فیصلہ کرتا ہوں، اتنی دیر میں ایک آدمی کہنے لگا، یارسول اللہ! حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ہمارے درمیان یہ فیصلہ فرمایا تھا، نبی ﷺ نے اسی کو نافذ کر دیا: ”فَأَجَازَ رَسُوْلِ اللهِ الْقَضَاءَ كَمَا قَضَيْتُ بَيْنَهُمْ“۔(۲)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دوراندیشی

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں ایک عجیب وغریب مقدمہ عدالتِ فاروقی میں

(۱) مسند احمد، حدیث: ۱۹۳۴۸

(۲) أخبار القضاة: قضاء معاذ فی الیمن: ۹۷/۱، المکتبة التجارية الكبرى، بشارع محمد علي بمصر

پیش ہوتا ہے، ایک انصاری نوجوان لڑکا کہتا ہے کہ: میں اس عورت کا بیٹا ہوں، مگر وہ عورت مجھے بیٹا ماننے سے انکار کر دیتی ہے، عورت سے سے پوچھا گیا تو اس نے کہا: میری تو کبھی شادی ہی نہیں ہوئی، ادھر عورت نے چند گواہوں کو بھی امیر المؤمنین کی خدمت میں پیش کر دیا جنہوں نے ثابت کیا کہ یہ عورت شادی شدہ نہیں ہے، امیر المؤمنین نے ساری باتیں سن کر اس نوجوان پر حد جاری کرنے کا حکم دیا، اس دوران حضرت علی رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور سارے مقدمے کی تفصیلات سنیں، پھر مسجد نبوی میں ان سارے حضرات کو بلا کر عورت سے پوچھا: کیا یہ تمہارا بیٹا نہیں ہے؟ اس عورت نے کہا: نہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس نوجوان سے کہا: تم بھی اس طرح اس کے ماں ہونے کا انکار کر دو جیسے یہ تمہارے بیٹے ہونے کا انکار کر رہی ہے، اس نوجوان نے کہا: میں یہ کیسے کر سکتا ہوں جب کہ میں خوب جانتا ہوں کہ یہ میری ماں ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس نوجوان کو ترغیب دلانے پر کہ آج سے تمہارا باپ میں اور تمہارے بھائی حسن وحسین ہوں گے تم اس عورت کے ماں ہونے کا انکار کر دو تو اس نوجوان اس کے ماں ہونے کا انکار کر دیا، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عورت کے اولیاء سے فرمایا: ”أَمْرِيْ فِيْ هٰذِهِ الْمَرْأَةِ جَائِزٌ“ کیا اس عورت کے سلسلے میں میری بات مانی جائے گی؛ اولیاء نے کہا: کیوں نہیں؟ ضرور آپ کی بات مانیں گے۔ ان کی باتیں سننے کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ گویا ہوئے: اے قنبر! (قنبر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے غلام کا نام تھا) ان حاضرین کے سامنے تم گواہ رہو کہ میں نے اس اجنبی خاتون کی شادی اس نوجوان سے کر دی، تم جا کر درہموں کی تھیلی لاؤ۔ قنبر گئے اور (۴۸۰) درھم کی تھیلی لائے، حضرت علی رضی اللہ عنہ اس عورت کو وہ رقم بطور مہر دیتے ہوئے اس نوجوان سے کہا: اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑ واور اس کے بعد ہمارے پاس اسی وقت آنا جب کہ تمہارے اوپر سہاگ کے نشانات ہوں۔

یہ سنتے ہی اس عورت نے کہا: اے ابوالحسن! یہ نوجوان تو میرے حق میں جہنم کا ٹکڑا بن جائے، میں اقرار کرتی ہوں کہ یہ میرا لڑکا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ: اس نوجوان کا ایک باپ حبشی تھا، میرے بھائیوں نے اس کے ساتھ میری شادی کر دی تھی، کچھ دنوں

کے بعد وہ اللہ کی راہ میں شہید ہوگیا، اس کے بعد میرا یہ بچہ پیدا ہوا تو میں نے اسے فلاں قبیلہ میں بھیج دیا، اس نے وہیں پرورش پائی، اس کے بعد میں نے اس کو بیٹا ماننے سے انکار کردیا "وَأَنْفَيْتُ أَنْ يَّكُوْنَ اِبْنِيْ"۔(۱)

☆ حضرت علی ؓ جب خلیفہ تھے تو ان کے سامنے ایک دلچسپ مقدمہ آیا، دو شخص ہمسفر تھے، ایک شخص کے پاس تین روٹیاں اور دوسرے کے پاس پانچ روٹیاں تھیں، دونوں مل کر کھانے بیٹھے، یکا یک ایک اور مسافر ان کے ساتھ شریک ہوگیا اور چلتے وقت اپنے ذمہ کی روٹیوں کی قیمت آٹھ درہم ادا کی، پانچ روٹیوں والنے پانچ درہم ساتھ رکھ کر تین درہم دوسرے کو دینا چاہا تو وہ راضی نہ ہوا اور نصف قیمت طلب کی، اب یہ مقدمہ حضرت علی ؓ خدمت میں پیش ہوا، آپ نے دوسرے سے کہا کہ اپنے ساتھ کا فیصلہ قبول کرلو، اس میں تمہارا نفع ہے، مگر اس نے انکار کیا کہ حق کے ساتھ جو بھی مل جائے وہ بہتر ہے، حضرت علی ؓ نے فرمایا: حق یہ ہے کہ تم ایک درہم کے اور تمہارا ساتھی ساتھ درہم کا مستحق ہے، یہ فیصلہ سن کر وہ حیران وششدر رہ گیا، حضرت علی ؓ نے فرمایا: تم تین آدمی تھے اور تمہارے تین روٹیاں اور تمہارے رفیق کی پانچ روٹیاں تھیں، تم دونوں برابر کھائے اور تیسرے کو بھی برابر کا حصہ دیا، تمہاری روٹیوں کے تین ٹکڑے کئے جائیں تو ٹکڑے بنتے ہیں اور تمہارے ساتھی کی پانچ روٹیوں کے تین تین ٹکڑے کئے جائیں تو وہ پندرہ بنتے ہیں اور ان کا مجموعہ چوبیس ہوتا ہے، تینوں میں سے ہر ایک نے برابر ٹکڑے کھائے تو ہر ایک کو آٹھ آٹھ ٹکڑے ملتے ہیں تو تم نے اپنے نو ٹکڑوں میں سے آٹھ خود کھائے اور ایک ٹکڑا تیسرے کو دیا، تمہارے ساتھی آٹھ ٹکڑے کھائے اور باقی سات ٹکڑے تیسرے کو دیا، اس لئے تم ایک درہم اور تمہارا ساتھی سات درہم کا حق دار رہوا۔

حضرت علی ؓ کو اللہ عزوجل نے علم وحکمت کا وافر حصہ عطا فرمایا، حضور اکرم ﷺ

(۱) الاستیعاب فی معرفة الأصحاب: علی بن أبی طالب: ۱۱۰۳/۳

نے حضرت علی ؓ کے تعلق سے فرمایا تھا کہ: میں علم ہوں اور علی اس کا دروازہ، حضرت عمر فاروق ؓ نے ایک مرتبہ ایک عورت کے بارے میں فیصلہ فرمایا، اس کے ساتھ ہی حضرت علی ؓ وہاں پہنچے اور حضرت علی ؓ نے فیصلہ پر غور فرمایا تو فیصلہ ان کو حق کے موافق نظر نہ آیا، تو حضرت علی ؓ نے عورت کے بارے میں پھر سے فیصلہ فرمایا، حضرت عمر ؓ نے اس فیصلہ کی حقانیت وصداقت کو دیکھ کر فرمایا: "لَوْلَا عَلِيٌّ لَهَلَكَ عُمَرُ"۔ (اگر علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہوجاتا) اسی حکمت اور عقل ودانائی وبینائی کی بنا پر ایسے مبنی برحق فیصلہ فرماتے کہ ہر شخص حیران وششدر رہ جاتا۔(۱)

معاذ بن جبل ؓ کے قضا کے واقعات

معاذ بن جبل ؓ کے بعض ساتھیوں سے روایت ہے کہ جب حضور اکرم ﷺ نے حضرت معاذ ؓ کو یمن کا حاکم بنا کر بھیجنے کا ارادہ کیا فرمایا تم کس طرح فیصلہ کروگے جب تمہارے پاس کوئی مقدمہ پیش ہوجائے انہوں نے کہا اللہ کی کتاب سے فیصلہ کروں گا آپ نے فرمایا اگر تم اللہ کی کتاب میں وہ مسئلہ نہ پاؤ تو؟ عرض کیا کہ رسول اللہ ﷺ! کی سنت کے مطابق فیصلہ کروں گا، حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر سنت رسول میں بھی نہ پاؤ تو؟ اور کتاب اللہ میں بھی نہ پاؤ تو؟ انہوں نے کہا کہ اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور اس میں کوئی کمی کوتاہی نہیں کروں گا، رسول اللہ ﷺ نے ان کے سینہ کو تھپتھپایا اور فرمایا کہ اللہ ہی کیلئے تمام تعریفیں ہیں جس نے اللہ کے رسول ﷺ کے پیغامبر (معاذ) کو اس چیز کی توفیق دی جس سے رسول اللہ ﷺ راضی ہیں "وَفَّقَ رَسُوْلَ رَسُوْلِ اللهِ لِمَا يَرْضَى رَسُوْلُ اللهِ"۔(۲)

ابوالاسود دویلی کہتے ہیں کہ حضرت معاذ بن جبل ؓ جس وقت یمن میں تھے تو ان کے سامنے ایک یہودی کی وراثت کا مقدمہ پیش ہوا جو فوت ہوگیا تھا، اور اپنے پیچھے ایک مسلمان بھائی چھوڑ گیا تھا حضرت معاذ ؓ نے فرمایا میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ

(۱) الطرق الحکمیة: ۴۳/۱، مکتبة دار البیان

(۲) اخبار القضاة: قضاء معاذ فی الیمن: ۹۸/۱ المکتبة التجاریة الکبری، بشارع محمد علی بمصر

فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اسلام اضافہ کرتا ہے کمی نہیں کرتا اور اس حدیث سے استدلال کر کے انہوں نے اسے وارث قرار دے دیا۔"إِنَّ الْإِسْلَامَ يَزِيْدُ"(۱)

☆ حضرت یحی بن سعید رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی دو بیویاں تھیں، ان میں سے جس کی باری کا دن ہوتا اس دن دوسرے کے گھر سے وضو نہ کرتے، پھر دونوں بیویاں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ملک شام گئیں اور وہاں دونوں اکٹھے بیمار ہوئیں اور اللہ کی شان دونوں کا ایک ہی دن انتقال ہوا، لوگ اس دن کافی مشغول تھے جس کی بناء پر دونوں کو ایک ہی قبر میں دفن کر دیا گیا؛ لیکن یہاں پر بھی حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے دونوں میں قرعہ ڈالا کہ کس کو قبر میں پہلے رکھا جائے۔"فَأَسْهَمَ بَيْنَهُمَا أَيَّتُهُمَا تُقَدَّمُ فِيْ الْقَبْرِ"(۲)

حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ بحیثیت قاضی یمن

حضرت ابوموسی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجتے ہوئے فرمایا خوشخبری دینا، نفرت مت پھیلانا، آسانی پیدا کرنا، مشکلات میں نہ ڈالنا، ایک دوسرے کی بات ماننا اور آپس میں اختلاف نہ کرنا، چنانچہ ان دونوں میں سے ہر ایک کا خیمہ تھا جس میں وہ ایک دوسرے سے ملنے کے لئے آتے رہتے تھے۔"يَزُوْرُ أَحَدُهُمَا صَاحِبَهُ"۔(۳)

اسحاق نضر شعبہ سعید بن ابی بردہ اپنے والد سے وہ ان کے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ جب ان کو اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یمن بھیجنے لگے تو دونوں سے فرمایا کہ آسانی کرنا سختی نہ کرنا اور خوش خبری سنانا نفرت نہ دلانا بلکہ رغبت دلانا ابوموسی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہم ایک ایسے ملک میں رہتے ہیں جہاں شہد

---

(۱) اخبار القضاۃ: قضاء معاذ فی الیمن: ۹۸/۱ المكتبة التجارية الكبري، بشارع محمد علي بمصر

(۲) صفوۃ الصفوۃ: ذکر نبذۃ من تعبدہ واجتہادہ: ۴۹۲/۱، دار المعرفۃ، بیروت

(۳) مسند احمد: حدیث أبی موسی الأشعری، حدیث: ۱۹۷۱۴، محقق شعیب الأرنؤط نے اس حدیث کو صحیح اور اس کے رجال کو ثقہ کہا ہے۔

سے شراب بنائی جاتی ہے جس کو مزر کہا جاتا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔"كُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ"(۱)

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور ان کے عدالتی فیصلے

عہدی اموری کے مشہور ومعروف قضاۃ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بھی شامل ہیں، ان کے فیصلے بھی نہایت معروف ہیں۔

☆ ایک مقروض شخص جو بالکل مفلس ہو چکا تھا، ادائیگی قرض سے عاجز ہو چکا تھا، قرض دینے والے نے یہ درخواست کی کہ اسے جیل بھیج دیا جائے، سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے یہ درخواست رد کر دی اور فرمایا کہ: میں صرف تمہارے لئے اسکو قید نہیں کر سکتا، میں اس کو آزاد کر دیتا ہوں کہ تلاش معاش کے ذریعہ تیرا قرض بھی ادا کرے اور اپنے اور اپنے اہل وعیال کے لئے رزق بھی حاصل کر سکے "لَا أَحْبِسُهُ لَكَ، وَلٰكِنْ أَدَعُهُ يَطْلُبُ لَكَ وَلِنَفْسِهِ وَلِعَيَالِهِ"(۲)

☆ مروان بن الحکم کے بھائی حارث بن حکم حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے پاس آکر ان کے تکیہ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے، اتنے میں ایک شخص آیا اور اس نے حارث کے خلاف دعوی کیا، سیدنا حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فوراً حارث کو حکم دیا اور اسے اٹھا کر اس کے فریق کے ساتھ بٹھایا، پھر مقدمہ سنا اور فیصلہ کیا۔(۳)

(۱) قاضی شریح بن حارث

نام شریح، کنیت ابوامیہ، نسب اکندی ہیں، ایک روایت یہ ہے کہ شریح نسلاً عرب نہ تھے؛ بلکہ ان خانوادوں میں سے تھے جو کندہ کے حلیف بن کر یمن میں آباد ہو گئے تھے۔

علامہ ابن سعد اور حافظ ابن عبدالبر وغیرہ تمام ارباب سیر وطبقات اسی کے قائل ہیں کہ وہ تابعی ہیں، البتہ وہ تابعین کے زمرے میں نہایت ممتاز اور اونچا درجہ رکھتے ہیں۔

---

(۱) بخاری: باب أبی موسی ومعاذ، حدیث: ۴۰۸۸

(۲) اخبار القضاۃ: تسویۃ أبی ہریرۃ بین الخصوم: ۱۱۲/۱

(۳) اخبار القضاۃ: تسویۃ أبی ہریرۃ بین الخصوم: ۱۱۲/۱

قضا کی استعداد وقابلیت

ایک قاضی کے لئے جن اوصاف وکمالات کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان میں بدرجۂ اتم موجود تھے، فضل وکمال کا یہ حال تھا کہ امام نووی لکھتے ہیں کہ شریح کی توثیق، دینداری، فضل وکمال، ذکاوت اوران کی روایات سے احتجاج پر سب کا اتفاق ہے۔

"وَاتَّفَقُوْا عَلَى تَوْثِيْقِ شُرَيْحٍ وَدِيْنِهِ وَفَضْلِهِ وَالِاحْتِجَاجِ بِرِوَايَاتِهِ وَذَكَائِهِ"(۱)

حافظ صفی الدین خزرجی لکھتے ہیں کہ: وہ بڑے جلیل القدر اور ذکی علماء میں سے تھے۔(۲)

حدیث وفقہ کے علاوہ مروجہ فنون قیافہ شناسی اور شاعری میں بھی کمال دستگاہ رکھتے تھے، وہ طبعا نہایت ذہین، ذکی، طباع، فریس اور فہیم واقع ہوئے تھے، پیچیدہ سے پیچیدہ معاملات کی تہہ تک بآسانی پہنچ جاتے تھے، ان اوصاف وکمالات نے ان میں قدرۃ قضاء کی نہایت اعلیٰ استعداد پیدا کردی تھی، حضرت علی بن ابی طالب ؓ کو زبان رسالت سے "أَقْضَاهُمْ عَلِيٌّ" کی سند ملی اور شریح کو "اَقْضَى الْعَرَبِ" عرب کا سب سے بڑا قاضی فرماتے تھے۔

عہدۂ قضا پر تقرر سے پہلے ان کی یہ صلاحیت واستعداد زبان زد عام وخاص ہوچکی تھی، لوگ اپنے معاملات اور فیصلہ کن امور میں ان کو حکم اور ثالث بناتے تھے، چنانچہ حضرت عمر ؓ نے ان کے ایک فیصلہ کو دیکھ کر انہیں کوفہ کا قاضی بنایا تھا۔

اس کا واقعہ یوں ہوا کہ حضرت عمر ؓ نے ایک شخص سے بشرط پسندیدگی ایک گھوڑا خریدا اور امتحان کے لئے ایک سوار کو دیا، گھوڑا سواری میں چوٹ کھا کر داغی ہوگیا، حضرت عمر ؓ نے اس کو واپس کرنا چاہا، گھوڑے کے مالک نے لینے سے انکار کردیا، اس پر نزاع ہوئی اور شریح ثالث بنائے گئے ، انہوں نے یہ فیصلہ دیا کہ اگر

(۱) تہذیب الأسماء: حرف الشین المعجمة: ۱/۳۴۱

(۲) تہذیب الکمال: ۱۲/۴۳۷، مؤسسة الرسالة، بیروت

گھوڑے کے مالک سے اجازت لے کر سواری کی گئی تھی تو گھوڑا واپس کیا جاسکتا ہے ورنہ نہیں۔(۱)

اسی فیصلہ پر حضرت عمر ؓ ان کو کوفہ کا قاضی بنایا، قاضی شریح نے اس قابلیت، اس خوش اسلوبی اور دیانت سے اس خدمت کو انجام دیا کہ حضرت عمر ؓ کے زمانہ سے لے کر عبدالملک کے زمانہ تک مسلسل ساٹھ سال قاضی رہے، اس طویل مدت میں بڑے بڑے انقلابات وحوادث ہوئے، خلافت راشدہ کا وجود ختم ہوکر اموی حکومت کا آغاز ہوا، ابن زبیر ؓ اور امویوں میں خوں ریز معرکہ آرائیاں ہوئیں، ساری دنیائے اسلام میں انقلاب برپا ہوا، لیکن شریح بدستور مسند قضاء پر متمکن رہے، ابن زبیر ؓ اور عبدالملک کی جنگ کے زمانہ میں اپنا دامن بچانے کے لئے صرف چند برسوں کے لئے مستعفی ہوگئے تھے۔

قاضی شریح کے مبنی برانصاف عدالتی فیصلے

فیصلوں میں عدل یہ ان کا عظیم اور بڑا وصف تھا، وہ فیصلہ کرنے میں کسی خارجی یا داخلی اثر سے بالکل متاثر نہ ہوتے، وہ قانون اور حق وانصاف کے مقابلے میں بڑی سے بڑی شخصیت کی بھی پرواہ نہیں کرتے تھے۔

☆ حضرت عمر ؓ کا مذکورہ بالا واقعہ بعض روایتوں میں یوں منقول ہے کہ: گھوڑا جب امتحان میں ہلاک ہوگیا اور حضرت عمر ؓ اسے واپس کرنا چاہا اور اس پر تنازعہ ہوا اور شریح حکم مقرر ہوئے، تو انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ جس کو خریدا ہے اسی کو لینا ہوگا یا جس حالت میں لیا تھا، اسی حالت میں واپس کرنا ہوگا، اس فیصلہ پر حضرت عمر ؓ ان کو کوفہ قاضی بنادیا "فَبَعَثَهُ قَاضِيًا"(۲)

یہاں انہوں نے ایک معمولی شخص کے مقابلہ میں حضرت عمر ؓ کے خلاف فیصلہ دیا ہے، اگر ان کا لڑکا بھی قانون کی زد میں آجاتا تھا تو اس کی بھی

(۱) کتاب الأوائل: الباب السابع ذکر القضاۃ

(۲) طبقات ابن سعد: ۶/۱۳۱، دار صادر، بیروت

پرواہ بالکل نہ کرتے تھے، ایک مرتبہ ان کے ایک لڑکے نے ایک ملزم کی ضمانت کی، ملزم بھاگ گیا تو اس کے بدلہ شریح نے لڑکے کو قید کر دیا۔(۱)

☆ ایک مرتبہ ان کے ایک اہم خاندان نے ایک شخص پر کچھ ناروا ظلم کیا، شریح نے اس کو ایک ستون میں بندھوا دیا، جب وہ فیصلہ کر کے اٹھے تو اس شخص نے کچھ کہنا چاہا تو شریح نے کہا: مجھ سے کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں ہے؛ اس لئے کہ میں نے تم کو نہیں قید کیا ہے؛ بلکہ حق نے قید کیا ہے "إِنِّي لَمْ أَحْبِسُكَ ، إِنَّمَا حَبَسَكَ الْحَقُّ "(۲)

☆ عدل گستری کی ایک اور مثال ملاحظہ کیجئے کہ: ان کے ایک لڑکے اور بعض دوسرے اشخاص کے درمیان کسی حق کے بارے میں تنازعہ تھا، لڑکے نے ان سے واقعات بتا کر پوچھا کہ اگر میرا حق نکلتا ہو اور مقدمہ میں کامیابی کی امید ہو تو میں دعوی کروں ورنہ خاموش رہوں، شریح نے مقدمہ کی نوعیت پر غور کر کے دعوی کرنے کا مشورہ کیا، لیکن جب مقدمہ ان کے سامنے پیش ہوا تو لڑکے کے خلاف فیصلہ دیا، فیصلہ دے کر جب گھر آئے تو لڑکے نے کہا: اگر میں نے پہلے آپ سے مشورہ نہ کر لیا ہوتا تو مجھ کو آپ سے کوئی شکایت نہ ہوتی؛ لیکن مشورہ دینے کے بعد آپ نے مجھے ذلیل کیا، شریح نے جواب دیا، جان پدر! تو مجھے ان لوگوں کے زیادہ عزیز ہے ، "يَا بُنَيَّ وَاللهِ أَنْتَ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ مِلْءِ الْأَرْضِ مِثْلَهُمْ ؛ وَلٰكِنَّ اللهَ هُوَ أَعَزُّ عَلَيَّ مِنْكَ" جب تو نے مجھ سے مشورہ کیا تو مقدمہ دیکھنے کے بعد مجھے ان لوگوں کا حق نظر آیا، اگر میں اس وقت تجھ سے اس کو ظاہر کر دیتا تو تو ان سے صلح کر لیتا اور ان لوگوں کا حق ضائع ہو جاتا۔(۳)

(۱) طبقات ابن سعد: ۶/ ۱۳۱، دار صادر، بیروت
(۲) طبقات ابن سعد: ۶/ ۱۳۵، دار صادر، بیروت
(۳) طبقات ابن سعد: ۶/ ۱۳۱

☆ شعبی کہتے ہیں کہ: میں قاضی شریح کی خدمت میں بیٹھا تھا، اتنے میں ایک عورت روتے ہوئے اپنے شوہر کی شکایت لے کر آئی جو کہ گھر سے باہر تھا، عورت زار وقطار رو رہی تھی، میں نے قاضی شریح سے کہا: اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت رکھے، میرے خیال میں یہ عورت مظلوم ہے اور اس کا حق پامال ہوا ہے۔ قاضی شریح نے پوچھا: کس دلیل کی بنا پر تم اس عورت کو مظلوم سمجھ رہے ہو؟ میں نے عرض کیا: اس کے زار وقطار رونے اور آنسوؤں کا سمندر بہانے کی وجہ سے۔ قاضی شریح نے فرمایا: جب تک حقیقت معاملہ واضح نہ ہو جائے، فیصلہ سنانے میں جلدی مت کرو؛ کیوں کہ یوسف علیہ السلام کے بھائی جب اپنے والد یعقوب علیہ السلام کی خدمت میں آئے تھے تو وہ بھی زار وقطار آنسو بہا رہے تھے، حالاں کہ انہوں نے یوسف علیہ السلام پر ظلم ڈھایا تھا "يَا شَعْبِيُّ أَنَّ إِخْوَةَ يُوسُفَ عليه السلام جَاءُوا أَبَاهُمْ عِشَاءً يَبْكُونَ"۔(۱)

عزیز قریب کی شہادت کا قانون

حدیث میں عزیز وقریب کی شہادت کی کوئی ممانعت نہیں ہے، اس لئے ایک عزیز کے مقدمہ میں دوسرے عزیز کی شہادت قبول کرنے میں کوئی قانونی رکاوٹ نہیں ہے، ابن ابی شیبہ کا بیان ہے کہ قاضی شریح نے عزیز کے مقابلہ میں عزیز کی شہادت ناقابل اعتبار قرار دی اور یہ قانون بنا دیا کہ لڑکے کی شہادت باپ کے متعلق، باپ کی شہادت لڑکے کے متعلق، بی بی کی شہادت شوہر کے متعلق، شوہر کی شہادت بیوی کے متعلق، آقا کی شہادت غلام کے متعلق اور غلام کی شہادت آقا کے متعلق اور اجیر کی شہادت اس شخص کے متعلق جس نے اس کو اجرت پر لیا ہو قبول نہیں کی جا سکتی، اس اصول پر وہ اس سختی سے عامل تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں حضرت امام رضی اللہ عنہ کی شہادت مسترد کر دی، اس کا واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زرہ کہیں گر پڑی اور ایک ذمی کے ہاتھ لگی، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شریح کی عدالت میں دعوی پیش کیا، شریح نے ذمی سے پوچھا:

(۱) وفیات الأعیان: القاضی شریح، ۲/ ۴۶۰

تم کیا کہتے ہو؟ اس نے کہا: میری ملکیت کا ثبوت یہ ہے کہ زرہ میرے قبضہ میں ہے، شریح نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ: آپ کے پاس اس کی کوئی شہادت ہے کہ زرہ گرگئی تھی، انہوں نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور قنبر کو شہادت میں پیش کیا، شریح نے کہا: قنبر کی شہادت تو قبول کرتا ہوں؛ لیکن حسن رضی اللہ عنہ کی شہادت رد کرتا ہوں، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: آپ نے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد نہیں سنا ہے کہ "اَلْحَسَنُ وَالْحُسَیْنُ سَیِّدَا شَبَابِ أَهْلِ الْجَنَّةِ" شریح نے کہا سنا ہے؛ لیکن باپ کے مقابلہ میں لڑکے کی شہادت معتبر نہیں ہوتی، اس فیصلہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بلا چوں و چرا تسلیم کیا اور زرہ یہودی کے پاس رہنے دی، اس واقعہ کا اس یہودی پر یہ اثر ہوا کہ اس نے خود اقرار کرلیا کہ زرہ آپ ہی کی ہے اور تمہارا دین سچا ہے، مسلمانوں کا قاضی امیر المومنین کے خلاف فیصلہ کرتا ہے اور وہ بلا چوں و چرا سر خم کر دیتا ہے، میں شہادت دیتا ہوں کہ محمد خدا کے سچے رسول ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس کے اسلام سے اتنی مسرت ہوئی کہ اس یادگار میں انہوں نے زرہ اپنی طرف سے اس کو دے دی۔(۱)

☆ ایک مرتبہ عدی بن ارطاۃ نے قاضی شریح کے سامنے ایک دعوی پیش کیا، دونوں میں حسب ذیل گفتگو ہوئی:

عدی: میں آپ کے سامنے کچھ باتیں پیش کرنا چاہتا ہوں۔
شریح: فرمایئے میں سننے کے لئے تیار ہوں۔
عدی: میں شام کا رہنے والا ہوں۔
شریح: اتنے دور دراز مقام کے؟ (بطور مذاق کہا)۔
عدی: میں نے آپ کے ہاں شادی کی ہے۔
شریح: شادی مبارک ہو۔
عدی: میں اپنی بیوی کو ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔
شریح: شوہر اپنی بیوی کا حق دار اور مختار ہے۔

(۱) شذرات الذہب: سنۃ ثمان وسبعین: ۱/ ۸۵، دار ابن کثیر

عدی: لیکن اس نے اپنے گھر میں رہنے کی شرط کرلی ہے۔
شریح: تو پھر شرط پوری کرنی چاہئے۔
عدی: آپ ہمارا فیصلہ کیجئے۔
شریح: فیصلہ کر دیا۔
عدی: کس کے خلاف؟
شریح: تمہاری ماں کے لڑکے کے یعنی تمہارے خلاف۔
عدی: کس کی شرط پر؟
شریح: تمہارے ماموں کی بہن کے لڑکے کی شہادت پر یعنی خود تمہاری شہادت پر۔ کیوں کہ عدی نے خود اقرار کرلیا تھا کہ بیوی سے گھر میں رہنے کی شرط منظور کرلی تھی۔

دینی واخلاقی مزاج

علمی کمالات کے ساتھ وہ فضائل اخلاق سے بھی آراستہ تھے، بڑے دیندار اور عبادت گذار تھے، قضاء کی ذمہ داریوں اور مشغولیتوں کے باوجود ان کا کافی وقت عبادت میں گذرتا تھا، ان کے غلام ابوطلحہ کا بیان ہے کہ: جب وہ صبح کی نماز پڑھ کر واپس آتے تھے تو گھر کے دروازے بند کر کے قریب قریب آدھے دن تک نوافل میں مشغول رہتے تھے "فظن أنه یصلی"(۱)

طبعا نہایت خوش اخلاق اور منکسر المزاج واقع ہوئے تھے، سلام میں ہمیشہ خود سبقت کرتے تھے، قاسم کا بیان ہے کہ کوئی شخص سلام میں شریح پر سبقت نہیں کرسکتا تھا، عیسیٰ بن حارث کا بیان ہے کہ میں ہمیشہ سبقت کرنے کی کوشش کرتا تھا، مگر کبھی کامیاب نہ ہوا "كَانَ أَوْلاَهُمَا بِاللهِ الَّذِیْ یَبْدَأُ بِالسَّلاَمِ"(۲)

وہ فتنہ وفساد کو ناپسند کرتے تھے، ان کی زندگی میں بڑے بڑے سیاسی انقلابات آئے، عبدالملک اور ابن زبیر رضی اللہ عنہ کا ہنگامہ برسوں جاری رہا، جس کی لپیٹ سے بہت کم

(۱) طبقات ابن سعد: ۶/ ۱۲۸، دار صادر، بیروت
(۲) طبقات ابن سعد: ۶/ ۱۴۱، دار صادر، بیروت

لوگ محفوظ رہ سکے، لیکن شریح کا دامن اس سے بھی بچارہا، اس ہنگامہ کے زمانہ میں وہ چند سال کے لئے مستعفی ہوگئے تھے "فأقام قاضيا خمسا وسبعين سنة لم يتعطل فيها إلا ثلاث سنين امتنع فيها من القضاء في فتنة الزبير"(۱)

دوسروں کی راحت کا اتنا خیال تھا کہ اپنے لئے کسی کوادنی تکلیف دینا بھی پسند نہ کرتے تھے، اپنے گھر کے تمام پرنالے اندر لگاتے تھے کہ اس کے پانی سے دوسروں کو تکلیف نہ پہنچے "لا يتخذ مثعبا في داره"(۲)

وفات

آپ نے حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی اور حضرت معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں کوفہ کے عہدۂ قضا پر فائز رہے، اور ۱۰۸ سال کی عمر پاکر سرزمین کوفہ میں ۸۷ ہجری میں داغ مفارقت دے گئے، آپ نے آخری عمر ضعف پیری کی وجہ سے استعفی دے دیا تھا، دم آخر یہ وصیت کی تھی کہ بغلی قبر کھودی جائے، جنازہ کی اطلاع کسی کو نہ دی جائے، جنازہ کے ساتھ نوحہ نہ کیا جائے، جنازہ کو آہستہ آہستہ لے جایا جائے، قبر پر چادر نہ ڈالی جائے، ان وصایا کے بعد انتقال فرمایا۔(۳)

(۲) کعب بن سور

کعب سے کوئی حدیث منقول نہیں ہے، اس لئے ارباب رجال نے ان کے حالات نہیں لکھے ہیں؛ لیکن وہ ایک ممتاز تابعی ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہم صحبت وہم جلیس اور نہایت ذہین اور طباع تھے، ان کی ذہانت اور طباعی کی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو عہدۂ قضاء پر مامور کیا۔

ان کے تقرر کا واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھے

(۱) وفیات الاعیان: القاضی شریح: ۲/ ۴۶۰، دارصادر، بیروت

(۲) طبقات ابن سعد: ۶/ ۱۴۳، دارصادر، بیروت

(۳) وفیات الاعیان: القاضی شریح: ۲/ ۴۶۳

ہوئے تھے کہ ایک عورت آپ کے پاس حاضر ہوئی اور کہا کہ: میں آپ کے پاس دنیا کے ایک بہترین آدمی کی شکایت لے کر آئی ہوں، کوئی آدمی عمل میں اس پر سبقت نہیں لے جاسکتا، اور اس کے جیسا عمل نہیں کرسکتا، وہ قیام لیل میں صبح کر دیتا ہے، روزے میں سارا دن گذار دیتا ہے، اتنا کہنے کے بعد اس عورت کو شرم دامن گیر ہوئی اور اس کے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی کہ امیر المؤمنین مجھے معاف فرمایئے، آپ نے فرمایا: خداتم کو جزائے خیر دے، تم نے اچھی تعریف کی، میں نے تم کو معاف کیا، اس کے بعد وہ عورت چلی گئی، اس کے واپس جانے کے بعد کعب نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ: امیر المؤمنین اس عورت نے آپ کے سامنے نہایت بلیغ پیرایہ میں شکایت پیش کی ہے، فرمایا کہ: کیسی شکایت؟ کعب نے کہا: اپنے شوہر کی (یعنی وہ رات دن عبادت میں مشغول رہتا ہے، اور اس کی طرف ملتفت نہیں ہوتا) یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عورت کو بلوا کر کعب سے کہا: تم دونوں کا فیصلہ کردو، کعب نے عرض کیا: آپ کی موجودگی میں فیصلہ کروں؟ فرمایا: جس چیز کو تم نے سمجھ لیا میں نہ سمجھ سکا، اس کا فیصلہ بھی تم ہی کو کرنا چاہئے، چنانچہ کعب نے کلام پاک کی اس آیت: "فانكحوا ما طاب لكم من النساء" تم کو جو عورتیں پسند ہوں ان سے نکاح کرو دو، تین اور چار تک۔(۱)

سے استدلال پر کہ جب قرآن میں چار بیویوں کی اجازت ہے تو اس کے یہ معنی یہ ہوئے کہ ہر چار شبانہ یوم میں ایک شبانہ یوم ہر بیوی کا حق ہوا تو تنہا بیوی کا کم سے کم یہی حق ہوگا، اس عورت کے شوہر کو تین دن روزہ رکھنے اور ایک دن بیوی کے لئے افطار کرنے اور تین رات عبادت کرنے اور ایک رات بیوی کے پاس رہنے کا حکم دیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ استدلال سن کر بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ: یہ (استدلال) میرے لئے پہلے (ذہانت) سے بھی زیادہ تعجب انگیز ہے، چنانچہ اسی وقت ان کو بصرہ کا قاضی بنا کر بھیج دیا "أن عمر بن الخطاب بعث كعب بن سور على قضاء البصرة"(۲)

(۱) کنزالعمال: حقوق متفرقة، حدیث: ۴۵۹۱۶

(۲) طبقات ابن سعد: کعب بن سور: ۷/ ۹۲، دارصادر، بیروت

فتنہ سے اجتناب

کعب بصرہ جانے کے بعد حضرت عمر ؓ اور حضرت عثمان ؓ کے زمانہ میں نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتے رہے، حضرت عثمان ؓ کی شہادت کے بعد جب حضرت عائشہ ؓا اور حضرت علی ؓ میں اختلاف رونما ہوا اور حضرت عائشہ ؓا حضرت علی ؓ سے مقابلہ کی تیاری کے لئے طلحہ ؓ اور زبیر ؓ کے ساتھ بصرہ آئیں تو کعب اس خانہ جنگی سے اپنے کو محفوظ رکھنے کے لئے ایک گھر میں خلوت نشیں ہوگئے اور کھانے کا سامان لینے کے لئے اس میں ایک سوراخ کرلیا، لوگوں نے حضرت عائشہ ؓا سے عرض کیا: اگر کعب آپ کے ساتھ ہوجائیں تو پورا قبیلہ ازد آپ کے ساتھ ہوجائے گا، یہ سن کر آپ کعب کے پاس تشریف لے گئیں اور باہر سے پکار کر کعب سے گفتگو کرنی چاہی، انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا، آخر میں حضرت عائشہ ؓا نے فرمایا: کعب کیا میں تمہاری ماں نہیں ہوں اور تم پر میرا حق نہیں ہے، یہ سن کر کعب جواب دینے پر مجبور ہوئے اور حضرت عائشہ ؓا سے گفتگو کی، انہوں نے فرمایا: میں چاہتی ہوں کہ تم لوگوں کو سمجھا کر اصلاح کی کوشش کرو، اس حکم کی تعمیل میں کعب کو کیا عذر ہوسکتا تھا، چنانچہ وہ قرآن لے کر لوگوں کو سمجھانے کے لئے نکلے اور دونوں فریق کو سمجھاتے تھے اور قرآن کی طرف بلاتے تھے۔

وفات

لیکن یہ معاملہ افہام وتفہیم سے بہت آگے بڑھ چکا تھا، اس لئے ان کی کوششیں بے کار ثابت ہوئیں اور جنگ شروع ہوگئی اور یہ اپنا فرض ادا کرتے ہوئے کسی شقی کے تیر سے ہلاک ہوگئے "فَجَاءَ سَهْمٌ غَرْبٌ فَقَتَلَهُ"۔(۱)

(۳) أیاس بن معاویہ

نام ایاس، کنیت ابو واثلہ، نسب اس طرح ہے کہ ایاس بن معاویہ بن قرۃ بن

(۱) طبقات ابن سعد: کعب بن ثور: ۷/۹۳، دار صادر، بیروت

ایاس بن ہلال بن رئاب بن عبیدہ بن سواۃ بن ساریہ بن ذبیان بن ثعلبہ بن سلیم بن اور بن قریبہ مزنی۔

فضائل وکمالات

ایاس اس دور کے مشہور قضاۃ میں سے تھے، فقہ ان کا خاص فن تھا اس میں ان کے امتیازی اور خصوصی درجہ کی وجہ سے عجلی ان کو فقیہ لکھتے ہیں، اپنی فقہی کمال کی وجہ سے وہ اموی دور میں بصرہ کے عہدہ قضاء پر مامور ہوئے، ان کے تقرر کے وقت حضرت حسن بصری ؒ ان کے پاس تشریف لے گئے، انہیں دیکھ کر ایاس رونے لگے "لَمَّا اسْتَقْضَى إِيَاسٌ أَتَاهُ الْحَسَنُ فَبَكَى إِيَاسٌ"۔(۱)

ایاس کو فہم وفراست، ذکاوت ودور اندیشی سے بھی وافر حصہ ملا تھا، وہ عقل ودانش کے مجسم پیکر تھے، ابن سعد ان کی فراست اور ذکاوت کے تعلق سے لکھتے ہیں کہ: "كَانَ عَاقِلاً مِنَ الرِّجَالِ فَطِنًا"۔(۲) ابن سیرین کے سامنے جب ان کا ذکر آتا تو فرماتے کہ: ''وہ مجسم فہم ہیں "إِنَّهُ فَهِمٌ"۔(۳) ان کے عہد کے لوگ کہتے تھے کہ ہر صدی میں ایک بڑا عاقل پیدا ہوتا ہے اور اس صدی کے عاقل ایاس ہیں "يُولَدُ فِي كُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ رَجُلٌ تَامُّ الْعَقْلِ، فَكَانُوا يَرَوْنَ إِيَاسَ بْنَ مُعَاوِيَةَ مِنْهُمْ"۔(۴) ابن عماد حنبلی لکھتے ہیں کہ: ان کی ذکاوت اور فطانت ضرب المثل تھی، ابوتمام کا شعر ہے:

إِقْدَامُ عُمَرٍ وَفِي شُجَاعَةِ عَنْتَرَ
فِي حُلْمِ أَحْنَفِ فِي ذَكَاءِ آيَاسِ(۵)

(۱) طبقات ابن سعد: إیاس بن معاویہ: ۷/۲۳۴، دار صادر، بیروت
(۲) طبقات ابن سعد: إیاس بن معاویہ: ۷/۲۳۴، دار صادر، بیروت
(۳) تہذیب التہذیب: حرف الألف، ۳/۳۸۳، مطبعۃ دائرۃ المعارف النعمانیۃ
(۴) تہذیب التہذیب: حرف الألف، ۳/۳۸۳، مطبعۃ دائرۃ المعارف النعمانیۃ
(۵) وفیات الأعیان: أبو تمام: ۲/۱۵، دار صادر، بیروت

قضاء اور فراست کے واقعات

قضاء میں مہارت بڑی حدتک ذہانت وفطانت پر موقوف ہوتی ہے، اس لئے ایاس اس دور کے ممتاز ترین قضاۃ میں شمار کئے جاتے تھے، ان کی دوراندیشی ان کی فراست وذکاوت کے یہ واقعات ملاحظہ کیجئے۔

☆ مجاہد بن سعید کہتے ہیں کہ: میں نے شعبی سے پوچھا کہ یہ بات ضرب المثل ہے کہ قاضی شریح لومڑی سے بھی زیادہ چالاک اور حیلہ باز ہیں، اس کی اصل کیا ہے؟ انہوں نے مجھے اس کی وجہ بیان کی کہ شریح طاعون کے زمانہ میں نجف کی طرف چلے گئے اور جب یہ نماز پڑھنے کے لئے کھڑے ہوئے تو ایک لومڑی ان کے سامنے آکر کھڑی ہوجاتی اور ان کا دھیان بٹاتی، جب اس پر عرصہ گذر گیا تو انہوں نے یہ ترکیب کی کہ ایک بانس کا ڈھانچا بنا کر اس کو اپنی قمیص پہنادی، آستین باہر کردی اور اپنی ٹوپی اڑھا کر اس پر باندھ دیا، جب لومڑی اپنی عادت کے مطابق آکر کھڑی ہوگئی تو شریح نے پیچھے سے آکر دفعتہ اس کو پکڑ لیا، اسی بناء پر کہا جاتا ہے کہ شریح لومڑی سے بھی زیادہ چالاک اور حیلہ باز ہیں "هُوَ أَدْهٰى مِنَ الثَّعْلَبِ وَأَحْيَلُ"۔ (۱)

☆ عمر بن ہبیرہ نے ایاس بن معاویہ کو بلایا اور پوچھا: آپ قرآن پڑھ سکتے ہیں؟ ایاس بن معاویہ نے کہا: ہاں، عمر بن ہبیرہ نے کہا: فرائض کا آپ کو علم ہے؟ ایاس بن معاویہ نے کہا: ہاں، عمر بن ہبیرہ نے کہا: عجم کی تاریخ سے آپ کو دلچسپی ہے؟ ایاس نے کہا: پڑھ رکھی ہے، عمرو بن ہبیرہ نے کہا: عرب کی تاریخ پڑھی ہے، قاضی ایاس نے کہا: ہاں پڑھی ہے، عمر بن ہبیرہ نے کہا: میری تمنا ہے کہ آپ کو اپنے ساتھ بحیثیت معاون مقرر کروں، ایاس نے کہا: میرے اندر تین خصلتیں ہیں اور ان تینوں کے ہوتے ہوئے میں منصب قضا کے لئے مناسب نہیں ہوسکتا۔ عمرو بن ہبیرہ نے کہا: وہ تین خصلتیں کیا ہیں؟

(۱) تاریخ دمشق: ۴۸/۲۳، دارالفکر، بیروت

ایاس نے کہا: پہلی خصلت تو یہ ہے کہ میں بدصورت ہوں جو آپ دیکھ رہے ہیں، دوسری یہ ہے کہ میرے اندر حدّت (تیز مزاجی) ہے اور تیسری یہ ہے کہ میں اس ذمہ داری کے نبھانے سے عاجز ہوں۔

عمرو بن ہبیرہ نے کہا: آپ بدصورت ہیں تو مجھے کوئی لوگوں کے سامنے بازار حسن قائم کرنا نہیں ہے، "وَأَمَّا الدَّمَامَةُ لَا أُرِيْدُ أَنْ أُحَاسِنَ بِكَ"، آپ اپنی عاجزی کی بات کررہے ہیں مگر میں سمجھتا ہوں آپ تکلف سے کام لے رہے ہیں، ورنہ آپ منصبِ قضا کے لئے بالکل موزوں ہیں اور جہاں تک آپ کی حدّت اور گرم مزاجی کا سوال ہے تو کوڑا آپ کو درست کردے گا، جایئے میں نے آپ کو قاضی بنادیا۔

پھر عمر بن ہبیرہ نے قاضی ایاس بن معاویہ کو سو درہم عطا کئے، یہ ان کی زندگی کی پہلی کمائی تھی۔ (۱)

☆ دوسرا واقعہ یہ ہے کہ ایک شخص نے ایک شخص کے پاس کچھ مال امانت رکھوایا تھا، جب اس نے واپس مانگا تو امانت دار نے انکار کردیا، مال کے مالک نے ایاس کی عدالت میں دعوی کیا، انہوں نے کہا: اس وقت لوٹ جاؤ، اس واقعہ کو پوشیدہ رکھنا، اس شخص کو یہ معلوم نہ ہونے پائے کہ تم میرے پاس آئے تھے، دو دن کے بعد پھر آنا، اس کو لوٹا کر ایاس نے امانت دار کو بلوایا اور اس سے کہا: میرے پاس بہت سی مال آگیا ہے، میں اس کو تمہارے پاس رکھوانا چاہتا ہوں، تمہارا گھر محفوظ ہے، اس نے کہا: ہاں، ایاس نے کہا: تو مال رکھنے کے لئے کسی جگہ کا انتخاب کرلو، اور دو باربردار لے کر آؤ، اس گفتگو کے بعد ایاس نے مال کے مالک کو بلوا کر کہا کہ: اب جا کر تم اس شخص سے اپنا مال مانگو اگر دے دے تو فبہا ورنہ اسکو کہنا کہ میں جا کر قاضی کو اطلاع کردوں گا، اس شخص نے جا کر کہا کہ: میرا مال دو، ورنہ میں قاضی کو جا کر اطلاع دوں گا، یہ سن کر اس نے کل روپیہ واپس کردیا

(۱) تاریخ دمشق لابن عساکر: إیاس بن معاویہ: ۲۵/۱۰، دار الفکر للطباعۃ والنشر

اور صاحب مال نے آ کر قاضی کو اطلاع دے دی کہ میرا مال مجھ کو مل گیا، اس کے بعد سابق قرارداد کے مطابق وہ ایاس کے پاس روپیئے لینے کے لئے آیا، انہوں نے اس کو ڈانٹ کر نکال دیا: "وَجَاءَ الأَمِيْنُ إِلىٰ إِيَاسٍ لِمَوْعِدِهِ فَزَجَرَهُ وَأَشْهَرَهُ، وَقَالَ: لاَ تَقْرَبِيْنَ يَا خَائِنُ" (۱)

☆ دو شخص قاضی ایاس کے یہاں اپنی دو چادروں کے سلسلے میں مقدمہ لے کر آئے، ان میں ایک چادر سرخ تھی اور ایک ہری، ان میں سے ایک شخص نے کہا: میں حوض میں غسل کرنے کے لئے چلا گیا اور اپنی چادر اوپر رکھ چھوڑا، اور یہ شخص آیا اور اس نے اپنی چادر بھی میری چادر کے بازو رکھی اور وہ بھی غسل کرنے کی غرض سے حوض میں داخل ہو گیا اور یہ پہلے نکل کر میری چادر لے کر چلتا بنا، میں حوض سے نکل کر اس کا پیچھا کرتا ہوا چلا، اس کا خیال یہ ہے کہ یہ چادر اسی کی تھی، تو قاضی ایاس نے کہا: تمہاری یہاں کوئی دلیل اور بینہ ہے، اس نے کہا: نہیں، تو انہوں نے ایک کنگھا منگوایا اور اس سے دونوں کے سروں میں کنگھی کی، ان میں سے ایک کے سر سے سرخ اون برآمد ہوا اور دوسرے کے سر سے ہرا اون، تو جس کے سر سے سرخ اون نکلا اس کے حق میں سرخ چادر کا فیصلہ کیا اور جس کے سر سے ہرا اون نکلا اس کے حق میں ہری چادر کا فیصلہ دیا "فَقَضَى بِالْحَمْرَاءِ لِلَّذِيْ خَرَجَ مِنْ رَأْسِهِ صُوْفٌ أَحْمَرُ، وَبِالْخَضْرَاءِ لِلَّذِيْ خَرَجَ مِنْ رَأْسِهِ صُوْفٌ أَخْضَرُ" (۲)

☆ ابراہیم بن مرزوق بصری کہتے ہیں کہ: ہم ایاس کے عہدہ قضاء پر مامور ہونے سے پہلے ہی سے ان کی ذہانت اور فطانت کو نوٹ کیا کرتے تھے، کہتے ہیں کہ ایک شخص آیا اور اونچی جگہ پر بیٹھ گیا اور راہ تکنے لگا، پھر ایک شخص کو دیکھ کر اپنی جگہ سے نیچے اتر آیا اور اس کو بغور دیکھ کر پھر اپنی جگہ لوٹ آیا، ایاس بن معاویہ کے ہم

(۱) الطرق الحكمية: فصل في الحكم بالفراسة: ۱/۲۵، مكتبة دار البيان
(۲) أخبار القضاة: ما حفظناه من قضايا إياس بن معاوية وفقهه: ۱/۳۳۹

نشینوں اور مصاحبوں نے کہا: اس آدمی کے متعلق آپ کا کہنا ہے، یہ کوئی ضرورت مند معلوم ہوتا ہے، ایاس نے کہا: یہ بچوں کا معلم ہے اور اس کا کانا غلام کھو گیا ہے اور یہ اس کو تلاش کر رہا ہے، اس سے انہوں نے معلوم کیا تو ایسا ہی پایا، ان لوگوں نے ایاس سے پوچھا: تم نے کیوں کر اس کو اس کے مقصد کو جانا تو ایاس نے کہا: جب اس نے اپنے بیٹھنے کے لئے اونچی جگہ تلاش کی تو میں سمجھ گیا کہ یا تو یہ بادشاہ ہو سکتا ہے اور اس کی حیثیت بادشاہ کی سی نہ تھی یا بچوں کا معلم اور استاذ ہو سکتا ہے اور یہ جب راستہ اور آنے جانے والوں کو تک رہا تھا تو میں نے غور کیا اور اچانک اپنے غلام کے مشابہ آدمی پر اس کی نظر پڑی تو اس نے اس کی آنکھوں کی کھوج شروع کی تو میں نے اندازہ لگایا کہ اس کا اندھا غلام کھو گیا ہے "فَعَلِمْتُ أَنَّهُ نَظَرَ فِيْ وَجْهِهِ إِلىٰ عَيْنَيْهِ، فَعَلِمْتُ أَنَّ غُلاَمَهُ أَعْوَرُ قَدْ ذَهَبَتْ إِحْدَى عَيْنَيْهِ" (۱)

☆ قاضی ایاس کہتے ہیں کہ: میں صرف ایک آدمی سے مغلوب ہو گیا، واقعہ یہ ہے کہ میں بصرہ کی عدالت میں تھا، اتنے میں ایک آدمی میرے پاس بحیثیت گواہ حاضر ہوا اور گواہی دی کہ فلاں باغیچہ کا مالک فلاں آدمی ہے، میں نے اس گواہ کو جانچنا چاہا کہ وہ جس بات کی گواہی دے رہا ہے اس کی جانکاری اس کو کہاں تک ہے، چنانچہ میں نے پوچھا: اس باغیچے میں کتنے درخت ہیں؟ گواہ بولا: میرے آقا قاضی صاحب اس عدالت میں کتنے برسوں سے منصبِ قضاء کی ذمہ داری ادا کر رہے ہیں؟۔ میں نے گھبرا کر کہا: اتنے برسوں سے۔ گواہ بولا: اس چھت کی کڑیوں کی تعداد کتنی ہے؟ گواہ کے سوال کا مقصد میں سمجھ گیا اور کہا: حق تمہارے ساتھ ہے، جاؤ میں نے تمہاری شہادت قبول کی۔ (۲)

☆ قاضی ایاس بن معاویہ کی ذہانت اور فطانت کے چرچے تھے، عدالت میں بیٹھتے تو

(۱) تاریخ دمشق: ایاس بن معاویة: ۱۰/۳۳
(۲) سنہرے فیصلے: عبد المالک مجاہد: ۱۴۱

ایسے شاندار اور بے لاگ فیصلے کرتے کہ لوگ ششدر اور حیرت زدہ رہ جاتے ، تاریخ نے ان کے فیصلوں کے حوالے سے متعدد واقعات بیان کئے ہیں، بڑی شخصیات کے جہاں بہت سارے مداح اور عزت وتوقیر کرنے والے ہوتے ہیں وہیں حاسدین کی بھی ایک بڑی ٹولی ہوتی ہے، چنانچہ کچھ لوگوں کی بڑی تعداد وہ بھی ہوتی ہے جو ان سے حسد اور جلن کرتے ہیں اور ہر وقت ان کی کوشش یہ ہوتی ہے ان کی سبکی اور خست کا موقع ہاتھ آجائے ، چنانچہ وہ ان کے عیوب تلاش کرنا شروع کی، تاکہ ان کی شخصیت داغدار ہوجائے۔

خاصی تگ ودو کے بعد ان کو ایک بات ہاتھ لگی کہ قاضی ایاس فیصلہ کرنے میں بہت جلد بازی کرتے ہیں، یقیناً یہ ایک بڑا عیب ہے جو قاضی کے شان کے منافی ہے، سنجیدگی اور متانت کا تقاضا یہ ہے کہ فیصلہ کرنے سے پہلے خوب غور وفکر کیا جائے اور اس کے بعد فیصلہ سنایا جائے ان حاسدین نے ان کے بارے میں لوگوں میں یہ شوشہ چھوڑ دیا اور رفتہ رفتہ عوام میں یہ بات مشہور ہوتی گئی کہ قاضی صاحب فیصلہ کرنے میں بڑے جلد باز ہیں۔

ادھر قاضی ایاس بن معاویہ کو بھی حاسدین کی چہ میگوئیوں کے بارے میں معلوم ہوگیا، انہوں نے بھی حاسدین کو سبق سکھانے کا فیصلہ کیا۔

قاضی ایاس نے نہایت ادب سے ان لوگوں کو مجلس میں بلایا، ان کی خوب آؤ بھگت کی ، ان کو خوب کھلایا پلایا اور پھر گفتگو شروع کی ، اس دوران اچانک انہوں نے اپنے ہاتھ کو بلند کیا اور کہنے لگے: ذرا بتانا ان انگلیوں کی تعداد کتنی ہے؟ حاضرین مجلس نے ایک نظر ان کے ہاتھ پر ڈالی اور ایک زبان ہوکر کہا: پانچ ہیں، پوری پانچ ۔قاضی ایاس نے ان کی طرف تبسم بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا کہ: ساتھیو! تم نے جواب دینے میں اس قدر جلدی کیوں کی، تم ایک دو تین چار پانچ تک گن کر تھوڑی دیر انتظار کرتے ، غور کرتے اور قدرے توقف کے بعد جواب دیتے ؟ وہ کہنے لگے : قاضی صاحب ! اس میں انتظار اور توقف کی کیا ضرورت ہے؟ جس چیز کی گنتی ہمیں معلوم ہو، بھلا اس میں توقف کیوں کریں؟ اب قاضی ایاس نے نہایت اطمینان اور سکون کے ساتھ ان سے

کہنا شروع کیا: جب میرے پاس مقدمات آتے ہیں، میں فریقین کی بات سننے کے بعد فوراً ہی معاملے کی تہہ تک پہنچ جاتا ہوں تو پھر فیصلہ سنانے میں کیوں توقف کروں؟ اب قاضی ایاس نے اس مثال سے معترضین کو جواب دیا، اس طرح حاسدین کی چال ناکام ہوگئی اور انہیں منہ کی کھانی پڑی، اور انہیں معلوم ہوا کہ وہ فیصلہ کرنے میں عجلت اور جلد بازی سے کام نہیں لیتے؛ بلکہ وہ اپنی خداداد ذہانت وفطانت کی بدولت بجلد معاملہ کی تہہ تک پہنچ جاتے ہیں اور بغیر کسی تاخیر کے مقدمہ کا فیصلہ کردیتے ہیں۔

☆ ایک آدمی نے حکومت کے ایک بڑے عہدیدار کے پاس ایک تھیلی بطور امانت رکھوائی اور بتایا کہ یہ دیناروں سے بھری ہوئی ہے اور خود ایک طویل مدت تک غائب رہا، جب امانت رکھوانے والا شخص طویل عرصہ اعلی افسر کے پاس نہ آیا تو اس نے ایک چال چلی، وہ یہ کہ اس نے تھیلی کے نچلے حصہ سے نہایت احتیاط کے ساتھ ڈوری کاٹ دی اور اس میں سے سارے دینار نکال کر اس کی جگہ درہم رکھ دیئے، پھر تھیلی کو اسی طرح سی دیا جیسی پہلے تھی، صاحب مال پندرہ سال کے بعد اس اعلیٰ افسر کے پاس آیا اور اس نے بطور امانت رکھوائی ہوئی اپنی تھیلی طلب کی، افسر نے صاحب مال کو اس کی تھیلی واپس کردی جو اس طرح سربمہر تھی جس طرح اس نے پندرہ سال قبل امانت رکھوائی تھی ۔جب صاحب مال نے تھیلی کھولی تو اس میں دینار کے بجائے درہم تھے، وہ یہ دیکھ کر جھنجھلا اٹھا اور بولا یہ تھیلی میری نہیں ہے ، میری تھیلی میں دینار تھے، جب کہ اس میں درہم ہیں ، مجھے اپنی دیناروں والی تھیلی چاہیئے ۔عہدے دار نے کہا: بھئی ! غور سے دیکھو، تھیلی وہی ہے جو تم نے میرے پاس رکھوائی تھی، آج تک یہ سربند ہے، یہی تھیلی تمہاری ہے ، میں نے تمہیں کوئی دھوکا نہیں دیا ہے، ادھر وہ شخص اس سے اصرار کرتا رہا کہ مجھے دینار چاہیئے، میری تھیلی وہ ہے جس میں دینار تھے، جب بات نہیں بنی تو صاحب مال نے اس وقت کے امیر عمر بن ہبیرہ کے پاس مقدمہ دائر کردیا، عمر بن ہبیرہ نے قاضی ایاس بن معاویہ کے پاس مقدمہ بھیج دیا۔قاضی ایاس نے صاحب مال

سے پوچھا: نوعیت مقدمہ بیان کرو؟ صاحب مال نے عرض کیا: میں نے اس عہدہ دار کے پاس دیناروں کی تھیلی بطور امانت رکھوائی تھی، مگر یہ مجھے درہموں کی تھیلی دے رہا ہے، قاضی ایاس نے پوچھا: کتنا عرصہ پہلے؟ صاحب مال نے جواب دیا: پندرہ برس پہلے۔ اب قاضی ایاس اس عہدے دار کی طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا: تم کیا کہتے ہو؟ عہدے دار نے کہا: اس کی تھیلی سربمہر رکھی ہوئی ہے، قاضی ایاس نے پوچھا: کتنے برسوں سے؟ عہدے دار نے کہا: پندرہ برسوں سے۔ قاضی ایاس نے خادموں کو حکم دیا کہ اس تھیلی کا بندھن کھول کر اس کے دراہم بکھیر دو، خادموں نے حکم کی تعمیل کی اور تھیلی کے پورے دراہم بکھیر دیئے، بکھرے ہوئے دراہم میں کچھ تو دس سال پرانے سکے تھے اور کچھ پانچ سال پرانے اور کچھ اس کے آگے پیچھے سالوں کے سکے تھے، قاضی ایاس نے عہدیدار سے مخاطب ہوئے، تم نے اقرار کیا ہے کہ یہ تھیلی تمہارے پاس پندرہ سال سے تھی اور اس تھیلی کے اندر دس پانچ سال پرانے سکے بھی ہیں، اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ تھیلی اس پندرہ سالہ مدت میں کبھی کھلی ضرور ہے، اور اس وقت دیناروں کو دراہم سے بدلا گیا ہے قاضی ایاس کی دلیل نے مجرم کو اقرار جرم پر مجبور کر دیا اور بالآخر عہدے دار نے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا "فَأَقَرَّ بِالدَّنَانِيرِ فَأَلْزَمَهُ إِيَّاهَا"۔(۱)

☆ کسی شعبہ اور صنف کے اشخاص کا اس شعبہ سے متعلق ایک کمال یہ بھی ہے کہ وہ اپنے ہم پیشہ اشخاص کی خصوصیات پر پوری نظر رکھتا ہو، ایاس اس عہد کے تمام مفتیوں اور قضاۃ کے محاسن و معائب سے خوب واقف تھے، حبیب بن اشہد کا بیان ہے کہ ایک شخص ایاس کے پاس ایک مقدمہ میں مشورہ کے لئے آیا کہ وہ اس میں کس کی طرف رجوع کرے تو انہوں نے کہا کہ: اگر تم اس کا صحیح فیصلہ چاہتے ہو تو عبدالملک بن یعلی کے پاس جاؤ، وہ صحیح معنوں میں قاضی ہیں، اور اگر محض فتوی لینا ہے تو حسن بصری کے پاس جاؤ، وہ میرے اور میرے باپ کے استاذ ہیں، اور اگر صلح

(۱) تاریخ دمشق: ۱۰/ ۳۳، دار الفکر للطباعۃ والنشر

مقصود ہے تو حمید الطویل کی طرف رجوع کرو، وہ اس طریقہ سے صلح کرادیں گے کہ تم سے کہیں گے کہ: تم اپنے حق کا کچھ حصہ لے لو اور کچھ چھوڑ دو اور اگر مقدمہ بازی کرنا ہے تو صالح الدوسی کے پاس جاؤ وہ تم کو رائے دیں گے کہ دوسرے کے حق سے بالکل انکار کر دو، اپنے حق سے زیادہ کا مطالبہ کرو اور جو لوگ موجود نہیں ہیں ان کو گواہ بناؤ "اِجْحَدْ مَا عَلَيْكَ وَادَّعِ مَا لَيْسَ لَكَ وَادَّعِ بَيِّنَةً غُيَّبًا"۔(۱)

☆ ایک مرتبہ قاضی ایاس بن معاویہ کی عدالت میں دو شخص آئے، ایک نے دعوی کیا کہ میں نے اپنے دوست کے ہاں اپنا مال امانت رکھا تھا، جب واپس لینے آیا تو اس نے انکار کر دیا کہ میرے ہاں تمہاری کوئی امانت نہیں ہے، قاضی ایاس اس کے دوست سے امانت کے بارے میں پوچھا: اس شخص نے انکار کر دیا اور کہا کہ: میرے دوست کے ہاں اگر کوئی گواہ ہو تو پیش کرے ورنہ میں قسم کھانے کے لئے تیار ہوں کہ اس کی کوئی امانت میرے ہاں نہیں ہے، قاضی ایاس نے محسوس کیا کہ مدعی علیہ جھوٹ بول رہا ہے اور شرعی حجت کا سہارا لے کر اپنے دوست کا مال ہضم کرنا چاہتا ہے، فیصلہ میں جلدی نہ کی، کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کیں اور مدعی سے کہا: تم نے اپنا مال اپنے دوست کو کس مقام پر حوالہ کیا تھا، اس نے کہا: فلاں مقام پر میں نے اس کو دیا ہے، قاضی ایاس نے پوچھا کہ: اس مقام کی کوئی خاص علامت ہے؟ مدعی نے کہا: ہاں وہاں ایک بڑا درخت تھا، جس کے سایہ میں ہم دونوں نے پہلے کھانا کھایا، پھر جب چلنے لگے تو اپنا مال اس کے حوالہ کر دیا، قاضی ایاس نے کہا: اس وقت تم اس درخت کے پاس جاؤ، ممکن ہے کہ تمہیں اصلی واقعہ یاد آجائے کہ اپنے اس دوست کے علاوہ کسی اور شخص کو مال دیا ہو یا اس جگہ کوئی اور معاملہ ہوا ہو جو تم بھول رہے ہو، لہٰذا فوری اس مقام پر پہنچو اور وہاں بیٹھ کر غور کرو اور جو بات یاد آجائے واپس آ کر عدالت برخواست ہونے سے پہلے مجھ کو

(۱) اخبار القضاۃ: ما حفظنا من أخبار بن معاویۃ: ۱/ ۳۵۰، المکتبۃ التجاریۃ بمصر

اطلاع کر دینا، یہ سن کر وہ شخص تیزی سے چلا گیا، ادھر قاضی ایاس دوسرے مقدمات میں مشغول ہو گئے اور مدعی علیہ عدالت میں بیٹھا رہا، اس عرصہ میں قاضی ایاس کبھی کبھی مخفی طور پر اس کو کن انکھیوں سے دیکھ لیا کرتے تھے، جب یہ اطمینان ہو گیا کہ مدعی علیہ غافل ہو گیا ہے تو اچانک اس کی طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا کہ کیا تمہارا وہ دوست اس مقام پر پہنچ گیا ہوگا؟ اس اچانک سوال پر مدعی علیہ بغیر سوچے سمجھے فورا بول پڑا کہ انہیں وہ مقام تو یہاں سے بہت دور ہے، بس قاضی ایاس نے دفتر بند کر دیا اور غضبناک انداز میں کہا: اے اللہ کے دشمن! تجھ کو امانت کا انکار ہے؛ لیکن اس مقام کا علم ہے جہاں امانت حوالہ کی گئی تھی، اللہ کی قسم! تو جھوٹا اور خیانت کار ہے، اس غیر متوقع فہمائش پر مدعی علیہ کے ہوش وحواس گم ہو گئے او روہ مجبور ہو گیا کہ امانت کا اقرار کر لیا جائے، آخر کار خیانت کا اقرار کر ہی لیا، قاضی ایاس نے اس کو قید کر دیا، جب اس کا ساتھی واپس آ گیا تو اس کا مال حوالہ کر دیا گیا، اس طرح قاضی ایاس نے اپنے خداداد ذہانت سے ایک ایسا مقدمہ حل کر دیا جس کے اسباب معدوم تھے اور حق والا حق سے محروم ہو رہا تھا۔(۱)

۱۲۰ھ میں وفات پائی، اور ان کی عمر اس وقت ۷۶ سال تھی۔

(۴) شَرِیک بن عبداللہ النخعی

ان کا نام شریک اور ابو عبداللہ کنیت تھی، یمن کے قبیلہ بنو مدحج کی ایک بڑی شاخ بنوالنخع سے نسبی تعلق رکھنے کے باعث نخعی کہلاتے ہیں۔ ان کی ولادت خراسان کے مشہور مردم خیز شہر بخارا میں ۹۵ھ میں ہوئی، بنوالنخع بعد طلوع اسلام کے یمن سے کوفہ آ کر آباد ہو گئے، اس لئے قاضی شریک بھی تا حیات کوفہ ہی میں رہے، ان کا خاندان علم وفضل کے اعتبار سے نہایت بلند مقام رکھتا تھا، امام ابراہیم نخعی جیسے جلیل القدر تابعی اسی گلستان فضل ودانش کے ایک گل سر سبز تھے۔

(۱) سیرت التابعین بحوالہ: عدل وانصاف کے حیرت انگیز واقعات: ۴۷

عملی لیاقت اور علوّ مرتبت

قاضی شریک کو فضل وکمال خاندانی ورثہ میں ملا تھا، فقہ وحدیث میں ان کی مہارت مسلّم تھی، اس کے علاوہ فہم ودانش، ذہانت وفطانت سے بھی بہرہ وافر پایا تھا، سلاطین وقت ان کے اکرام وتعظیم میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے تھے، کوئی علماء حدیث کی مرویات کا ان سے بڑا واقف اس وقت نہ تھا۔(۱) ابن خلکان نے لکھا ہے کہ وہ عالم، فقیہ، ذی فہم، ذہین اور فطین تھے "كَانَ عَالِمًا فَهِيْمًا ذَكِيًّا"(۲) علامہ ذہبی نے بھی ان کو کثیر الروایہ اور بلند پایہ محدث قرار دیا ہے۔

فقہ میں بھی غیر معمولی کمال حاصل تھا اور اسی باعث وہ ایک طویل زمانہ تک واسط، اہواز اور کوفہ میں مسند عدل وانصاف کی زینت بنے رہے، علماء نے ان کے علم وفضل کا اعتراف کرتے ہوئے کمال تفقہ کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے۔

عہدۂ قضا

فقہ وفتاوی میں ان کے کمال تبحر کی وجہ سے بہت سے سلاطین نے انہیں اپنے زمانہ خلافت میں قضاء کے عہدۂ جلیلہ پر فائز کیا، سب سے پہلے خلیفہ منصور نے ۱۵۳ھ میں انہیں کوفہ کا قاضی مقرر کیا اور پھر کچھ عرصہ کے بعد معزول کر دیا، اس کے بعد جب مہدی مسند خلافت پر جلوہ افروز ہوا تو اس نے قاضی شریک کو دوبارہ اس منصب پر مامور کیا "فَعَزَلَهُ مُوْسَى الْهَادِيْ"(۱) مؤرخ ابن خلکان نے اہواز کے قاضی ہونے کا بھی ذکر کیا ہے۔(۲)

عدل پروری

قاضی شریک کی کتابِ زندگی کا اصل باب ان کے زمانۂ قضا کا کردار وعمل ہے، وہ

(۱) میزان الاعتدال: شریک بن عبداللہ النخعی: ۲/۲۷۰، دار المعرفة للطباعة والنشر، بیروت

(۲) وفیات الأعیان: القاضی شریک النخعی: ۲/ ۴۶۴، دار صادر، بیروت

(۳) الاعلام: شریک بن عبداللہ: ۳/ ۱۶۳

(۴) وفیات الأعیان: القاضی شریک النخعی: ۲/ ۴۶۴، دار صادر، بیروت

اس عظیم آزمائش سے بھی بڑی خوبی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے، اس پوری مدت میں عدل پروری، انصاف پسندی اور غیر جانبداری کی ایسی مثالیں قائم کیں کہ یہ تاریخ کا مستقل اور روشن باب ہے۔

خود قاضی صاحب کے زبانی یہ واقعہ لکھا ہے کہ:

☆ جب خلیفہ منصور نے مجھے کوفہ کا قاضی مقرر کیا تو میں وہاں گیا، والی کوفہ محمد بن سلیمان کا کاتب حماد بن موسی کسی قضیہ میں ماخوذ ہو کر میرے سامنے پیش ہوا، میں نے دلائل وشواہد کی بنیاد پر فیصلہ صادر کر کے جیل بھیج دیا، ایک دن ناگاہ مجھے خبر ملی کہ حاکم نے اسے رہا کر دیا ہے، میں نے سوچا کہ یہ پہلا موقع ہے، اگر اس بار ہی میں نے کمزوری کا ثبوت دیا تو پھر حالات پر قابو حاصل کرنا مشکل ہوگا۔

چنانچہ میں فوراً محمد بن سلیمان کے پاس پہنچا اور نہایت درشت لب ولہجہ میں کہا کہ: تمہیں تو میرے فیصلوں کے نفاذ میں مدومعاون بننا چاہئے تھا نہ کہ مخالف تم نے قید سے رہا کر کے توہین عدالت کا ارتکاب کیا ہے، بخدا اگر تم نے اسے دوبارہ قید میں نہ پہنچایا تو میں امیر المؤمنین کے سامنے تمہاری حقیقت کی پول کھول کر رکھ دوں گا، یہ رنگ دیکھ کر حاکم مذکور نے فوراً اپنے کاتب کو قید خانہ میں واپس کر دیا "فَرَدَّهُ إِلَى الْحَبْسِ"۔(۱)

☆ کوفہ میں نہر فرات کے کنارے ایک خوبصورت باغ تھا جس کا مالک کوفہ کا ایک شخص تھا، اس باغ کے ساتھ ہی کوفہ کا گورنر موسی کا محل تھا، موسی کی خواہش تھی کہ کسی طرح یہ باغ خرید لے تاکہ اس کا محل کھلا اور کشادہ ہو سکے، چنانچہ اس نے اس کے مالک کو پیش کش کی کہ وہ باغ اسے فروخت کر دے مگر اس نے انکار کر دیا۔ کچھ عرصہ گذرا، وہ شخص فوت ہو گیا، اس کے ورثاء میں چند بیٹے اور ایک بیٹی تھی، اب موسیٰ بن عیسیٰ نے ورثاء کو دوبارہ پیش کش کی کہ وہ باغ خریدنا چاہتا ہے اور اس کے لئے خطیر رقم بھی پیش کی، لڑکوں نے اپنا حصہ بیچنے پر رضامندی

(۱) أخبار القضاة: شريك بن عبدالله النخعي: ۱۵۱/۳، المكتبة التجارية بمصر

ظاہر کر دی، مگر بیٹی نے اپنا حصہ بیچنے سے انکار کر دیا، اس نے اپنی حصہ کے ارد گرد دیوار تعمیر کر دی، وہ تمام ترغیبات کے باوجود اس کے حصہ کو فروخت کرنے پر آمادہ نہ ہوئی، گورنر نے ایک دن اپنے نوکروں کو حکم دیا جنہوں نے دیوار کو گرا کر اس زمین کو محل میں شامل کر دیا، ادھر اس لڑکی نے گورنر کوفہ موسی بن عیسی کے خلاف قاضی شریک کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا۔ قاضی شریک نے گورنر کو حاضر عدالت ہونے کا حکم دیا، اس نے اس کو اپنی سبکی اور بے عزتی تصور کرتے ہوئے اس نے پولیس چیف کو یہ کہلا بھیجا کہ قاضی کو سمجھاؤ کہ اس نے ایک عورت کے دعوے کو بغیر کسی گواہوں کے کیسے قبول کر لیا۔ پولیس چیف حاضر عدالت ہو کر گورنر کا موقف بیان کیا، قاضی شریک نے کہا: میں نے تمہیں تو نہیں گورنر کو بلوایا تھا، اسے خود آ کر وضاحت کرنی چاہئے، تم نے اپنا مشورہ دے کر عدالت کے معاملات میں دخل اندازی کرتے ہوئے توہین عدالت کی ہے، لہٰذا تمہیں جیل جانا ہوگا، اس کے ساتھ قاضی نے عدالتی پولیس کو حکم دیا کہ پولیس چیف کو حوالات میں بند کر دیا جائے۔ گورنر کو جب پتہ چلا کہ پولیس چیف کے ساتھ کیا بیتی تو اس نے قاضی کو سمجھانے کے لئے چند معززین شہر کو روانہ کیا، چنانچہ یہ وفد قاضی کے پاس آیا، گورنر کا پیغام دیا اور اس کی ناراضگی سے آگاہ کیا۔ چنانچہ قاضی شریک نے کہا کہ عدالت کی نظر میں عام وخاص برابر ہیں؛ لہٰذا تمہیں بھی توہین عدالت کے جرم میں جیل بھجوایا جاتا ہے، یہ احوال دیکھ کر خود گورنر اپنی پولیس فورس کو لے کر سیدھا جیل گیا اور پولیس چیف سمیت تمام لوگوں کو رہا کر دیا۔ ادھر جیل کا نگراں سیدھا قاضی شریک کے پاس آیا اور سارا واقعہ کہہ سنایا، قاضی شریک نے کہا: کہ میں نے اس عہدے کی نہ تو طلب کی تھی اور نہ تمنا، یہ تو مجھے خلیفہ نے مجبور کیا تھا اور میں نے اس شرط پر اس عہدے کو قبول کیا تھا کہ میرے ہر فیصلے کو نافذ کیا جائے گا، قاضی نے اپنے کاغذات، کتب اور اپنا ذاتی سامان اکٹھا کیا، اپنی سواری پر بیٹھے اور بغداد کا رخ کیا۔

گورنر کو جب قاضی کے شہر کو چھوڑنے کی اطلاع ملی تو بڑا پریشان ہوا، اسے خوب معلوم تھا کہ اگر خلیفہ کو سارے حالات کا پتہ چل گیا تو میری گورنری ختم ہوجائے گی، چنانچہ اس نے قاضی شریک کو کوفہ کے باہر روک لیا اور ان کی بات ماننے کے لئے تیار ہوگیا، قاضی نے کہا: میں اس شرط پر تمہاری بات ماننے کے لئے تیار ہوں کہ جن لوگوں کو تم نے رہا کیا ہے ان کو دوبارہ جیل واپس بھیجنا ہوگا اور تمہیں اس عورت کے ساتھ عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہونا ہوگا۔

قاضی نے بیان سننے کے بعد فیصلہ سنایا، جو دیوار گرائی گئی ہے اسی طرح دوبارہ بنوائی جائے، عورت کی زمین واپس کی جائے اور اسے زمین فروخت کرنے پر مجبور نہ کیا جائے، گورنر کے فیصلہ تسلیم کرنے پر تمام قیدیوں کو رہا کرنے کا قاضی نے حکم دیا، دوسرے دن قاضی شریک گورنر کے دربار میں تشریف لے گئے، گورنر نے خیر مقدم کیا، اپنے ساتھ بٹھایا اور آنے کا مقصد دریافت کیا، قاضی شریک کہنے لگے: "أَيُّهَا الْأَمِيْرُ ! هَلْ تَأْمُرُنِيْ الْآنَ بِشَيْءٍ"؟ میں آپ کے پاس اس لئے آیا ہوں کہ اگر میرے لائق کوئی کام یا خدمت ہو تو اس کو حکم دیجئے، میں اسے بجالاؤں؟ گورنر نے کہا: کل تو تم نے میری سبکی کی اور آج یہ کہہ رہے تھے، قاضی شریک نے کہا: "فَذَاكَ حَقُّ الشَّرْعِ وَهَذَا حَقُّ الْأَدَبِ" جو میں نے کل کیا وہ شرعی حق تھا، نافذ کرنا میری ذمہ داری تھی، جہاں تک ادب کا تعلق ہے، آپ حاکم شہر ہیں، آپ کا احترام اور عزت کرنا بہت ضروری ہے، لہٰذا یہ ادب کا حق ہے۔(۱)

مذہبی رنگ اور دینی مزاج

قابل ذکر بات یہ ہے کہ قاضی شریک نے اس آزمائش سے محفوظ رہنے کی حتی الامکان پوری جدوجہد کی، جب بھی حاکم وقت نے ان کو بلا کر اس عہدہ کی پیشکش کی تو انہوں نے برملا اس سے اپنے آپ کو نااہل بتا کر معذوری ظاہر کردی، چنانچہ منصور عباسی نے ان سے کہا: "قَدْ وَلَّيْتُكَ قَضَاءَ الْكُوْفَةِ" یعنی میں نے آپ کو کوفہ کا قاضی مقرر

(۱) أخبار القضاۃ: شریک بن عبداللہ النخعی: ۱۷۱/۳، المکتبۃ التجاریۃ بمصر

کیا ہے تو فوراً عاجزی سے فرمایا: "يَا أَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ إِنِّيْ إِنَّمَا أَنْظُرُ فِيْ الصَّلَاةِ وَالصَّوْمِ فَأَمَّا الْقَضَاءُ فَلَا أُحْسِنُهُ" (اے امیر المؤمنین! میں تو صرف نماز روزہ ہی کے امور سے واقفیت رکھتا ہوں قضاء کی ذمہ داریوں سے باحسن عہدہ برآنہ ہوسکوں گا)۔

اسی طرح جب مہدی نے انہیں یہ منصب تفویض کرنے کے لئے بلایا تو فرمایا: "لَا أَصْلَحُ لِذٰلِكَ" یعنی میں اس کی صلاحیت نہیں رکھتا، لیکن بالآخر حکمرانوں نے جبر وزبردستی کی حد تک اصرار کیا تو وہ بادل ناخواستہ اس کو قبول کرنے پر تیار ہوگئے۔(۱)

پورے زمانۂ قضا میں ان کا یہ مستقل معمول رہا کہ مجلس عدل منعقد کرنے سے قبل دوپہر کا کھانا تناول فرماتے، پھر اپنے موزے میں سے ایک کاغذ نکال کر اسے بغور دیکھتے، اس کے بعد مقدمات کی پیشی کا حکم دیتے، ان کے بعض احباب کو تجسس پیدا ہوا کہ آخر اس کاغذ میں کیا لکھا ہے جسے روزانہ پابندی سے دیکھنے کا معمول ہے، چنانچہ انہوں نے دیکھا تو اس میں تحریر تھا:

"يَا شَرِيْكُ بْنُ عَبْدِ اللهِ أُذْكُرِ الصِّرَاطَ وَحِدَّتَهُ يَا شَرِيْكُ بْنِ عَبْدِ اللهِ أُذْكُرِ الْمَوْقِفَ بَيْنَ يَدَيِ اللهِ عَزَّوَجَلَّ"(۲)

"اے شریک بن عبداللہ! پل صراط اور اس کی باریکی کو یاد رکھو، اے شریک بن عبداللہ! اس دن کو یاد رکھو جب تم خداوند قدوس کے روبرو کھڑے ہوگے"

یہ دراصل اللہ عزوجل کے سامنے ایک حلف نامہ تھا؛ تاکہ عدالت کی کاروائی کے ہر ہر موڑ پر اس ذات کبریا کے حاضر وناظر ہونے کا یقین دل کی گہرائیوں میں جاگزیں رہے اور کہیں لغزش وزیادتی نہ ہونے پائے۔

نہایت ہی عبادت گذار تھے، محمد بن عیسیٰ عینی شاہد ہیں کہ میں نے قاضی شریک کی پیشانی پر سجدہ کے واضح نشانات دیکھے۔

(۱) اخبار القضاۃ: ۱۴۳/۳
(۲) البدایۃ والنہایۃ: ۱۸۳/۱۰، داراحیاء التراث العربی

(۵) حفص بن غیاث

حفص نام اور کنیت ابو عمر تھی، یمن کے مشہور قبیلہ مذحج کی نخع نامی ایک شاخ کوفہ میں آباد ہوگئی تھی، اسی خاندان کی بنا پر نخعی کہلائے، ان کی ولادت ۱۱۷ھ میں ہشام عبد الملک کے ایام خلافت میں ہوئی "وُلِدَ حَفَصُ بْنُ غِيَاثٍ سَنَةَ سَبْعِ عَشَرَةَ وَمِائَةَ فِيْ خِلَافَةِ هِشَامِ بْنِ عَبْدِ الْمَلِكِ"(۱) خود ان کی ہی زبانی منقول ہے "وُلِدتُّ سَنَةَ سَبْعَ عَشَرَةَ وَمِائَةَ" کوفہ کی اس مردم خیز سرزمین سے ان کا تعلق ہے جس کی خاک سے علماء وفضلاء کی کئی نسلیں اٹھی تھیں۔

فضل وکمال

علمی حیثیت سے نہایت بلند مقام رکھتے تھے، انہوں نے مشاہیر تابعین سے کسب فیض کیا، حدیث وفقہ میں پوری مہارت کے ساتھ استغناء وبے نیازی حفظ واتقان، سیر چشمی وفراخ دستی کا پیکر مجسم تھے، یحی بن سعید القطان کا قول ہے: "أَوْثَقُ أَصْحَابِ الأَعْمَشِ حَفَصُ بْنُ غِيَاثٍ"(۲) امام اعمش کے تلامذہ میں حفص بن غیاث سب سے زیادہ ثقہ تھے۔

خطیب بغدادی رقم طراز ہیں:

"كَانَ حَفَصٌ كَثِيْرُ الْحَدِيْثِ حَافِظًا لَهُ ثَبَتًا فِيْهِ وَكَانَ أَيْضًا مُقَدَّمًا عِنْدَ الْمَشَائِخِ الَّذِيْنَ سَمِعَ مِنْهُمُ الْحَدِيْثَ"(۳)

"حفص بن غیاث کثیر الحدیث، حافظ اور ثقہ تھے، یہاں تک کہ وہ اپنے شیوخ سے بھی بلند مرتبہ تھے"۔

منصب قضاء

ان کی کتاب زندگی کا سب سے زرّیں، تابناک اور روشن صفحہ قضاء وافتاء کے

(۱) طبقات ابن سعد: الطبقة السابعة: ۶/ ۳۸۹، دار صادر، بیروت
(۲) تاریخ بغداد: حفص بن غیاث: ۹/ ۶۸، دار الغرب الإسلامی، بیروت
(۳) تاریخ بغداد: حفص بن غیاث: ۹/ ۶۸، دار الغرب الإسلامی، بیروت

سلسلے میں ان کی خدمات ہیں، کوفہ، بغداد میں وہ سالہا سال تک اس منصب کی زینت بنے رہے۔

بغداد کے مشرقی ومغربی حصوں میں ہمیشہ علاحدہ علاحدہ دو قاضیوں کا تقرر ہوا کرتا تھا، سب سے پہلے ۱۷۷ھ میں خلیفہ ہارون الرشید نے انہیں شرق بغداد کے منصب قضاء پر فائز کیا تھا، اس وقت قاضی حفص کی عمر ۶۰ سال تھی، دو سال تک وہ نہایت شان وشوکت کے ساتھ بغداد کے قاضی رہے، خلیفہ ان کی بڑی تعظیم وتکریم کیا کرتا تھا، اور ان کے عدالتی فیصلوں کو بہت قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔

ان کے منصبِ قضاء پر فائز ہونے کا واقعہ یہ ہے کہ: ابن ادریس، حفص بن غیاث اور وکیع بن جراح کو منصب قضاء پر فائز کرنے کے لئے ہارون الرشید کے ہاں لایا گیا، ابن ادریس تو لنگڑتے ہوئے آئے، پھر کہا: السلام علیکم، اور وہاں آکر بادشاہ کے سامنے گر گئے، ہارون رشید نے کہا: ان میں کوئی فضل وکمال معلوم نہیں ہوتا، وکیع بن جراح نے کہا: مجھے منصب قضاء پر فائز کیجئے، پھر اپنی شہادت کی انگلی کو آنکھ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا: امیر المؤمنین! میں نے اس سے ایک سال سے کچھ نہیں دیکھا ہے، انہوں نے اس سے اپنی شہادت کی انگلی مراد لی تھی، ہارون نے سمجھا اس سے آنکھ کی خرابی مراد لیا، اور یہ معذرت کر کے وہاں سے نکل گئے، صرف حفص بن غیاث رہ گئے، انہوں نے کہا: میرے اوپر قرض بھی ہے اور میرے اہل وعیال بھی ہیں، اگر آپ مجھے اس سے بے نیاز کر دیں تو منصب قضاء کو سنبھال سکتا ہوں، چنانچہ ان کو قضاء کی ذمہ داری سونپی گئی:

"عَلَيَّ دَيْنٌ وَلِيَ عِيَالٌ، فَإِنْ كَفَيْتَنِيْ وَأَعْفَيْتَنِيْ وَإِلَّا وَلَّيْتُ، قَالَ: بَلٰى، فَوَلَّاهُ الْقَضَاءَ"(۱)

حفص اپنے اس عہدۂ قضا سے تین سو درہم پاتے ہیں، اپنے ان دونوں ساتھیوں پر سو سو درہم خرچ کرتے تھے "فَكَانَ يَأْخُذُ ثَلَاثَ مِائَةٍ ويدفع إِلٰى كُلِّ وَاحِدٍ

(۱) أخبار القضاة: حفص بن غياث النخعي: ۳/ ۱۸۴

مِنْ ذَيْنِكَ مِائَةً"۔(۱)

بے لاگ عدالتی فیصلے

☆ قاضی حفص نے ایک قرضدار مجوسی سردار کے مقدمہ میں دلائل وشواہد کی بنیاد پر اس کے خلاف فیصلہ دیا، ۲۹ ہزار کے اس قرض کا کچھ تعلق امام جعفر سے بھی تھا، اس نے خلیفہ پر دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ وہ قاضی حفص کو معزول کردیں؛ لیکن ہارون الرشید اس کے لئے کسی طرح تیار نہ ہوا؛ بلکہ اس بے لاگ فیصلہ سے اس قدر مسرور ہوا کہ اس نے حفص بن غیاث کو تیس ہزار درہم دیئے جانے کا حکم دیا؛ لیکن پھر جب ان کی معزولی کے لئے امام جعفر کا دباؤ حد سے زیادہ بڑھا تو ہارون نے ان کو کوفہ کا قاضی مقرر کردیا، جہاں انہوں نے پوری شان سے ۱۳ سال تک اس منصب کی عزت بڑھائے رکھی۔(۲)

قاضی حفص نے کوفہ وبغداد کو ملا کر تقریباً ۱۵ سال تک اس فرض کو انجام دیا، اس طویل مدت میں انہوں نے کبھی بھی اس اعلیٰ عہدہ کی شان سے فروتر کوئی بات نہیں کی، جرأت، بے باکی، حق گوئی سے وہ زیریں دوراں مقدمات کو فیصل فرماتے، اس میں کسی صاحب جاہ ومنصب کی کوئی پرواہ نہ کرتے اور نہ ارباب ثروت ودولت کو خاطر میں لاتے؛ بلکہ کتاب وسنت اور دلائل ونظائر کی روشنی میں جو بات قرین حق وانصاف ہوتی اسے بے باکانہ انداز میں ظاہر فرماتے۔

☆ ایک دفعہ حفص بن غیاث مسند قضاء پر بیٹھے اپنے کام میں منہمک تھے کہ خلیفہ کا قاصد ان کی طلبی کا پروانہ لے کر حاضر ہوا، قاضی حفص نے اس سے کہا: مقدمات سے فارغ ہو کر آؤں گا، کیوں کہ میں عوام کا خادم ہوں، چنانچہ وہ اس وقت تک اپنے مقام سے نہ ہٹے جب تک تمام مقدمات فیصل نہ ہوجاتے۔

مذہبی رنگ اور دینی مزاج

ان کے خوف وخشیت کا یہ عالم تھا کہ وہ منصب قضاء کی ذمہ داریوں اور اس کی

(۱) أخبار القضاة: حفص بن غياث النخعي: ۱۸۴/۳ (۲) سیر الصحابہ: ۱۲۴/۹، کتب خانہ نعیمیہ

نزاکت اور عند اللہ اس کے مسئول ہونے کا خوف ان کو اس قدر دامن گیر تھا کہ وہ اکثر بلک بلک کر رویا کرتے تھے کہ ایسا گراں بار فریضہ میرے ناتواں کاندھوں پر لاد دیا گیا ہے، نہ معلوم اس سے کما حقہ عہدہ برآ ہوں گا یا نہیں ان ہی کا قول ہے: "لَأَنْ يُدْخِلَ الرَّجُلُ إِصْبَعَهُ فِيْ عَيْنِهِ فَيَقْتَلِعُهَا فَيَرْمِيْ بِهَا خَيْرٌ لَهُ مِنْ أَنْ يَكُوْنَ قَاضِيًا" آدمی اپنی انگلی آنکھوں میں ڈال کر اسے نکال پھینکے یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ قضاء کا کام کرے"(۱)

لیکن یہ حقیقت مسلم ہے کہ انہوں نے اس منصب قضاء کی ذمہ داریوں کو نہایت احسن اور بہتر طور پر انجام دیا، یہی وجہ ہے ان کی حیثیت کو محققین نے نہایت اجاگر کیا ہے، امام وکیع سے جب بھی کوئی مسئلہ دریافت کیا جاتا تو فرماتے: "اِذْهَبُوْا إِلٰى قَاضِيٍ فَاسْئَلُوْهُ" اسے قاضی سے دریافت کرلو، ولید بن ابی بدر کہتے ہیں کہ: جب قاضی حفص منصب قضاء سے سبکدوش ہوئے تو امام وکیع نے فرمایا: "ذَهَبَتِ الْقَضَاءُ بَعْدَ حَفْصٍ"(۲) سجادہ کا بیان ہے کہ حفص پر قضائت کا خاتمہ ہو گیا "كَانَ يُقَالُ خَتَمَ الْقَضَاءَ حَفْصُ بْنُ غَيَاثٍ"(۳)

کسبِ حلال میں فرط احتیاط کا یہ عالم تھا کہ اپنے عہدۂ قضا کے دوران ایک مرتبہ پندرہ روز تک علالت کی بنا پر فرائض منصبی انجام نہ دے سکے، چنانچہ صحت یاب ہونے کے بعد سو درہم یہ کہہ کر عالم کو واپس بھیجا کہ "هٰذِهِ رِزْقُ خَمْسَةَ عَشَرَةَ يَوْمًا لَمْ أَحْكُمْ فِيْهَا بَيْنَ الْمُسْلِمِيْنَ، لاَ حَظَّ لِيْ فِيْهَا"(۴) یہ پندرہ دن کا روزینہ ہے جس میں میں نے مسلمانوں کا کوئی فیصلہ نہیں کیا، اس لئے اس رقم کو لینے کا مجھے کوئی حق نہیں۔

(۱) أخبار القضاة: حفص بن غياث النخعي: ۱۸۶/۳
(۲) أخبار القضاة: حفص بن غياث النخعي: ۱۸۴/۳
(۳) العبر في خبر من غبر: ۲۴۴/۱، دار الكتب العلمية، بيروت
(۴) تاريخ بغداد: حفص بن غياث: ۸/۹، دار الغرب الإسلامي، بيروت

قاضی حفص بغداد وکوفہ کے (چیف جسٹس) تھے جو حکومت کا بلند ترین عہدہ ہوتا ہے، دنیا اوراس کے الوان وتنعّمات ان کے قدموں میں پڑے ہوئے تھے، لیکن ان کی بے نیازی اوراستغناء کا عالم یہ تھا کہ وہ اپنے جملہ مصارف کے لئے سودرہم رکھ کر مابقیہ مستحقین میں تقسیم کردیا کرتے تھے۔

اسی کے ساتھ وہ بہت سیر چشم اورسخی واقع ہوئے تھے، ان کا دسترخوان اس قدر وسیع تھا کہ جس میں ان کے تلامذہ کے علاوہ بہت سے مقامی وبیرونی لوگ بھی شریک رہتے تھے، مزید برآں گاہ بگاہ پوری بستی کی دعوت بھی کردیا کرتے تھے، امام وکیع کا قول ہے کہ ''وَكَانَ سَخِيًّا ، عَفِيْفًا ، مُسْلِمًا''(۱)

ابوجعفر المسندی کہتے ہیں کہ: ''كَانَ حَفْصُ بْنُ غِيَاثٍ مِنْ اَسْخَى الْعَرَبِ وَكَانَ يَقُوْلُ مَنْ لَّمْ يَأْكُلْ مِنْ طَعَامِيْ لَا اُحَدِّثُهُ ، وَإِذَا كَانَ يَوْمُ ضِيَافَتِهِ لَا يَبْقٰى رَأْسٌ مِنَ الرَّوَاسِيْنَ'' حفص بن غیاث عرب کے سب سے زیادہ سخی آدمی تھے، وہ فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص میرا کھانا نہیں کھائے گا اس سے میں حدیث بیان نہیں کروں گا، جب ان کے یہاں دعوت کا دن ہوتا تو کوئی شخص اس میں شرکت سے باقی نہیں رہتا تھا۔(۲)

اس کا نتیجہ تھا کہ پوری عمر عسرت اور تنگ دستی میں گذاری، رحلت کے وقت ان کے پاس ایک درہم نہ تھا؛ بلکہ نوسودرہم کے مقروض نکلے جو ان کے پسماندگان نے ادا کیا۔(۳)

وفات

تاحیات ان کی یہ تمنا رہی کہ وفات کے وقت قضاۃ کی زنجیروں سے آزاد ہوجاؤں، خداوندقدوس نے ان کی یہ آرزو پوری فرمائی اوروفات سے دوسال قبل عہدۂ

(۱) تاریخ بغداد: حفص بن غیاث: ۸/۹، دارالغرب ال إسلامی، بیروت
(۲) تذکرۃ الحفاظ: الطبقۃ السادسۃ من الکتاب: ۱/۲۱۸، دارالکتب العلمیۃ، بیروت
(۳) تذکرۃ الحفاظ: الطبقۃ السادسۃ من الکتاب: ۱/۲۱۸، دارالکتب العلمیۃ، بیروت

قضا سے ان کی علاحدگی کے سامان فراہم کردیئے۔

ملازمت سے سبکدوشی کے بعد فالج کے شکار ہوگئے، اور بالآخر امین کے عہدِ خلافت میں ۱۰ ذی الحجہ کوان کی شمع حیات گل ہوئی (۱) امیر کوفہ فضل بن عباس نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔(۲)

(۶) یحیی بن یعمر رحمہ اللہ

ان کا نام یحیی، ابوسلیمان کنیت تھی، ان کا قبیلۂ لیث سے تعلق تھا۔

فضل وکمال

قرآن، وحدیث، فقہ، زبان ادب جملہ علوم وفنون کے جامع تھے۔

قرآن کے ممتاز عالم ہونے کے علاوہ حافظ حدیث بھی تھے، انہوں نے اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم سے روایتیں نقل کی ہیں، فقہ پر بھی ان کو کافی عبوراوردرک حاصل تھا، جس کی بنا پران کو مرو کا عہدۂ قضاان کے سپرد کیا گیا۔

زبان وادب پر بھی ان کو کافی عبور حاصل تھا، نحوادب عربی زبان کے یگانہ فاضل تھے، اس کے علاوہ نہایت فصیح وبلیغ تھے۔

ان کا سب سے اہم کارنامہ جو ابدالآباد قائم رہے گا، قرآن کومنقوط کرنا ھے، ابتداء میں قرآن پاک نقطوں سے خالی تھا، سب سے اول یحیی نے پڑھنے والوں کی آسانی کے لئے نقطے لگائے۔(۳)

بحیثیت قاضی ان ایک کاانوکھا انداز

یحیی خراسان کے پایہ تخت مرو کے قاضی تھے، مرو میں باقاعدہ دارالقضاء تھا، لیکن حاجت مندوں کی آسانی کے لئے وہ چلتے پھرتے، راستے گلی میں تنازعوں کا فیصلہ

(۱) طبقات ابن سعد: الطبقۃ الرابعۃ: ۶/۳۴۶
(۲) طبقات ابن سعد: ۷/۳۶۸، دارصادر، بیروت
(۳) تاریخ بغداد: حفص بن غیاث: ۸/۹، دارالغرب الإسلامی، بیروت

کرد یتے تھے، یحیی بن موسی کا بیان ہے کہ: میں نے یحیی بن یعمر کو بازاروں اورگلیوں میں فیصلہ کرتے ہوئے دیکھا، بسااوقات وہ سواری پر چلتے ہوتے، اس حالت میں دو فریق آجاتےتوسواری روک کرکھڑے کھڑے فیصلہ دے دیتے:

"رَأَیْتُ یَحْیَی بْنَ یَعْمُرٍ عَلَی الْقَضَاءِ بِمَرْوَ فَرُبَّمَا رَأَیْتُهُ یَقْضِیْ فِیْ السُّوْقِ وَفِیْ الطَّرِیْقِ ، وَرُبَّمَا جَائَهُ الْخَصْمَانِ وَهُوَ عَلَی حِمَارٍ فَیَقِفُ عَلَی الْحِمَارِ حَتّٰی یَقْضِیْ بَیْنَهُمَا"(۱)

(۷) اسد بن فرات

اسد نام، کنیت ابوعبداللہ، والد کا اسم گرامی فرات اور جدامجد کا نام سنان تھا۔ ان کا خاندان بنی سلیم بن قیس کے آزاد کردہ غلاموں میں سے تھا، قاضی اسد کا آبائی وطن نیشاپور (خراسان) تھا، وہ ابھی بطن مادر ہی میں تھے کہ ان کے والد ہجرت کر کے حران (دیارابی بکر) چلے آئے ۱۴۲ھ میں ان کی ولادت ہوئی۔

انہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم امام مالک سے حاصل کی، پھرانہوں نے امام محمد کے زیرتربیت حنفی فقہ حاصل کیا، چنانچہ اگر چہ وہ مسلکا مالکی تھے، لیکن منصب قضاء پر فائز ہونے کے بعدانہوں نے تمام نزاعات اور معاملات کوفقہ حنفی کی روسے فیصل کیا۔

منصب قضاء پر تقرر

ان کے کمال تفقہ کے باعث عہدہ قضاء پر فائز رہے، جس زمانہ میں وہ آفریقہ آئے، عبداللہ بن غانم اس زمانہ میں قیروان کے قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) تھے، وہ اسد کے قدرداں اوران کے علم وفضل کے معترف تھے، جب تک زندہ رہے، مسائل ومعاملات میں انہیں سے رجوع کرتے رہے۔

ان کی وفات کے بعد ۱۹۱ھ میں ایک دوسرے اہل علم ابومحرز اس عہدہ پر سرفراز کئے گئے، پھرافریقہ کے شیوخ وعلماء نے اسد کوممتاز عہدہ پر مامور کرانا چاہا، چنانچہ علی بن

(۱) طبقات ابن سعد: تسمیۃ من کان بخراسان: ۷/۳۶۸

حمید نے والی افریقہ زیادۃ اللہ کے سامنے اسد کی علمی مرتبت، فضل وکمال اور شہرت کا تذکرہ کر کے اس خواہش کا اظہار بھی کیا، لیکن ابومحرز کو دولتِ اغلبیہ کے بانی ابراہیم بن اغلب نے اس عہدہ پر نامزد کیا تھا، اس لئے زیادۃ اللہ نے انہیں معزول کرنا مناسب نہ سمجھا اور اس کی یہ دوسری شکل اختیار کی کہ اسد کو ۲۰۳-۴ھ میں اس عہدہ میں مساوی حیثیت سے ابومحرز کا شریک بنادیا، یہ اسلامی حکومت میں پہلی مثال تھی کہ ایک ہی عہدہ پر ایک ہی حیثیت اوراختیار کے ساتھ دواشخاص مامور کئے جائیں۔

اسد کا یہ تقرر ابومحرز کو ناگوار گذرا، علاوہ ازیں ان دونوں میں کسی قدر علمی چشمک موجود تھی، اب یہ معاصرانہ چشمک پہلے سے زیادہ تیز ہوگئی اور باہمی مسابقت کے جذبات پیدا ہوگئے اور کبھی کبھی مناظرہ ومجادلہ کی نوبت تک آجاتی، صاحب معالم نے ان دونوں کی علمی نوک جھونک کے واقعات کا ذکر کر کے ان کے علم وفضل کا موازنہ کیا ہے اور فرماتے ہیں کہ:

"اسد ابومحرز سے علم وفضل میں زیادہ تھے اورانہیں فقہ پربھی زیادہ عبور حاصل تھا اور ابومحرز اگر چہ اسد سے علم وفقہ میں کم پایہ تھے، مگر بعض اوقات (مسائل کے جواب میں) حق ان کے ساتھ رہتا تھا"

اس کے بعد ۲۰۹ھ میں منصور طبندی نے زیادۃ اللہ کے خلاف خروج کیا اوردار السلطنت قیروان پر قابض ہوگیا، منصور کے مستولی ہونے کے بعد قاضی ابومحرز اور قاضی اسد دونوں اس کے پاس پہنچے، اس کی مجلس میں سلطنت کے اعیان اورفوج کے ممتاز قائدین موجود تھے، منصور نے ان دونوں کے عہدۂ قضا کی مناسبت سے ان کے سامنے زیادۃ اللہ کے مظالم بیان کئے اور دونوں کی رائے طلب کی، ابومحرز نے موقع ومحل سے خائف ہوکراس کے بیان کی تائیدکردی؛ لیکن قاضی اسد نے صاف گوئی سے کام لیا اور نہ صرف یہ کہ منصور کی تردید کردی؛ بلکہ اسے ظالم ٹھہرایا، یہ سن کر ایک فوجی افسر تلوار سونت کر اسد کے سر پر کھڑا ہوگیا، مگر معاملہ رفع دفع ہوگیا، اس کے بعد دونوں لوٹ آئے اور خائف رہے کہ پھرکوئی ناگوار صورت نہ پیش آئے۔

زیادۃ اللہ نے ۲۱۱ھ میں منصور پر غلبہ حاصل کر لیا اور قیروان پر قابض ہو گیا، منصور کے روبرو اسد اور محرز کی جو گفتگو ہوئی تھی وہ امیر زیادۃ اللہ کے کانوں تک پہنچ چکی تھی، اسی بناء پر زیادۃ اللہ نے دوبارہ اقتدار حاصل کرنے کے بعد ابومحرز کو عہدۂ قضا سے معزول کر دیا اور قاضی اسد اپنے عہدہ پر فائز رہے، اور اب وہ افریقہ کے تنہا قاضی القضاۃ تھے۔

پھر اس کے بعد ان کی اس صاف گوئی سے متاثر ہو کر زیادۃ اللہ نے ان کو فوج کا سپہ سالار بھی بنایا اور یہ ان دونوں عہدوں کو بحسن وخوبی انجام دیتے رہے، اور ان ہی کی قیادت میں صقلیہ فتح ہوا دوران جنگ ہی یہ زخم ہو گئے، زخم اتنا کاری تھا کہ جانبر نہ ہو سکے، اور انہیں زخموں کی تاب نہ لا کر بماہ ربیع الآخر ۲۱۳ھ کو علم وفضل اور شجاعت وشہامت کا یہ آفتاب غروب ہو گیا۔

(۸) محمد بن عبدالرحمن بن أبی لیلی الانصاری

ان کا نام محمد، کنیت ابوعبدالرحمن تھی، اپنے دادا کی طرف منسوب ہو کر عام شہرت ابن ابی لیلی سے پائی۔ ان کے جد امجد یسار رضی اللہ عنہ عظیم اور جلیل القدر صحابی ہیں، جنگ احد وغیرہ متعدد غزوات میں وہ رسول اللہ ﷺ کے ہمرکاب رہے، ان کے والد عبدالرجمن بن أبی لیلی بھی کبار تابعین میں شمار کئے جاتے ہیں۔

علمی فضل وکمال

ان کو حدیث میں سے بلند رتبہ حاصل نہ تھا، البتہ فقہ پر ان کو کامل دسترس حاصل تھا، علمی اعتبار سے یہ بلند رتبہ اتباع تابعین میں شمار ہوتے ہیں، فقہ میں ان کو شعبی سے خصوصی تلمذ حاصل تھا، ان کی محدثانہ حیثیت پر نقد وجرح کے باوجود تمام ائمہ ومحققین نے ان کی فقیہانہ تیز نگاہی کا بالاتفاق اعتراف کیا ہے

امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "كَانَ فِقْهُ ابْنِ اَبِیْ لَیْلٰی أَحَبُّ إِلَیْنَا مِنْ حَدِیْثِهٖ" (۱)

(۱) تہذیب التہذیب: ۳۰۲:۳۰، مطبعۃ دائرۃ المعارف النظامیۃ، الہند

محمد بن عبدالرحمن کی فقہ ہمارے نزدیک ان کی حدیث سے پسندیدہ تر ہے۔

منصب قضاء

فقہ وفتاوی میں غیر معمولی مہارت اور کمال کی بناء پر وہ طویل ترین مدت تک منصب قضاء پر فائز رہے، ان کے فیصلوں اور فتووں کو بڑی قدر ومنزلت سے دیکھا جاتا تھا، چنانچہ ساجی کا بیان ہے کہ "كَانَ یُمْدَحُ فِیْ قَضَاءِهٖ"

امام ابویوسفؒ فرماتے ہیں کہ:

"مَا وُلِّیَ قَضَاءُ اَحَدٍ أَفْقَهَ فِیْ دِیْنِ اللهِ وَلاَ أَقْرَءَ لِكِتَابِ اللهِ وَلاَ أَقْوَلَ حَقًّا بِاللهِ وَلاَ أَعَفَّ مِنَ الْأَمْوَالِ مِنْ اِبْنِ أَبِیْ لَیْلٰی" (۱) ابن ابی لیلی سے زیادہ دین کی سمجھ رکھنے والا، کتاب اللہ کو پڑھنے والا، حق گو اور مالی امور میں پاک دامن کوئی شخص مسند قضاء کی زینت نہیں دیکھا۔

سلیمان بن مسافر کہتے ہیں کہ: میں نے منصور سے ایک بار پوچھا کہ کوفہ میں اس وقت سب سے بڑا فقیہ کون ہے؟ اس نے فوراً جواب دیا: قاضی کوفہ محمد بن عبدالرحمن بن ابی لیلی۔

ان کے زمانہ میں اس منصب پر طویل عرصہ تک فائز رہنے کی بنا پر مفتی کوفہ اور قاضی کوفہ ان کے نام کے جزء بن گئے تھے، سب سے پہلے یوسف بن عمرو ثقفی نے انہیں قضاء کا منصب سپرد کیا تھا، پھر تقریباً ۳۳ سال تک وہ عہد بنی امیہ اور عہد بنی عباس دونوں میں اس فریضہ کو بحسن وخوبی انجام دیتے رہے۔

رمضان المبارک ۱۴۸ھ میں علم کی یہ شمع فروزاں گل ہو گئی، وفات کے وقت بھی قاضی کوفہ تھے۔

(۹) اسماعیل بن علیہ

ان کا نام اسماعیل، ابوالبشر کنیت تھی، والد کا نام ابراہیم بن مقسم اور والدہ کا نام

(۱) تاریخ بغداد: ۳/۳۵۹، دار الغرب الاسلامی، بیروت

علیہ تھا، علیہ قبیلہ بنوشیبان کی لونڈی تھیں؛ لیکن بڑی صاحب علم تھیں، انہی کی نسبت سے اسماعیل ابن علیہ کہلائے۔

ان کے والد ابراہیم بھی غلام تھے اور کپڑے کی تجارت کرتے تھے، اس سلسلہ میں وہ برابر بصرہ آیا جایا کرتے تھے، وہاں آمد ورفت کے دوران انہوں نے علیہ بنت حسان سے شادی کر لی اور بصرہ ہی میں مستقل طور پر رہائش اختیار کر لی، اور یہیں ۱۱۰ھ میں اسماعیل بن علیہ پیدا ہوئے، ان کی والدہ فضل وکمال کے باوجود چونکہ باندی تھیں اس لئے ان کی طرف وہ اپنی نسبت پسند نہیں کرتے تھے۔

غالباً اس لئے انہوں نے اپنی کنیت ابوالبشر رکھ لی تھی، مگر ابن علیہ کے مقابلہ میں یہ کنیت مشہور نہ ہوسکی۔ ابتدائی تعلیم اپنی والدہ ہی سے حاصل کی اور پھر اس کے بعد ان کی والدہ ان کو ایک مشہور محدث عبدالوارث کے پاس لئے گئی کہ اس کو تمہاری طرح محدث بنانا ہے، عبدالوارث نے ان کو تمام محدثین اور ان کی مجالس کا حاضر باش بنایا۔

فضل وکمال

اسماعیل بن علیہ کو یوں تو ہر فن میں خوب مہارت تھی؛ لیکن علم حدیث میں ان کو خصوصی درک اور کمال حاصل تھا، امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ: بصرہ میں اتقان وتثبت ابن علیہ پر ختم ہوجاتا ہے "إِلَيْهِ يَنْتَهِي فِيْ التَّثَبُّتِ بِالْبَصْرَةِ"(۱) ان کی جلالت علمی کی وجہ سے کبار محدثین بھی روایت حدیث میں ان کی مخالفت کرنے کی جرأت نہیں کرتے تھے۔

حدیث کے علاوہ ان کو فقہ پر عبور اور درک حاصل تھا، امام شعبہ انہیں "رَيْحَانَةُ الفقهاء" کہا کرتے تھے۔(۲)

عہدۂ قضاء اور اس سے معزولی کے اسباب

فقہی مہارت اور تبحر علمی کی وجہ سے متعدد عہدوں پر بھی فائز ہوئے، چنانچہ ان کو

(۱) شذرات الذہب: سنة ثلاث وتسعين ومائة: ۴۲۸/۲، دار ابن کثیر، دمشق

(۲) تہذیب الأسماء للنووی: باب إسماعيل: ۱۲۰/۱، دار الکتب العلمیة، بیروت

سب سے پہلے بصرہ کی صدقات کا انتظام سپرد کیا گیا، پھر بغداد کے محکمہ فوجداری کے ذمہ دار بنائے گئے اور آخر میں بغداد کے منصب قضاء پر فائز ہوئے، لیکن عرصہ تک اس منصب پر قائم نہیں رہ سکے، عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ کی ناخوشی کا علم ہوتے ہی اس عہدہ سے مستعفی ہوگئے۔

واقعہ کی تفصیل یہ بیان کی جاتی ہے کہ عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ تجارت کرتے تھے اور اس میں انہیں کافی نفع بھی تھا، لیکن یہ پیشہ جلب زر ومنفعت کے لئے نہیں تھا؛ بلکہ علماء اور طلبہ کی خدمت اور ان کی دنیوی ضروریات پوری کرنے کے لئے تھا، چنانچہ ابن مبارک رحمہ اللہ خود ہی فرماتے ہیں: اگر سفیان بن عیینہ، سفیان ثوری، فضیل ابن السماک اور ابن علیہ رحمہم اللہ یہ پانچ حضرات نہ ہوتے تو میں تجارت نہ کرتا۔

ابن علیہ کے قاضی ہونے کے بعد جب ابن مبارک بغداد آئے اور انہیں اس کا علم ہوا تو نہایت آزردہ خاطر ہوئے اور جو تحفے وہ ابن علیہ کے پاس معمولاً بھیجا کرتے تھے انہیں موقوف کر دیا اور جب ابن علیہ ابن مبارک رحمہ اللہ کی خدمت میں ملاقات کے لئے حاضر ہوئے تو آپ نے کوئی التفات نہیں کیا، ابن علیہ تھوڑی دیر بیٹھ کر گھر واپس چلے گئے اور دوسرے دن اس مضمون کا ایک خط لکھا:

"میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ کے لطف وکرم کا منتظر تھا؛ لیکن آپ نے مجھ سے کلام ہی نہیں کیا، معلوم نہیں جناب کو میری کون سی حرکت ایسی ناگوار ہوئی؟"

یہ خط پڑھ کر حضرت ابن مبارک رحمہ اللہ نے فرمایا کہ: یہ شخص بغیر سختی کے نہیں مان سکتا اور پھر جواب میں یہ تیز وتند اشعار لکھ کر بھیجے۔

يَا جَاعِلَ الدِّيْنِ لَهُ بَازِيًا
يَصْطَادُ أَمْوَالَ الْمَسَاكِيْنِ

"اے دین کے ذریعہ غیروں کے اموال کا شکار کرنے والے"

اِحْتَلْتَ لِلدُّنْيَا وَلَذَّاتِهَا

بِحِيْلَةٍ تَذْهَبُ بِالدِّيْنِ

''تو نے دنیا اور اس کی لذتوں کو حاصل کرنے کے لئے ایک ایسا حیلہ اختیار کرلیا ہے جو دین کو تباہ کرکے رہے گا''

صِرْتَ مَجْنُوْنًا بِهَا بَعْدَ مَا
كُنْتَ دَوَاءً لِلْمَجَانِيْنِ

''پہلے تم دنیا کے مجنون کا علاج کرتے تھے، اب خود تم اس کے مجنون ہو گئے ہو''

أَيْنَ رِوَايَاتُكَ فِيْ سَرْدِهَا
لِتَرْكِ أَبْوَابِ السَّلَاطِيْنِ

اب بادشاہوں کے دروازے سے بے پرواہ ہوکر تمہارا روایت حدیث کرنا کہاں گیا؟

اِنْ قُلْتَ أُكْرِهْتُ فَذَا بَاطِلٌ
زَلَّ حِمَارُ الْعِلْمِ فِيْ الطِّيْنِ

''اگر تم یہ کہو کہ مجھے عہدۂ قضا کے قبول کرنے پر مجبور کیا گیا تو یہ عذر سراسر باطل ہے، اب تو یہ کہنا زیادہ موزوں ہے کہ علم کا گدھا کیچڑ میں گر گیا''

ابن علیہ کے پاس جب عبداللہ بن مبارک کا یہ خط پہنچا تو آپ پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ آپ اسے پڑھتے جاتے تھے اور روتے جاتے تھے، پورا خط پڑھنے کے بعد آپ فوراً مجلس قضاء سے اٹھے اور ہارون رشید کے پاس جاکر اپنا استعفاء پیش کرتے ہوئے فرمایا: خدا کے لئے آپ میرے بڑھاپے پر رحم کیجئے؛ کیوں کہ اب میں اس عہدہ پر باقی نہیں رہ سکتا۔

خلیفہ ہارون الرشید نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس مجنون (ابن مبارک) نے آپ کو بہکا دیا ہے، ابن علیہ نے فرمایا: بہکایا نہیں؛ بلکہ انہوں نے تو مجھے فی الحقیقت ایک مصیبت سے نجات دلائی ہے، اور میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو بھی اس سے

رستگاری عطا فرمائے، ہارون الرشید نے آپ کا استعفاء منظور کرکے آپ کو خدمت قضاء سے سبک دوش فرمایا، حضرت عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ کو اس کی اطلاع ملی تو بے انتہا خوش ہوئے اور حسب سابق ایک تھیلی رقم کی ابن علیہ کے یہاں بھیجا۔(۱)

امام نووی کی رائے ہے کہ یہ پہلے بصرہ کے صدقات وزکوۃ کے والی بنائے گئے، پھر ہارون الرشید کے آخری دور میں بغداد کے قاضی بنائے گئے۔(۲)

عبادت اور خوف خدا

ابن علیہ کو قرآن مجید کی تلاوت اور عبادت سے بے حد شغف، بلکہ عشق تھا، ابن مدینی نے ایک رات ان کے ساتھ بسر کی تو انہوں نے دیکھا کہ حضرت ابن علیہ نے اسی شب میں تہائی قرآن مجید کی تلاوت کی۔

زہد واتقاء اور احساسِ آخرت اس دور کی ایک عام خصوصیت تھی، ابن علیہ بھی ان صفات میں زمرۂ تابعین میں نمایاں تھے، حضرت ابن مبارک رحمہ اللہ کا ان کی طرف میلان اور پھر ان کی مدد کرنا خود اس بات کا واضح ثبوت ہے، پھر ابن مبارک کی تنبیہ پر ان کا استعفاء دینا غایتِ تقوی کی دلیل ہے، ابن علیہ بلاشبہ "فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلاً وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْراً" کی مجسم تصویر تھے، ان کی خشیت الٰہی کا یہ عالم تھا کہ برسوں وہ ہنسے نہیں، ان کے تلامذہ کا بیان ہے کہ جب سے وہ بصرہ کے والی بنائے گئے، انہیں کبھی ہنستے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔

وفات

جمعرات کے دن ۲۴ یا ۲۵ ذی قعدہ ۱۹۳ھ کو علم وعمل کی یہ شمع فروزاں گل ہوگئی (۳) جنازہ کی نماز ان کے صاحبزادے ابراہیم نے پڑھائی اور بغداد کے مشہور قبرستان ابن مالک میں تدفین عمل میں آئی۔

---

(۱) تاریخ بغداد: اسماعیل بن ابراہیم: ۷/۱۹۶، دار الغرب الإسلامی، بیروت
(۲) تہذیب الأسماء للنووی: باب إسماعیل: ۱/۱۲۰، دار الکتب العلمیة، بیروت
(۳) شذرات الذہب: سنة ثلاث وتسعین ومائة: ۲/۴۲۸، دار ابن کثیر، دمشق

(۱۰)امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ

نام یعقوب، کنیت ابو یوسف تھی، سلسلہ نسب ان کے جداعلی سعد بن خَنْبَتَہْ سے جاملتا ہے، یہ جلیل القدر صحابی رضی اللہ عنہ تھے، غزوۂ احد میں شرکت کی اجازت چاہی مگر کم سنی کی وجہ سے اجازت نہیں ملی، دوسال کے بعد غزوۂ خندق پیش آیا تو اس میں شرکت کا شرف حاصل کیا، اس غزوہ میں انہوں نے بڑی جانبازی دکھائی، دشمنوں سے برسر پیکار تھے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ ان پر پڑی، فرمایا: کون ہو تو بولے: مجھے سعد خنبتہ کہتے ہیں، پھر قریب بلایا اور سر پر دست شفقت رکھا، امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست شفقت پھیرنے کی برکت ہم اب تک محسوس کررہے ہیں "فَتِلْكَ الْمَسْحَةُ فِيْنَا إِلَى السَّاعَةِ"۔(۱)

ان کے والد ابراہیم ایک غریب آدمی تھے، اور کوفہ میں مزدوری کر کے گذر اوقات ہوتا تھا۔

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کوفہ میں ۱۱۳ھ یا ۹۳ میں پیدا ہوئے۔(۲)

تعلیم کا آغاز اور معاشی تنگی

ابتدائے عمر ہی سے ان کو لکھنے پڑھنے کا شوق تھا، مگر ان کے والد اپنی غربت کی وجہ سے چاہتے تھے کہ حصول معاش میں ان کا ہاتھ بٹائیں، اس وجہ سے ان کو بہت دنوں تک باقاعدہ تحصیل علم کا موقع نہ مل سکا، مگر ان کے ذوق علم اور طلب اور جستجو نے ان کو اکسایا کہ اسی تنگی وترشی میں والد سے چھپ چھپا کر علمائے کوفہ کی خدمت میں حاضری دی جائے، کوفہ میں اس وقت فقہ وحدیث کی بہت سی مجلسیں چلتی تھیں، جن میں محمد بن ابی لیلی اور امام ابوحنیفہ رحمہما اللہ کی مجالس درس کو خاص خصوصیت حاصل تھی، چنانچہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ پہلے خصوصیت سے ابن ابی لیلی کی مجالس میں شریک ہوتے رہے، اور تقریباً ۸۔۹ سال

(۱) مناقب الامام الاعظم للموفق: ۲/۲۱۰، طبع: دائرۃ المعارف النظامیۃ بحیدرآباد ۱۳۲۱ھ

(۲) مناقب موفق

تک ان سے کسبِ فیض کیا، اس کے بعد امام صاحب کی مجالس میں شرکت کرنے لگے اور ان کو یہ مجلس ایسی بھائی کہ پھر امام صاحب کی زندگی میں اس سے علاحدہ نہ ہوسکے۔(۱)

عہدہ قضا

ان کی علمی لیاقت اور صلاحیت کا شہرہ چہاردانگ عالم میں عام وتام ہے، اسلئے یہ تو محتاجِ بیان نہیں ہے، لیکن انہوں نے قضاء کے عہدہ کو بھی ایک طویل مدت زینت بخشی اور قضاء کا عہدہ جو حفظ وامانت، عدل پروری اور انصاف کا طالب ہوتا ہے اس کا تمام حق ادا کردیا۔

ائمہ اسلاف کا عہدۂ قضاء سے انکار کے اسباب

عہد نبوی اور عہد صدیقی میں عہدۂ قضاء اسلامی حکومت کا کوئی الگ شعبہ نہیں تھا، بلکہ ہر صوبہ اور ضلع کا والی ہی قاضی ہوا کرتا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں جب اسلامی حکومت کے حدود وسیع ہوگئے اور انتظامی اور عدالتی ضرورتوں کی بنا پر انتظامیہ اور عدلیہ کو ایک ساتھ رکھنا مشکل ہوگیا اور پھر ولاۃ کی بدعنوانیاں سامنے آئیں تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ان دونوں شعبوں کو الگ کردیا، پھر خلفائے بنی امیہ کو دین اور دین کے تقاضوں اور کاموں سے شغف باقی نہ رہا تو انہوں نے عہدہ قضاء کی اہمیت کم کردی، ایسے لوگوں کا عہدہ قضا پر تقرر ہونے لگا تو جو علم وفقہ سے تو کم مناسبت رکھتے تھے، دنیا کے لالچی، حریص اور امراء اور بادشاہوں کے خوشامد واقع ہوئے تھے، چنانچہ واقعہ ہے کہ بنوامیہ کا تیسرا فرماں روا جب وہ مصر پہنچا تو وہاں کے قاضی کو بلایا، اس وقت وہاں کے قاضی عابس تھے، اس نے ان سے پوچھا کہ قرآن یاد ہے، بولے: نہیں، پھر پوچھا: فرائض یعنی تقسیم وراثت میں پختگی پیدا کرلی ہے، جواب ملا: نہیں، مروان کو اس جواب سے حیرت ہوئی اور بولا "فَبِمَ تَقْضِیْ" پھر آپ فیصلہ کیسے کرتے ہیں۔(۲)

(۱) مناقب الامام الاعظم للکردری: ۲/۱۳۳، طبع: دائرۃ المعارف النظامیۃ بحیدرآباد ۱۳۲۱ھ

(۲) کتاب الولاۃ: وکتاب القضاۃ للکندی: عابس بن سعد: ۱/۲۲۶

صرف یہی نہیں قاضیوں کے انتخاب میں اہل وناا ہل کا بہت کم خیال کیا جاتا؛ بلکہ حکمراں طبقہ قاضیوں کے فیصلوں تک میں دخل اندازی کرتا تھا، چنانچہ اموی اورعباسی دور کامشکل سے کوئی ایسا قاضی ملے گا جس کے فیصلہ میں ارباب حکومت کی مداخلت کا کوئی نہ کوئی واقعہ پیش نہ آیا ہو، صرف اموی دور کے قاضی خیر بن نعیم اورعباسی دور کے قاضی حفص بن غیاث کے متعلق ان کے تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ ارباب حکومت نے ان کو اپنے فیصلوں کے بدلنے پر مجبور کرنا چاہا مگر حکومت سے منسلک رہتے ہوئے بھی ان کے پائے ثبات میں کوئی تزلزل نہ آیا۔ یہی وجہ تھی محتاط فقہاء ومحدثین حکومت کا تعاون لینے کو براہی سمجھتے تھے، اگر کسی مجبوری کی بناء پر تعاون کرتے بھی تھے تو اسے اضطرار سمجھ کرانجام دیتے تھے۔

قاضی حفص فرماتے ہیں کہ: جب میری یہ حالت ہوگئی کہ مردار کھانا میرے لئے حلال ہوگیا تو اس وقت میں نے عہدۂ قضا قبول کیا، قاضی شریک کو مجبوراً عہدہ قضاء قبول کرنا پڑا، تو انہوں نے اس کو دین کے فروخت کرنے سے تعبیر کیا، ان کے الفاظ یہ ہیں:

"بِعْتُ دِيْنِيْ" میں نے اپنے دین کو بیچ دیا۔

چونکہ وہ جانتے تھے کہ عہدۂ قضاء پر فائز ہونے کے بعد اس جرأت اور آزادی کے ساتھ دینی احکام کی روشنی میں معاملات کا فیصلہ نہیں کرسکتے جس آزادی سے وہ عہدہ افتاء پر کرسکتے تھے، لیکن ان میں جو غیر معمولی لوگ تھے انہوں نے کسی بھی حالت میں عہدۂ قضا کو قبول نہیں کیا، ان ہی لوگوں میں سفیان ثوری رحمہ اللہ، امام مالک رحمہ اللہ، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اوران کے بعض تلامذہ امام زفر وغیرہ ہیں، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے تو بنوامیہ اور بنی عباس دونوں کا عہد حکومت دیکھا اوران کو ان دونوں عہدوں میں یہ لقمہ تر پیش کیا گیا؛ لیکن انہوں نے اس کو کسی بھی قیمت پر قبول نہیں کیا، امام ابویوسف رحمہ اللہ اورامام محمد رحمہ اللہ نے ایک مصلحت کی بناء پراس عہدہ قضاء کو قبول کیا۔ مگر کبھی انہوں نے حق وعدل کی روش سے سرموانحراف نہیں کیا، اس کی وجہ سے ان کوکئی دفعہ جیل بھی جانا پڑا، ان کے عہدۂ قضا کے قبول کرنے کی مزید ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کے ذریعہ سے وہ اسلامی نظام اوران

قوانین کو نافذ کرنا چاہتے تھے جو امام صاحب، اوران کی وفات کے بعد خود انہوں نے اوران کے احباب نے کتاب وسنت کی روشنی میں مستنبط کئے تھے۔

امام ابویوسف رحمہ اللہ کے عہدۂ قضاء کی مدت

امام ابویوسف رحمہ اللہ عہدۂ قضاء پر کتنے دن مامور رہے اس میں اختلاف ہے، ایک مرتبہ خود انہوں نے اپنے شاگرد سے بیان کیا کہ: میں ۱۷ برس امام صاحب کی خدمت میں رہا اور ۱۷ برس دنیا کے کاموں میں (یعنی عہدۂ قضاء پر) سب سے پہلے مہدی کے وقت قاضی مقرر ہوئے اوران کی وفات ۱۸۲ھ میں عہدۂ قضا کی حالت میں ہوئی تو اگران کے تقرر کا ۱۵۹ھ مانتے ہیں تو قضاء کی مدت ۲۲۔ ۲۳ برس ہوتی ہے۔

زمانۂ قضاء کے چند واقعات

امام ابویوسف رحمہ اللہ تین عباسی خلفاء کے دور میں قاضی رہے، مہدی، ہادی اور ہارون رشید، مہدی نے ان کو صرف بغداد کے مشرق کا قاضی بنایا تھا، مگر خلیفہ ہادی کے زمانہ میں وہ پورے بغداد کے قاضی بنادیئے گئے۔

☆ ایک باغ کے معاملہ میں خلیفہ ہادی اورکسی عام آدمی میں اختلاف ہوگیا، ہادی نے حکم دیا کہ معاملہ قاضی کے روبرو پیش کیا جائے، امام ابویوسف رحمہ اللہ کے سامنے شہادتیں گذریں جن سے باغ ہادی کا ثابت ہوتا تھا، لیکن امام نے انہی شہادتوں پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ خفیہ تحقیقات کیں، جس سے معلوم ہوا کہ باغ خلیفہ کے مخالف فریق ہی کا ہے، جس کے خلاف عدالت میں شہادتیں گذررہی ہیں، امام صاحب نے مقدمہ کو اس وقت تو ملتوی کردیا، ہادی سے ملاقات ہوئی تو اس نے پوچھا کہ مقدمہ میں آپ نے کیا فیصلہ کیا، امام ابویوسف رحمہ اللہ نے فرمایا: کہ شہادتیں تو آپ کے موافق ہیں، مگر مدعا علیہ کی طرف سے یہ مطالبہ ہوا ہے کہ مدعی (خلیفہ) سے حلف لے لی جائے، ہادی نے پوچھا: تو آپ کی کیا رائے ہے، کیا آپ مدعی کا حلف اٹھانا صحیح سمجھتے ہیں، امام ابویوسف رحمہ اللہ نے فرمایا کہ: قاضی ابن ابی لیلی رحمہ اللہ کی تو یہی رائے ہے، "قَدْ كَانَ اِبْنُ أَبِيْ لَيْلٰى يَرَاهُ" (امام ابویوسف کا یہ مسلک نہیں تھا) اسکے بعد

ہادی نے کہا کہ: اچھا تو باغ مدعا علیہ کے حوالہ کردیجئے۔(۱)

اسی طرح کا ایک فیصلہ انہوں نے ہارون الرشید کے خلاف بھی دیا تھا، مگر اس میں ان سے ذرہ سی غلطی ہوگئی تھی، جن کا ان کو زندگی بھر افسوس رہا، واقعہ یہ ہے کہ سواد عراق کے ایک بوڑھے نے ہارون کے خلاف یہ دعوی دائر کیا کہ فلاں باغ میرا ہے؛ لیکن خلیفہ نے اس پر غاصبانہ قبضہ کرلیا ہے، اتفاق سے یہ مقدمہ اس روز پیش ہوا جس روز خود ہارون الرشید فیصلے کے لئے بیٹھا ہوا تھا، قاضی ابویوسف رحمہ اللہ نے فریقین کے بیانات اوران کے دعوی ہارون کے سامنے پیش کررہے تھے، جب اس مقدمہ کی باری آئی تو انہوں نے خلیفہ کے سامنے اس کو پیش کیا اور کہا کہ: آپ کے اوپر دعوی ہے کہ آپ نے فلاں آدمی کا باغ زبردستی لے لیا ہے، مدعی یہاں موجود ہے، حکم ہو تو حاضر کیا جائے، بوڑھا سامنے آیا تو قاضی ابویوسف رحمہ اللہ نے پوچھا: بڑے میاں! آپ کا دعوی کیا ہے؟ اس نے کہا کہ میرے باغ پر امیر المؤمنین نے ناحق قبضہ کرلیا ہے، جس کے خلاف دادرسی چاہتا ہوں، قاضی نے سوال کیا: اس وقت وہ کس کے قبضہ اور نگرانی میں ہے، بولا: امیر المؤمنین کے ذاتی قبضہ میں ہے، اب قاضی ابویوسف رحمہ اللہ نے ہارون رشید سے مخاطب ہوکر کہا کہ: دعوی کے جواب میں کچھ آپ کہنا چاہتے ہیں، ہارون نے کہا: میرے قبضہ میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس میں اس شخص کا حق ہو، نہ خود باغ ہی میں اس کا کوئی حق ہے، قاضی نے فریقین کے بیانات سننے کے بعد مدعی سے پوچھا کہ تمہارے دعوی کے ثبوت کے لئے کوئی دلیل بھی ہے، کہا: ہاں خود امیر المؤمنین سے قسم لی جائے، ہارون نے قسم کھا کر کہا کہ: یہ باغ میرے والد مہدی نے مجھے عطا کیا تھا، میں اس کا مالک ہوں، بوڑھے نے یہ سنا تو اس کو بہت غصہ آیا اور یہ بڑبڑاتا ہوا عدالت سے نکل گیا، جس طرح کوئی شخص آسانی سے ستو گھول کر پی جائے اسی طرح اس شخص نے آسانی سے قسم کھالی (استقه كأنه سويق) ایک معمولی آدمی کی زبان سے یہ الفاظ سن کر ہارون کا چہرہ غصہ سے تمتما اٹھا، یحیی برمکی نے ہارون کو خوش کرنے کے لئے امام ابویوسف رحمہ اللہ سے مخاطب ہوکر کہا کہ:

(۱) مناقب الامام الاعظم للموفق: ۲/ ۲۱۷، طبع: دائرۃ المعارف النظامیۃ بحیدر آباد ۱۳۲۱ھ

نے دیکھا اس عدل وانصاف کی نظیر دنیا میں مل سکتی ہے، امام ابویوسف رحمہ اللہ نے اس کی تحسین کی، کہا کہ: مگر انصاف کے بغیر کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔(۱)

اس واقعہ میں امام ابویوسف رحمہ اللہ نے انصاف کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی، مگر پھر بھی آخر وقت تک ان کو جب اس واقعہ کا خیال آتا تو فرماتے تھے: میں اپنے اندر سخت کوفت محسوس کرتا ہوں اور ڈرتا ہوں کہ میں نے انصاف میں جو کوتاہی کی ہے، اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا کیا جواب دوں گا؟ لوگوں نے کہا کہ: آپ نے انصاف میں کیا کوتاہی کی اور آپ اس سے زیادہ کیا کرسکتے تھے کہ ایک معمولی کسان کے مقابلہ میں وقت کے سب سے بڑے بادشاہ کو قسم کھانے پر مجبور کردیا، فرمایا: لوگوں نے نہیں سمجھا کہ مجھے کس خیال سے تکلیف ہوتی ہے، پھر افسوس کے لہجہ میں فرمایا کہ: مجھے تکلیف اور کڑھن اس کی ہے کہ میں ہارون رشید سے یہ نہ کہہ سکا کہ آپ کرسی سے اتر جایئے جہاں آپ کا فریق کھڑا ہے وہیں ایک فریق کی حیثیت سے آپ بھی کھڑے ہوجایئے، یا اجازت دیجئے کہ اس کے لئے بھی کرسی لائی جائے "فَأَقُوْلُ يَا أَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ! أَنْتَ عَلَى كُرْسِيٍّ وَهُوَ عَلَى الأَرْضِ، فَيُدْعٰى لَهُ بِكُرْسِيٍّ فَيُجْلِسُ عَلَيْهِ"(۲)

امام ابویوسف رحمہ اللہ نے جب خلفاء کی پرواہ نہیں کی تو وزراء وارکان حکومت کی پرواہ کیا کرتے، چنانچہ انہوں نے متعدد وزراء اور خواص حکومت کی شہادتیں رد کردیں، ایک بار علی بن عیسی وزیر مملکت نے کسی معاملہ میں شہادت دی، تو امام صاحب رحمہ اللہ نے اسے قبول نہیں کیا، یہ ایک وزیر کی توہین تھی، اس نے معاملہ ہارون رشید کے سامنے پیش کیا، ہارون نے امام صاحب سے دریافت کیا تو فرمایا کہ: میں شہادت اس لئے رد کردی کہ میں نے اپنے کانوں سے ان کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں تو خلیفہ کا عبد اور غلام ہوں اور جب یہ غلام ہیں تو غلاموں کی شہادت معتبر نہیں، بعض روایتوں میں ہے کہ: انہوں نے کہا کہ: یہ جماعت سے نماز نہیں پڑھتے؛ اس لئے میں ان کی شہادت رد کرتا ہوں۔(۳)

(۱) مناقب الامام الاعظم للکردری: ۲/ ۱۴۶، طبع: دائرۃ المعارف النظامیۃ بحیدر آباد ۱۳۲۱ھ
(۲) مناقب الامام الاعظم للموفق: ۲/ ۲۲۴، طبع: دائرۃ المعارف النظامیۃ بحیدر آباد ۱۳۲۱ھ
(۳) مناقب الامام الاعظم للموفق: ۲/ ۲۲۴، طبع: دائرۃ المعارف النظامیۃ بحیدر آباد ۱۳۲۱ھ

☆ ایک مرتبہ ایک شخص نے مامون رشید پر بیس ہزار درہم کا وعدہ کیا، مامون رشید کو عدالت میں حاضر ہونا پڑا، نوکروں نے اس کے لئے عدالت میں قالین بچھادی، قاضی القضاۃ امام ابو یوسف ؒ نے یہ دیکھ کر نوکروں کو حکم دیا کہ وہ قالین اٹھا کر رکھیں اور کہا کہ عدالت میں دعوی کرنے والا اور ملزم دونوں برابر ہیں، کسی کے ساتھ امتیازی برتاؤ نہیں کیا جاسکتا، مامون نے جب قاضی کی یہ حق پرستی دیکھی تو ان کی تنخواہ بڑھادی، اب ہر آدمی اندازہ لگاسکتا ہے کہ جس دور میں ایسے ہمت والے قاضی ہوں اور ایسے انصاف پسند بادشاہ ہوں تو عام لوگ کتنی امن وچین کی زندگی بسر کرتے ہوں گے؟۔(۱)

قاضی القضاۃ عہدہ کی ابتداء

امام ابو یوسف ؒ خلیفہ مہدی کے عہد خلافت میں بغداد کے مشرقی حصہ کے قاضی مقرر ہوئے تھے، خلیفہ ہادی کے زمانہ میں بھی اسی عہدہ پر تھے، ہارون الرشید کے ہاتھوں میں خلافت کی باگ ڈور آئی تو سال بھر تک تو اس نے ان کو اسی حیثیت میں رکھا، مگر اس کے بعد تمام ممالک محروسہ کا قاضی القضاۃ بنادیا "كَانَ إِلَيْهِ تَوَلِّيَةُ الْقَضَاءِ فِي الآفَاقِ مِنَ الشَّرْقِ وَالْغَرْبِ"(۲)

خود امام ابو یوسف ؒ فرماتے ہیں: "فَوَلاَّنِيْ قَضَاءَ الْبِلَادِ كُلِّهَا"(۳)

ان بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ رسماً اور تبرکاً قاضی نہیں تھے، بلکہ کہنا چاہیے کہ حکومت کے محکمۂ عدلیہ کے پورے انچارج یا بالفاظ دیگر وزیر عدل وقانون تھے، امام ابو یوسف ؒ نے اس عہدہ کو جس کی کوئی قیمت نہ تھی اس قدر باوقار عہدہ بنادیا تھا، اس کی تائید ابو الولید الطیالسی کی روایت سے ہوتی ہے: "هٰذَا هُوَ الْوَزِيْرُ وَقَاضِيُ الْقُضَاةِ" یہی وہ شخص ہے جو وزیر اور قاضی القضاۃ ہے۔ ہارون بھی ان کا احترام بجالاتا

(۱) ملتِ اسلامیہ کی مختصر تاریخ:۱۹۸، بحوالہ عدل وانصاف کے حیرت انگیز واقعات:۶۰
(۲) شذرات الذہب:۱/۲۹۳ دار الکتب العلمیۃ، بیروت
(۳) مناقب الامام الاعظم للموفق:۲/۲۱۱، طبع: دائرۃ المعارف النظامیۃ بحیدرآباد ۱۳۲۱ھ

تھا، ان کو ہر وقت دربار میں باریابی کی اجازت تھی، ان کی سواری باب خلافت سے اندر چلے جانے کے باوجود بھی سواری سے نہیں اترتے تھے، حریم خلافت کا پردہ اٹھایا جاتا اور ان کی سواری اندر چلی جاتی۔ جب ہارون کا سامنا ہوتا تو وہ خود سلام میں سبقت کرتا اور ان کا اعزاز واکرام کرتا۔

علالت اور وفات

موت سے کچھ دن پہلے بیمار ہوئے، ان کو بیمار ہونے سے پہلے ہی اپنی موت کا کچھ اندازہ ہوگیا تھا، وہ برابر کہا کرتے تھے کہ ۱۷ برس امام صاحب کی خدمت میں رہا اور ۱۷ برس دنیا کے کاموں میں، اب میرا وقت قریب ہے، موت سے پہلے وصیت کی کہ میرے مال میں سے ایک ایک لاکھ درہم اہل مکہ، اہل مدینہ اور اہل کوفہ پر تقسیم کردیا جائے، اس کے بعد وراثت تقسیم ہو۔(۱)

علالت کے ایام میں ان پر کچھ عجیب رقت طاری تھی، عہدۂ قضا کی ذمہ داریوں کو انہوں نے جس دیانت سے انجام دیا، اس کی تفصیل اوپر آچکی ہے، لیکن آخر وقت میں وہ کہتے تھے کہ: کاش! میں فقر وفاقہ کی حالت میں اس دنیا سے چلا جاتا اور عہدۂ قضا نہ قبول کرتا، پھر بھی میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میں نے قصداً نہ کسی پر ظلم کیا ہے اور نہ کسی فریق کی پاسداری کی ہے اور نہ میری خواہش ہوئی کہ فلاں فریق کامیاب ہو اور فلاں نہ کامیاب "وَلاَ أَحْبَبْتُ خَصْمًا عَلٰى خَصْمٍ"(۲)

جس روز ان کی وفات ہوئی، ان کی عجیب کیفیت تھی، اور زبان پر یہ کلمات جاری تھی:

"بارالہا! تو جانتا ہے کہ میں نے کسی فیصلہ میں جو تیرے بندوں کے درمیان تھا، خود رائی سے کام نہیں لیا اور نہ خلاف واقعہ فیصلہ کیا، ہمیشہ میری کوشش رہی کہ جو فیصلہ ہو وہ تیری کتاب اور تیرے رسول کی سنت

(۱) مناقب الامام الاعظم للکردری:۲/۱۴۵، طبع: دائرۃ المعارف النظامیۃ بحیدرآباد ۱۳۲۱ھ
(۲) مناقب الامام الاعظم للموفق:۲/۲۲۴، طبع: دائرۃ المعارف النظامیۃ بحیدرآباد ۱۳۲۱ھ

کے موافق ہو، جب کسی مسئلہ میں دشواری پیش آتی تھی تو میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کو اپنے اور تیرے درمیان واسطہ بناتا تھا، اور جہاں تک مجھے معلوم ہے کہ امام ابوحنیفہؒ احکام کو خوب سمجھتے تھے، اور عمداً وہ کبھی حق کے دائرے سے باہر نہیں جاتے تھے، یہ بھی زبان پر تھا کہ: اے اللہ! تو جانتا ہے کہ میں ہمیشہ پاک دامن رہا اور کبھی ایک درہم جان بوجھ کر حرام کا نہیں کھایا "جَعَلْتُ بَيْنِي وَبَيْنَكَ أَبَا حَنِيفَةَ لِأَنِّي عَلِمْتُ أَنَّهُ لَمْ يَكُنْ فِي عِلْمِكَ أَحَدًا أَعْلَمُ بِهِ مِنْهُ"(۱)

ان کی وفات کا لوگوں پر بڑا اثر ہوا، خصوصیت سے ہارون رشید بہت غمگین تھا، جنازہ نکلا تو مشایعت کی اور خود نماز جنازہ پڑھائی اور اپنے خاندان کے مقبرے خاص میں دفن کرایا (۲) اس سے فارغ ہوا تو لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا: تمام اہل اسلام کو چاہئے کہ ان کی وفات پر ایک دوسرے کی تعزیت کریں یعنی حادثہ ایک شخص کا نہیں، ایک خاندان کا نہیں؛ بلکہ پوری ملت کا ہے۔

تقوی وخشیت الٰہی

اللہ کا خوف اور اس کا ڈر اس کے رگ وپے میں سرایت کیا ہوا تھا۔

علی بن عیسی کہتے ہیں:

"میں ایک بار ایسے وقت میں امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے پاس آیا کہ مجھے گمان تھا کہ وہ آرام گاہ میں ہوں گے اور ملاقات نہ ہو سکے گی، میں نے اطلاع کرائی تو فوراً بلالیا، دیکھا کہ ایک علاحدہ کمرے میں لنگی باندھے بیٹھے ہیں اور ان کے گرد کتابوں کا انبار ہے، میں نے کہا: میں تو سمجھتا تھا کہ آپ سے ملاقات نہ ہو سکے گی، امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے فرمایا کہ: دیکھو اس کمرے کے چاروں طرف یہ الماریاں ہیں، ان میں کتابیں

(۱) مناقب الامام الاعظم للموفق: ۱/۲۴۱، والکردری: ۲/۱۴۵، طبع: دائرۃ المعارف النظامیۃ بحیدر آباد ۱۳۲۱ھ
(۲) تاریخ بغداد: ۱۴

اور کاغذات کے بہت سے پوٹ رکھے ہوئے ہیں، یہ تمام میرے فیصلوں کی نظیریں ہی، قیامت کے دن جب مجھ سے باز پرس ہوگی کہ تم نے فیصلے کس طرح کیے تو خدا کے حضور اس کے جواب میں یہی پیش کروں گا "هٰذِهٖ كُلُّهَا قَضَايَا قَضَيْتُ بِهَا وَأَنَا مُحْتَاجٌ إِلَى أَعْدَلَ لِهَا جَوَابًا إِذَا سُئِلْتُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ"(۲)

(۱۱) امام محمد شیبانی

محمد نام، ابوعبداللہ کنیت، شجرہ نسب کچھ اس طرح ہے، محمد بن الحسن الفرقد الشیبانی۔ ان کے والد دمشق کے ایک گاؤں حرستا کے رہنے والے تھے، ترک وطن کر کے بہ سلسلۂ ملازمت عراق آئے اور وہیں ایک گاؤں "واسط" میں سکونت اختیار کرلی، امام محمد یہیں ۱۳۲ھ میں پیدا ہوئے۔ واسط میں ابھی عمر کے چند سال گذرنے پائے تھے کہ ان کے والد وہاں سے شامی لشکر کے ساتھ کوفہ چلے آئے اور پھر وہیں مستقل بود وباش اختیار کرلی، کوفہ اس وقت علم وفن کا مرکز اور علماء ومشائخ کا گہوارہ تھا، علمی اعتبار سے اسے تمام ممالک اسلامیہ میں "ام البلاد" کی حیثیت حاصل تھی، اسی مادر علمی کی آغوش میں امام محمد نے تعلیم وتربیت حاصل کی اور اسی ماحول میں انہوں نے نشو ونما پائی، سب سے پہلے حسب روایت قرآن کی تعلیم حاصل کی، اس کے بعد ادب ولغت کی ابتداء کی گئی، ادب اور لغت کی تعلیم سے فراغت کے بعد کوفہ کے بڑے بڑے شیوخ کے درس میں شریک ہونے لگے، فطری استعداد وصلاحیت اور کوفہ کے علمی ماحول نے کم سنی ہی میں انہیں ایک جوہر قابل بنا دیا۔(۲)

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے یہاں آمد اور ان سے شرف تلمذ

ابھی تیرہ چودہ برس کے ہی تھے کہ ایک مسئلہ دریافت کرنے کی غرض سے امام صاحب رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، وہ مسئلہ یہ تھا کہ اگر نابالغ عشاء کی نماز پڑھ کر

(۱) مناقب الامام الاعظم للموفق: ۲/۲۴۴ طبع: دائرۃ المعارف النظامیۃ بحیدر آباد ۱۳۲۱ھ
(۲) مناقب الامام الاعظم للکردری: ۲/۱۴۶ طبع: دائرۃ المعارف النظامیۃ بحیدر آباد ۱۳۲۱ھ

سوجائے اور اسی رات میں وہ بالغ ہوجائے تو کیا وہ عشاء کی نماز دہرائے گا، امام صاحب نے اثبات میں جواب دیا، یہ سوال چونکہ انہوں نے اپنے متعلق کیا تھا، اس لئے وہاں سے فوراً اٹھے، وضو کیا اور مسجد کے ایک گوشہ میں جا کر عشاء کی نماز دہرائی، امام صاحب نے یہ دیکھ کر حاضرین سے فرمایا کہ انشاء اللہ یہ لڑکا رشید ہوگا "إِنَّ هٰذَا الصَّبِيَّ يَفْلَحُ" (۱)

گویا یہ ایک معمولی واقعہ تھا؛ لیکن یہی واقعہ تحصیل فقہ اور امام صاحب سے ان کی عقیدت وتلمذ کا سبب بن گیا، چنانچہ کچھ دنوں کے بعد وہ پھر امام صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حلقۂ تلمذ میں داخل ہونے کی خواہش کا اظہار کیا، امام صاحب نے اپنے دستور کے مطابق شریک درس ہونے کے لئے حافظ قرآن ہونے کی شرط ان کے سامنے رکھی تو پھر وہ ایک ہفتہ کے بعد اپنے والد کے ساتھ امام صاحب کے پاس آئے اور عرض کیا کہ میں نے قرآن حفظ کرلیا ہے، "فغاب سبعة أيام ، ثم جاء وقال حفظته" (۲) اس کے بعد انہوں نے کوئی مسئلہ دریافت کیا، امام صاحب نے ان سے پوچھا کہ: یہ مسئلہ تم کسی سے سن کر دریافت کررہے ہو یا تمہارا طبع زاد ہے، امام محمد رحمہ اللہ نے کہا: یہ سوال خود میرے ذہن میں آیا ہے، امام صاحب رحمہ اللہ نے ان سے فرمایا کہ تم تو بڑے لوگوں جیسا سوال کرتے ہو تم برابر میرے حلقۂ درس میں آتے رہو، اس کے بعد امام محمد رحمہ اللہ مستقل طور پر امام صاحب کے سلسلہ تلامذہ میں داخل ہوئے اور ہمیشہ سفر وحضر میں ان کی صحبت میں رہا کرتے، ان کی حیات تک کسی دوسرے حلقۂ درس میں نہیں گئے، امام ابوحنیفہؒ سے ان کو صرف چار سال استفادہ کا موقع ملا، پھر امام صاحب رحمہ اللہ کی وفات کے بعد امام ابویوسف رحمہ اللہ کی طرف رجوع کیا جو امام صاحب کے محبوب اور سب سے زیادہ ذی علم تلامذہ میں سے تھے، اور ان کے حلقۂ درس میں فقہ کی تکمیل کی، اور بجز چند آخری سالوں کے بہت کم ان سے علاحدہ رہے۔ (۳)

(۱) مناقب الامام الاعظم للكردري: ۲/۱۵۵، طبع: دائرة المعارف النظامية بحيدرآباد ۱۳۲۱ھ
(۲) مناقب الامام الاعظم للكردري: ۲/۱۵۵، طبع: دائرة المعارف النظامية بحيدرآباد ۱۳۲۱ھ
(۳) مناقب امام محمد، تذكرة الحفاظ

عہدۂ قضاء سے انکار

اسلاف امت میں بہت سی ہستیاں ایسی گذری ہیں جنھوں نے حکومت کے کسی بھی عہدہ کو قبول کرنے کو پسند نہیں کیا اور نہ امراء وسلاطین کی قربت اور نزدیکی ہی کو گوارہ کیا، اس کی ایک وجہ تو یہ تھی جیسا کہ پہلے مذکور ہوا کہ ان کو امراء وسلاطین کے دباؤ میں فیصلے کرنے پڑتے تھے، جو دینی حمیت اور غیرت کے مغائر تھا، اما ابوحنیفہ رحمہ اللہ کو جب خلیفہ منصور نے عہدۂ قضا پیش کیا تو یہ کہہ کر اس ذمہ داری سے سبکدوشی اختیار کرلی تھی کہ ''میں اس عہدہ کی صلاحیت نہیں رکھتا، امام ابویوسف رحمہ اللہ کچھ مصلحتوں سے عہدۂ قضاء کو قبول کیا تھا، انہیں عہدۂ قضا کے انکار کرنے والوں میں امام محمد رحمہ اللہ، عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ اور امام زفر رحمہ اللہ بھی شامل تھے، امام محمد رحمہ اللہ اس بارے میں اس قدر سخت اور شدید واقع ہوئے تھے کہ امام ابویوسف رحمہ اللہ نے جب عہدۂ قضا قبول کیا تو انہوں نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا، لیکن بعد میں کچھ احوال ایسے پیش آئے کہ امام محمد رحمہ اللہ نے عہدۂ قضا کو قبول کیا۔

امام ابویوسف رحمہ اللہ نے عہدہ قضا اس لئے قبول کیا تھا کہ اس منصب پر فائز ہوکر امام کے مستنبط کردہ مسائل کی ترویج واشاعت کا کام کیا جائے، اس لئے ان کی خواہش تھی کہ امام محمد بھی اسی کاز کی تکمیل کے لئے عہدہ قضا قبول کرلیں، اتفاق سے اسی زمانہ میں ''رقہ'' میں قاضی کے تقرر کا مسئلہ درپیش ہوا اور اس سلسلہ میں امام ابویوسف رحمہ اللہ سے مشورہ کیا گیا تو انہوں نے امام محمد رحمہ اللہ کے انتخاب کا مشورہ دیا، امام محمد رحمہ اللہ اس وقت کوفہ میں تھے، کوفہ سے بغداد بلائے گئے، چنانچہ وہ بغداد آئے اور پہلے امام ابویوسف رحمہ اللہ کے پاس گئے اور ان سے اپنے انتخاب کی وجہ دریافت کی کہ کوفہ اور بصرہ میں تو ہمارے مسلک کی اشاعت اور ترویج ہوچکی ہے، اگر آپ شام میں چلے جائیں تو وہاں بھی اس کی ترویج کا ذریعہ پیدا ہوجائے گا، امام محمد رحمہ اللہ نے اس مصلحت کو اپنے انتخاب کے لئے پسند نہیں کیا اور کہا کہ: اس میں براہ راست مجھ سے گفتگو کرنی چاہئے تھی، اس گفتگو کے بعد امام ابویوسف رحمہ اللہ نے ان سے یحی برمکی کے پاس چلنے کے لئے کہا، دونوں صاحب یحیی برمکی کے پاس گئے، امام ابویوسف رحمہ اللہ نے یحی سے کہا کہ: محمد بن حسن رحمہ اللہ سامنے موجود

ہیں، ان سے (عہدۂ قضا کے) معاملات طے کر لیجئے، یحی نے امام محمد رحمہ اللہ پر ایسا دباؤ ڈالا کہ وہ عہدۂ قضا قبول کرنے پر مجبور ہو گئے۔(۱)

امام محمد رحمہ اللہ نے عہدہ قضا قبول تو کر لیا؛ لیکن یہ بات چونکہ ان کی طبیعت اور ضمیر کے خلاف تھی اور اس کا ذریعہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ ہوئے تھے، اس لئے انہوں نے امام ابو یوسف رحمہ اللہ سے ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور اس میں اس قدر شدت اختیار کی کہ ان کے یہاں آمد و رفت بھی ترک کر دی، اور مشہور ہے کہ وفات کے بعد ان کے جنازہ میں شرکت بھی نہیں کی۔(۲)

دوسری روایت اس سلسلے میں یہ ہے کہ ہارون رشید نے خود ان کو اس عہدہ کے لئے منتخب کیا تھا، جب امام محمد رحمہ اللہ کو معلوم ہوا تو وہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے پاس گئے اور اپنے گذشتہ تعلقات کو یاد دلا کر فرمایا کہ مجھے اس آزمائش میں نہ ڈالئے، امام ابو یوسف رحمہ اللہ ان کو لے کر یحیی کے پاس گئے، اس نے ان کو ہارون رشید کے پاس بھیج دیا اور اس طرح مجبور ہو کر انہیں یہ عہدہ قبول کر لینا پڑا۔(۳)

بے لاگ فیصلہ اور عہدۂ قضا سے برطرفی

امام محمد رحمہ اللہ نے یہ عہدہ بادل ناخواستہ قبول کیا تھا، ان کی خواہش کو اس میں ذرہ برابر دخل نہ تھا، اس لئے وہ جب تک اس عہدہ پر فائز رہے بڑی دیانت داری سے بلا کسی رو ورعایت کے اس کے فرائض انجام دیتے رہے، انہوں نے کبھی اپنے فیصلہ میں خلیفۂ وقت یا ارکان دولت کی پرواہ نہ کی، چنانچہ ان کے قاضی ہونے کے کچھ ہی روز بعد یحیی بن عبداللہ کی امان کا قصہ دربار میں پیش ہوا، ہارون نقض عہد کر کے یحیی کو سزا دینا چاہتا تھا؛ لیکن اس ارادہ کی تکمیل کے لئے قضا کے فیصلہ کی ضرورت تھی، چنانچہ تمام قضاۃ دربار میں بلائے گئے، امام محمد رحمہ اللہ بھی موجود تھے، ہارون نے سب سے پہلے امام محمد رحمہ اللہ سے دریافت کیا، انہوں نے فرمایا کہ: یحی بن عبداللہ کو جو امان دی جا چکی ہے وہ صحیح ہے

(۱) مناقب الامام الاعظم للکردری: ۲/ ۱۶۵، طبع: دائرۃ المعارف النظامیۃ بحیدر آباد ۱۳۲۱ھ

(۲) تاریخ بغداد: امام ذہبی، ترجمہ امام محمد

(۳) مناقب الامام الاعظم للکردری: ۲/ ۱۶۵، طبع: دائرۃ المعارف النظامیۃ بحیدر آباد ۱۳۲۱ھ

اور اس امان کا نقض اور یحی کا قتل کسی طرح جائز نہیں ہے، ان کے بعد ہارون بن حسن بن زیاد سے مخاطب ہوا، انہوں نے کچھ صاف جواب نہ دیا، پھر اس نے ابوالبختری وہب بن وہب سے دریافت کیا، انہوں نے ہارون کی مرضی کے مطابق جواب دیا، امام محمد رحمہ اللہ پر عتاب شاہی نازل ہوا اور وہ عہدۂ قضا سے برطرف کر دیئے گئے اور انہیں افتاء سے بھی روک دیا گیا "وَمَنَعَهُ عَنِ الْفَتْوٰى"۔(۱)

قید و بند

غالبا اسی فتوے کے سلسلہ میں استاد کی سنت کے مطابق انہیں قید و بند کی مشقت اٹھانی پڑی، مناقب کردری میں محمد بن سلام (امام محمد رحمہ اللہ کے خاص شاگرد) کا بیان ہے کہ:

"طُلِبَ مُحَمَّدٌ لِلْقَضَاءِ فَحُبِسَ وَوُكِّلَ بِهِ قَرِيْنٌ حَتّٰى لَا يَطَّلِعُ أَحَدٌ وَلاَ يَدْخُلُ عَلَيْهِ أَحَدٌ ، وَضِيْقَ فِيْ السِّجْنِ الْفِقْهُ ، فَرَشَوْتُ السُّجَّانَ رِشْوَةً عَظِيْمَةً وَدَخَلْتُ عَلَيْهِ بِكِيْسٍ مِنَ الدَّرَاهِمِ "۔(۲)

امام محمد فیصلہ کے لئے بلائے گئے اور پھر قید کر دیئے گئے اور ان کو قید تنہائی دے دی گئی، گویا علم فقہ کے افادہ کو محبوس کر دیا گیا، میں نے دربان کو کچھ دے دلا کر ان کے پاس ایک تھیلی درہم لے کر پہنچا۔

اتفاق سے اسی زمانے میں ام جعفر (ہارون کی بی بی) کو کوئی جائداد وقف کرنے کا خیال پیدا ہوا، اس نے امام محمد رحمہ اللہ سے سے وقف نامہ لکھنے کی درخواست کی، انہوں نے یہ کہہ کر معذرت کر دی کہ مجھے فتوی دینے سے روک دیا گیا ہے، ام جعفر نے امام محمد رحمہ اللہ کے معاملہ (غالبا پابندی اٹھا لینے کے بارے میں) ہارون سے گفتگو کی، ہارون نے انہیں فتوی کی اجازت دے دی اور پھر ان کو بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ قاضی القضاۃ کا عہدہ پیش کیا،(۳) جس پر وہ غالبا آخر وقت تک فائز رہے۔

(۱) مناقب الامام الاعظم للکردری: ۲/ ۱۶۵، طبع: دائرۃ المعارف النظامیۃ بحیدر آباد ۱۳۲۱ھ

(۲) مناقب الامام الاعظم للکردری: ۲/ ۱۶۵، طبع: دائرۃ المعارف النظامیۃ بحیدر آباد ۱۳۲۱ھ

(۳) مناقب الامام الاعظم للکردری: ۲/ ۱۶۵، طبع: دائرۃ المعارف النظامیۃ بحیدر آباد ۱۳۲۱ھ

وفات

امام محمد ؒ کے قاضی القضاۃ ہونے کے کچھ ہی دن بعد ہارون کو کسی ضرورت سے ''رے'' جانا پڑا، امام محمد کو بھی وہ اپنے ساتھ لے گیا، اسی مقام پر ۱۷۹ میں ۵۸ برس کی عمر میں امام فقہ نے داعی اجل کو لبیک کہا، اتفاق سے کسائی مشہور امام نحو بھی اس سفر میں ہارون کے ساتھ تھے، انہوں نے بھی اسی دن یا دو دن کے بعد انتقال کیا، ہارون کو ان دونوں ائمہ فن کے پے در پے انتقال کا بڑا رنج ہوا اور اس نے غایت افسوس میں کہا کہ: فقہ ونحو دونوں کو میں نے ''رے'' میں دفن کردیا "دَفَنْتُ الْيَوْمَ اللُّغَةَ وَالْفِقْهَ"(۱)

جبل طبرک جورے کا مشہور قلعہ ہے اسی میں امام فقہ کو سپرد خاک کیا گیا۔

جرأت وحق گوئی

آپ کے صحیفہ اخلاق کا ایک نمایاں باب جرأت وحق گوئی بھی تھا، جب کبھی حق بات کے اظہار کا موقع آجاتا تو آپ اس میں کسی کی رو ورعایت اور مداہنت نہیں کرتے تھے، یحیی طالبی کا ذکر اوپر آچکا ہے، ہارون نے اس سلسلہ میں بڑی کوشش کی کہ اس کی مرضی کے مطابق فتوی دے دیں؛ لیکن انہوں نے اس کے شاہانہ دبدبہ کی پرواہ کئے بغیر پوری جرأت کے ساتھ حق کا اظہار کیا۔

ایک روز امام محمد ؒ دوسرے علماء کے ساتھ ہارون کے محل میں بیٹھے ہوئے تھے، اتفاق سے اس وقت ہارون رشید بھی آگیا، تمام حاضرین اس کی تعظیم کے لئے کھڑے ہوگئے؛ لیکن امام محمد ؒ نے اپنی جگہ سے جنبش بھی نہیں کی، تھوڑی دیر بعد ہارون نے امام محمدؒ کو تخلیہ میں بلایا، امام محمد ؒ اندر گئے تو ہارون نے ان سے کہا: بنو تغلب (نصاری) کو نقض عہد کرکے میں قتل کرانا چاہتا ہوں، امام محمد نے فرمایا کہ حضرت عمر ؓ نے انہیں امن دے دی ہے، اس لئے نقض عہد کی کوئی گنجائش نہیں ہے، ہارون نے کہا کہ حضرت عمر ؓ نے اس شرط پر امان دی تھی کہ وہ اپنے بچوں کو بپتسمہ (عیسائی بنانا) نہ کریں؛ لیکن انہوں نے اس کی خلاف ورزی کی ہے، امام محمد ؒ نے فرمایا کہ: انہوں نے بپتسمہ کے

(۱) تاریخ بغداد: حرف الحاء: ۲/۱۸۱، دار الکتب العلمیة، بیروت

باوجود انہیں امان دی تھی، اس پر ہارون نے کہا کہ: حضرت عمر ؓ کو ان سے جنگ کا موقع نہیں مل سکا، امام محمد نے فرمایا: اگر ایسا ہے تو اس کے بعد حضرت عثمان ؓ اور حضرت علی ؓ کو ان سے جنگ کرنی چاہئے تھی؛ حالاں کہ ان لوگوں نے ان سے کوئی تعرض نہیں کیا، اس سے معلوم ہوتا ہے: ہ حضرت عمر ؓ نے ان سے بلاشرط صلح کی تھی، اس پر ہارون بہت خفا ہوا اور ان کو محل سے باہر نکلوایا، بعض روایتوں میں ہے کہ جب لاجواب ہوگیا تو اس نے پوچھا کہ: میرے آنے پر آپ میری تعظیم کے لئے کیوں کھڑے نہیں ہوتے، امام محمد ؒ نے جواب دیا کہ یہ خدام کا کام ہے، علماء کے درجہ سے یہ چیز فروتر ہے، آپ کے ابن عم (حضرت ابن عباس ؓ) نے آنحضرت ﷺ سے روایت کیا ہے کہ جو شخص یہ پسند کرتا ہے کہ لوگ اس کی تعظیم کے لئے باادب کی طرح کھڑے رہیں تو اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔(۱)

ایک مرتبہ ہارون رشید نے کسی شخص کے بارے میں امان لکھوائی، غالباً اس خیال سے دوسرے سے لکھوائی کہ ضرورت کے وقت اس سے انکار کی گنجائش نکل سکے، چنانچہ اس نے اس امان کے بارے میں امام محمد ؒ سے فتوی پوچھا کہ میں نے اسے اپنے ہاتھوں سے نہیں لکھا ہے، دوسرے سے لکھوایا ہے، تو کوئی شخص اگر قسم کھائے کہ وہ کوئی خط یا تحریر اپنے ہاتھ سے نہ لکھے گا؛ لیکن اگر دوسرے سے لکھوائے تو اس کی قسم ٹوٹے گی یا نہیں، امام محمد ؒ نے اپنی ذکاوت سے مسئلہ کی نوعیت کو سمجھ لیا، فرمایا کہ وہ قسم کھانے والا شخص عوام میں ہے تو جب تک وہ نیت نہ کرے اس کی قسم نہ ٹوٹے گی؛ لیکن اگر بادشاہ ہے تو قسم ضرور ٹوٹ جائے گی، اس لئے کہ بادشاہ کے حکم سے جو چیز لکھی جائی گی وہ بادشاہ کی ہی ہوگی، اس پر ہارون رشید بہت برافروختہ ہوا۔

انہیں تمام واقعات اور امام محمد ؒ کی حق گوئی اور بے باکی اور حق کی حمایت میں امراء اور سلاطین کی پرواہ بالکل نہ کرنے کی وجہ سے ہارون رشید کو یہ شبہ ہوا کہ ہمارے خلاف آئے دن جو طالبیوں کی سازش ہوا کرتی ہے، اس میں امام محمد کا ہاتھ ہے،

(۱) مناقب الامام الاعظم للکردری: ۲/۱۶۳، طبع: دائرۃ المعارف النظامیۃ بحیدرآباد ۱۳۲۱ھ

چنانچہ اس نے حکم دیا کہ ان کی کتابوں کا جائزہ لیا جائے کہ ان میں اس قسم کے باغیانہ خیالات تو نہیں پائے جائے، امام محمد کو جب معلوم ہوا تو انہوں نے محمد بن سماعہ سے جو ان تمام واقعات میں ان کے ساتھ تھے، کہا کہ: فوراً گھر پر جا کر میری کتابوں کو محفوظ کرلو، ورنہ ہوسکتا ہے کہ ایسی کوئی چیز ان میں شامل کردی جائے جو ان میں موجود نہ ہو، چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا، اس کے بعد جب ہارون کے سامنے یہ کتابیں پیش ہوئیں تو ان میں بجز حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل کی حدیثوں کے اور کوئی چیز نہیں ملی، اس پر ہارون رشید نے کہا کہ: اس سے زیادہ تو ان کے فضائل ہمارے پاس موجود ہیں۔

(۱۲) سوّار بن عبداللہ

اپنے علم میں ممتاز، حق کے معاملہ میں جری اور کارِ قضا میں مضبوط کردار ادا کرنے والے ہیں، قاضی بھی رہے، امیر بھی، طبیعت میں غیر معمولی قناعت تھی، ان کے صاحبزادے عبداللہ بن سوار نے ان سے پوچھا: ہم لوگ زیادہ دولت مند ہیں یا امیر المؤمنین؟ انہوں نے حکیمانہ جواب دیا: مال کے اعتبار سے امیر المومنین اور غناءِ نفس کے اعتبار سے ہم لوگ۔

عہدۂ قضا اور اصلاحات

منصب قضاء پر آتے ہی انہوں نے پوری شدت سے کام لیا، امین اور نائبین مختلف کاموں کے لئے مقرر کئے، ان کی تنخواہیں مقرر فرمائیں، اوقاف کا بندوبست اپنے ہاتھ میں لیا، مختلف اموال کے وصی اور نگرانوں کے کام کی نگہداشت کے لئے اپنی طرف سے عہدہ دار مقرر فرمائے، مقدمات اور متعلق کاموں کے لئے طویل فائلیں تیار کرائیں، اور ایسے اموال جن کے مالکوں کا پتہ نہیں ہوتا انہیں اپنی نگرانی میں لیا، ایسے مال کا نام ''حشریہ'' رکھا، مزاجاً بردبار تھے، خیر کی تلاش میں رہتے، غصہ بہت کم آتا، گفتگو میں بڑی حکمت تھی، مسائل کو سلجھانے اور مفاہمت کرانے کا خاص سلیقہ تھا۔(۱)

(۱) اخبار القضاۃ: سوار بن عبداللہ بن قدامۃ: ۲/ ۵۷، مکتبۃ التجاریۃ بمصر

☆ بصرہ میں ایک نہر تھی جسے ''نہر ابن عمر'' کہا جاتا تھا، خلیفہ منصور نے اسے بند کردینا چاہا، حضرت سوار ایک وفد لے کر منصور کے دربار میں حاضر ہوئے اور ان سے کہا کہ: امیر المؤمنین! اگر آپ ایک لاکھ انسانوں کو پیاس سے ماردینا چاہتے ہیں تو نہر بند کردیں، میں آپ کو اہل بصرہ سے ڈراتا ہوں، خلیفہ نے کہا: تم مجھے بصرہ والوں سے ڈراتے ہو، میں سپہ سالار کو بھیج کر ان کے آخری سے آخری آدمی کو ختم کردوں گا، سوار نے کہا: حضرت! میرا وہ مقصد نہیں تھا جو آپ نے سمجھا، میں آپ کو یتیم کی بددعا سے، بیواؤں اور بے سہارا لوگوں سے ڈراتا ہوں، خلیفہ منصور اپنے ارادہ سے باز آگیا اور اسی وقت انہیں بصرہ کا قاضی مقرر کیا۔

☆ ایک دفعہ سوار ابوجعفر المنصور کے یہاں گئے اور اس کے دست بوسی کئے بغیر بیٹھ گئے، ابوجعفر کو چھینک آئی اس نے الحمد للہ نہیں کہا تو سوار نے بھی اس کا جواب نہیں دیا، پھر اس کو چھینک آئی تو اس نے الحمد للہ کہا تو سوار نے چھینک کا جواب دیا، پھر سوار وہاں سے اٹھ کر چلے گئے اور ابوجعفر ان کو تکتا رہ گیا "فَأَتْبَعَهُ أَبُوْ جَعْفَرٍ بَصَرَهُ"۔(۱)

☆ ایک دفعہ عقبۃ بن سلم الہنائی بصرۃ کے گورنر نے ایک شخص سے موتی لے لیا جس کو اس نے سمندر سے حاصل کیا تھا اور اس کو قید کردیا، اس شخص کی بیوی سوار بن عبد اللہ کے پاس مقدمہ لے کر آئی، اس نے کہا: میں اللہ پر بھروسہ کرتی ہوں، پھر قاضی پر، امیر عقبہ بن مسلم نے میرے شوہر کو گرفتار کرلیا ہے اور اس کا موتی اس سے چھین لیا ہے، اور اسے جیل میں قید کردیا ہے، چنانچہ سوار نے اس بات کی حقیقت جاننے کے لئے امیر کے پاس کارندہ بھیجا اور یہ کہلا بھیجا کہ اگر یہ بات درست ہے تو اس آدمی کو رہا کردو اور اس کا موتی اس کے حوالے کردو، عقبہ کو جب پیغام پہنچا تو اس نے اس کو ٹھکرا دیا، اور سوار کو بری بری گالیاں دیں، چنانچہ کارندے نے ساری تفصیلات سوار کو بتادیں، تو سوار نے یہ کہلا بھیجا کہ اگر تم اس

(۱) اخبار القضاۃ: سوار بن عبداللہ بن قدامۃ: ۲/ ۵۷

آدمی کو رہا نہ کرو گے اور اس کا موتی اس کے حوالہ نہ کرو گے تو میں خود تمہارے پاس سفید کپڑے زیب تن کر کے آؤں گا، اور تمہیں بغیر کسی ہتھیار اور فوج کے تباہ وتاراج کردوں گا، اور تمہارا ایسا انجام کروں گا لوگ ایک مدت تک اس کا چرچا کریں گے، " وَلأَقْتُلَنَّكَ قِتْلَةً يَتَحَدَّثُ النَّاسُ بِهَا"، جب عقبہ کے مصاحبوں نے اس درشت کلام اور سخت لب ولہجہ کو سنا تو اس کو سمجھایا کہ قاضی کی بات مان لی جائے۔(۱)

(۱۳) قاسم بن معن

نام قاسم، کنیت ابوعبداللہ اور اسم گرامی معن تھا، مخزن علم کوفہ کو ان کی وطنیت کا شرف حاصل ہے، ان کے جد امجد حضرت عبد اللہ بن مسعود ؓ کی شخصیت آسمان صحابیت کا وہ کوکب تاباں تھی جس پر پوری اسلامی تاریخ فخر کرتی ہے، وہ نہ صرف قرآن وحدیث اور اصول وفرائض وغیرہ میں یگانہ روزگار تھے؛ بلکہ فقہ میں ایک مستقل مکتبِ فکر کے بانی بھی تھے، جس کی اساس پر بعد میں فقہ حنفی کا فلک رفعت محل تعمیر ہوا، قاضی قاسم نے اپنی اس آبائی وراثت سے خوب وافر حصہ پایا تھا۔

فضل وکمال

علمی اعتبار سے ان کا مرتبہ اور مقام نہایت ہی بلند تھا، جملہ علوم وفنون پر انہیں کامل دسترس حاصل تھا، حدیث، فقہ، تاریخ ورجال، زبان وادب میں ان کا عبور مسلم خیال کیا جاتا تھا، امام ابو حاتم ؒ بیان کرتے ہیں ۔"كَانَ مِنْ أَرْوَى النَّاسِ لِلْحَدِيْثِ وَالشِّعْرِ وَأَعْلَمُهُمْ بِالْعَرَبِيَّةِ وَالْفِقْهِ" (۲) وہ حدیث، فقہ اور عربیت کے بہت بڑے واقف کار تھے ۔: "كَانَ إِمَامًا عَلاَّمَةً ثِقَةً قَاضِيَ الكوفة "(۳)

(۱) اخبار القضاة: سوار بن عبداللہ بن قدامة: ۲/۵۷
(۲) تذکرۃ الحفاظ: الطبقۃ الخامسۃ من الکتاب: ۱/۱۷۵، دار الکتب العلمیۃ، بیروت
(۳) شذرات الذہب: ۱/۲۷۹، دار الکتب العلمیۃ، بیروت

ابن ناصر کہتے ہیں کہ وہ امام، علامہ، ثقہ اور کوفہ کے قاضی تھے۔

علامہ یاقوت حموی لکھتے ہیں کہ:

"إِنَّ الْقَاسِمَ مِنَ الْمُحَدِّثِيْنَ وَالْفُقَهَاءِ وَالزُّهَّادِ وَالثِّقَاتِ وَلَمْ يَكُنْ بِالْكُوْفَةِ فِيْ عَصْرِهِ نَظِيْرُهُ وَلَا أَحَدٌ يُّخَالِفُهُ فِيْ شَيْءٍ يَّقُوْلُهُ"(۱)

"بلا شبہ قاسم بن معن محدثین، فقہائ، زہاد اور ثقات کے زمرہ میں شمار کئے جاتے ہیں، اور کوفہ میں اس زمانے میں ان کی کوئی نظیر نہ تھی اور نہ ان کے قول کی مخالفت کرنے والا کوئی شخص تھا"۔

اگر قاضی قاسم اپنی تبحر علمی اور فضل وکمال کی وجہ سے امامت اور اجتہاد کے درجہ پر فائز تھے؛ لیکن چوں کہ انہوں نے ایک عرصہ تک امام ابوحنیفہ ؒ کی ہم نشینی کا شرف حاصل کیا تھا اور وہ ان کی علمی ژرف بینی اور نکتہ رسی سے بے حد متاثر تھے، اس لئے بیشتر امور میں ان ہی کے مسلک کے پیرو تھے، اور اسی کے مطابق فتوی دیتے تھے، "كَانَ فَقِيْهًا فِيْ رَأْيِ أَبِيْ حَنِيْفَةَ وَلَقِيَهُ" (۲) ایک مرتبہ ان سے کسی نے دریافت کیا کہ: آپ خود کو امام ابوحنیفہ ؒ کے غلاموں میں شمار کرنا پسند کریں گے، برجستہ فرمایا:

"مَا جَلَسَ النَّاسُ إِلٰى أَحَدٍ أَنْفَعُ مِنْ مُجَالَسَةِ أَبِيْ حَنِيْفَةَ"(۳)

"امام ابوحنیفہ ؒ کی صحبت سے زیادہ نفع بخش کسی اور کی مجلس نہیں"

عہدۂ قضا

فقہ وافتاء میں غیر معمولی مہارت کے باعث کوفہ کے عہدۂ قضا پر بھی ایک طویل عرصہ تک مامور رہے، ان کے جد امجد حضرت عبد اللہ بن مسعود ؓ بھی کامل دس سال

(۱) معجم الأدباء: القاسم بن معن المسعودی: ۵/۲۲۳۲، دار الغرب الإسلامی، بیروت
(۲) معجم الأدباء: القاسم بن معن المسعودی: ۵/۲۲۳۲، دار الغرب الإسلامی، بیروت
(۳) اخبار القضاة، القاسم بن معن: ۳/۱۶۷

تک کوفہ کے قاضی اور افسر خزانہ رہ چکے تھے، جب قاضی شریک نخعی کی معزولی کے بعد یہ آبائی وراثت قاسم کے ہاتھوں میں آئی تو انہوں نے اس فرض کو ایسی شان وشوکت اور احتیاط وانصاف کے ساتھ انجام دیا کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے دور کی یاد تازہ ہوگئی۔

خلیفہ منصور کے زمانہ میں اس عہدہ کی ذمہ داریاں سنبھالیں اور پھر ہارون الرشید کے عہد تک برابر اس پر مامور رہے۔

ایثار وتبرع

استغناء اور بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ اپنے طویل زمانہ قضاء میں کبھی مشاہرہ اوراجرت لینا پسند نہ کیا اور تاحیات تبرعاً یہ خدمت انجام دی، علامہ ابن سعد رقم طراز ہیں:

"وُلِّيَ قَضَاءُ الْكُوفَةِ وَلَمْ يَرْزُقْ عَلَيْهِ شَيْئًا حَتّٰى مَاتَ" (۱)

''وہ کوفہ کے قاضی مقرر ہوئے اور زندگی بھر اس کا مشاہرہ نہیں لیا''

جب ان کی خدمت میں تنخواہ پیش کی جاتی تو اس کو فوراً مستحقین میں تقسیم کردیتے اور اس میں سے ایک حبہ اپنے استعمال میں نہ لاتے۔

یزید بن یحیی کہتے ہیں:

"كَانَ الْقَاسِمُ يُقَسِّمُ أَرْزَاقَهُ إِذَا جَائَتْهُ وَلاَ يَسْتَحِلُّ أَنْ يَّاخُذَ رِزْقًا" (۲)

''امام قاسم کے پاس جب تنخواہ آتی تو اس کو تقسیم کردیتے تھے اور کوئی مشاہرہ لینا جائز نہیں سمجھتے تھے''

حالت مرض میں فریضۂ قضاء کی ادائیگی

اس تبرع و بے نیازی کے باوجود منصب قضاء کی منصبی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں سرمو کوتاہی نہ کرتے؛ یہاں تک کہ شدید علالت ونقاہت کی حالت میں بھی مجلس عدالت منعقد کرتے اور پوری حاضر دماغی کے ساتھ عدالتی فیصلے نافذ کرتے، ابن کناسہ بیان

(۱) معجم الأدباء: القاسم بن معن المسعودی: ۲۲۳۱/۵
(۲) أخبار القضاة: القاسم بن معن: ۱۷۷/۳

کرتے ہیں کہ: قاسم سخت بیماری کے عالم میں بھی عدالت میں بیٹھے تھے "كَانَ يَحْكُمُ الْحُكْمَ وَهُوَ عَلِيْلٌ" (۱)

شرافت ونجابت

فطری شرافت، نرم خوئی اور بلند ظرفی ان کی شخصیت کے خاص جوہر تھے، اس کا اندازہ لگانے کے لئے صرف اس واقعہ کا نقل کردینا کافی ہے:

ایک شخص نے اپنے مکان کی چھجہ اتنا نیچا لگوا رکھا تھا کہ اس سے راہ گیروں کو دقت پیش آتی تھی، لوگوں نے اس معاملہ کو قاضی قاسم کی بارگاہِ عدل وانصاف میں پیش کیا، قاضی موصوف نے اس کے انہدام کا فیصلہ صادر کیا، اس پر مالکِ مکان نے بغیر کسی رو ورعایت کے قاضی سے کہا کہ: ''پھر آپ نے کیوں اپنے مکان میں سرراہ روزن کھلوار رکھے ہیں؟ فرمایا: اس سے کسی راہگیر کو زحمت نہیں ہوتی اور نہ سواریوں کی آمد ورفت میں کوئی رکاوٹ پیدا ہوتی ہے'' اس کے بعد فوراً اپنے بعض خدام کو حکم دیا کہ وہ جاکر پہلے ان کے مکان کے روزن بند کردیں اور پھر بعد میں اس شخص کے چھجہ کو منہدم کریں؛ تاکہ پھر آئندہ کوئی شخص اس معاملہ میں انہیں شرمندہ نہ کرسکے۔ "فَأَهْدِمْ فِيْ مَنْزِلِيْ أَوَّلًا، ثُمَّ أَهْدِمْ فِيْ مَنْزِلِهِ" (۲)

خلیفہ کے نزدیک قدر ومنزلت

ان کے علم وفضل اور ایثار وقربانی سے خلیفہ ہارون رشید بے حد متاثر تھا، بعض مفسد قاضی قاسم کے خلاف برابر ریشہ دوانیوں میں مصروف رہتے اور خلیفہ کو ان کے خلاف برانگیختہ کرنے کی کوشش کرتے؛ لیکن وہ کسی بات پر کان نہ دھرتا۔

ایک مرتبہ ہارون ''حیرۃ'' گیا اور چالیس دن تک وہاں مقیم رہا؛ لیکن قاضی قاسم بن معن اس سے ملنے نہ آئے، اس پر وزیر فضل نے خلیفہ سے کہا کہ: حضور آپ چالیس دن سے یہاں آئے ہوئے ہیں، اس عرصہ میں تمام شرفاء اور قضاۃ آپ کے دربار میں

(۱) أخبار القضاة: القاسم بن معن: ۱۷۸/۳
(۲) اخبار القضاة: القاسم بن معن: ۱۷۷/۳

حاضر ہوئے، مگر آپ نے خیال نہ فرمایا کہ قاسم بن معن ابھی تک نہیں آئے، یہ سن کر خلیفہ نے نہایت ترش لب ولہجہ میں جواب دیا۔

"مَا أَعْرِفُنِيْ أَيُّ شَيْءٍ تُرِيْدُ، تُرِيْدُ أَنْ أَعْزِلَهُ، لاَ وَاللهِ لاَ أَعْزِلُهُ" (۱)

''مجھے معلوم نہیں کہ تم کیا چاہتے ہو؟ کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ میں قاسم کو معزول کردوں، نہیں بخدا میں ایسا نہیں کرسکتا''

وفات

۱۷۵ھ میں خلیفہ ہارون الرشید کے ہمراہ مقام رقہ کی طرف روانہ ہوئے، درمیان میں مقام رأس العین میں پہنچ کر پیغام اجل آگیا اور محبوب حقیقی سے جا ملے، احمد بن کامل نے ان کا سنہ وفات ۱۸۸ھ بتلایا ہے؛ لیکن بقول مرزبانی اول الذکر ہی صحیح ہے۔ (۲)

خواجہ غلام الثقلین۔ وکیل (م ۳/۹/۱۹۱۵ء):

وہ وکالت کرتے تھے؛ لیکن ایک آزاد منش مزدور کی طرح، اگر مہینے کے پہلے چند روز میں ماہوار خرچ کے لائق فیس مل جاتی تو وہ باقی سارا وقت اپنے قومی اور علمی کاموں میں لگا دیتے، عدالت میں دکان لگا کر نہ بیٹھتے، بارہا ایسا ہوا کہ ان کے پاس گاؤں سے مقدمہ والے آتے اور انہیں وکیل کرنا چاہتے؛ لیکن اکثر وہ ان فریقوں کو بلا لیتے، انہیں مقدمہ بازی کے خطروں سے آگاہ کرتے اور ان کا اعتماد حاصل کر کے خود ہی بغیر ایک پیسہ لئے جھگڑے کا فیصلہ کر دیتے۔ (خواجہ علام السیدالدین)

علی گڑھ کالج میں ان سے پہلے اور غالباً ان کے بعد بھی، کوئی ایسا طالب علم نہیں ہوا جس کا مطالعہ ایسا گہرا اور معلومات اتنی وسیع ہو اور جو کام کرنے میں ایسا انتھک ہو۔ (مولوی عبدالحق)

علمی لحاظ سے ہمارے طلبہ میں کوئی طالب علم غلام الثقلین جیسا نہیں ہوا۔ (کالج پرنسپل، سرتھیوڈور بک)

(۱) اخبار القضاۃ: القاسم بن معن: ۱۸۰/۳

(۲) معجم البلدان: ۲۰۰/۶

کالج کے زمانے سے ان کا معمول تھا کہ تقریباً ہر روز یا انگریزی یا فارسی کی ایک کتاب ختم کر دیتے تھے اور اس شغف میں اکثر کھانا بھول جاتے تھے (خواجہ غلام السیدالدین)

ان کا انتقال، قرآن سنتے ہوئے ہوا۔ (۱)



(۱) سب کے لئے، مولف ابن غوری: ۹۴

مسلمان حکمرانوں اور قضاۃ کے
دیگر عدل گستری اور صدق وامانت کے واقعات

☆ کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور خالد بن زید جہنی روایت کرتے ہیں دونوں نے بیان کیا کہ: ایک اعرابی آیا اور عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! ہمارے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کر دیجئے، اس کا فریق مخالف کھڑا ہوا اور عرض کیا: ٹھیک ہے ہمارے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کر دیجئے، اعرابی نے کہا کہ: میرا بیٹا اس کے یہاں مزدور تھا، اس نے اس کی بیوی سے زنا کیا، لوگوں نے مجھ سے کہا کہ تیرے بیٹے کو سنگسار ہونا چاہئے، میں نے اپنے بیٹے کو سو بکریاں اور ایک لونڈی دے کر چھڑا لیا، پھر میں نے علم والوں سے دریافت کیا تو انہوں نے کہا تیرے بیٹے کو ایک سو کوڑے لگنے چاہئیں اور ایک سال کے لیے جلاوطن ہونا چاہئے، نبی ﷺ نے فرمایا: تمہارے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کر دوں گا، لونڈی اور بکریاں تو تجھے واپس کی جاتی ہیں اور تیرے بیٹے کو ایک سو کوڑے پڑیں گے اور ایک سال کے لیے جلاوطن ہوگا اور ایک آدمی سے آپ ﷺ نے فرمایا: اے انیس کل تو اس شخص کی بیوی کے پاس جا اگر (وہ زنا کا اقرار کرے تو) اس کو سنگسار کر دے "فَإِنِ اعْتَرَفَتْ فَارْجُمْهَا" چنانچہ انیس نے صبح کے وقت جا کر اس کو سنگسار کر دیا۔(۱)

☆ قاضی امیر حکم کی شہادت کورد کرتا ہے

سعید بن عبد الرحمن الداخل نے قاضی ابن بشیر کی خدمت میں ایک مقدمہ میں

(۱) بخاری: باب من أمر غیر الإمام بإقامة الحد، حدیث: ٦٨٤٢

اپنی طرف سے ایک آدمی کو نائب بنا کر بھیجا، دراصل سعید بن عبد الرحمن کے قبضہ میں ایک تحریر تھی، جس میں چند صاحب اثر لوگوں کے دستخط تھے، دستخط کنندگان میں سے سارے لوگوں کی وفات ہو چکی تھی، صرف امیر المؤمنین حکم اور ایک آدمی زندہ تھا، یہ دوسرا آدمی سعید بن عبد الرحمن کے حق میں لکھی گئی تحریر کی گواہی تو دیتا تھا؛ مگر کچھ دنوں بعد اس کی بھی موت واقع ہوگئی، ادھر تحریر سے متعلقہ مقدمہ وقت کے ساتھ ساتھ پیچیدہ ہوتا جارہا تھا۔

ایک دن سعید بن عبد الرحمن یہ نوشتہ دیوار لے کر امیر حکم کے پاس گیا اور اس کے عہدہ امیر کے دستخط دکھلائے جو اس نے اپنی خلافت سے پہلے اپنے باپ کے عہدِ حکومت میں کئے تھے، سعید بن عبد الرحمن نے امیر کو یہ نوشتہ دیوار بطور یاددہانی دکھلایا؛ تاکہ قاضی کے پاس جب نوشتہ دیوار جائے تو وہ اسے نافذ کرے اور اس کو باطل قرار دینے سے گریز کرے۔

امیر حکم اپنے چچا سعید بن عبد الرحمن سے کہا کہ: چچا جان! ہم اب شہادت کے دینے کے قابل نہ رہے، ہم دنیوی چاہت میں جس طرح ٹوٹ پڑے ہیں اس سے آپ بخوبی واقف ہیں، اس لئے ہماری شہادت قبول نہ کی جائے گی، اس لئے مجھے رسوا نہ کیجئے، سعید بن عبد الرحمن نے حکم کی تجویز قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ سبحان اللہ! بھلا قاضی کی کیا مجال کہ وہ آپ کے حکم کو رد کر دے، الغرض حکم نے چچا کا اصرار دیکھ کر قاضی کے سامنے شہادت دینے کا وعدہ کر لیا، چنانچہ اس نے مشہور زمانہ دو فقیہوں کو بلایا، ایک کاغذ پر اپنی شہادت کا مضمون قلم بند کیا اور اس پر مہر لگا کر فقیہوں کو دے دیا، پھر گویا ہوا، آپ دونوں میرا یہ نوشتہ لے کر قاضی کی خدمت میں جائیں، دونوں فقیہ حکم کی تعمیل میں قاضی کی عدالت میں اس وقت پہنچے، جب وہ عدالت کی کرسی پر گواہوں کے بیانات سننے کے لئے جلوہ افروز ہوا، جب انہوں نے خلیفہ کا خط قاضی کے ہاتھ میں دیا تو اس نے خط کا مضمون پڑھا اور پھر فقیہوں کی بات سن کر گویا ہوا۔

میں نے آپ دونوں کا مقصد سن لیا، اب آپ لوگ بخیر وعافیت اللہ کی حفظ وامان میں واپس جاسکتے ہیں۔

اتنے میں سعید بن عبدالرحمن کا نائب حاضر ہوا اور پورے اعتماد کے ساتھ قاضی سے یوں مخاطب ہوا: آپ کے پاس امیر کی شہادت بھی پہنچ چکی ہے، اب اس سلسلے میں آپ کیا کہیں گے؟ قاضی نے نائب سے وہ نوشتہ دیوار لیا اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد کہا: ''میرے نزدیک یہ شہادت قابل قبول نہیں، میرے پاس کوئی عادل شاہد لے کر آؤ'' یہ فیصلہ سنتے ہی نائب گھبرا سا گیا اور جلدی سے سعید بن عبدالرحمن کی خدمت میں پہنچا اور حقیقت حال سے آگاہ کیا، جب سعید بن عبدالرحمن کے کانوں سے قاضی کا فیصلہ ٹکرایا تو گویا کہ اس کے پاؤں تلے زمین کھسک گئی، فوراً سواری پر بیٹھا اور امیر حکم کی خدمت میں پہنچ کر یہ واویلا کرنے لگا۔

''ہماری سلطنت چلی گئی، ہمارا رعب و دبدبہ زائل ہوگیا، اس قاضی کی یہ مجال کہ آپ کی شہادت کو بھی ردی کی ٹوکری میں ڈال دے'' سعید نے امیر کو مزید اکساتے ہوئے کہا کہ: اللہ تعالی نے آپ کو حکومت سونپی ہے اور اپنے بندوں کے امیر کے طور پر منتخب فرمایا ہے اور مسلمانوں کے جان و مال کا نگہبان بنایا ہے، یہ قاضی اس لائق نہیں ہے کہ اسے آپ یہ اہم منصب سونپیں۔ سعید کا طویل کلام سن کر امیر گویا ہوا: ''چچا جان! کیا میں نے اس قضیے میں کسی شک کا اظہار کیا ہے؟ قاضی ایک نیک و صالح آدمی ہے، اللہ کی راہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت اس کو حق بات سے نہیں پھیر سکتی، جو اس پر واجب تھا اس نے کیا، اور وہ چور دروازہ بند کر دیا جس سے بمشکل داخل ہوا جا سکتا تھا، اللہ تعالیٰ قاضی کو جزائے خیر دے، یہ سن کر سعید کو غصہ آگیا اور وہ کہنے لگا: میرے حق میں آپ کی طرف سے یہی کچھ کہنے کو رہ گیا ہے۔

امیر نے جواب دیا: ''نَعَمْ قَدْ قَضَيْتُ الَّذِيْ كَانَ لَكَ عَلَيَّ وَلَسْتُ وَاللهِ! أُعَارِضُ الْقَاضِيَ فِيمَا احْتَاطَ لِنَفْسِهِ وَلاَ أَخُوْنُ الْمُسْلِمِيْنَ فِيْ قَبْضِ يَدٍ مِّثْلِهِ'' ہاں میرے اوپر آپ کا حق بنتا تھا اسے میں نے پورا کر دیا اور اللہ کی قسم! قاضی نے اپنے آپ کو جس احتیاط سے محفوظ رکھا ہے، میں اس کے بارے میں اس کے آڑے نہیں آؤں گا اور نہ اس قسم کے (خوددار اور اچھے) لوگوں کو (حق بات سے)

روک کر مسلمانوں کے حق میں خیانت کا مرتکب ہوں گا''۔(۱)

☆ گورنر کے سامنے اس کا بیٹا کوڑے کھاتا ہے:

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ امیر المؤمنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں مصر کے حاکم تھے، مصر کا ایک آدمی حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا:

اے امیر المؤمنین! میں ظلم سے آپ کی پناہ لینے آیا ہوں۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: تم نے ایسے آدمی کی پناہ حاصل کی ہے جو تمہیں پناہ دے سکتا ہے، مصری بولا: میں نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے بیٹے کے ساتھ دوڑ میں مقابلہ کیا، میں اس سے آگے بڑھ گیا تو وہ مجھے کوڑے سے مارنے لگا اور کہنے لگا: میں شریف خاندان کا بیٹا ہوں، یہ شکوہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مصر کے حاکم حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو خط لکھا کہ وہ اپنے بیٹے کے ساتھ تشریف لائیں، عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اپنے بیٹے کے ساتھ امیر المؤمنین کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے پوچھا: مصری کہاں ہے؟ وہ سامنے آیا اور کہنے لگا: یہ کوڑا لے اور مار، امیر المؤمنین کا حکم ملتے ہی عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے بیٹے پر کوڑا برسانے لگا اور امیر المؤمنین کہتے جا رہے تھے، شریف خاندان کے بیٹے کو مارو، حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ: مصری نے عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے بیٹے کو کوڑے لگائے اور اللہ کی قسم! بہت مارا اور ہم اس کی پٹائی چاہتے بھی تھے؛ لیکن مصری برابر مارے جا رہا تھا، حتی کہ ہماری خواہش ہوئی کہ اب اس کی پٹائی بند ہو جائے، پھر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے مصری سے فرمایا: کوڑا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی چندیا (گنجے سر) پر بھی لگاؤ'' مصری نے عرض کیا: اے امیر المؤمنین! ان کے بیٹے نے میری پٹائی کی ہے اور میں اس سے قصاص لے لیا، پھر امیر المؤمنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ عمرو رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا:

''تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنا رکھا ہے جب کہ ان کی ماؤں نے

(۱) قصص العرب: ۳/۹۶-۹۷

انہیں آزاد جنا تھا''(مُذْ كُنَّ تَعَبْدتُّمُ النَّاسَ وَقَدْ وَلَدَتْهُمْ أُمَّهَاتُهُمْ أَحْرَارًا) ۔عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے عرض کیا:''یا أمیر المؤمنین ! لم أعلم ولم یأتنی '' اے امیر المومنین ! مجھے اس معاملے کی کچھ خبر بھی نہیں اور نہ یہ میرے پاس شکایت لے کر آیا تھا''(۱)

☆ مجھ سے اپنا بدلہ لے لو

احنف بن قیس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ: ہم چند لوگ ایک عظیم الشان خوشخبری سنانے کے لئے امیر المؤمنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے دریافت کیا، آپ لوگوں نے کونسی جگہ قیام فرمایا؟ ہم نے عرض کیا: فلاں جگہ، امیر المؤمنین ہمارے ساتھ ہمارے پڑاؤ کی طرف چلنے لگے جہاں ہم نے اونٹوں کو بھی باندھ رکھا تھا اور اونٹوں کی حالت یہ تھی کہ مسلسل بھوک کی شدت سے وہ کمزور ہو چکے تھے اور کئی دنوں کے سفر نے انہیں تھکا دیا تھا، اونٹوں کی حالت زار دیکھتے ہی امیر المؤمنین گویا ہوئے: کیا تمہیں سواریوں کے بارے میں اللہ تعالی سے ڈر نہیں لگتا، کیا تمہیں اس بات کی خبر نہیں کہ ان چوپایوں کے بھی تمہارے اوپر حقوق ہیں؟ تم نے ان اونٹوں کو راستے میں کچھ آرام کے لئے کیوں نہ چھوڑ دیا؛ تاکہ یہ زمین کی نباتات کھا لیتے؟

ہم نے عرض کیا: امیر المؤمنین! عظیم فتح وکامرانی کی خوشخبری لے کر ہم تیزی کے ساتھ بھاگتے دوڑتے آپ کی خدمت میں چلے آئے ہیں؛ تاکہ آپ اور دیگر مسلمانوں کو اس خوشخبری سے خوشی ہو اور ان کا کلیجہ ٹھنڈا ہو، یہی وجہ ہے کہ ہم لوگوں نے راستے میں اپنی سواریوں کو روکنا گوارا نہیں کیا، امیر المومنین ہماری باتیں سن کر لوٹ گئے اور ہم بھی ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگے، اسی دوران میں ایک آدمی شکایت لے کر حاضر ہو گیا اور کہنے لگا! امیر المومنین! فلاں شخص نے مجھ پر ناحق ظلم وزیادتی کی ہے، آپ اس کے خلاف میری مدد کریں۔

امیر المومین نے اپنا کوڑا بلند کیا اور اس کے سر پر دے مارا فرمانے لگے:

(۱) حیاۃ الصحابۃ: محمد یوسف کاندھلوی: ۳۳۸/۲، موسسۃ الرسالۃ، بیروت

"تَدْعُونَ عُمَرَ ، حَتّٰى إِذَا شَغَلَ فِيْ أُمُوْرِ الْمُسْلِمِيْنَ أَتَيْتُمُوْهُ وَقُلْتُمْ : أَغِثْنِيْ ، أَغِثْنِيْ " عجب تماشا ہے کہ تم لوگ (خالی اوقات میں) عمر کے سامنے اپنا قضیہ پیش نہیں کرتے ہو، مگر جب عمر مسلمانوں کے اہم معاملات کو سلجھانے میں مصروف ہو جاتا ہے تو پھر تم آ کر کہنے لگتے ہو کہ میری مدد کرو، میری مدد کرو۔

چنانچہ وہ آدمی خود کو ملامت کرتے ہوئے واپس ہو گیا، امیر المؤمنین نے فوراً ہی اس آدمی کو واپس بلانے کا حکم دیا، جب وہ واپس آیا تو آپ نے اپنا کوڑا اس آدمی کے آگے ڈال دیا اور کہنے لگے: "اقتص" مجھ سے بدلہ لے لو، وہ کہنے لگا: نہیں، میں بدلہ نہیں لوں گا؛ بلکہ میں اسے اللہ کے لئے اور آپ کے لئے چھوڑتا ہو، امیر المؤمنین نے فرمایا: ایسا نہیں ہوگا، یا تو تم اللہ کے لئے درگزر کر دو اور اس کا بدلہ اسی سے مانگو، بصورت دیگر مجھ پر چھوڑ دو (پھر ایسی صورت میں تمہیں مجھ سے قصاص لینا پڑے گا) وہ کہنے لگا: نہیں نہیں، میں اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لئے معاف کرتا ہوں، اس کے بعد امیر المؤمنین وہاں سے چل پڑے اور گھر پہنچے، ہم لوگ بھی آپ کے ہمراہ تھے، آپ نے دو رکعت نماز ادا فرمائی اور خود کو مخاطب کر کے کہنے لگے:

> ''ابن الخطاب! تو ایک خاکسار ومتواضع آدمی تھا تو اللہ تعالی نے تجھے اعلیٰ مقام ومرتبے سے نوازا، تو گم گشتہ راہ تھا، تو اللہ تعالی نے تجھے ہدایت کی روشنی سے آشنا کیا، تو ایک ذلیل انسان تھا تو اللہ تعالی نے تجھے عزت واکرام بخشا اور پھر لوگوں پر حکمراں بنایا، مگر جب ایک آدمی اپنے اوپر ظلم کرنے والے کے خلاف تجھ سے تعاون طلب کرنے کے لئے حاضر ہوا تو تو نے اس کی پٹائی کر دی، ذرا بتا کہ کل قیامت کے روز تو اپنے پروردگار کو کیا جواب دے گا؟'' احنف بن قیس کا بیان ہے: امیر المؤمنین نے یہ کہہ کر اپنے اوپر اس طرح ملامت کی کہ مجھے یقین ہو گیا کہ آپ پوری دنیا والوں میں اس وقت سب سے بہتر ہیں''(۱)

(۱) قصص العرب: ۱۳/۳-۱۴

☆ مظلوم کی بددعا سے بچو

جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ اہل کوفہ نے عمر رضی اللہ عنہ سے سعد رضی اللہ عنہ کی شکایت کی تو عمر رضی اللہ عنہ نے سعد کو معزول کردیا، اور عمار رضی اللہ عنہ کو ان لوگوں کا حاکم بنایا ان لوگوں نے (سعد رضی اللہ عنہ کی بہت سی) شکایتیں کیں، یہاں تک کہ بیان کیا کہ وہ نماز اچھی طرح نہیں پڑھتے، تو عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو بلا بھیجا اور کہا: کہ اے ابواسحاق! یہ لوگ کہتے ہیں کہ تم نماز اچھی طرح نہیں پڑھتے، انہوں نے کہا سنو! اللہ کی قسم! ان کے ساتھ میں نے ویسی نماز ادا کی ہے جیسے حضور ﷺ کی نماز ہوتی تھی، چنانچہ پہلی دو رکعتوں میں زیادہ دیر لگاتا تھا اور اخیر کی دو رکعت میں تخفیف کرتا تھا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: اے ابواسحاق! تم سے یہی امید تھی، پھر عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص یا چند شخصوں کو سعد رضی اللہ عنہ کے ہمراہ کوفہ بھیجا، تاکہ وہ کوفہ والوں سے سعد رضی اللہ عنہ کی بابت پوچھیں) (چنانچہ وہ گئے) اور انہوں نے کوئی مسجد نہیں چھوڑی کہ جس میں سعد رضی اللہ عنہ کی کیفیت نہ پوچھی ہو اور سب لوگ ان کی عمدہ تعریف کرتے رہے یہاں تک کہ بنی عبس کی مسجد میں گئے تو ان میں سے ایک شخص کھڑا ہوگیا، اس کو اسامہ بن قتادہ رضی اللہ عنہ کہتے تھے کنیت اس کی ابوسعدہ تھی اس نے کہا کہ سنو! جب تم نے ہمیں قسم دلائی تو مجبور ہوکر میں کہتا ہوں کہ سعد رضی اللہ عنہ لشکر کے ہمراہ جہاد کو خود نہ جاتے تھے اور غنیمت کی تقسیم برابر نہ کرتے تھے سعد (یہ سن کر) کہنے لگے کہ دیکھ میں تین بددعائیں تجھ کو دیتا ہوں اے اللہ! اگر یہ تیرا بندہ جھوٹا ہو نمود و نمائش کے لئے اس وقت کھڑا ہوا ہو تو اس کی عمر بڑھا دے اور اس کو فقر میں مبتلا کر، اور اس کو فتنوں میں مبتلا کردے، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اس کے بعد جب اس سے (اس کا حال) پوچھا جاتا تھا تو کہتا ایک بڑی عمر والا بوڑھا ہوں، فتنوں میں مبتلا مجھے سعد رضی اللہ عنہ کی بددعا لگ گئی۔ عبدالملک (راوی حدیث) کہتے ہیں کہ میں نے اس کو دیکھا ہے، اس کی دونوں ابرو اس کی آنکھوں پر بڑھاپے کے سبب سے جھک پڑی ہیں، وہ راستوں میں لڑکیوں کو چھیڑتا ہے، ان پر دست درازی کرتا ہے "فَأَنَا رَأَيْتُهُ بَعْدُ قَدْ سَقَطَ حَاجِبَاهُ عَلَى عَيْنَيْهِ مِنَ الْكِبَرِ وَأَنَّهُ لَيَتَعَرَّضُ لِلْجَوَارِي فِي الطُّرُقِ يَغْمِزُهُنَّ"(۱)

(۱) بخاری: باب وجوب القرائۃ للإمام والمأموم، حدیث: ۷۲۲


ہرمزان ایرانیوں کے ایک لشکر کا سردار تھا، ایک مرتبہ مغلوب ہوکر اس نے جزیہ دینا بھی قبول کیا تھا؛ مگر پھر باغی ہوکر مقابلے پر آیا، آخر شکست ہوئی اور گرفتار ہوا اس حالت میں امیر المؤمنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا کہ تاج مرصع سر پر تھا، دیباج کی قبا زیب تن کئے ہوئے تھا، کمر سے مرصع تلوار آویزاں تھی اور بیش بہا زیورات سے آراستہ تھا، امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ اس وقت مسجد نبوی میں تن تنہا سوئے ہوئے تھے، آپ نے اپنی پگڑی کو تکیہ بنالیا تھا، ہاتھ میں کوڑا تھا۔

ہرمزان بحیثیت قیدی امیر المؤمنین کی خدمت میں لایا گیا تھا، آہستہ آہستہ لوگوں کا ازدحام ہوتا گیا، لوگوں میں کانا پھوسی سے امیر المؤمنین کی آنکھیں کھل گئیں، دیکھتے ہوئے گویا ہوئے، یہ ہرمزان ہے، لوگوں نے بتایا ہاں، ہرمزان کو لانے والے وفد نے کہا: امیر المؤمنین! یہ اہواز کا حاکم ہے، آپ اس سے تبادلۂ خیال کریں، امیر المؤمنین نے فرمایا: جب تک یہ اپنے اس لباس میں رہے گا، میں اس سے تبادلۂ خیال نہیں کرسکتا، چنانچہ ہرمزان نے اپنے جسم سے زرق و برق لباس اتارا اور معمولی لباس میں آگیا، امیر المؤمنین نے پوچھا: ''بار بار تیری بدعہدی کا تیرے پاس کیا عذر ہے'' ہرمزان گویا ہوا: مجھے خوف ہے کہ کہیں آپ میری معذرت سنے بغیر مجھے قتل کردیں، فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ڈرو مت، تمہاری معذرت ضرور سنی جائے گی، پھر ہرمزان نے پانی مانگا، پانی آیا تو اس نے پیالہ ہاتھ میں لے کر کہا: میں ڈرتا ہوں کہیں آپ مجھے پانی پینے کی حالت میں ہی قتل نہ کردیں۔

امیر المؤمنین نے فرمایا: تم خوف نہ کھاؤ، جب تک پانی نہ پی لوگے، تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا، ہرمزان نے یہ سنتے ہی پیالہ ہاتھ سے چھوڑ دیا اور اس کا پانی گرادیا اور کہا: اس شرط کے مطابق اب آپ مجھے قتل نہیں کرسکتے؛ کیوں کہ آپ نے مجھے امان دے دی ہے، عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اس کی اس چالاکی اور فریب دہی پر بہت غصہ آیا؛ لیکن حضرت انس رضی اللہ عنہ درمیان میں بول اٹھے اور کہا: امیر المؤمنین! یہ سچ کہتا ہے؛ اور دوسرے لوگوں نے بھی اس کی تائید کی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہرمزان تو نے مجھے

دھوکا دیا؛ لیکن میں تجھے دھوکا نہ دوں گا، اسلام نے اس کی تعلیم نہیں دی، ایفائے عہد اور حسن سلوک کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہرمزان مسلمان ہوگیا، امیر المؤمنین نے دو ہزار سالانہ اس کی تنخواہ مقرر کردی اور وہ مدینہ منورہ میں رہنے لگا۔(۱)

☆عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی نگاہ میں مظلوم کی قدر:

خلیفہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ حمص کے بازار میں گھوم رہے تھے، اتنے میں ایک آدمی ان کے پاس آیا جو دھاری دار چادر زیب تن کئے ہوئے تھا، اس نے عرض کیا: اے امیر المؤمنین! آپ کا حکم ہے کہ جو کوئی مظلوم ہو وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو؟ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے کہا: ہاں، وہ شخص بولا: پھر آپ کی خدمت میں دور دراز کے علاقے سے چل کر ایک مظلوم حاضر ہوا ہے، عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے پوچھا: تیرا خاندان کہاں ہے؟ وہ بولا: ابین (یمن کا صوبہ) سے بھی دور۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے فرمایا: اللہ کی قسم! تیرا خاندان عمر کے خاندان سے بہت دور ہے، یہ کہہ کر اپنی سواری سے فوراً اتر گئے اور پوچھا: تیرے اوپر کیسا ظلم ڈھایا گیا ہے؟ پردیسی نے کہا: میری غلہ اگانے والی زمین پر ایک آدمی نے ناجائز قبضہ جمالیا ہے اور مجھے اس سے یکسر بے دخل کردیا ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اس کا قضیہ سن کر عروہ بن محمد کو لکھا کہ وہ اس مظلوم کی داستان اور شہادت سنے اور جب اس کا حق ثابت ہوجائے تو اسے واپس دلادے، یہ خط لکھ کر اپنی مہر لگادی، جب پردیسی نے واپسی کے لئے اٹھنا چاہا تو عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اس سے کہا: ٹھہر جاؤ، تم دور دراز علاقے سے حاضر ہوئے ہو، راستے میں تمہارا کتنا زادِ سفر خرچ ہوا ہے، یا سواری پر تمہاری کتنی لاگت آئی ہے اور کتنے کپڑے بدلنے پڑے ہیں؟ ان سب کا حساب لگایا گیا تو لاگت پندرہ دینار پہنچی، چنانچہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اسے یہ رقم دے کر روانہ کیا۔(۲)

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا مدعی کے ساتھ حسن برتاؤ

☆ ایک بار حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ حمص کے بازاروں میں تاجروں کا جائزہ

(۱) سنہرے فیصلے: ۲۳۸ (۲) سنہرے فیصلے، عبدالمالک مجاہد: ۴۹، مکتبہ دارالسلام

لینے اور بھاؤ معلوم کرنے کے لئے گھوم رہے تھے کہ اچانک ایک آدمی ان کے پاس آ کھڑا ہوا، اس نے قطر کی بنی ہوئی دھاری دار چادریں اپنے اوپر ڈال رکھی تھیں، اس نے کہا: اے امیر المؤمنین! میں نے سنا ہے کہ آپ نے یہ حکم دے رکھا ہے کہ جو کوئی مظلوم ہو وہ دادرسی کے لئے آپ کے پاس آئے۔

عمر بن عبدالعزیز نے کہا: ہاں میں نے کہہ رکھا ہے۔

آدمی: تو یہ آدمی (خود) مظلوم ہے دور دراز سے چل کر آیا ہے۔

عمر: آپ کے اہل خانہ کہاں ہیں؟

آدمی: عدن میں۔

عمر: اللہ کی قسم آپ کا گھر تو عمر کے گھر سے دور ہے، پھر عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ اپنی سواری سے اترے اور اس آدمی کے سامنے کھڑے ہوگئے، پوچھنے لگے: تم پر کیا ظلم ہوا ہے؟۔

آدمی: آپ تک رسائی رکھنے والا ایک آدمی میری زمین سلب کرلیا ہے اور اس کا مالک بن بیٹھا ہے، عمر بن عبدالعزیز نے اسی وقت عدن کے گورنر عروہ بن محمد کو خط لکھا: جیسے ہی آپ کے پاس میرا خط پہنچے اس کے حامل کے مقدمہ کی گواہی طلب کر، اگر یہ حق پر ہے تو اس کا حق دلاؤ، آدمی واپس جانے لگا تو عمر بن عبدالعزیز نے کہا: ذرا ٹھہر جاؤ، آپ بہت دور سے ہمارے پاس آئے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ آپ نے اس سفر میں بہت سی رقم صرف کی ہے، نئے کپڑوں کو بوسیدہ کیا ہے اور ممکن ہے کہ سواری کا کوئی جانور بھی اس طویل سفر کی نذر ہوگیا ہو، پھر انہوں نے تمام چیزوں کا اندازہ لگایا تو اس کی ملکیت گیارہ دینار بنی جو عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اسے ادا کردی اور کہا یہ بات عام لوگوں کو بتانا کہ کوئی مظلوم اپنی داستانِ ظلم سنانے اور اس سے نجات پانے کے لئے امیر المؤمنین کے پاس آنے سے نہ گھبرائے خواہ وہ کتنی ہی دور کیوں نہ ہو۔(۱)

(۱) تذکرہ تابعین: ۵۹، بحوالہ عدل وانصاف کے حیرت انگیز واقعات: ۷۸

☆رشوت کا اثر وکردار:

عباسی خلیفہ مہدی کے زمانے میں عافیہ بن یزید بغداد میں بحیثیت قاضی مقرر تھے، ایک دن ظہر کے وقت اچانک قاضی صاحب خلیفہ مہدی کی خدمت میں پہنچ گئے اور اندر آنے کی اجازت طلب کی، خلیفہ کی اجازت سے گھر کے اندر داخل ہوئے اور سلام کے بعد عرض کیا: خلیفۃ المسلمین! وہ صندوق منگوائیں جس میں منصب قضا پر بحالی کے سلسلے میں میرا معاہدہ ہے، کیونکہ اب میں اس منصب سے مستعفی ہونا چاہتا ہوں، آپ سے گذارش ہے کہ آپ میرا استعفی منظور کرلیں۔

قاضی عافیہ بن یزید کی گفتگو سے خلیفہ مہدی کو گمان ہوا کہ شاید حکومت کے کسی ذمہ دار نے قاضی کے فیصلے کو نظر انداز کیا ہے، چنانچہ پوچھ بیٹھا: کیا کسی نے آپ کا فیصلہ ماننے سے انکار کردیا ہے جو آپ منصبِ قضاء سے مستعفی ہونا چاہتے ہیں؟ انہوں نے کہا: اس قسم کی کوئی بات نہیں، خلیفہ نے کہا: ''پھر آپ کے منصب قضاء سے سبکدوشی کیوں چاہتے ہیں؟ قاضی صاحب کہنے لگ: امیر المؤمنین! بات دراصل یہ ہے کہ ایک ماہ قبل دو آدمیوں نے میرے پاس مقدمہ دائر کیا تھا، مقدمے کی نوعیت بڑی ہی پیچیدہ تھی، ہر دو فریق کے پاس واضح ثبوت اور شہادت موجود تھی، فیصلہ سنانے میں دیر لگ سکتی تھی؛ کیوں کہ دونوں فریقوں کے دلائل پر غور وفکر اور نتیجے تک پہنچنے کے لئے خاصا وقت درکار تھا، چنانچہ میں نے مقدمہ سننے کے بعد اس امید میں فریقین کو واپس بھیج دیا کہ وہ باہم مصالحت کرلیں گے اور یوں ان کا مقدمہ حل ہوجائے گا، اس مدت میں دونوں فریقوں میں سے ایک کو کسی طرح معلوم ہوگیا کہ مجھے پکی ہوئی تازہ کھجوریں زیادہ مرغوب ہیں، چنانچہ اس نے بہت ہی عمدہ کھجوریں اکٹھی کیں اور میرے دربان کو بھاری رقم رشوت دے کر کھجوریں مجھ تک پہنچانے کو کہا، میں نے اتنی عمدہ کھجوریں کبھی نہیں دیکھی تھیں؛ لیکن جب دربان نے کھجور کا طبق میری خدمت میں حاضر کیا تو میں نے اسے کوڈانٹ ڈپٹ کر طبق واپس کروادیا، دوسرے دن جب دونوں فریق عدالت میں حاضر ہوئے تو وہ دونوں میری نگاہ میں یکساں نظر آرہے تھے۔ ''فَهَذَا يَا أَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ! وَلَمْ اَقْبَلْ،

فَكَيْفَ يَكُوْنُ حَالِيْ لَوْ قَبِلْتُ'' امیر المؤمنین! ہدیہ قبول نہ کرنے کے باوجود میری یہ حالت ہوگئی (کہ عدم مساوات کا تیر میری نگاہ میں چبھ گیا) پھر اگر میں نے ہدیہ قبول کرلیا ہوں تو کیا ہوتا؟ (لامحالہ مجھے ناحق فیصلہ کرنا پڑتا)۔

امیر المؤمنین! حیلے بہانے سے شیطان میرا دین اور میری عاقبت برباد کرسکتا تھا؛ کیونکہ ہر انسان کے ساتھ شیطان لگا ہوا ہے اور لوگ اس کے پھندے میں پھنس کر تباہ وبرباد ہورہے ہیں؛ لہٰذا اے امیر المؤمنین! آپ مجھے اس ذمہ داری سے سبکدوش کردیں، اللہ تعالی آپ کو اس کا بدلہ دے گا، مجھ سے اس سلسلے میں درگذر کریں، اللہ تعالی آپ کی مغفرت کرے گا۔(۱)

☆حجاج کے سامنے دوٹوک جواب

حجاج بن یوسف ثقفی نے ابن فجائۃ کے بھائی کو گرفتار کروایا اور کہا کہ: میں تجھے ضرور قتل کروں گا، قیدی نے عرض کیا: آخر سبب کیا ہے؟

حجاج نے کہا: تیرے بھائی قطر نے میرے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کیا تھا، قیدی نے جواب دیا، میرے پاس امیر المؤمنین کی جانب سے لکھا ہوا ورق ہے کہ میرے بھائی کی غلطی کی سزا مجھے نہیں دی جائی گی، حجاج بن یوسف بولا: لاؤ مجھے دو۔

قیدی نے کہا: میرے پاس امیر المؤمنین کے خط کے علاوہ آسمانی خط بھی ہے، پھر کہنے گا: میرے ساتھ اللہ تعالی کا یہ فرمان ہے ''وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ أُخْرٰى''(۲) کوئی آدمی دوسرے کے گناہوں کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

حجاج اس کے دندان شکن جواب سے تعجب میں پڑ گیا اور اس کی راہ چھوڑ دی۔(۳)

☆عدل ہی ملک ہے:

خلیفہ منصور عباسی کے زمانے میں کسی حاکم نے ایک آدمی کی جاگیر پر ناجائز قبضہ کرلیا، وہ آدمی خلیفہ کے دربار میں شکایت لے کر گیا اور عرض کیا: اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت

(۱) قصص العرب: ۷۵/۳ (۲) الانعام: ۱۶۴

(۳) سنہرے فیصلے، عبدالمالک مجاہد: ۱۲۹

رکھے اے امیر المؤمنین! میں اپنی حاجت بیان کروں یا کوئی مثال دوں؟ خلیفہ نے کہا: حاجت سے پہلے کوئی مثال ہی بیان کرو۔ وہ آدمی گویا ہوا:

بچے کو جب کسی ناپسندیدہ بات کا سامنا ہوتا ہے تو ماں سے بڑھ کر کوئی دوسرا اس کا مددگار نہیں ہوتا، جب کچھ ہوش مند ہوتا ہے تو اپنے باپ سے شکایت کرتا ہے؛ کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ ماں سے زیادہ اس کا باپ اس کا مددگار ہوسکتا ہے، پھر جب جوان ہو جاتا ہے تو اپنی شکایت حاکم کے پاس لے جاتا ہے؛ کیوں کہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ باپ کے مقابلے میں حاکم زیادہ طاقت ور ہے، پھر جب اس کی عقل میں اضافہ ہوتا ہے تو اپنا مسئلہ سلطان کے دربار میں پیش کرتا ہے؛ کیوں کہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان سب لوگوں سے زیادہ طاقت ور ہے؛ لیکن جب اسے بادشاہ کے دربار میں بھی انصاف نہیں ملتا تو پھر اللہ تعالیٰ کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔

مجھے بھی ایک مصیبت آپڑی ہے اور شکایت لے کر آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں، مجھے معلوم ہے کہ آپ سے زیادہ طاقت ور اس روئے زمین پر کوئی نہیں، اگر آپ نے میرے ساتھ انصاف کر دیا تو ٹھیک ورنہ میں انصاف کے لئے اللہ تعالیٰ کا دروازہ کھٹکھٹاؤں گا، خلیفہ منصور نے کہا: ہم تمہارے ساتھ انصاف ہی کریں گے، اس نے بتایا کہ آپ کے فلاں حاکم نے میری زمین پر ناجائز قبضہ کر لیا ہے، خلیفہ نے اپنے حاکم کو جاگیر واپس کرنے کا حکم دیا اور اس کو لکھا کہ اس آدمی کے لئے اسبابِ راحت مہیا کرو اور اس کی معیشت کو تشفی بخش بناؤ۔(۱)

☆حاکم وقت گواہی مسترد

قسطنطنیہ کی سلطنت عثمانیہ کا دارالحکومت، آج کا استنبول ہے، جہاں عدالت لگی ہوئی ہے، قاضی شمس الدین محمد حمزہ عدالت کی کرسی پر براجمان ہیں، مقدمہ پیش ہوا، قاضی نے گواہان کی فہرست دیکھی، اس کے اندر حاکم وقت سلطان بایزید کا نام بھی شامل ہے، سامنے دیکھا تو وہ گواہوں کے کٹھرے میں کھڑا ہے۔

(۱) سنہرے فیصلے:۱۶۱

اچانک قاضی نے فیصلہ سنایا، سلطان بایزید کی گواہی کو مسترد کیا جاتا ہے؛ کیونکہ گواہ قابل اعتبار نہیں، عدالت میں سناٹا چھا گیا، حاکم وقت کی گواہی ناقابل قبول، لوگ حیران و ششدر رہ گئے۔ سلطان بایزید نے آگے بڑھ کر قاضی کو مخاطب کیا، کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ مجھے گواہی کے قابل کیوں نہیں سمجھا گیا؟ قاضی نے حاکم کی حیثیت اور ہیبت کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا، ’’گواہ باجماعت نماز ادا نہیں کرتا؛ اس لئے اس کی گواہی ناقابل قبول ہے‘‘ قاضی نے حاکم وقت کی گواہی کو مسترد کرکے اسلام کے عدالتی نظام کے وقار کو مزید جلا بخشی اور ثابت کر دیا کہ کرسئ عدالت پر بیٹھ کر چھوٹے اور بڑے میں تمیز نہیں کی جاسکتی۔

حاکم نے فیصلہ سنا اور اس کے سامنے گردن جھکا دی، اپنی کمزوری کا اعتراف کیا، حکم دیا کہ فی الفور میرے محل کے سامنے ایک خوبصورت مسجد بنائی جائے۔ اس مسجد کی اگلی صف اپنے لئے مخصوص کی اور اس کے بعد نماز باجماعت سے غفلت کا کبھی مرتکب نہیں ہوا۔

☆غصے میں فیصلہ نہ کریں

موسیٰ بن اسحاق نیشاپور اور اہواز میں قاضی رہے، یہ بہت فصیح اللسان اور متبحر عالم تھے؛ مگر انہیں کبھی مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا گیا، ایک مرتبہ ایک خاتون ان کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہنے لگی۔ ’’قاضی صاحب! آپ کے لئے دو آدمیوں کے درمیان غصے کی حالت میں فیصلہ کرنا جائز نہیں۔ قاضی صاحب نے پوچھا: کیوں؟ خاتون نے عرض کیا؛ کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ’’لَا یَقْضِیْ الْقَاضِیْ بَیْنَ اِثْنَیْنِ وَهُوَ غَضْبَانٌ‘‘ قاضی غصے کی حالت میں دو آدمیوں کے درمیان فیصلہ نہ کرے، یہ سن کر قاضی موسیٰ بن اسحاق مسکرانے لگے۔(۱)

☆ایک چوکیدار کی فرض شناشی

ابو العباس سفاح کا ولی عہد اس کا بھائی ابوجعفر منصور تھا، جب وہ طلبِ علم کے

(۱) کتاب الأذکیاء:۲۴۵

لئے ادھرادھر پھرا کرتا تھا تو ایک دن ایک منزل پر اترا جہاں ہر آدمی سے دو درہم محصول لیا جاتا تھا، چوکیدار نے کہا: جب تک آپ محصول ادا نہ کریں گے، یہاں قیام پذیر نہیں ہو سکتے، منصور نے کہا: میں بنو ہاشم میں سے ہوں اور ابوالعباس کا بھائی ہوں، محصول سے درگذر کرو، اس نے کہا: حکمِ حاکم سے مجبور ہوں، منصور نے کہا: رسول اللہ ﷺ کے چچا کے بیٹوں میں سے ہوں، چوکیدار نے کہا: جو آئین ہے اس کے خلاف کس طرح عمل کرسکتا ہوں؟ منصور نے کہا: میں قرآن مجید جانتا ہوں، عالم، فقیہ اور ماہر فرائض ہوں، دو درہم کیا میں ہزار ہزار درہم کا ایک نکتہ بیان کروں گا، چوکیدار نے کہا: یہ سب صحیح ہے؛ لیکن آئین سلطنت میں کسی کے ساتھ رواداری نہیں ہے، اس لئے مجھے اس معاملے میں معذور سمجھو۔

ایک ادنی چوکیدار اپنے فرائض کی بجا آوری میں اس شخص کا جو بنو ہاشم میں سے ہے، عالم اور فقیہ ہے اور تھوڑے ہی عرصہ کے بعد خلیفہ بننے والا ہے، کوئی لحاظ نہیں کرتا۔(۱)

☆ سلطان محمود کا بے مثال انصاف:

سلطان محمود ہندوستان کا ایک نامور بادشاہ گذرا ہے، اس کا ایک بھانجا تھا، اس کا ایک شادی شدہ عورت سے ناجائز تعلق تھا، اس کے خاوند نے بہت داد فریاد کی؛ لیکن کسی نے نہ سنی، قاضی، وزیر اور امیر کوئی بھی شہزادے کے مقابلے میں اس غریب کی نہ سنتا تھا، آخر وہ شخص جرأت و ہمت کر کے خود سلطان تک پہنچا اور نہایت دلیری سے اپنے دکھ درد کی تمام داستان بیان کی، سلطان نے اس کو اطمینان دلایا اور کہا: میں تمہارا انصاف کروں گا؛ مگر اس راز سے کسی کو آگاہ نہ کرو اور اگر وہ پھر تمہارے مکان پر آئے تو سیدھے میرے پاس پہنچو۔

بادشاہ نے دربانوں کو بھی تاکید کر دی کہ جب یہ شخص آئے تو فوراً مجھے خبر کر دو، خواہ میں کسی بھی حال میں ہوں، غرض جب شہزادہ حسب عادت گیا اور اس شخص کو اس کے مکان سے باہر نکال کر اس کی بیوی کے پاس جا بیٹھا تو اس نے سلطان کو خبر کر دی، سلطان

(۱) سنہرے فیصلے ۲۰۵

خود آیا اور سارا ماجرا اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اپنے بھانجے کا سر تلوار کے ایک ہی وار سے الگ کر دیا اور تھوڑے وقفے کے بعد پانی مانگا اور دو نفل ادا کئے۔(۲)

☆ ایک مرتبہ ایک سوداگر نے سلطان محمود سے اس کے لڑکے شہزادہ مسعود کی شکایت کی اور کہا کہ میں پردیسی ہوں اور مدت سے اسی شہر میں پڑا ہوں، گھر جانا چاہتا ہوں؛ لیکن نہیں جا سکتا؛ کیوں کہ شہزادہ نے مجھ سے ساٹھ ہزار دینار کا سودا خریدا ہے اور قیمت ادا نہیں کرتا ہے، میں چاہتا ہوں کہ شہزادہ مسعود کو قاضی کے سامنے بھیجا جائے، محمود کو سوداگر کا یہ واقعہ سن کر بہت رنج ہوا اور مسعود سے کہلا بھیجا کہ یا تو سوداگر کا تصفیہ کر دے یا اس کے ساتھ کچہری میں قاضی کے سامنے حاضر کر کے شرعی حکم جاری کیا جائے، جب سلطان کا حکم پہنچا تو اس نے فوراً اپنے خزانچی سے پوچھا کہ خزانہ میں کس قدر رقم موجود ہے؟ اس نے عرض کیا: بیس ہزار دینار، شہزادے نے یہ رقم سوداگر کو دے کر بقیہ رقم کے لئے تین دن کی مہلت مانگو اور سلطان کی خدمت میں کہلا بھیجا کہ میں بیس ہزار درہم اس وقت ادا کر دیئے ہیں اور تین دن میں بقیہ ادا کر دوں گا، سلطان نے کہلا بھیجا کہ میں کچھ نہیں جانتا جب تک تم سوداگر کے دینار ادا نہیں کرو گے میں تمہاری صورت دیکھنا نہیں چاہتا، مسعود کو جب یہ خبر ملی تو وہ ادھر ادھر سے قرض لے کر دوسری نماز کے وقت تک ساٹھ ہزار دینار نقد سوداگر کو ادا کر دیئے۔(۲)

☆ ایک مرتبہ ایران کے کسی علاقے کو محمود نے فتح کر کے زیادہ دن نہیں گذرے تھے، سوداگروں کا ایک قافلہ لوٹ لیا گیا، اس قافلہ میں بڑھیا کا ایک لڑکا بھی تھا، بڑھیا نے جب محمود سے اس کی شکایت کی تو اس نے کہا: وہ علاقہ بہت دور ہے اس لئے انتظام بہت مشکل ہے، بڑھیا بھی بہت ہمت والی تھی، اس نے جواب دیا کہ جب تم کسی علاقہ کا انتظام نہیں کر سکتے تو نئے نئے ملک کیوں فتح کرتے ہو؟

(۱) انسائیکلو پیڈیا تاریخ عالم: ۱/ ۷۹-۸۰، سنہرے فیصلے: ۲۴۲
(۲) ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ: ۱/ ۲۶۳، عدل وانصاف کے حیرت انگیز واقعات: ۸۸

محمود نے جب بڑھیا کا جواب سنا تو وہ بہت شرمندہ ہوگیا، بڑھیا کو روپیئے دے کر رخصت کر دیا؛ لیکن اس علاقہ کا ایسا انتظام کیا کہ سوداگروں کے قافلوں کو لوٹنے کی پھر کوئی ہمت نہ کرسکتا تھا۔(۱)

☆ قاضی محمد بن بشیر کی بے باکی:

عباس بن عبداللہ بن مروان القرشی امیر کے خاص دربانوں میں سے تھا جو تقرب اور خصوصیت اس کو حاصل تھی وہ کسی اور کو میسر نہ تھی، ایک شخص نے اس کے خلاف جائیداد غیر منقولہ کا مقدمہ قاضی محمد بن بشیر کی عدالت میں دائر کیا جب عباس قرشی کو معلوم ہوا کہ قاضی صاحب نے اس کے خلاف فیصلہ کیا ہے تو وہ امیر الحکم کے پاس آیا اور شکایت کی اور برا بھلا کر قاضی کو معزول کرنے کو کہا، ساتھ ہی قاضی صاحب کی اور بھی شکایتیں کی، امیر نے کہا: اگر تو سچا ہے تو قاضی صاحب کے گھر جا کر ان سے خارج اوقاتِ عدالت میں مل، اگر وہ تجھے تنہاء اپنے پاس آنے دیں تو ہم تجھ کو سچا مانیں گے اور انہیں موقوف کر دیں گے، قرشی اس شان کے ساتھ قاضی صاحب کے گھر گیا کہ اس کے ہمراہوں کی کثرت کی وجہ سے راستہ چلنا دشوار تھا، قرشی نے قاضی صاحب کے گھر پہنچ کر دروازہ کھٹکھٹایا، ایک بوڑھیا باہر نکلی، قرشی نے اپنا نام بتا کر اندر آنے کی اجازت چاہی، قاضی صاحب کو جب یہ معلوم ہوا تو انہوں نے بڑھیا سے کہا کہ: اس سے کہہ دو کہ اگر کوئی حاجب ہو تو مسجد میں جہاں اہل مقدمہ بیٹھتے ہیں وہاں بیٹھو اور میرے آنے کا انتظار کرو، تمہارے اندر آنے کی کوئی ضرورت نہیں، قرشی نے اندر آنے کے لئے اصرار کیا؛ مگر قاضی صاحب کے یہاں کچھ شنوائی نہ ہوئی، جاسوسوں نے الحکم کو اس کی اطلاع دی تو وہ اس خبر سے بہت خوش ہوا۔(۲)

☆ نورالدین کا اپنے امراء کے خلاف عدالتیں قائم کرنا

نورالدین کے قیام دمشق کے زمانہ میں اس کے بہت سے امراء وہاں آباد ہوگئے

(۱) ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ: ۱/ ۲۶۴، عدل وانصاف کے حیرت انگیز واقعات: ۹۲
(۲) عدل وانصاف کے حیرت انگیز واقعات: ۹۵

تھے اور انہوں نے املاک وجائیداد حاصل کر لی تھی اور اپنے پڑوسی زمینداروں اور مالکان زمین پر بڑی زیادتیاں کرتے تھے، قاضی کمال الدین کی عدالت میں استغاثوں اور دعوؤں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی، قاضی صاحب امراء کی کوئی رعایت نہ کرتے اور ان کے مقابلہ میں بے لاگ انصاف کرتے تھے؛ لیکن امیر الامراء اسد الدین کے جاہ واقتدار کی وجہ سے اس کے خلاف کاروائی کرنے میں انہیں دشواری پیش آتی تھی، انہوں نے نورالدین کو ادھر توجہ دلائی، اس نے امراء کے مقدموں کی سماعت کے لئے دارالعدل کے نام سے ایک عدالت قائم کی اور اس میں خود بیٹھنا شروع کیا، اسدالدین کو معلوم ہوگیا کہ یہ اہتمام صرف اس کی وجہ سے کیا گیا ہے، اس نے اپنے تمام ماتحت امراء بلا کر ان سے کہا کہ میرے علاوہ قاضی کمال الدین کو اور کسی امیر سے مزاحمت کا خطرہ نہیں ہے اور یہ عدالت صرف میری وجہ سے قائم ہوئی ہے، اگر تم میں سے کسی کے باعث مجھ کو عدالت میں حاضر ہونا پڑا تو اس کو سولی پر چڑھادوں گا اور جن جن لوگوں کے ساتھ تمہارے تنازعات ہوں ابھی جا کر ان کا فیصلہ کرلو اور جس قیمت پر بھی ہوسکے مدعیوں کو راضی کرلو خواہ اس میں میری کل املاک میرے ہاتھ سے نکل جائے، امراء نے کہا: اگر ان کو اس کی خبر ہوجائے گی تو وہ مطالبہ میں بڑی زیادتی کریں گے، اسدالدین نے کہا: کچھ بھی ہو میرے کل املاک ہاتھوں سے نکل جانا میرے لئے اس سے زیادہ آسان ہے کہ نورالدین مجھ کو ظالم سمجھے اور زمرہ عوام میں شامل کردے، اس حکم پر تمام امراء کو اپنے اپنے فریق کو رضامند کرنا پڑا اور دارالعدل میں اس کے خلاف ایک مقدمہ بھی پیش نہ ہوسکا، دو تین دن عدالت میں بیٹھنے کے بعد نورالدین نے کمال الدین سے کہا کہ اسدالدین کے خلاف کوئی مدعی نظر نہیں آتا، اس وقت کمال الدین نے پورا واقعہ بیان کیا، یہ سن کر نورالدین سجدۂ شکر بجالایا اور کہا کہ: خدا کا شکر ہے کہ میرے ساتھی خود انصاف کر لیتے ہیں اور اس کے لئے ان کو میرے پاس آنے کی ضرورت نہیں رہتی۔(۱)

(۱) تاریخ اسلام: ۳/ ۲۵۳

☆ **بادشاہ کا بہنوئی قید خانے میں:**

سیف الدین نامی ایک عرب امیر ہندوستان کے ایک بادشاہ کے پاس آیا، اس کی نہ صرف مہمان نوازی اور خاطر داری کی؛ بلکہ کچھ عرصے کے بعد بادشاہ نے اپنی بہن فیروزہ کی شادی اس غریب الدیار امیر کے ساتھ کردی، شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی اور بادشاہ نے اسے جاگیر میں گجرات اور کھمبایت (جوناگڈھ رن کچھ وغیرہ) کے علاقے دیئے؛ لیکن اس بدّو نے اس نعمت عظمیٰ کی قدر نہ کی، بیس دن کے بعد جب محل شاہی میں جانے لگا تو بلا اطلاع اندر جانے کا قصد کیا کہ میں بادشاہ کا بہنوئی ہوں، میرے لئے ادب اور اطلاع کوئی معنیٰ نہیں رکھتے، دربان نے منع کیا تو دربان کے سر کے بال پکڑ کر باہر گھسیٹا، امیر نے دربان کو زور سے لاٹھی رسید کی حتیٰ کہ خون نکل آیا، دربان اسی عالم میں بادشاہ کے پاس آیا اور سارا واقعہ بیان کیا، بادشاہ تھوڑی دیر تک عالم سکوت میں رہا اور کہا یہ جرم ایسا سنگین ہے کہ بادشاہ بھی معاف نہیں کرسکتا، قاضی کے پاس جاؤ اور اپنا مقدمہ پیش کرو، قاضی کمال الدین شہر کے رئیس القضاۃ تھے، ان کے پاس مقدمہ گیا، انہوں نے ساری کیفیت سنی اور چونکہ امیر سیف الدین کو اپنے فعل سے انکار نہ تھا، اس لئے اسے رات بھر قید میں رکھا، شہزادی فیروزہ جو امیر کی بیوی اور بادشاہ کی بہن تھی، بھائی کے خوف سے قید خانے میں بچھونا اور کھانا تک نہ بھیجا، دوسرے دن دوپہر کو قاضی نے اس کی رہائی کا حکم دیا۔(۱)

☆ **بادشاہ کے سامنے ایک بیوہ کی بے باکی:**

سلطان ملک شاہ سلجوقی ایک مرتبہ اصفہان کے جنگل میں شکار کھیل رہا تھا، کسی گاؤں میں قیام ہوا، وہاں ایک غریب بیوہ کی گائے تھی جس کے دودھ سے اس کے تین بچوں کی پرورش ہوتی تھی، سلطان کے لشکریوں نے اس گائے کو ذبح کرکے خوب کباب اڑائے، غریب بڑھیا کو خبر ہوئی تو وہ بدحواس ہوگئی، لشکریوں کے اس نامناسب فعل پر کوئی روک ٹوک کرنے والا نہ تھا، ان کے آگے کوئی لاوارث بیوہ کی فریاد سننے کو تیار نہ تھا، ساری

(۱) تاریخ دہلی: ۲/۱۷۲، سنہرے فیصلے: ۱۷۲

رات اس نے پریشانی میں کاٹی۔

صبح ہوئی، دل میں خیال آیا کہ کوئی نہیں سنتا تو نہ سے، کیا بادشاہ بھی نہ سنے گا جس کو اللہ نے غریبوں کو ظالموں سے نجات دینے کے لئے اتنی بڑی سلطنت دی ہے؟ بادشاہ تک پہنچنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی، معلوم ہوا کہ بادشاہ فلاں راستے سے شکار کو نکلے گا، چنانچہ اصفہان کے مشہور نہر کے پل پر جا کر کھڑی ہوگئی، جب سلطان پل پر آیا تو بڑھیا نے ہمت اور جرأت سے کام لے کر کہا:

اے الپ ارسلان کے بیٹے! میرا انصاف اس نہر کے پل پر کرے گا یا پل صراط پر؟ جو جگہ پسند ہو انتخاب کرلے، بادشاہ کے ہمراہی یہ بے باکی دیکھ کر حیرت زدہ ہوگئے، بادشاہ گھوڑے سے اتر پڑا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس عجیب وغریب اور حیرت انگیز سوال کا اس پر خاص اثر ہوا ہے، بڑھیا سے کہا: پل صراط کی طاقت نہیں ہے، میں اسی جگہ فیصلہ کرنا چاہتا ہوں، کہو کیا کہتی ہے، بڑھیا نے اپنا سارا قصہ بیان کیا، بادشاہ نے لشکریوں کی اس ظالمانہ حرکت پر افسوس کا اظہار کیا اور ایک گائے کے عوض اس کو ستر گائیں دلائیں اور مالا مال کردیا اور جب اس بڑھیا نے کہا: تمہارے عدل وانصاف سے میں خوش ہوں اور میرا اللہ خوش ہے، تب وہ گھوڑے پر سوار ہوا۔(۱)

☆ **بادشاہ کو کوئی گواہ نہیں مل سکا**

قاضی ابوحازم (یہ بغداد کے قاضی تھے، ۳۱۶ھ میں وفات ہوئی) کو ایک مرتبہ خلیفہ معتضد باللہ (۲۷۹ھ-۲۸۹ھ) نے پیغام بھیجا کہ فلاں شخص کی طرف جس پر کئی لوگوں نے دعوی کرکے اپنا اپنا مال لے لیا ہے، میرا بھی کچھ مال نکلتا ہے، مجھے بھی مدعی سمجھئے اور میرے دعوے پر غور کرکے میرا حصہ بھی مجھے دلوایئے۔

قاضی نے جواب میں کہلا بھیجا کہ قضا کی ذمہ داری میری گردن پر ڈال کر اب آپ یہ فرماتے ہیں کہ بغیر گواہوں کے آپ کے دعوے کو مان لیں، یہ کس طرح ہوسکتا ہے؟ آپ گواہ پیش کیجئے؟

(۱) سنہرے فیصلے: ۲۶۳

خلیفہ نے کہلا بھیجا کہ فلاں اور فلاں میرے دو معزز گواہ ہیں، قاضی نے جواب دیا: وہ گواہ آپ کے نزدیک معزز ہوں گے؛ تاہم جب تک میں یہ نہ دیکھ لوں کہ بموجب احکام شرع وہ شہادت کے قابل ہیں، آپ کے دعوے کو نہیں مان لیتا، نہ ان کی شہادت قبول کرسکتا ہوں، خطیب بغدادی، ابن عساکر نے ابوالحسین الخصیبی سے اس سلسلے میں جو الفاظ نقل کئے ہیں وہ یہ ہیں: "فَإِنْ زُكِّيَا قَبِلْتُ شَهَادَتَهُمَا وَإِلاَّ أَمْضَيْتُ مَا قَدْ ثَبَتَ عِنْدِيْ" وہ دونوں گواہ آکر میرے پاس شہادت دیں، میں ان کی تفتیش کروں گا، اگر وہ شہادت کے قابل ہوئے تو میں ان کی شہادت قبول کروں گا بصورت دیگر میں ثابت شدہ مقدمہ کے مطابق فیصلہ کروں گا۔

خلیفہ کے گواہوں نے جب سنا کہ عدالت میں ہم پر خوب جرح ہونے والی ہے تو انہوں نے شہادت دینے سے انکار کردیا اور قاضی ابوحازم نے خلیفہ کے مقدمے کو خارج کردیا اور خلیفہ کو کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔(۱)

☆ **جھوٹا مقدمہ**

مروان بن حکم کے دور خلافت میں اروی بنت اویس نامی خاتون نے حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ پر مقدمہ دائر کیا، حضرت سعید رضی اللہ عنہ عشرہ مبشرہ میں سے تھے، مقدمہ یہ تھا کہ انہوں نے اروی کی زمین کے ایک ٹکڑے پر ناجائز قبضہ کرلیا ہے، مقدمہ مرواو کے پاس گیا، اس نے نہایت عزت واحترام کے ساتھ حضرت سعید رضی اللہ عنہ کو بلوایا، یہ اس وقت خاصے بوڑھے ہوچکے تھے، مقدمہ پیش ہوا تو انہوں نے کہا کہ: میں اس کی زمین پر کیسے قبضہ کرسکتا ہوں جب کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے خود سنا ہے کہ۔

مروان کہنے لگا: اے صحابی رسول رضی اللہ عنہ ! آپ بتایئے کہ آپ نے کیا سنا ہے؟ کہنے لگ:: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "مَنْ أَخَذَ شِبْرًا مِنَ الأَرْضِ ظُلْمًا يُطَوَّقُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ سَبْعِ أَرَضِيْنَ" جس شخص نے کسی کی بالشت برابر زمین بھی ظلم سے قبضہ کی تو قیامت کے دن ساتوں زمینوں کو طوق بنا کر اس کے گلے میں ڈال دیا جائے گا۔

(۱) تاریخ الخلفاء، جلال الدین السیوطی: ۳۲۳، مکتبۃ السعادۃ، مصر

مروان نے کہا: اس حدیث کے سننے کے بعد کسی دلیل، گواہ یا حجت کی کوئی ضرورت نہیں، مقدمہ خارج کردیا اور فیصلہ دیا کہ سعید پر ناجائز مقدمہ بنایا گیا ہے، جس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ سعید رضی اللہ عنہ صحابی رسول تھے، ان کی عمر کے اس حصے میں اہانت ہوئی تھی اور انہیں عدالت میں طلب کیا گیا تھا، ہاتھوں کو آسمانوں کی طرف اٹھا کر فرمایا: "اَللّٰهُمَّ إِنْ كَانَتْ كَاذِبَةً فَعَمِّ بَصَرَهَا وَاقْتُلْهَا فِيْ أَرْضِهَا" اے اللہ! اگر یہ عورت جھوٹی ہے تو اس کو اندھی کردے اور اس کو اسی کی زمین میں ہلاک کردے، چنانچہ مرنے سے پہلے وہ عورت اندھی ہوگئی، ایک دن اپنی زمین میں پھر رہی تھی کہ اچانک ایک گڑھے میں گر کر مرگئی۔(مسلم: تحریم الظلم وغضب الأرض، حدیث: ۱۶۱۰)

رعایا کی مصلحت کے لئے بیٹے کی قربانی!

عبداللہ کے بعد ۹۱۲ء میں اس کا پوتا عبدالرحمن سوم ہسپانیہ کا حکمران ہوا، خلیفہ عبدالرحمن کے دو بیٹے تھے، الحکم اور عبداللہ، دونوں قابل اور ممتاز تھے؛ لیکن بادشاہ نے الحکم کو اپنا ولی عہد قرار دیا۔

ابن عبدالدار، عبداللہ کا ایک اولوالعزم رفیق تھا، اس کو خلیفہ سے اس امر کی شکایت تھی کہ اس نے اسے قاضی القضاۃ کا عہدہ نہیں دیا تھا، عبدالدار نے عبداللہ کو بہکایا اور اسے بغاوت پر آمادہ کیا، چنانچہ ایک نحس ساعت میں خلیفہ اور الحکم دونوں کو قتل کرنے کی خوفناک سازش کی گئی، عبدالرحمن کو بھی خبر ہوگئی، اس نے ایک معتبر سردار کو کافی فوج کے ساتھ روانہ کیا، شہزادہ اپنے رفیق عبدالدار کے ساتھ گرفتار کرلیا گیا، جب خلیفہ کے سامنے پیش ہوا تو اس سے پوچھا:

کیا اس وجہ سے آزردہ ہو کہ تم خلیفہ نہیں ہو؟ شہزادے نے کوئی جواب نہ دیا؛ لیکن اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے، بادشاہ کے حکم سے دونوں الگ الگ کمروں میں بند کردیئے گئے، عبدالدار اسی رات خودکشی کرکے مرگیا۔

ادھر شہزادہ عبداللہ بن عبدالرحمن کے بارے میں اس کے اپنے باپ نے فیصلہ دیا

(۱) سنہرے فیصلے: ۲۸۶

کہ اسے قتل کر دیا جائے ، جب عبداللہ کے قتل کا فیصلہ ہوا تو اس کے بھائی الحکم نے جو ولی عہد تھا اور اپنے بھائی سے بڑی محبت رکھتا تھا ، رحم کی سفارش کی ، بادشاہ نے سفارش نا منظور کی اور اپنا تاریخی فیصلہ کچھ اس طرح سنایا: تمہاری سفارش اور التجا بجا ہے ، میں بھی یہی چاہتا ہوں اور اس کی موت کو ٹھنڈے دل سے دیکھنا گوارہ نہیں کرتا ؛ لیکن میں خلیفہ ہوں ، مجھے آئندہ کا خیال بھی رہنا چاہیئے ، اس کے دل کی خلش کبھی نہ جائے گی ، میرے بعد تم دونوں ہمیشہ لڑتے رہو گے ، تم دونوں کا انجام تو جو ہو سو ہو ؛ لیکن رعایا تباہ و برباد ہو جائے گی ، کتنی مائیں اپنے بچوں کو روئیں گی ، کتنی عورتیں بیوہ ہوں گی اور کتنے بچے یتیم ہو جائیں گے ، ملک میں قحط سالی اور فصلوں کی تباہی دائمی بدامنی پیدا کر دے گی ، جب ان باتوں کی طرف میرا خیال جاتا ہے تو کانپ اٹھتا ہوں ، اس لئے ہزار ہا لوگوں کو بے خانماں ، ہزاروں عورتوں کو بیوہ اور ہزاروں بچوں کو یتیم کرنے کے بجائے بہتر ہے ایک ہی شخص کا جو بانیٔ فساد ہے ، خاتمہ کر دیا جائے ۔

میں اپنے اس نوجوان فرزند کو بہت روؤں گا اور جب تک زندگی ہے روتا رہوں گا ؛ لیکن اے الحکم ! نہ تمہارے آنسو ، نہ میرا رونا اور نہ میرے تمام خاندان کی سفارشیں میرے اس بدقسمت بیٹے کو اس صریح جرم کی سزا یابی سے بچا سکتی ہیں ۔ چنانچہ عبداللہ اسی شب کو قتل کر دیا گیا اور دوسرے دن اپنے خاندانی قبرستان میں دفن ہوا ، یہ واقعہ ۹۴۹ء کا ہے ۔ (۱)

☆ ایک بار ہیبت خان نے جو سلطان بلبن کے نہایت معتبر غلاموں میں سے تھا ، اقطاع اودھ کی جاگیریں رکھتا تھا ، ایک شخص کو حالتِ مستی میں مار ڈالا ، اس کی بیوی سلطان غیاث الدین بلبن کے پاس فریاد لائی ، سلطان نے ہیبت خان کو طلب کر کے پانچ سو درے لگوائے اور عورت سے کہا : ہیبت خان آج تک میرا غلام تھا ؛ لیکن آج سے تو اس کی مالک ہے ، تجھے اختیار ہے چاہے تو مار ڈالے ، چاہے معاف کرے ، بمشکل تمام ہیبت خان نے بیس ہزار روپیئے دے کر اس عورت کو راضی کیا اور نجات پائی ۔ (۲)

(۱) سنہرے فیصلے : ۳۰۰ (۲) سلاطین ہند اول ، بحوالہ عدل وانصاف کے حیرت انگیز واقعات : ۸۰

☆ ایک بیوہ کی آزادانہ فریاد:

دولت عباسیہ کا تاجدار مامون الرشید جس نے نوشیرواں کے عدل اور حاتم کی سخاوت کی یاد تازہ کر دی تھی سلطنت بغداد پر جلوہ افروز ہے ، شہزادہ عباس ، مامون الرشید کا بڑا لڑکا طائفۃ النمل کے قریب شکار میں مصروف تھا کہ اس کی نظر ایک حسین وجمیل ، خوبرو عورت پر پڑی جو ایک چشمے سے پانی کا گھڑا بھر رہی تھی ۔ اس نے اس عورت سے مخاطب ہو کر کہا : تو کون ہے اور کس خاندان سے تعلق رکھتی ہے ، کیا ایسے غیر آباد مقامات پر بھی جہاں پہاڑ اور جنگلوں کے سوا کچھ نہیں ہے ، حسن جنم لے سکتا ہے ؟ شہزادہ کی بات پر غیور عورت کے تیور بدل گئے ، اس کا چہرہ غصہ سے تمتما گیا ، چنانچہ اس نے سپاہیوں سے کہا کہ اس عورت کا حسب نسب معلوم کر کے اس کو میری جانب سے پیغام نکاح دو ، چنانچہ سپاہی حکم کی تعمیل میں عورت کے حسب ونسب کا پتہ کر آئے کہ عورت خاندان برامکہ سے تعلق رکھتی ہے ، نام مغیرہ بنت ازار ہے ، وہ دو بچوں کی ماں اور حسین بن موسی کی بیوہ ہے ، اس کے عزیز واقارب میں سے اب کوئی زندہ نہیں ہے ، صرف دو معصوم بچے ہیں ، نکاح کا پیغام اس عورت کے لئے قیامت سے کم نہ تھا ، وہ آپے سے باہر ہو گئی ، کہنے لگی : ہارون ہماری جانیں تباہ کر چکا ہے ، اب مامون ہماری عزت کے درپے ہے ، لیکن عباس یاد رکھے کہ اس کی شہزادگی کو اس ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی کی دہلیز پر دونوں ہاتھوں سے مسل دوں گی ۔ چنانچہ عباس نے اس عورت کو دو گھنٹے کی مہلت دے کر اس کو گھر سے نکل جانے کو کہا ، مغیرہ یہ پیغام سن کر دروازے پر آئی اور قاصد سے کہا : عباس اس وقت کو بھول جائے جب میرے دادا جعفر کا سرا کے دادا ہارون کے سامنے رکھا گیا اور اس بے گناہ قتل نے آلِ برامکہ کو دو ، دو دانوں کو محتاج کر دیا ؛ لیکن برمکی بیبیاں عباسی مظالم کو جس تحمل سے برداشت کرتی آئی ہیں ، تاریخ اس کو فراموش نہیں کر سکتی ، اتنا کہہ کر مغیرہ ایک سفید چادر سر پر ڈال کر دونوں بچوں کو ساتھ لے کر باہر چلی گئی ۔

ایک طویل مدت کے بعد یہ مغیرہ جس پر کہ ضعیفی کے آثار نمایاں ہو چکے تھے مامون کے دربار میں حاضر ہوئی اور کہا کہ ایک بیوہ کا مکان صرف اس لئے کہ وہ اپنی عصمت کی

محافظ تھی، سلطنت عباسیہ کو مبارک ہو؛ لیکن مامون الرشید! ایک دن اس بادشاہ کو بھی منہ دکھانا ہے جس کی سلطنت کبھی فنا نہ ہوگی، ایک ظالم کے خلاف تیرے پاس فریاد لائی ہوں، انصاف کرا اور داد دے، مامون الرشید نے عورت سے کہا: اس ظالم کا نام بتا کہ وہ کون ہے؟ عورت نے ہنس کر کہا: شہزادہ عباس جو تخت شاہی پر آپ کے برابر بیٹھا ہے، مامون کا چہرہ اتنا سنتے ہی غصے سے سرخ ہوگیا، اس نے چوبدار کو حکم دیا کہ عباس کو اس عورت کے برابر کھڑا کردے؛ تاکہ مدعی اور مدعا علیہ میں کوئی امتیاز نہ رہے، شہزادہ عباس خاموش تھا اور ہر سوال کے جواب میں رک رک کر ایک آدھ بات کہہ دیتا، مغیرہ دھڑلے سے اپنی داستان سنائے جا رہی تھی، اس نے کہا: ''عباس! یہ صحیح ہے کہ تو مامون الرشید کا لڑکا اور سلطنت کا مالک ہے؛ لیکن یہ ہاتھ منتظر تھے اس وقت کے کہ اگر تو اپنی دھن میں آگے بڑھ کر میرے قریب پہنچتا تو تیری گردن مروڑ کر رکھ دیتے، آلِ برامکہ کی دولت عباسیوں نے پامال کردی؛ مگر ہماری عصمت وہ دولت ہے کہ ہم عباسیوں کو اس پر قربان کردیں گے''۔

وزرائے سلطنت مغیرہ کی جرأت پر متعجب ہوئے اور کہا: یہ بے باکی آدابِ شاہی کے خلاف ہے، ادب سے گفتگو کرو، مامون نے کہا: اس کو مت روکو، یہ حق رکھتی ہے کہ جو کچھ اس کے منہ میں آئے کہے، یہ صرف اس کی صداقت ہے جس نے اس کی زبان کو تیز اور اس کے حوصلے بلند کردیا ہے اور عباس کی کمزوری ہے جس نے اس کو گونگا کردیا ہے۔

اسی وقت پانچ تھیلیاں اشرفیوں سے بھری ہوئی اہل کاروں سے لے کر مامون الرشید نے مغیرہ کے قدموں میں ڈال دیں اور نہ صرف اس کا مکان واپس کیا؛ بلکہ ایک عالی شان محل ''قصر عباس'' مغیرہ کو عطا فرما کر درخواست کی کہ وہ شہزادے کا قصور معاف کردے۔(۱)

☆ سلیمان اعظم سلاطین عثمانیہ میں سب سے بڑا اور باعظمت حکمراں تھا، ۲۶ سال کی عمر میں تخت نشیں ہوا، اس کو عدل وانصاف کا بڑا خیال تھا اور انصاف کے معاملہ میں کسی کی رعایت نہ کرتا تھا، اس کے داماد پاشا کا واقعہ سلیمان اعظم کی عدل کا بہترین ثبوت ہے، فرہاد پاشا کو فوراً معزول کردیا، بعد میں فرہاد پاشا کی بیوی جو

(۱) سنہرے فیصلے: ۲۱۰

سلیمان اعظم کی بیٹی تھی، بڑی التجا کے بعد اس کو دوبارہ والی بنادیا؛ لیکن جب فرہاد پاشا نے وہی ظلم اور ناانصافی کا طریقہ اختیار کیا تو سلیمان نے نہ صرف اس کو معزول کردیا؛ بلکہ قتل کردیا۔(۱)

☆ایک فیصلہ

ایک سوداگر کی تھیلی جس میں چار سو دینار تھے گم ہوگئی، اس نے ڈھول پٹا کر اعلان کیا کہ اس طرح تھیلی گم ہوگئی ہے، جس شخص کو مل جائے وہ لے آئے، اسے دوسو دینار کا انعام دیا جائے گا، اتفاقاً یہ تھیلی ایک غریب شخص کو مل گئی اور وہ اسے لے کر مالک کے پاس انعام کی امید میں پہنچ گیا، لیکن سوداگر اپنی تھیلی کو دیکھ کر بدنیت ہوگیا اور اس غریب آدمی سے کہنے لگا: اس تھیلی میں نہایت قیمتی موتی بھی تھا، کیا وہ بھی اس کے اندر ہے؟ وہ آدمی بڑا گھبرایا اور سمجھ گیا اب یہ مجھے دھوکہ دے رہا ہے اور انعام نہ دینے کے لئے جھوٹ بولنے لگا ہے، اب ان دونوں میں جھگڑا ہوگیا، آخر یہ دونوں لڑتے ہوئے فیصلہ کے لئے قاضی کے پاس پہنچے، قاضی نے اس غریب سے موتی کے بارے میں پوچھا: تو وہ قسم کھا کر کہنے لگا کہ تھیلی میں مجھے دیناروں کے سوا کوئی چیز نہ ملی، اب قاضی نے سوداگر سے پوچھا: بتاؤ وہ موتی کیسی تھی؟ سوداگر نے الٹی سیدھی باتیں کیں، کچھ صحیح نہ بتاسکا، قاضی نے سمجھ لیا کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے اور جھوٹ سے مقصد اس کا یہ ہے کہ اپنے اعلان کے مطابق اسے انعام نہ دینا پڑے، قاضی نے کہا: میرا فیصلہ سنو، اے سوداگر! اگر تمہارا دعوی ہے کہ میری تھیلی گم ہوگئی ہے جس میں دینار تھے اور موتی بھی تھی اور یہ آدمی جو تھیلی لایا ہے اس میں موتی نہیں ہے؛ لہٰذا میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ تھیلی تمہاری ہے ہی نہیں، لہٰذا تم اپنی گمشدہ تھیلی کے لئے پھر سے اعلان کراؤ ممکن ہے تمہاری گمشدہ تھیلی تمہیں مل جائے اور تم کامران وبامراد ہوجاؤ، بہرحال یہ تھیلی تمہاری نہیں ہے، پھر قاضی نے اس غریب آدمی سے مخاطب ہوکر کہا کہ یہ تھیلی چالیس روز تک احتیاط سے رکھو، اگر اس کا کوئی دوسرا دعویدار پیدا نہ ہو تو یہ تمہاری ہے۔(۲)

(۱) سلاطین ہند اول: عدل وانصاف کے حیرت انگیز واقعات: ۸۱

(۲) سچی حکایات: ۸۴/۷، عدل وانصاف کے حیرت انگیز واقعات: ۱۰۸

☆ قاضی منذر کا فیصلہ

خلیفہ عبد الرحمن نے قرطبہ میں ایک مکان اپنی ضرورت کی وجہ سے خریدنا چاہا، وہ مکان یتیم بچوں کی ملکیت میں تھا اور وہ یتیم بچے قاضی منذر کی نگرانی میں تھے، جب قاضی کے پاس اس مکان کی خریداری کا پیغام پہنچا تو قاضی صاحب نے فروخت کرنے سے انکار کر دیا اور خلیفہ کی خدمت میں کہلا بھیجا کہ یتیموں کی جائیداد اسی وقت منتقل ہو سکتی ہے جب ان میں تین شرطوں میں سے کوئی ایک شرط پوری۔(۱) کوئی سخت ضرورت لاحق ہو، (۲) جائیداد کے تلف ہو جانے کا اندیشہ ہو (۳) ایسی قیمت ملتی ہو کہ جس کے لینے میں یتیموں کا آئندہ فائدہ مقصود ہو، فی الحال ان تین شرطوں میں سے کوئی ایک شرط موجود نہیں اور ملازمین سرکار نے جو قیمت اس مکان کی تجویز کی ہے وہ بہت کم ہے، خلیفہ یہ پیغام سن کر خاموش ہو گیا اور اس نے سمجھا کہ قاضی بغیر قیمت بڑھائے نہ مانے گا، چنانچہ قاضی نے فورا مکان کو منہدم کروا دیا، اس کے بعد ملازمین شاہی نے دوگنی قیمت دے کر اس زمین کو خرید لیا، خلیفہ کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے قاضی کو بلا کر مکان منہدم کرانے کا سبب دریافت کیا، قاضی منذر نے کہا: جس وقت میں نے مکان منہدم کرنے کا حکم دیا تھا اس وقت میرے پیش نظر قرآن کی یہ آیت تھی: "فَانْطَلَقَا حَتّٰٓی اِذَا رَکِبَا فِی السَّفِیْنَةِ خَرَقَهَا قَالَ اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا لَقَدْ جِئْتَ شَیْئًا اِمْرًا"(۱) خلیفہ یہ سن کر خاموش ہو گیا اور اس روز سے قاضی منذر کی اور زیادہ عزت کرنے لگا، اس واقعہ سے خلیفہ اور قاضی دونوں کی پاک باطنی کا ثبوت ملتا ہے۔(۲)

☆ سلطان جلال الدین ایک روز شکار کو نکلے تو ان کو ایک دیہاتی ملا جو رو رہا تھا، پوچھا: کیوں روتے ہو؟ اس نے کہا: میرے پاس تربوز تھے جو میری کل پونجی تھی، تین لڑکوں نے وہ تربوز مجھ سے چھین لئے، سلطان نے کہا: میرے لشکر میں چلے جاؤ اور وہاں فلاں مقام پر جا کر بیٹھ جاؤ، میں شام کو واپس آؤں گا اور تمہیں خوش حال کر دوں گا، چنانچہ وہ دیہاتی لشکر میں گیا اور سلطان کے بتائے ہوئے

(۱) سورۃ الکہف:۷۱ (۲) سنہرے فیصلے:۲۱۰

مقام پر بیٹھ گیا، سلطان جب لشکر میں آیا تو اپنے ملازمین سے کہا: مجھے تربوز کی خواہش ہے، لشکر اور خیمہ میں پتہ لگاؤ شاید مل جائے، ملازموں نے ادھر ادھر پتہ لگایا تو ایک ملازم تربوز لے کر آ گیا، سلطان نے پوچھا: یہ تربوز کہاں ملا؟ اس نے بتایا: فلاں حاجب کے خیمہ میں تھا، سلطان نے حکم دیا کہ اس حاجب کو حاضر کرو، چنانچہ وہ حاضر ہوا، سلطان نے اس سے پوچھا کہ: یہ تربوز کہاں سے لیا؟ اس نے بتایا کہ: کچھ لڑکے لائے تھے، سلطان نے کہا: ان لڑکوں کو حاضر کرو، وہ حاجب گیا اور یہ سوچا کہ معاملہ سنگین معلوم ہوتا ہے، لڑکے کہیں قتل ہی نہ کر دیئے جائیں، ان لڑکوں کو بھگا دیا اور سلطان سے کہہ دیا کہ وہ لڑکے بھاگ گئے، سلطان نے اس دیہاتی سے پوچھا: کیا یہی وہ تربوز ہے جو تجھ سے چھینا گیا، اس نے کہا: ہاں، تو اس سے کہا: اس حاجب کو لے جاؤ، یہ ہمارا غلام ہے، ہم تجھے بخشتے ہیں، اس لئے کہ اس نے لڑکوں کو حاضر نہیں کیا جنہوں نے تمہارے تربوز چھینے تھے اور خدا کی قسم! اگر تو نے اسے چھوڑ دیا تو میں تیری گردن اڑا دوں گا، چنانچہ دیہاتی نے اس حاجب کا ہاتھ پکڑ کر اسے باہر لے آیا، اب حاجب نے اپنے آپ کو آزاد کرنے پر اس سے تین سو دینار پر سودا طئے کر لیا اور اسے تین سو دینار دے کر اس کے پنجے سے آزاد ہو گیا، پھر وہ دیہاتی سلطان کے پاس آیا اور کہا: حضور! جو غلام آپ نے مجھے دیا تھا وہ میں نے تین سو دینار میں بیچ دیا ہے، سلطان نے کہا: تم اس سودے پر خوش بھی ہو؟ وہ بولا بڑی خوشی ہوئی، فرمایا: اچھا جا قیمت اپنے قبضہ میں کر اور سلامتی کے ساتھ رخصت ہو جا۔(۱)

☆ بادشاہ سکندر لودھی کا فیصلہ:

سلطان سکندر انصاف کرنے میں حد درجہ کوشش کرتا تھا اور خاص فراست و دانائی سے کام لے کر حقیقت تک پہنچتا تھا، چنانچہ صاحب طبقات الکبری نے ایک دفعہ بیان کیا کہ گوالیار کے دو غریب آدمی جو بھائی بھائی تھے، مفلسی سے تنگ آ کر فوج میں شامل ہو گئے،

(۱) سچی حکایات: ۴۸۳، عدل وانصاف کے حیرت انگیز واقعات:۱۰۹

ایک لڑائی میں انہیں دولعل مل گئے، ایک اس دولت پر قانع ہو کر گھر جانا چاہتا تھا اور دوسرا اس کے بعد بھی قسمت آزمائی پر مصر تھا، جب ایک بھائی گھر جانے لگا تو دوسرے بھائی نے لعل اس کے سپرد کئے اور کہا کہ: میری بیوی بچوں کو دے دینا، جب یہ گوالیار واپس آیا تو اس نے اور چیزیں تو دیں؛ لیکن لعل نہ دیا، جب مالک واپس آیا تو اس نے اپنی بیوی سے استفسار کیا، اس نے انکار کیا، الغرض یہ معاملہ میاں بھورا تک پہنچا جو دربارِ سکندر لودھی کے امراء کبار میں سے تھا، انہوں نے گواہ طلب کئے، خائن بھائی نے ایک قمار خانہ سے دو جھوٹے گواہ پیش کئے اور میاں بھورا نے ان گواہوں پر اعتبار کر کے فیصلہ کر دیا کہ لعل بیوی سے وصل کر لینا چاہئے، یہ غریب بہت پریشان ہوئی، سیدھا آگرہ جا کر بادشاہ کی خدمت میں پہنچی، بادشاہ نے فریقین اور گواہوں کو طلب کیا، یہاں بھی وہی صورت پیش آئی، بادشاہ کو یقین ہو گیا کہ لعل اس عورت کو نہیں دیا گیا؛ لیکن وہ گواہوں کی موجودگی میں کوئی خلاف حکم نہیں دے سکتا تھا، آخر کار اس نے سوچ کر گواہوں سے پوچھا: جب تمہارے سامنے اس عورت کو لعل دیا گیا ہے تو تم نے اسے ضرور دیکھا ہوگا، انہوں نے کہا: ہاں ہم نے دیکھا تھا، یہ سن کر بادشاہ نے موم کا ایک ٹکڑا ان دونوں کو دیا اور کہا: جاؤ الگ الگ اس لعل کی صورت، مقدار، موم کے ذریعے ظاہر کرو، جب دونوں بنا کر لائے تو ایک کا بنا ہوا نمونہ دوسرے سے بالکل مختلف تھا اور لعل کی ہیئت وصورت سے کچھ مناسبت نہ تھی، بادشاہ نے گواہوں کو دھمکایا تو انہوں نے سارا حال بیان کر دیا جس سے حقیقت واضح ہو گئی۔(۱)

☆ سلطان شمس الدین عادل اور فاضل شخص تھا، اس کے مآثر میں لکھا ہے کہ رد مظالم اور مظلوموں کی دادرسی میں بہت سخت تھا، عام تھا کہ جس پر کوئی ظلم ہو وہ رنگے ہوئے کپڑے پہن کر پھرے؛ تا کہ بادشاہ فوراً پہچان لے، کیوں کہ ہندوستان میں لوگ عموماً سفید رنگ کے کپڑے پہنتے ہیں اور رات کے واسطے یہ تجویز کی کہ اپنے دروازوں کے برجوں پر سنگ مرمر کے بنے ہوئے دو شیر رکھ کر ان دونوں کے گلے میں زنجیر ڈال رکھی تھی، جب مظلوم آ کر زنجیر ہلاتا تو فوراً بادشاہ کو خبر

(۱) سلاطین ہند: ۱؍۲۴۳، عدل وانصاف کے حیرت انگیز واقعات

ہو جاتی تھی اور وہ فی الفور اس کے مقدمہ کا فیصلہ کرنے آجاتا۔(۱)

☆امیر کابل عبد الرحمن کا فیصلہ:

ضلع پشاور کے دو شراکتی اس غرض سے کابل گئے؛ تا کہ وہاں گوشت کی تجارت کریں، قلیل عرصہ میں انہوں نے دو تین ہزار روپیہ کما لیا، اپنے وطن جانے کا ارادہ کیا، دونوں شراکتی اپنے منافع کی رقم لے کر اپنے وطن کی طرف چل پڑے، جلال آباد کے قریب پہنچ کر انہوں نے ایک نابینا کو دیکھا جو راستہ کے کنارے ایک بڑے درخت کے نیچے صدا لگا رہا تھا، افسوس کہ گردش دوراں نے سب کچھ چھین لیا؛ حتی کہ آنکھوں کی نظر چھین لی، کیا ہی اچھا ہوتا اگر ایک مرتبہ تھیلی پر روپیہ رکھنے کا موقعہ میسر آجائے، بار بار اندھا یہی جملہ دہرا رہا تھا، دونوں شراکتی اس کے قریب پہنچ گئے اور اندھے سے دریافت کیا بھائی تم زمانہ کی گردش سے نالاں کیوں ہوا؟ اندھے نے کہا: میں اس علاقہ کا ممتاز شخص تھا، میری بہت سے جائیداد تھی؛ لیکن قسمت نے پلٹا کھایا کہ میری آنکھوں کی بینائی بھی ساتھ لی گئی، مجھے اس بات کا بہت شوق ہے کہ اس مفلسی میں اگر اپنا نہیں تو دوسرے کا کمایا ہوا نقدان ہاتھوں میں ایک لمحہ کے لئے رکھ کر اپنے دل کو تسکین دوں، دونوں شراکتی نے یہ سمجھا کہ یہ اندھا ہے، جائے گا کہاں؟ اپنے روپیوں کی تھیلی ایک لمحہ کے لئے اس کو دینے میں کیا حرج ہے،؟ انہوں نے یہ تھیلی اسے دی، تھوڑی دیر بعد انہوں نے اپنی تھیلی کا مطالبہ اندھے سے کیا تو اس نے کہا: کیسی تھیلی؟ واپسی کیسی؟ ان کے اصرار پر بھی اندھے نے تھیلی واپس نہ کی، پھر وہ کہنے لگا: میں نے تمام عمر یہاں بیٹھے بیٹھے گذاری دی، پیسہ پیسہ جمع کیا، تم کہاں سے بدبخت ڈاکو یہاں پہنچ گئے، ان دونوں نے اپنے پیسہ زبردستی چھین لینے کی کوشش کی تو اندھے نے زور زور سے چلانا شروع ڈاکو! ڈاکو کوئی مدد کو آئے، محلہ والے وہاں پہنچ گئے، ان دونوں کو گرفتار کر لیا گیا، انہوں نے اس کو دربار میں پیش کیا، امیر عبد الرحمن دربار میں حاضر تھا، بادشاہ نے پہلے اندھے کا بیان سنا، پھر ملزموں کی داستانِ مظلومی سنی، پھر حکم دیا کہ ایک کڑاہی لے آؤ اور اس میں پانی ڈال کر خوب گرم کرو، یہ سن کر دونوں شراکتی بے چارے سہم گئے،

(۱) سفر نامہ ابن بطوطہ: ۳؍۹۲

جب پانی خوب گرم ہوگیا تو بادشاہ نے غضبناک ہوکر کہا: روپیوں کو کھول کر پانی میں ڈال دو، بادشاہ مسند قضاء سے اٹھا اور کڑاہی کے پاس آکر گرم گرم پانی کی سطح بغور دیکھ کر واپس چلا گیا، حکم ہوا کہ کڑاہی کا پانی گرا کر روپئے شراکتی کے حوالے کر دیا جائے، پھر نابینا کو مناسب سزا دینے کا حکم دیا، قاضی نے جرأت کر کے فیصلہ کی تفصیل سننے کی خواہش کی تو بادشاہ نے کہا: جن دو شخصوں کو ملزم ٹھہرایا گیا تھا اور درحقیقت وہ بالکل بے گناہ تھے، انہوں نے گوشت فروخت کر کے روپیہ جمع کیا تھا؛ کیوں کہ پانی کی سطح پر چربی کے پگھلے ہوئے ذرات ظاہر ہوئے جس سے یہ ظاہر ہوا کہ ان گوشت فروشوں کے ہاتھ کا میل ہے جو ان کے ہاتھوں پر گوشت کی چربی کی وجہ سے پڑتا تھا، وہ روپیوں کو بھی لگ گیا ہوگا، تجربہ کیا تو صحیح نکلا، بادشاہ کے اس فیصلہ سے حاضرین دربار بے حد خوش ہوئے۔(۱)

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا



(۱) سچی حکایات: ۳/ ۵۰۳، عدل وانصاف کے حیرت انگیز واقعات: ۱۲۰


مسلم سائنسدانوں
کے کارنامے

علم فلکیات میں مسلمانوں کے کارنامے

عہد بنی امیہ کے اختتام تک مسلمان دوسری قوموں کے علم ہیئت سے بالکل نابلد تھے ، سب سے پہلے سندھ میں سنسکرت کی فلکیاتی تحریر ''ہرگنٹر'' کا ترجمہ ''زیہ الأرکند'' کے نام سے ہوا تھا،جس کی بنیاد پر قندھار میں ''زیج الھند'' اور ''زیج الجامع'' مرتب کی گئی تھی،اس کے بعد ۷۴۲ء میں سنسکرت سے اور ترجمہ ''زیج الھرفن'' کے نام سے ہوا، ۱۵۴ھ/۷۷۱ءامیں سندھ کے راجہ کی طرف سے عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور کے دربار میں ایک سفیر اپنے ساتھ سنسکرت کتاب ''مہا سدھانت'' کا ایک نسخہ لایا،جس کا موضوع علم ہیئت تھا،خلیفہ نے ''محمد بن ابراہیم فزاری'' کو حکم دیا کہ وہ اس کتاب کا ترجمہ عربی میں کرے ، الفزاری نے کتاب کے ترجمے میں ہندی سفیر اور ایک مسلم سائنسداں ''یعقوب بن طارق کی مدد سے عربی مسودہ تیار کیا،جس کا نام ''السند ھند الکبیر'' رکھا گیا،علم ہیئت کے موضوع پر یہ عربی زبان میں پہلی کتاب تھی، غالبا ۷۹۰ء میں الفزاری نے ایک فلکیاتی جدول عربی تقویم کے مطابق تیار کی جو ''زیج علی سن العرب'' کے نام سے مشہور ہوئی، دوسری صدی ہجری کے نصف آخر میں ''یعقوب بن طارق'' نے دو کتابیں ''ترکیب الأفلاك'' اور ''کتاب الھلال'' تحریر کیں ، مزید برآں انہوں نے ''زیج محلول فی السند ھند لدرجة درجة'' کے عنوان سے ایک زیج بھی تیار کی،اسی زمانے میں مسلمان ایرانی علم ہیئت سے بھی واقف ہوئے ، ایرانیوں کے پاس پہلوی زبان میں ایک فلکیاتی جدول ''زیك شتر وأیار'' موجود تھی، جسے ''یزدگرد سوم (المقتول: ۶۵۱ء) کے عہد میں شائع کیا گیا تھا،مسلمانوں نے اس کا عربی ترجمہ ''زیج الشاہ یا زیج الشھریار'' کے عنوان سے کیا۔

پھر سن ۲۱۲ھ/ ۸۲۸ء میں بغداد کے ریاضی داں حجاج بن یوسف مطر (المتوفی: ۱۲۴/ ۸۲۹ء) نے المجسطی کا عربی ترجمہ کیا جو پہلے ترجمہ سے بہتر تھا،تیسری صدی ہجری کے نصف اول میں مشہور طبیب حنین بن اسحاق (۸۰۹= ۸۷۳ء) نے المسجطی کا ایک اور ترجمہ کیا جس کی تصحیح کا کام بعد میں بغداد کے ریاضی داں ثابت بن قرہ الحرانی نے انجام دیا، مسجطی کے یہ ترجمے شامی اور یونانی زبانوں سے کئے گئے تھے،علم ہیئت سے متعلق دوسری یونانی کتابوں اور جدولوں کے ترجمے بھی اسی زمانے میں ہوئے ، اس طرح تیسری صدی ہجری کے وسط تک مسلمانوں کے پاس علم ہیئت کے موضوع پر ہندی، ایرانی ، یونانی اور شامی زبانوں کا وہ سارا ورثہ آ پہنچا جسے دنیا کی مہذب قوموں نے صدیوں میں جمع کیا تھا۔

اس کے علاوہ مسلمانوں عملی طور پر اس فن میں کارنامے انجام دینے کے لئے افلاک اور اجرام سماوی کے مشاہدے کے لئے مناسب آلات کی مدد سے ترصید کا عمل جنوب مغربی ایران کے مقام جندی نیشاپور میں شروع کیا،''خلیفہ مامون الرشید'' کے عہد (۱۹۸=۲۱۸/ ۸۱۳= ۸۳۳ء) میں بغد کے محلہ شماسیہ شاہی حکم کے مطابق نو مسلم انجنیر ابوطیب سند علی کی سرپرستی میں ایک رصد گاہ تعمیر کی گئی ، مامون ہی کے عہد خلافت میں دمشق کے جبل قاسیوں پر ایک اور رصد گاہ کا قیام عمل میں آیا جس کے سربراہ حکیم یحی بن منصور (المتوفی: ۱۲۴ھ/ ۸۲۹) مقرر کئے گئے ، ان دو رصد گاہوں کے علاہ بغداد کے تین ماہرین ہیئت احمد بن موسی بن شاکر، محمد بن موسی شاکر، اور حسن بن موسی بن شاکر نے دریائے دجلہ کے کنارے باب الطاق میں اپنے مکان کے اندر ایک رصد گاہ قائم کر رکھی تھی ، یہ تینوں آپس میں بھائی بھائی تھے، چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی میں سلطان شرف الدولة (۳۷۶=۳۷۹ھ/ ۹۸۶=۸۹۶ء) نے بغداد میں ایک رصد گاہ تعمیر کرائی ، جس میں عبد الرحمان الصوفی ، ابو الوفاء محمد بن احمد البوزجانی اور احمد الصاغانی کام کرتے تھے۔

مصر میں فاطمی خلیفہ الحاکم کو فلکیات سے دلچسپی تھی، ان کے دور میں قاہرہ کی وہ

رصدگاہ پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی جس کی تعمیر کا کام ان کے والد نے شروع کیا کرایا تھا، مصر کے سب سے عظیم ہیئت داں ابوالحسن علی بن عبدالرحمن بن احمد بن یوسف صدفی المعروف بہ ابن یونس نے اسی رصدگاہ میں فلکیات پر بڑی اہم تحقیقات انجام دیں۔

سلجوقی سلاطین میں جلال الدین ملک شاہ (۴۶۵=۴۸۵ھ/۱۰۷۲=۱۰۹۲) نے رے میں ایک رصد بنوائی تھی جس میں عمر خیام (۴۴۰=۵۲۶ھ/۱۰۴۸/۱۱۳۲ء) کی نگرانی میں فلکیات پر تحقیق کی جاتی تھی، بغداد کی تباہی کے ایک سال بعد ہلاکو خان (المتوفی: ۱۲۶۵ء) نے آذربائجان میں مراغہ کے مقام پر ایک رصدگاہ تعمیر کی، جس کے نگراں نصیر الدین طوسی تھے، اس کے بعد ۸۲۳/۱۴۲۰ء میں تیموری شہزادہ الغ بیگ (المقتول: ۸۵۲/۱۴۴۹) اور الکاشی (المتوفی: ۸۳۳/۱۴۲۹ء) جیسے عظیم سائنسداں کام کرتے تھے، سمرقند کی رصدگاہ کی پیروی عالم اسلام کے دوسرے شہروں میں بھی کی گئی، صرف ہندوستان میں جے پور، جین، دہلی، متھرا اور بنارس میں پانچ رصدگاہوں کا قیام عمل میں آیا مسلمانوں نے اہم رصدگاہ استنبول میں قائم کی جو ۹۸۳ھ/۱۵۷۵ء اور ۹۸۵ھ/۱۵۷۷ء کے درمیان تعمیر ہوئی، ان رصدگاہوں کے علاوہ اسلامی دنیا کے مختلف شہروں میں بھی چھوٹی چھوٹی رصدگاہیں تھیں، جہاں ماہرین فلکیات پر کام کرتے تھے۔

اسپین میں مسلمانوں نے اشبیلہ میں ایک مینار تعمیر کرایا جو مینار اور رصدگاہ دونوں کا کام دیتا تھا، اسپینی ہیئت داں جابر بن افلح (پانچویں صدی ہجری/گیارہویں صدی عیسوی) نے اسی رصدگاہ میں یونانی تصنیف المجسطی کی اصلاح کا کام انجام دیا تھا۔

ان رصدگاہوں میں مسلمانوں نے فلکیاتی جدولیں مرتب کیں جنہیں زیچ کا نام دیا گیا جو فارسی لفظ سے ماخوذ ہے، پہلے جندی شاپور کی رصدگاہ کے مشاہدات کی بنیاد پر احمد نہاوندی نے "الزیج المشتمل" تحریر، مامون کے عہد میں بغداد اور دمشق کی رصدگاہوں میں کی گئی تحقیقات کی بنیاد پر حکیم یحیی بن مصنور "الزیج الممتحن" کے نام سے ایک مصدقہ فلکیاتی جدول مرتب کی جو ’’زیج مامونی‘‘ بھی کہلاتی ہے، قاہرہ کی رصد گاہ میں ابن یونس نے "زیج الحاکمی" مرتب کی، رے کی رصدگاہوں میں عمر خیام نے

ایک زیچ تیار کی جو ’’زیج ملک شاہی‘‘ کے نام سے معروف ہے، مراغہ کی رصدگاہ میں نصیر الدین طوسی کی نگرانی میں جو زیچ تیار ہوئی وہ ’’زیج ایلخانی‘‘ کے نام سے مشہور ہوئی، سمرقند کی رصدگاہ میں کاشی اور قاضی زادہ رومی نے ’’زیج سلطانی‘‘ کے نام سے ایک فلکیاتی جدول مرتب کی جو ’’زیج سلطانی‘‘ کہلائی، الکاشی نے بھی ایک زیچ اپنے طور پر تیار کی تھی جو ’’زیج الخاقانی‘‘ کے نام سے معروف ہوئی۔

مسلمانوں نے علم ہیئت پر اتنی کچھ کتابیں لکھی اور جدولیں تیار کی جن کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہیں، صرف کندی نے جو اصل میں فلسفی تھا ہیئت پر بتیس کتابیں تصنیف کی تھیں، مسلمانوں کی یہ کتابیں مشرق ومغرب کے کتب خانوں میں مخطوطات کی شکل میں پڑی ہوئی ہیں، یورپ والوں کی وساطت سے ابھی تک جو کچھ سامنے آیا ہے وہ پورے سرمائے کا ہزارواں حصہ بھی نہیں ہے۔

بہر حال مسلمانوں نے جن قوموں سے علم ہیئت اخذ کیا تھا، ان کے یہاں اس کی حیثیت زیادہ تر نظری علم کی تھی، یونان کے علم کا ہر طرف شہرہ تھا؛ لیکن افلاک ونجوم کا مشاہدہ کرنے کے لئے ان کے پاس چند معمولی آلات تھے، مسلمانوں نے سب سے پہلے آلات سازی، آلات تنصیب اور ان کے استعمال کے طرف توجہ دے کر ہیئت کو سائنسی بنیادوں پر کھڑا کیا، الفزاری پہلے شخص ہیں جنھوں نے اصطرلاب تیار کیا، محمد بن موسی خوارزمی نے اصطرلاب اور اصطرلاب سازی کے موضوع پر دو کتابیں قلم بند کیں، علی بن عیسی الاصطرلابی نے اس آلے کی تاریخ تصنیف کی، جابر بن سنان نے رصد کا ایسا آلہ ایجاد کیا، جس نے زاویوں کی پیائش منٹوں تک کی جاسکتی تھی، اس آلے کو کروی اصطرلاب (Spheical Astrolabe) نام دیا گیا، اصطرلاب کے فن پر مختلف علماء نے کتابیں تحریر کیں، اس کی سب سے ترقی یافتہ شکل ’’الزرقالی‘‘ ایجاد کی، جس کا نام ’’صحیفہ زرقالیہ‘‘ پڑا اس کی ایجاد علم ہیئت میں بجائے خود ایک ایسا کارنامہ تھا جو مشرق ومغرب کی فلکیاتی تاریخ میں موضوع بحث بن گیا تھا۔ علی بن عیسی الاصطرلابی نے ایک اور آلہ سدس (Sextabtant) ایجاد کیا جس سے کم سے فاصلہ کی پیائش کی جاسکتی تھی،

اس کے علاوہ مسلمانوں نے ثالث(Triquetrun) تکونی آلے، عکس ساز آلے، آنکھ کے پہناوے، مزولے(Quaradrant) اور زاویہ گیر(Dioptra) بنائے، صحیح اور درست پیمائش کے لئے ابن سینا نے آج کے ورنیر کی طرح ایک آلہ تیار کیا، وقت کی پیمائش کے لئے مسلمانوں نے کئی طرح کی گھڑیاں ایجاد کیں، گھڑی میں پنڈولم کا استعمال بھی پہلے انہوں نے کیا۔

مسلمانوں کی رصدگاہوں کی تنظیمی خصوصیات اور آلات کی فوقیت کا اعتراف انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے مقالہ نگار(D.PINGREE) بھی ان الفاظ میں کیا ہے "موخر زمانے کی مسلم رصدگاہوں مراغہ، سمرقند اور استنبول سے ہمسایہ ملک زیادہ متاثر ہوئے، یورپ کے علم ہیئت میں ان رصدگاہوں کے بار آور اثرات بڑے ہیں، ان اداروں کے متعدد آلات اور تنظیمی خصوصیات کو ناکیو براہے کی رصدگاہوں واقع ۱۵۷۶ء (uraniborg) اور ۱۵۸۴ء(Stjernborg) میں اپنایا گیا۔ (۱)

فلکیات کے موضوع پر مسلمانوں نے بے شمار کتابیں تحریر کی ہیں، ان میں سے کم وبیش سو کتابیں ایسی ہیں جو ہیئت کی تاریخ میں گراں قدر اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں، یورپ والے انہیں کتابوں کی بدولت اس علم سے روشناس ہوئے، ابتدائی دور کے مصنفین میں الفرغانی کی تصنیف "المدخل إلى علم هيئة الأفلاك" اس لحاظ سے بڑی اہم تصنیف ہے کہ یہ صدیوں تک یورپ میں مستند ترین آخذ مانی گئی۔ ول دوران رقم طراز ہیں:

> " ان میں ایک سائنسداں "ابو الفرغانی / الفرغانی (نواح: ۸۶۰ء) ماوراء النہر کے رہنے والے ہیں تھے انہوں نے فلکیات کے موضوع پر ایک کتاب تحریر کی جو یورپ اور مغربی ایشیاء میں سات سو سال تک مستند ماخذ رہی"۔(۲)

---

(۱) The Encyclopadia of Islam vol.111p.1138

(۲) The age of faith p.396

۱۔ ابواسحاق ابراہیم بن جندب: ۱۵۷ھ/۷۷۶ء

ابراہیم بن جندب اجرامِ فلکی کے مشاہدے میں مہارت رکھتا تھا، اس نے فلکیات (Astronomy) میں تحقیقات کیں، علمِ نجوم میں بھی ماہر تھا اور ایک صناع بھی تھا، چنانچہ اجرامِ فلکی کے مشاہدے کے لئے اس نے اپنے ذہن ودماغ سے ایک آلہ "اصطرلاب" ایجاد کیا، اس کے ذریعہ فاصلہ کی پیمائش بھی کی جاسکتی تھی۔

یہ ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتا تھا، بغداد میں تعلیم حاصل کی، آٹھویں صدی عیسوی میں سلطنتِ عباسیہ کے قیام کے بعد علمِ ہیئت کی تحقیق ومطالعہ کا آغاز کیا، خلیفہ منصور اور خلیفہ ہارون رشید نے علوم وفنون کی طرف پوری توجہ کی۔

علمی خدمات اور کارنامے

ابراہیم بن جندب نے علمِ ہیئت کے مطالعہ کے ذریعے اجرامِ فلکی کا مشاہدہ کیا، جلدی ہی وہ فلکیات (Astronomy) میں مشاہدے کے ذریعے نئی نئی تحقیقات کرنے لگا۔

وہ دنیا کا پہلا عالی دماغ نجومی (astrologer) تھا، ماہر صناع میکانک (mechanice) ہونے کے سبب اس نے چاند تاروں اور اجرامِ فلکی کے صحیح مشاہدے کے لئے ایک نیا آلہ ایجاد کیا۔ اس انوکھے آلہ کو "اصطرلاب" کا نام دیا گیا۔

یہ حقیقت ہے کہ دوربیں کا موجد ابراہیم بن جندب تھا، جس کے جدت پسند دماغ نے مشاہدات فلکی کی ضرورت کے پیشِ نظر "اصطرلاب" ایجاد کیا، جو مدتوں آبزوویٹروں میں رائج رہی، گیارہویں صدی عیسوی میں ہسپانیہ کا نامور سائنس داں ابواسحاق بن یحیی نقاش الزرقانی نے اس "اصطرلاب" کو مزید ترقی دی، اس نئی ایجاد کا نام صحیفۂ زرقانیہ رکھا جو بعد میں (Sphacia) کے نام سے یورپ کے آبزرویٹروں میں مدتوں استعمال ہوتی رہی، آج اہلِ مغرب گلیلو (اٹلی ۱۵۶۴ء۔ ۱۶۴۲ء) کو دوربیں کا موجد کہتے ہیں، جس نے اصطرلاب کو ترقی دے کر نئی شکل دی۔

"اصطرلاب" ایک قسم کی دوربین (telescope) تھی، اس دوربین کے

ذریعہ بآسانی چاند تاروں کا مشاہدہ کیا جاسکتا تھا اور ان کے فاصلے کی پیمائش کی جاسکتی تھی۔

اصطرلاب کی بناوٹ اس طرح تھی کہ اس کی دو نلکیاں تھیں، ایک نلکی اپنی جگہ پر نصب یعنی فٹ رہتی تھی اور دوسری نلکی اوپر کی جانب جاسکتی تھی اور دائیں بائیں حرکت کر سکتی تھی، یہ نلکیاں ایک اونچے (stand) یعنی تپائی پر لگادی گئی تھیں، عجائباتِ فلک کے مشاہدے کے لئے یہ سیدھی سادی دوربین تھی۔(۱)

حقیقت یہ ہے کہ اس دوربین کا موجد ابراہیم بن جندب تھا، اس لئے جدت پسند دماغ نے ضرورت سے مجبور ہوکر ایک نئی چیز بنائی اور اس سے فائدہ اٹھایا۔

گلیلیو (اٹلی ۱۵۶۴ء۔۱۶۴۲ء) جس کو دوربین کا موجد کہا جاتا ہے، اس نے اس تصور کو لیا اور اصطرلاب کو ترقی دے کر ایک ایسا آلہ بنایا جس میں دیگر سہولتیں پیدا کر دی تھیں۔(۲)

۲۔ عباس بن سعید الجوہری: ۲۲۹ھ/۸۴۷ء

عباس بن سعید الجوہری مامون الرشید کا غلام تھا، مامون اس کو بہت چاہتا تھا اور اپنے پاس رکھتا تھا، الجوہری نے علمِ ہیئت میں مہارت پیدا کر لی تھی، اس لئے اپنے مالک کو ایک رصد گاہ تعمیر کرنے پر آمادہ کیا، مامون نے اس کی خواہش کے مطابق دو رصد گاہیں تعمیر کرادیں جس کے منتظم یحی منصور تھے۔

مامون نے عباس کو آزاد کردیا تھا، مگر اس نے اپنے آپ کو مامون سے علاحدہ کرنا پسند نہیں کیا اور پوری زندگی شاہی محل میں گذاردی، اور یہ مامون کے مقربین میں سے تھا۔

اس نے ہی رصدگاہ کے لئے آلات کی صنعت پر توجہ کی اور اس نے آلات تیار کئے اور آلاتِ رصدیہ کی صنعت میں کمال پیدا کیا۔

مامون الرشید کے حکم سے دو رصدگاہیں ایک بغداد میں ''شمامہ'' کے مقام پر، دوسرے ملک شام میں ''دمشق'' کے قریب ''قاسیون'' میں تعمیر ہوئیں، دونوں رصد گاہوں کے لئے آلات رصدیہ کو لقب کرنا اور ان کی دیکھ بھال الجوہری کے ذمہ تھا،

(۱) مسلمان سائنسداں اور ان کے خدمات: ۱۷۱
(۲) ۱۰۰ عظیم مسلم سائنسداں: ۲۴

الجوہری تعمیرات کا نگراں بھی تھا۔(۱)

۳۔ علی بن عیسی اصطرلابی ۲۲۴ھ-۸۶۴ء

علمِ ہیئت کا ماہر اور ہونہار صناع تھا، زمین سے اجرامِ فلکی یعنی چاند، تاروں اور سورج کے درمیان کا فاصلہ کتنا ہوگا، اس کی پیمائش کا طریقہ ایجاد کیا، اور آلۂ سدس (sextant) تیار کیا جس سے کم سے کم فاصلہ معلوم کیا جاسکتا ہے، یہ کمپاس کی شکل کا دائرہ نما ایک آلہ ہے اور آج بھی زیرِ استعمال ہے اسے ورنیئر اسکیل (Vernier scale) کہتے ہیں، اہلِ یورپ نے سولہویں صدی میں یہ آلہ تیار کیا، ۸۶۴ء میں وفات پائی۔

علمی خدمات اور کارنامے

علی بن عیسی اصطرلابی علمِ ہندسہ (جامیٹری) سے خصوصی لگاؤ رکھتا تھا، اس نے مشاہدے اور تجربہ کے بعد یہ معلوم کرنا چاہا کہ ستاروں کے درمیان کتنا فاصلہ ہوگا اور ان کے اجرامِ فلکی کا زمین سے کتنا فاصلہ ہوگا۔

چنانچہ اس نے بڑی دماغی کاوش کے بعد سدس (sex tant) ایجاد کیا، سدس کمپاس ہی کی شکل کا دائرہ نما آلہ ہوتا ہے، اس پر زاویے اور درجے بنے ہوئے ہوتے ہیں، اس میں درجوں سے نیچے منٹوں تک زاویئے کی پیمائش کی جاسکتی ہے، یہ بہت نازک کام ہوتا ہے۔ یہ آلہ اصطرلاب میں نصب ہوتا ہے، چوں کہ اصطرلاب کی صنعت میں کافی ماہر تھا، اس لئے اصطرلابی کے لقب سے مشہور ہوا۔

اجرامِ فلکی کی تحقیق کرنے والا دوربین سے دیکھتا ہے اور سدس سے فاصلہ معلوم کرتا ہے، موجودہ زمانے میں یہ کام ورنیئر اسکیل (Vernier scale) سے لیا جاتا ہے، ورنیئر سے کم سے کم فاصلہ معلوم کرسکتے ہیں، اور اس کی پیمائش کرسکتے ہیں، ورنیز کو ایک فرانسیسی انجینئر اصطرلابی کے صدیوں کے بعد یعنی سولہویں صدی میں ایجاد کیا تھا۔(۲)

(۱) معجم علماء العرب والمسلمین: ۱۴۴
(۲) معجم علماء العرب والمسلمین: ۸۱، د: محمد فارس

۴۔جابر بن سنان حرانی ۲۶۱ھ/ ۹۲۵ء

جابر بن سنان حرانی مشاہدۂ افلاک سے بڑی دلچسپی رکھتا تھا، وہ ایک اچھا صناع بھی تھا، مشاہدۂ افلاک کے سلسلے میں اس نے آلاتِ رصدیہ تیار کئے، اس نے ایک ایسا آلہ ایجاد کیا جس کے ذریعہ مشاہدہ کے وقت فاصلہ معلوم کیا جاسکتا تھا، یہ آلہ کروی اصطرلاب کے نام سے موسوم ہے(Spherical Astrolober)

جابر بن سنان حران کا باشندہ تھا، اپنے وطن میں تعلیم پائی اور مطالعہ میں مصروف ہوگیا، آلات رصدیہ سے اسے لگاؤ تھا، وہ بغداد آگیا اور پوری زندگی یہیں گذاری، یہاں اس کے خاندان نے کافی علمی کام کئے اور شہرت حاصل کی۔

علمی خدمات اور کارنامے

جابر ایک ہوشیار صناع اور آلاتِ رصدیہ کا ماہر تھا، علمِ ہیئت پر اس نے کافی کام کئے، مشاہدہ افلاک میں جو دقتیں پیش آتی تھیں، جابر نے ان کے حل کی تلاش میں رہتا تھا، آخر بڑی کدوکاوش اور تجربے کے بعد ایک آلہ ایجاد کیا جس کے ذریعہ فاصلہ کی صحیح صحیح پیائش کی جاسکے، اس مفید آلہ کا نام اصطرلاب (Spherical Astrolober) رکھا، کروی اصطرلاب میں یہ کمالِ صناعی تھی کہ زاویئے کی پیائش منٹوں میں کی جاسکتی تھی۔

۵۔ابوعبیداللہ محمد بن جابر البنانی ۳۰۵ھ- ۹۲۹ء

محمد بن جابر البنانی علم ہیئت کا ماہر تھا، اس عظیم ہیئت داں نے زمین کی گردش اور سورج سے متعلق تحقیق کی، اس نے بہت سی نئی نئی باتیں دریافت کیں۔

جابر البنانی بھی حران کا باشندہ تھا، ابتدائی تعلیم اپنے والد سے پائی اور پھر علم وفن کی کتابوں کے ذریعہ مشاہدے میں مصروف ہوگیا، آخر میں وہ حران سے نکل کر بغداد کے قریب آباد ہوگیا۔

جابر نہایت ذہین تھا، ساتھ ہی محنتی اور مستقل مزاج تھا، ذہین اور محنتی جابر نے سائنس میں بڑی لگن سے کام کر کے اس فن میں کافی اضافہ کیا اور وہ بہت جلد بغداد میں

اچھا ریاضی داں اور سائنسداں کی حیثیت سے مشہور ہوگیا۔

علمی خدمات اور کارنامے

جابر البنانی نے اپنی تحقیقات کا مرکز سورج اور زمین، نیز چاند اور تاروں کو بنایا، اس نے زمین کی گردش اور سورج کی رفتار سے متعلق تحقیق کی، جابر نے انحرافِ دائرۃ البروج (Inclination Of Ecliptic) کی صحیح صحیح پیائش کی یعنی سورج کی گذرگاہ کا جھکاؤ 33,1/2 درجے نہیں ہے؛ بلکہ ۲۳ درجے اور ۳۵ منٹ ہے۔

جابر نے ثابت کیا کہ سورج کی گردش زمین کے جس مدار (Orbit) پر گھومتی ہے، وہ دائرہ کی طرح گول نہیں؛ بلکہ بیضوی شکل کا ہے، جس کے دو مرکز ہیں، سورج ان میں سے ایک مرکز پر ساکن ہے، اس وجہ سے زمین کی گردش کے دوران ایک مقام ایسا آتا ہے جہاں سورج زمین سے سب سے زیادہ فاصلہ پر آجاتا ہے۔

فلکیات کے شعبہ میں البنانی کی کی خدمات اور دریافتیں بہت اہم ہیں، انہوں نے اپنے مشاہدات کا سلسلہ ۲۶۴ھ/ ۸۷۷ء سے لے کر ۳۰۶ھ/ ۹۱۸ء تک جاری رکھا، انہیں مشاہدات کی روشنی میں انہوں نے مشہور عالم یونانی ہیئت داں بطلیموس کی غلطیوں کی نشاندہی کر کے ان کی تصحیح کی اور ان کے بتائے گئے غلط تخمینوں کی جگہ درست اور صحیح یا کم از کم آج کی تسلیم شدہ مقداروں سے بڑی حد تک قریب قیمتیں دریافت کیں، جن کی چند ایک مثالیں یہ ہیں:

۱۔ بطلیموس نے اوج شمس (Apogee) اور سورج کے خروج مرکز (Eccentricity) کو غیر تغیر پذیر قرار دیا تھا، البتانی نے ان کی تصحیح کر کے ثابت کیا کہ یہ دونوں تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔

۲۔ بطلیموس نے راس السرطان اور راس الجدی کی تقدیم (Precesion) کی قیمت سو سال میں ''ایک درجہ'' دریافت کی تھی، ثابت بن قرہ نے یہ مقدار ''چھیاسٹھ سالوں میں ایک درجہ'' معلوک، البنانی نے ثابت بن قرہ کی بتائی گئی مقدار کی تصدیق کر کے بطلیموس کی غلطی واضح، یہ تصدیق شدہ مقدار ''أقرب

إلى الصواب“ ہے، اصل مقدار ”بہتر سال میں ایک درجہ ہے“۔

۳۔ بطلیموس نے سال اعتدالی کا طول 365 دن 5 گھنٹے 55 منٹ 12 سکنڈ بتایا تھا، یہ اصل مقدار 6 منٹ 7.28 سکینڈ زیادہ ہے، البنانی نے سال اعتدالی کا طول 365 دن 5 گھنٹے 46 منٹ 24 سکنڈ دریافت کیا جو اصل سے صرف 2 منٹ اور 7.24 سکینڈ کم ہے۔

۴۔ بطلیموس نے سورج کے مدار کے لئے خروج مرکز کی قیمت آج کل کی زبان کے مطابق 0.0208 معلوم کی تھی، چوں کہ خروج مرکز بھی تغیر پذیر ہے، اس لئے اس وقت اس کی مقدار 0.0175 تھی، بطلیموس کی مقدار اصل 0.0033 زیادہ تھی، البنانی نے یہ مقدار آج کی بول چال کے مطابق 0.017326 معلوم کی تھی جب کہ آج کے حساب سے ۸۸۰ء میں البنانی کے مشاہدے کے وقت یہ مقدار 0.016771 رہی ہے، البنانی کی دریافت کردہ قیمت اصل قیمت سے صرف 0.000555 زیادہ ہے۔

۵۔ بطلیموس نے طریق الشّمس (Ecloptic) کے جھکاؤ کے زاویہ کی قیمت 203-51-20 دریافت کی تھی، البنانی نے یہ مقدار 230-35 بتائی جو درست اور صحیح ہے۔

۶۔ بطلیموس نے سورج کے سالانہ گرہن کو ناممکن بتایا تھا، البتانی کے نزدیک یہ ممکن ہے۔

مزید برآں البتانی پانچ سیاروں کی حرکت کے حالات درج کئے، نیا چاند دیکھنے اور چاند گرن کی مقدار معلوم کرنے کے طریقے بتائے، سورج اور چاند کے ظاہری قطر کی پیائش اور ماہ شمسی اوجی (Anomalestic Month) میں سورج اور چاند کے تغیر پر روشنی ڈالی، فلکیات میں انہوں نے دوسری دریافتیں کی ہیں ان کا احاطہ کرنا ناممکن ہے۔

یورپ اور امریکہ کے اہل قلم بھی ان کی تعریف کرتے ہیں، وِل دوران نے ان کے مشاہدات کے لئے ”دورسی اور درستی کے لحاظ سے غیر معمولی“ کے الفاظ کہہ کر ان کی

مہارت کا اعتراف کیا ہے۔(۱)

فلپ کے ہٹی کہتے ہیں:

”البتانی ایک حقیقی محقق تھے، انہوں نے بطلیموس کی متعدد غلطیوں کی تصحیح کی، چاند اور دوسرے سیاروں کے مداروں کے متعلق تخمینوں کو درست کیا، انہوں نے سورج کی سالانہ گرہن کے امکان کو ثابت کیا اور زیادہ صحت کے ساتھ طریق الشّمس کے جھکاؤ کی مقدار معین کی، نیز انہوں نے رویت ہلال کا تعین کرنے کے لئے بنیادی نظریات پیش کئے“(۲)

جابر نے علمِ ہیئت سے متعلق نقشے (Tables) تیار کئے اور ان نقشوں کے مطابق زیچ تیار کی (Astronomical Table) اسے زیچ البتّانی بھی کہتے ہیں۔

جابر علمِ ریاضی کا بھی ماہر تھا، اس نے علمِ ریاضی میں نئی نئی دریافتیں کیں، علم المثلث یعنی ٹرگنومیٹری میں اس کی دریافتیں نہایت صحیح تھیں۔

جابر نے زاویوں کے جیوب (Sinces) کا صحیح نقشہ بنایا اور دیگر نسبتوں کے ساتھ اس کے تعلق کے بارے میں بعض اہم مسافتیں دریافت کیں، اس نے زاویوں کے ظل التمام (Contangents) کے نقشے سب سے پہلے تیار کئے اور ان کو رواج دیا۔

دنیا میں تین ریاضی داں سب سے بڑے سمجھے گئے ہیں، ان میں الخوارزمی اور البنانی بھی ہے۔

جابر نے علمِ ہیئت پر اپنے تجربات اور مشاہدات کی بنیاد پر زیچ البنانی مرتب کی تھی، یہ زیچ یورپ اور جرمنی میں بار بار شائع ہوئی، زیچ البنانی کا سب سے بڑا پہلے ترجمہ ۱۱۱۳ء میں شائع ہوا تھا۔(۳)

۶۔ ابوالحسن علی بن عبدالرحمن یونس صوفی ۳۹۵ھ- ۱۰۰۹ء

ابن یونس صوفی عالی دماغ محقق تھا، یہ رے میں پیدا ہوا، اس کی تعلیم اور اساتذہ

(۱) The age of faith.p.242 (۳) موسوعة علماء العرب والمسلمين:۸۹

(۲) History of confict between religion and science.p.116

کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہوسکا، لیکن یہ ضرور ہے کہ اس نے تحقیق مطالعہ اور مشاہدے کے ذریعے بہت سے علمی کام انجام دئے، اس دانشور نے المعز، عزیز اور حاکم تین سلاطین کا دورِ حکومت دیکھا، اور ہر ایک کی قدردانی اور حوصلہ افزائی سے وہ مستفید ہوا۔

سائنس ایکاڈیمی کے تحت قاہرہ میں ایک بلند پایہ رصدگاہ بھی قائم کی گئی تھی، اس رصدگاہ کے انتظامات نہایت باقاعدہ تھے اور ماہرین کی جماعت یہاں مطالعہ میں ہمہ وقت مصروف رہتی تھی۔

عالی دماغ ابن یونس صوفی علم ہیئت کا زبردست ماہر تھا، اس نے مطالعہ افلاک میں بڑی ہی دلچسپی لی اور اس کی بعض حیرت انگیز دریافتیں صحیح تھیں۔ وہ آج بھی صحیح تسلیم کی جاتی ہیں، اور آج کے سائنسدانوں نے اسے تحسین وآفرین کہا۔

انہوں نے بو یہ سلاطین سے وابستہ رہ کر لگ بھگ ساکن سیاروں کے موضوع پر یہ کتاب تحری کی "صور الكواكب الثابتة" اس میں ۴۸ جھرمٹوں کے علاوہ بعض اہم ستاروں کی تفصیل دی گئی ہے، یہ کتاب مصور ہے، اس میں انسانوں اور حیوانوں کی شکلوں میں آسمانی برج دکھائے گئے ہیں، کتاب میں متعدد نقشے اور جدولیں شامل ہیں، ستاروں کے وقوع، جسامت اور رنگت کے بارے میں مصنف نے حقیقی مشاہدات پر مبنی معلومات فراہم ہیں، کتاب میں چمک کے لحاظ سے جو درجہ بندی کی گئی ہے، اسے بعد کے ہیئت دانوں نے بھی سراہا ہے، "صوار الكواكب الثابتة" سے یورپ کے ماہرین فلکیات نے کافی استفادہ کیا ہے، تیرہویں صدی قشتالہ کے الفانسو دہم نے اپنی کتاب مرتب تو "صور الكواكب الثابتة" ان کے زیر مطالعہ تھی، پندرھویں، اور سولھویں صدی عیسوی میں اسے وی آنا اور یوریبنو برگ کی رصدگاہوں میں مستند ماخذ کا مقام حاصل تھا، کتاب کا لاطینی ترجمہ ترھویں صدی سے پہلے کیا گیا تھا، ۱۸۱۳ء میں اسے فرانسیسی ترجمے کے ساتھ شائع کیا گیا، یہ کتاب بلا شبہ فلپ کے ہٹی کے الفاظ میں:

''رصدی ہیئت کا شاہکار ہے'' (۱)

(۱) History of the Arab p.376

علمی خدمات اور کارنامے

ابن یونس صوفی نے مشاہدات فلکی سے جو حیرت انگیز نئی دریافتیں کیں، ان میں سے انحراف دائرۃ البروج (Inclination of the Ecliptic) کا اہم مسئلہ ہے اس نے اپنی تحقیق اور مشاہدے سے انحراف دائرہ البروج کی قیمت ۲۳ درج ۳۵ منٹ نکالی، جو آج کے دور میں دریافت شدہ قیمت کے بالکل مطابق ہے۔

ابن یونس صوفی نے اپنی تحقیق سے دوسری بات جو دریافت کی وہ یہ تھی کہ اوج شمس (Suns longitude) کا طول فلکی (۸۶ (longitude)) درج اور (۱۰) منٹ قرار دیا، موجودہ زمانے کی مصدقہ قیمت بھی اسی قدر ہے۔

تیسری اہم دریافت اس کی استقبال اعترالین (Prectssion of Equinozts) کی صحیح صحیح قیمت معلوم کرنا ہے، اس نے استقبال اعترالین کی صحیح صحیح قیمت (۵۱~۲) سکنڈ (ثانیہ) سالانہ دریافت کی، استقبال اعترالین کا مسئلہ تو کہیں زیادہ نازک ہے۔

لیکن ابن یونس صوفی کی مہارت تامہ نے اس مشکل ترین مسئلہ کو بھی حل کرلیا، موجودہ زمانے کی دریافت شدہ قیمت اس سے معمولی زیادہ ہے، یعنی (۷ء ۵۳) (ثانیہ) یہ کوئی فرق نہیں۔ استقبال اعترالین کی صحیح صحیح دریافت سے زمین کے محور کی حرکت کا پتہ چلتا ہے۔ (۱)

۷۔ احمد بن محمد سجستانی ۴۳۳ھ-۱۰۲۴ء

علم ہیئت کا ماہر، گردش زمین (Rotation of earth) کا نظریہ پیش کرنے والا دنیا کا پہلا عظیم سائنسداں اس کے نظریے کے ذریعے اس باکمال سائنس داں نے بہت سے مسائل کو حل کردیا، اور قدیم نظام ہیئت کو بدل دیا، علم ریاضی میں قطع مخروطی (conicsection) کے ذریعے ہندسوں تثلیث کا موجد اور باکمال ریاضی داں۔ وطن سجستان، ولادت ۹۵۱ء وفات ۱۰۲۴ء عمر ۷۳ سال۔

(۱) موسوعة علماء العرب والمسلمين: ۶۲

علمی خدمات اور کارنامے

گردش زمانے کا نظریہ: سجستانی سے پہلے اکثر مسلم سائنسداں زمین کو ساکن اور اجرامِ فلکی مثلاً چاند، سورج اور ستاروں کو متحرک مانتے تھے، لیکن یہ نظریہ محدود زمانے تک قائم رہا۔

مغربی سائنس دانوں میں کوپرنکس (coperoicec) جو پولینڈ کا باشندہ تھا اور ۱۴۷۳ء ۔ ۱۵۴۳ء میں گذرا ہے، کہا جاتا ہے کہ گردش زمین کا نظریہ سب سے پہلے اسی نے قائم کیا اور آج بھی لاعلمی کی بنا پر لوگ اسی مغربی سائنس داں کو مانتے ہیں۔

لیکن گردش زمین کا نظریہ کوئی نیا نہیں مسلم سائنس دانوں نے بھی اس پر بحث کی ہے، اور اس کو پرنکس کے سر اس کا سہرا باندھنا تو قطعی غلط اور سراسر ناانصافی ہے۔

قطع مخروطی کی ایجاد

علم ریاضی میں بھی احمد سجستانی ایک بلند پایہ محقق اور اس کا ماہر تھا، اسے علم ریاضی پر عبور تھا، علم ریاضی میں اس کا ایک خاص کارنامہ ہے، جس نے اس کی شہرت کو چار چاند لگا دیئے وہ یہ ہے کہ ریاضی وسیع تر فن میں علم ہندسہ کی ایک شاخ جسے قطع مخروطی کہتے ہیں (conic section) کے طریقے کو دریافت کیا۔

قدیم ترین زمانے میں ریاضی داں کسی زاویے کی تقسیم باآسانی کر لیتے تھے، چار حصوں میں بھی تقسیم کر سکتے تھے، زاویے کو جیومنٹری کے عام طریقوں سے تین حصوں میں تقسیم کرنا وہ مشکل نہیں ناممکن سمجھتے تھے، اور اس میں ان کو بھی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔

مخروط اس جسم کو کہتے ہیں، جو نیچے سے زیادہ اور چورس ہو مگر اوپر جاتے ہوئے اس کی گولائی کم ہوجاتی ہے، اور بتدریج چھوٹی ہوجاتی ہے، جیسے گاجر کی شکل ہوتی ہے۔

احمد سجستانی کا کمال یہ ہے کہ اس نے اس اہم مسئلہ کو حل کر کے جسے لوگ ناممکن سمجھتے تھے اسے ممکن بنا دیا، اس نے اپنے خاص نظریے ''قطعات مخروطی'' کے ذریعے اس کا حل ڈھونڈ نکالا، اور زاویئے کی ہندسوی تثلیث یعنی جیومنٹری کے ذریعے اس کو تین

مساوی حصوں میں تقسیم کرنے میں قطعات مخروطی کے ذریعے وہ کامیاب ہو گیا۔

۸۔ابوریحان محمد بن احمد بیرونی

محمد بن احمد البیرونی ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتا تھا، وہ خوارزم شہر سے باہر کے ایک دیہات کا رہنے والا تھا، اس لئے البیرونی کے نام سے مشہور ہوا۔

البیرونی کی ابتدائی تعلیم دستور کے مطابق ہوئی لیکن ناداری کی وجہ سے وہ ہمیشہ پریشان رہتا تھا، اللہ تعالیٰ نے اسے شوق اور حوصلہ بہت دیا تھا، اس لئے وہ علم کے حصول کی طرف ہمیشہ راغب رہا اور باوجود ہزار مشکلات اور مصائب کے کبھی مایوس نہ ہوا، وہ شب وروز علمی مشاغل اور تحقیق وجستجو میں مصروف رہا۔

پھر اسکی علمی قابلیت اور استعداد کا چرچا اب عوام میں ہونے لگا، پھر وہ بادشاہوں کے درباروں سے متعلق ہو گیا، اس طرح اس کی غربت اور افلاسی کے دن جاتے رہے۔

ابوریحان علوم وفنون پر مجتہدانہ نظر رکھنے والا، علم ہیئت کا ماہر، فلسفی، باکمال نجومی اور ساجیات کا ماہر، عظیم تاریخ داں اور جغرافیہ داں (Geographer) زمین کے متعلق گہری تحقیق کرنے والا دھاتوں کی کثافت اضافی معلوم کرنے والا، اور ان کے صحیح صحیح فرق کو معلوم کرنے والا، علم ریاضی کا ماہر، ریاضی کے مسئلوں کا نیا حل دریافت کرنے والا، تنہا زمین کے محیط کی صحیح صحیح تحقیق کرنے والا، ماہر اراضیات (geologlist) آثار قدیمہ کا پہلا ماہر (pre-historic)

خوارزم کے قریب ایک دیہات میں ۹۷۲ء میں اسکی ولادت ہوئی اور وفات ۱۰۴۹ء میں غزنی میں بعمر ۷۷ سال ہوئی۔

علمی خدمات اور کارنامے

عالی دماغ البیرونی پہلا غیر ہندوستانی ہے جس نے سنسکرت زبان سیکھی اور ہندوؤں کے پرانوں اور مذہبی کتابوں مثلاً بھگوت، گیتا، رامائن، مہابھارت اور منوشاستر وغیرہ کا خود مطالعہ کر کے ان کے اقتباسات عربی زبان میں ڈھال کر اپنی کتابوں میں حوالے دیئے اور اپنی تصانیف کے ذریعے اہل ہند کے لٹریچر کو دنیا کے سامنے پیش کیا۔

البیرونی شب وروز علمی اور تحقیقی کاموں میں مصروف رہتا تھا، تصنیف وتالیف اس کا دلچسپ اور پسندیدہ مشغلہ تھا، اس نے مختلف موضوعات پر جوعملی اور تحقیقی کتابیں لکھی ہیں، ان کی تعداد ڈیڑھ سوسے زیادہ ہے اور صفحات کی تعداد کا اندازہ ہزار سے اوپر ہے۔

البیرونی نے علم ہیئت اور ریاضی ہر ایک بہترین کتاب لکھی جس کا نام تفہیم ہے، سدس علمی کتاب میں سوال وجواب، علم ہیئت اور ریاضی کو سمجھایا گیا۔

قانون مسعودی میں البیرونی نے علم ریاضی کے بعض اہم ترین مسئلے حل کئے ہیں، ایک جگہ اس نے ٹرگنومیٹری سے بحث کی ہے۔

ٹرگنومیٹری (trigonomentry) علم مثلث کے مسئلہ کو اس طرح بتاتا ہے کہ ایک خاص نصف قطر کے دائرے کے اندر اگر ایک مساوی کی ضلاع مثلث، یا ایک مربع یا مخمس (pentagon) یعنی پانچ اضلاع، یا ایک مسدس (hexagon) شش پہلی یا ایک ثمن (gon) ہیئت پہلی یا ایک معشر اس کو نے والی شکل کی اضلاع بنائی جائے تو ان میں سے ہر ایک کا ضلع دائرہ کے نصف قطر کی مقدار میں کیوں کر نکالا جاسکتا ہے، البیرونی نے مثالیں دے کر ان کو حل کیا ہے۔

ایک جگہ البیرونی نظریہ کی وضاحت کی ہے جس کے تحت اس نے زاویئے کے ان چھوٹے سے چھوٹے فرقوں سے جیپ کی قیمتیں نکالی ہیں، اس کا یہ نظریہ عوامل (fuction) آج کے زمانے میں جس طرح لکھا جاتا ہے، اس کا یہ سلسلہ لامتناہی ہے، مگر البیرونی نے اسے صرف تین درجہ تک لکھا ہے۔

علم ریاضی کی تاریخ اس کلیہ کو نیوٹن (انگلستان ۱۶۴۲ھ) اور اس کے چند ہم عصر مغربی ممالک کے ریاضی دانوں کی طرف منسوب کیا جاتا ہے جو سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں گذرے ہیں؛ لیکن درحقیقت مسلم دور کے اس نامور سائنسداں اور علم ریاضی کے ماہر البیرونی نے آج تک سات صدیاں قبل نہ صرف اس کلیہ کو دریافت کیا تھا؛ بلکہ اس نے جدولین مرتب کر کے ان سے عملی کام بھی لیا تھا، البیرونی نے علمِ ریاضی میں کئی کلئے نئے دریافت کئے تھے، جو آج بھی تعلیم کئے جاتے ہیں۔

عرض البلد اور طول البلد کی دریافت

البیرونی نے قانونِ مسعودی میں دنیا کے مختلف شہروں کے درمیان طول البلد (longituade) کا فرق دریافت کرنے کے اصول وقواعد بتائے ہیں، ان قاعدوں میں کروی ٹرگنومیٹری (spherical trigonomentry) کے بعض مسائل کا اطلاق کیا گیا ہے، یہ نہایت مشکل مسئلے ہیں جو ریاضی کے ایک طالب علم کے نقطۂ نظر سے خاصے پیچیدہ ہیں۔

البیرونی نے دنیا کے مشہور شہروں کے درمیان اپنی تحقیقات کے مطابق جو طول البلد کا فرق معلوم کیا ہے، اس کی جدول یہاں پیش کیا جاتا ہے، اس نے دنیا کے شہروں کا طول البلد یہ بتایا ہے۔

لاہور : ۳۴درجے، ۳منٹ	جرجانیہ:۱۰درجے، ۱۳منٹ
سیالکوٹ:۳۲درجے ۵۵منٹ	شیراز:۱۵درجے،۴۶منٹ
پشاور:۳۴درجے، ۴۴منٹ	رے:۱۲درجے،۱۵منٹ
ملتان:۲۹درجے	بغداد:۲۴درجے،۲۰منٹ
بلخ:۳درجے،۲۰منٹ	رقہ:۳۰درجے،۴۱منٹ
نیشاپور:۹درجے،۲۰منٹ	اسکندریہ:۴۲،۲۶منٹ

زمین کے محیط کی پیمائش

حوصلہ مند البیرونی نے زمین کے محیط اور قطری پیمائش بھی کی تھی، مامون الرشید کے دور میں سائنس دانوں نے زمین کے محیط کو قطب تارے کے ذریعہ معلوم کیا۔

مامون دور کے سائنسدانوں کا طریقہ بہت صاف اور سادہ تھا یعنی ایک وسیع میدان میں کسی مقام پر قطب تارے کی بلندی کا زاویہ معلوم کرلو اور پھر شمال کی طرف چلے جاؤ اور ساتھ ہی ساتھ بلندی کے اس زاویئے کی نئی پیمائش بھی لیتے جاؤ، یہاں تک کہ ایسے مقام پر پہنچ جاؤ جہاں یہ زاویہ پورا ایک ڈگری بڑھ جائے، اب پہلے مقام اور دوسرے مقام

کے درمیان کا فاصلہ ناپو، یہ زمین کے محیط کی ایک ڈگری کی پیائش ہوئی۔

اب اسے (۳۶۰) کے ساتھ ضرب دو تو زمین کا محیط صحیح صحیح نکل آئے گا، اس محیط کو پانی یعنی (۳ء۱۴۱۶) پر تقسیم کرنے سے زمین کا محیط پورا معلوم ہوجائے گا اور پھر اس کو اگر دو پر تقسیم کردیں تو نصف قطر معلوم ہوگا۔

البیرونی کا طریقہ جو اس نے پہلے فطری طور پر نکالا تھا اس سے مختلف تھا، اس طریقے میں پہلے زمین کا نصف قطر معلوم کیا جاتا ہے اور پھر اسے (۲ء۱) یعنی (۳ء ۱۴۱۲x۲) کے ساتھ ضرب دے کر زمین کا محیط دریافت کیا جاتا ہے، البیرونی کا طریقہ صرف وہاں استعمال کیا جاسکتا ہے جہاں وسیع میدان ہو اور اس میں ایک بلند ٹیلا ہو؛ لیکن بیرونی اپنے طریقے سے زمین کا محیط (۲۴۷۷۹) میں بتایا جو بہت حد تک صحیح ہے۔

اس نئے دور میں یعنی آج کل کی تحقیق کے مطابق زمین کا محیط (۲۴۹۷۷) میں بتایا گیا جو بہت حد تک صحیح ہے۔

اس نئے دور میں یعنی آج کل کی تحقیق کے مطابق زمین کا محیط (۲۴۸۵۸) میں ہے، اس لحاظ سے البیرونی کی پیمائش میں آج کی نسبت صرف (۷۴) میں کی کمی ہے اور مامونی کے مقابلے میں میں عہد مامون کی نسبت (۶ء) فی صد کی غلطی تھی؛ لیکن البیرونی کی پیمائش میں یہ غلطی صرف (۳ء) فیصد ثابت ہوتی، یہ غلطی اس قدیم دور کے حالات کو دیکھتے ہوئے کوئی غلطی نہیں ہے۔

البیرونی کی کتابیں اور یورپ

یورپ کے دانشوروں نے البیرونی کی قدر کی اور اس کی کتابوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

آثارالباقیہ: البیرونی کی کتاب آثارالباقیہ اصل عربی زبان ہی میں مقام لیزگ میں ۸۷۸ء میں شائع ہوئی اور پھر فوراً ہی اس کا انگریزی ترجمہ: ۱۸۷۹ء میں لندن میں شائع ہوا اور بہت پسند کیا گیا۔

کتاب الہند: البیرونی کی ''کتاب الہند'' اصل عربی زبان میں شہر لیزگ سے

۱۸۸۷ء میں شائع ہوئی اور سال بھر کے اندر ہی اس کا انگریزی ترجمہ لندن سے ۱۸۸۸ء میں شائع ہوا۔

قانونِ مسعودی: اصل عربی میں دائرۃ المعارف (حیدرآباد نے شائع کیا) اس کے بعض اجزاء کا ترجمہ بھی یورپ کی زبانوں میں ہوچکا ہے؛ لیکن پوری کتاب کا مکمل ترجمہ اب تک یورپ کی زبانوں میں نہیں ہوسکا، قانونِ مسعودی میں بہت مشکل مسائل ہیں اور فنی اعتبار سے اس کا درجہ بہت بلند ہے غالباً اسی وجہ سے اس علمی کتاب کے ترجمے کی جرأت کوئی نہ کرسکا۔

۹۔ابوالفتح عمر بن خیام

عالی دماغ فلسفی اور شاعر، علم فلکیات اور ہیئت کا زبردست عالم، ماہر ریاضی داں، شمسی اور قمری تاریخوں کی تحقیق کرکے ان میں مفید اصلاحات کرنے والا، دونوں قسموں کی تاریخوں میں مطابقت پیدا کرنے کا طریقہ دریافت کرنے والا، ماہر موسمیات، شمسی مہینوں کے دنوں کا تعین کرکے درست کرنے والا، لیپ سال (leap year) کا موجد اور مصنف، وطن نیشاپور (ایران) ولادت ۱۰۳۹ء، وفات: ۱۱۳۱ء، بعمر ۹۲ سال۔

عمر خیام کا خاندان معمولی حیثیت رکھتا تھا، اس کے والد ابراہیم ایک خیمہ دوز تھے، اور خیّام کے نام سے مشہور تھے، خیّام کے معنی ہیں خیمہ بنانے اور سینے والے کے، یہ لفظ عمر خیام کے نام کا بھی جزو بن کر مشہور ہوگیا۔

خراسان کا پایۂ تخت نیشاپور اس قدیم زمانے میں علم وفن کا مشہور مرکز تھا، عمر خیام نے اسی شہر میں آنکھیں کھولیں، سمرقند، بخارا اور بلخ کے اہل علم ودانش کا طوطی بولتا تھا، عظیم الشان مدرسے قائم کئے تھے، ایسے دور میں نیشاپور متعدد درسگاہوں اور علماء کی مجلسوں کی آغوش میں خیام پل کر جوان ہوا، ریاضی، ہیئت اور فلسفہ کے سبق وقت کے نامور اساتذہ سے لئے، حکیم بوعلی سینا کا انتقال عمر خیام کی پیدائش سے دوسو سال قبل ہوچکا تھا، تاہم فضا میں اس کے علم وفن کی مہک تازہ تھی، اس جید عالم اور باکمال طبیب کے لائق ونامور شاگردوں کی صحبت عمر خیام کو حاصل تھی، چنانچہ اپنی تصانیف میں اکثر بوعلی سینا کے فلسفے

اور علمی افکار سے متاثر ہوکر اسے اپنا استاد کہہ کر یاد کیا ہے۔

علمی خدمات اور کارنامے

مطالعہ اور محنت کا عادی عمر خیام نے علم ریاضی پر بڑی قابلیت سے اپنی پہلی کتاب ''مکعبات'' لکھی ؛لیکن نوجوان عمر خیام کی طرف کسی نے توجہ نہ کی ، اربابِ اقتدار اور روٴسائے وطن کی اس ناقدری کے باعث ۱۰۶۶ء میں اس نے ترکستان کے دارالسلطنت سمرقند کا رخ کیا، جہاں کے ذی علم رئیس شہر ابوطاہر نے اس جوہر نایاب کی پذیرائی کی ،وہ صاحب علم وفضل تھا،علمی شغف رکھتا تھا،اس کا تعلق شاہ ترکستان کے دربار سے تھا،ابوطاہر نے عمر خیام کو ایک جوہر قابل سمجھ کر بڑی قدر ومنزلت کی، یہ ۱۰۶۶ء کا زمانہ تھا۔

امیر ابوطاہر کو بھی علم ریاضی سے خاص دلچسپی تھی ،عمر خیام نے اپنے محسن کے علمی شوق وذوق دور مطالعہ کو دیکھتے ہوئے علم ریاضی ۱۰۶۷ء میں اپنی مشہور تصنیف ''الجبر والمقابلہ'' مرتب کیا، یہ کتاب سات سال کی محنت میں مکمل ہوئی تھی ،اوراس وقت اس کی عمر صرف اٹھائیس سال کی تھی۔

خیام نے اپنی مہارت کی بناء پر ''الجبر والمقابلہ'' میں کافی نئی نئی دریافتیں کیں ،اس نے اس کتاب میں کئی نئے قاعدے بھی لکھے ہیں۔

۱۔ وہ کعب اور جذر جو عدد کے معادل ہو۔
۲۔ وہ کعب اور عدد جو جذر کے معادل ہو۔
۳۔ وہ عدد اور جذر جو کعب کے معادل ہو۔
۴۔ وہ کعب اور مال جو عدد کے معادل ہو۔
۵۔ وہ کعب اور عدد جو مال کے معادل ہو۔
۶۔ وہ عدد اور مال جو کعب کے معادل ہو۔

عمر کعب نے ان سب سوالات کو مقطوع مخروطی کے ذریعہ ثابت کیا ہے۔

عمر خیام کی کتاب ''الجبر والمقابلہ'' یورپ میں شائع ہوکر مشہور ہو چکی ہے ،مولانا شبلی نعمانی نے اپنے مقالات میں عمر خیّام کے بارے میں لکھا ہے کہ اس نادر کتاب نے

اہل یورپ کے نزدیک خیام کو ریاضی داں اعظم ہونے کا ثبوت دیا ہے۔

عمر خیّام کا قابل قدر کارنامہ الجبرے میں مسئلہ دورقمی (binomiol theoroiom) کی ایجاد کا اصول ہے، اس مسئلہ کو سب سے پہلے عمر خیام نے دریافت کیا ہے جو اس طرح ہے:

+bn-+

na b+a=(a+b)

عمر خیام کے اس الجبرے کا ۱۸۵ء میں پیرس میں woepoke نے فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا، کتاب ''الجبر والمقابلہ'' علم ریاضی میں الجبرے کے موضوع پر چوتھی یا پانچویں کتاب ہے، اس موضوع پر سب سے پہلی تصنیف ڈھائی سو برس پہلے محمد بن موسی خوارمی کی دنیا کے سامنے آچکی تھی ، سمرقند میں عمر خیام کی اپنے مربی ابوطاہر کی وساطت سے بہرافروز ہوا، ترکستان کے نامور وزیر نظام الملک اہل علم ودانش کا قدرداں تھا، شاہ ترکستان اور شاہِ ایران میں دوستانہ روابط اور قرابت کا دوہرا رشتہ بھی قائم تھا، دس سال سمرقند میں گذار کر عمر خیام اپنے وطن نیشاپور لوٹا جہاں سے اس کو بے پناہ محبت تھی۔

عمر خیام کو علم طب میں بھی دستگاہ حاصل تھی اور ملک شاہ کے دربار اس کا تعارف بحیثیت طبیب ہوا، ملک شاہ کے خوردسال بیٹے کو چیچک کا مرض لاحق ہوا، شاہی طبیبوں کے علاج سے فائدہ نہ ہوا، جس سے ملک شاہ کو بہت تشویش ہوئی ، ایسے میں عمر خیام کو طلب کیا گیا، شہزادہ کو اللہ نے شفادی اور عمر خیام شاہی طبیب کے عہدہ پر مامور ہوا، اس کی شہرت علم ریاضی ، ہیئت اور فلسفہ وغیرہ میں بام عروج پر تھی ، بحیثیت طبیب وہ بے انتہا مقبول ہوا اور اس کی شہرت عوام وخواص میں ہوئی، ملک شاہ چوں کہ علم دوست بادشاہ تھا، عالموں اور فنکاروں کی قدر ومنزلت کرتا تھا۔

ملک شاہ نے عمر خیام کو اصفہان میں نوتعمیر رصدگاہ (obseryatory) کا ناظمِ اعلیٰ مقرر کیا، ایک زرکثیر آلات رصد کے لئے خرچ کیا اور سات مشہور ہیئت دانوں کو تحقیق ومشاہدات کے لئے رصدگاہ میں مامور کیا۔

شمسی سال پیمائش واصلاح

عالی دماغ حوصلہ مند عمر خیام کو اپنی صلاحیتوں سے کام لینے کا موقع ملا، اس نے نہایت احتیاط اور گہرائی سے اجرامِ فلکی کا مطالعہ اور مشاہدہ کیا، بہت سی نئی نئی دریافتیں کیں۔

علم ہیئت کے ماہرین کے اہم فرائض میں اجرام فلکی کا مشاہدہ کرنا، دن اور رات، طلوع اور غروب، شمسی سال، قمری سال اور موسم کی تحقیق کرنا شامل ہے۔

خیام نے اس رصد گاہ میں جو مشاہدات کئے اور اپنی تحقیقات سے جو نئی نئی دریافت کیں، ان میں سے سب سے زیادہ اہم اور مشکل کام شمسی اور قمری سال کی پیمائش کرنا اور ان میں باہم مطابقت پیدا کرنا، شمسی سال سے مراد وہ پوری مدت اور وقت ہے جس میں زمین سورج کے گرد ایک پورا چکر کاٹ لیتی ہے۔

قدیم ترین زمانے کے یونانی حکماء سال کو پورے تین سو پینسٹھ (۳۶۵) دن کا مانتے تھے اور اسی سے مہینوں اور دنوں کا حساب لگاتے تھے۔

مسلم دور میں سب سے پہلے محمد بن جابر البنانی (المتوفی ۹۲۹ء) جو مشاہدہ افلاک کا ماہر تھا، اس نے شمسی سال کی تحقیق کر کے پورے ایک سال کی مقدار تین سو پینسٹھ (۳۶۵) دن، پانچ گھنٹے، چھیالیس منٹ اور چوبیس سکنڈ متعین کی تھی۔

عمر خیام نے بھی شمسی سال کی کمالِ احتیاط سے تحقیق کی اور پیمائش کے بعد پورے سال کی مقدار تین سو پینسٹھ دن، پانچ گھنٹے اور انچاس منٹ بنایا، عمر خیام کی تحقیق آج کے دور سے بہت قریب ہے اور زیادہ صحیح ہے، آج کے سائنسداں سال کی مقدار تین سو پینسٹھ دن، پانچ گھنٹے، اڑتالیس منٹ اور ۴۸ء۷ سکنڈ بتاتے ہیں۔

عمر خیام کی تحقیق جو آج سے نو برس پہلے محض علمی مہارت اور معمولی آلات کے ذریعے کی گئی تھی اور آج کے اس سائنسی دور میں جب کہ علم وفن انتہائی کمال کو پہنچ گیا ہے، دونوں کی تحقیق میں صرف (۱۱ء۳) سکنڈ کا فرق پایا جاتا ہے، یہ معمولی ترین فرق کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

سرکاری مطالبات کی وصولی اور تنخواہوں کی ادائیگی

کھیتوں میں فصلیں ہمیشہ شمسی حساب سے پکتی ہیں، اس لئے ریاست کے خزانے میں شمسی حساب سے رقمیں آتی تھیں؛ لیکن ملازمین کی تنخواہیں اور دیگر اخراجات کا بجٹ قمری حساب سے تھا اور ادائیگی ہوتی تھی۔

شمسی سال کے مقابلے میں قمری سال چھوٹا ہوتا ہے، یعنی قمری سال شمسی سال پورے ایک سال میں گیارہ دن کم ہوتا ہے اور شمسی سال اتنا ہی بڑا ہوتا ہے، اس حساب سے بتیس شمسی برسوں میں تینتیس قمری سال آتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ بتیس برسوں میں ایک سال کا فرق پڑتا ہے۔

ہر بتیس سال میں ایک سال بڑھ جانے سے حکومت کو ایک سال کے اخراجات کا نقصان ہوتا تھا؛ کیوں کہ سرکاری اخراجات کا تعین اور ادائیگی تو قمری حساب سے ہوا کرتی تھی، جو بتیس سال میں ایک سال کے اخراجات زیادہ ادا کرنے پڑتے تھے؛ لیکن سرکاری مالیہ اور آمدنی شمسی حساب سے ہوتی تھی، اس وجہ سے حکومت کو ایک سال کے اخراجات زیادہ ادا کرنے پڑتے اور نقصان ہوجاتا تھا، اب اس کے لئے کوئی مناسب تدبیر کرنی ضروری تھی۔

عمر خیام کا کارنامہ

عمر خیام نے شمسی اور قمری سال میں اسی فرق کو اصولی طور پر یوں دور کیا کہ سب سے پہلے حکومت سے یہ اصول منوایا کہ مذہبی اور دینی امور مثلاً حج، عیدین، رمضان وغیرہ کا تعین تو قمری حساب اور ہجری تقویم سے کیا جائے اور دیگر امور سلطنت مثلاً مالیہ کی وصولی، بجٹ کے اخراجات لا تعین، بجٹ اور سرکاری ملازمین کی تنخواہوں کی ادائیگی وغیرہ شمسی حساب اور ایرانی تقویم سے کی جائے۔

شمسی تقویم میں اصلاح

سال میں پانچ دن ایسے آجاتے ہیں جو بڑھ جاتے تھے، اہل عرب ایسے سال کو ''کبیر'' (leapyer) کہتے تھے اور اہل ایران ''دزدیدہ'' (چرائے ہوئے دن) کہتے

تھے،اہل یورپ میں ابھی یہ شعور پیدا نہیں ہوا تھا۔

خیام نے شمسی تقویم میں ایک بہت بڑی اصلاح کی اس نے ان زائد دنوں کو سال کے بارے مہینوں میں کھپا دیا، اس طرح کہ بعض مہینوں کو تیس دن کا اور بعض کا اکتیس دن کا بنا دیا اوران کا کلی مجموعہ تین سو پینسٹھ (۳۶۵) دن کا ہوگیا۔

لیکن (۳۶۵) دنوں کے بعد بھی سال میں قریباً چھ گھنٹے کی زیادتی آجاتی ہے اور یہ بچ رہتا تھا، عمر خیام نے ہر چوتھے سال کے ایک مہینے میں ایک دن زیادہ کردیا، گویا یہ چوتھا سال (۳۶۶) دنوں کا ہوگیا۔

مزید اصلاح کے لئے ۱۳۲ویں سال کو لیپ کا سال قرار نہ دینے کا ضابطہ بنایا، آج دنیا میں عمر خیام کا اصلاح شدہ شمسی کیلنڈر رائج ہے جو اس کے کمالِ علم کی روشن دلیل ہے۔

مزید اصلاح کے لئے ۱۳۲ سال کو لیپ کا سال قرار نہ دینے کا ضابطہ بنایا، آج دنیا میں عمر خیام کا اصلاح شدہ شمسی کیلنڈر رائج ہے جو اس کے کمالِ علم کی روشن دلیل ہے۔

عمر خیام نے اپنی بندگی کے آخری ایام فلسفے کے مطالعے اور شاعری کے مشغلے میں گذارے، وہ نہایت شوق وظریف الطبع تھا اور حافظہ بلا کا قوی تھا۔

دو جرمن دانشوروں نے جن کا نام جیکب (Jacob) اور وائڈمن عمر خیام کے سائنسی کارناموں اور اصلاحات پر ایک پر از معلومات مقالہ لکھا جو ۱۹۱۲ء میں جرمنی زبان کے رسالہ ''اسلام'' کی جلد سوم میں بقدر بیس صفحات شائع ہوا، عمر خیام مشرق سے زیادہ مغرب میں مقبول ہوا، فریڈ رک روزی کے مطابق مشرق کے کسی شاعر کو اتنی مقبولیت حاصل نہ تھی، جتنی کے خیام کو فٹز جرالڈ نے عمر خیام کی ایک سو ایک رباعیوں کا انگریزی ترجمہ کیا جو اتنے مقبول ہوئے کہ بقول سید صباح الدین عبدالرحمن ''انجیل کی عبارت کے بعد انگریزی دان کی زبان پر یہی اشعار تھے''۔

عمر خیام نے ریاضی میں ایک تہلکہ خیز کنٹری بیوشن کی، جس کو binomial coefficients کہتے ہیں، یورپ میں اس دریافت کا نام (pascal,s triangle) رکھ دیا گیا ہے۔

مذہبی رنگ اور دینی مزاج

آخری ایام کا ذکر علامہ سید سلیمان ندوی یوں تحریر فرماتے ہیں کہ: ''مرض الموت کے بعد آخری لمحوں میں وہ بوعلی سینا کی کتاب الٰہیات شفا کا مطالعہ کررہا تھا، جب واحد اور کثیر کی بحث پر پہنچا تو اس پر یہ اثر ہوا کہ اٹھ کھڑا ہوا، لوگوں کو بلا کر وصیت کی، پھر نماز پڑھی، اس درمیان میں کچھ کھایا نہ پیا، آخر عشاء کی نماز پڑھ کر سجدہ کیا اور یہ طوطی خوش نوا ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا۔

عمر خیام ۱۱۳۱ء میں انتقال کیا اور نیشاپور کے قریب گورستان میں تدفین ہوئی۔

محمد خیام کو شعر وادب پر کمال حاصل تھا، مولانا شبلی رقم طراز ہیں: خیام کی رباعیات اگرچہ سیکڑوں، ہزاروں ہیں؛ لیکن سب کا قدر مشترک صرف چند مضامین ہیں جو دنیا کی بے ثباتی، خوش دلی کی ترغیب، مسئلہ جبر، توبہ واستغفار، ان میں ایک ایک مضمون کو وہ بار بار ادا کرتا ہے، لیکن ہر دفعہ اس طرح بدل کر کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی نئی چیز ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے سامنے خیام کی رباعی پڑھی جاتی تو وہ رو پڑتے۔(۱)

۱۰۔حکیم یحیی بن منصور (۲۱۴ھ/۸۳۳ء)

حکیم یحیی بن منصور ہیئت داں اور منجم تھا اور دربار میں اسی حیثیت سے وہ باریاب ہوا، حکیم یحیی ایک پڑھے لکھے خاندان کا چشم وچراغ تھا، اس کے والد علم ہیئت کے ماہر تھے، علم منجم کا تعلق علم ہیئت سے ہے، اس لئے ہیئت داں نجومی بھی ہوتا ہے، اس دور میں عوام کو علمِ نجوم سے بڑی دلچسپی تھی، عوام چاند تاروں کے اثرات کے قائل تھے، نجومی چاند، تاروں کو دیکھ کر آئندہ پیش آنے والی باتیں بتادیتے تھے، اس علم کو علمِ نجوم، علمِ جوتش یا انگریزی میں (astrology) کہتے ہیں۔

حکیم یحیی منصور نے علم نجوم میں کمال پیدا کیا؛ چوں کہ اپنے فن کا ماہر تھا، دربار میں خوب عزت پائی۔

---

(۱) موسوعة علماء العرب: ۱۶۴

علمی خدمات اور کارنامے

سائنس کی دنیا میں مامون الرشید کا یہ سب سے بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے ایک عظیم رصدگاہ (obsevatory) بغداد میں شماسیہ کے مقام پر تعمیر کرائی اور دوسری رصدگاہ ملک شام میں دمشق کے قریب قاسیون کے بلند اور مسطح میدان میں تعمیر کرائی۔

اسی تعمیر میں باکمال ہیئت دانوں کی ایک جماعت مقرر تھی جو سب کی نگرانی کرتے تھے، ان میں حکیم یحیی منصور بھی تھا، بغداد کی رصدگاہ دو برس میں کام کرنے لگی، ہر قسم کے آلات مثلا اصطرلاب وغیرہ نصب تھے، ماہرین کی جماعت حکیم یحیی منصور بھی تھا۔

قاسیون (دمشق) کی رصدگاہ جب تیار ہوئی تو حکیم یحیی منصور کا تقرر صدر کی حیثیت سے وہاں ہوگیا، حکیم یحیی منصور اور ماہرین کی جماعت نے وہاں فلکیات کا مطالعہ اور مشاہدہ شروع کردیا۔

حکیم یحیی منصور نے چاند اور بعض دیگر سیاروں کے متعلق چند نئی نئی دریافتیں کیں، ستاروں کے متعلق زیچ (Astronomical tables) سب سے پہلے تیار کی، جس کا نام زیچ مامونی رکھا، یہ زیچ فلکیات سے متعلق پہلی کتاب ہے۔

۱۱۔(ابومحمود) حامد بن الخضر الخجندی (۳۹۱ھ-۱۰۰۰ء)

ابومحمود حامد بن الخضر الخجندی کے حالاتِ زندگی بہت کم دستیاب ہیں، نصیرالدین طوسی کے بیان کے مطابق اس کو خان کا لقب حاصل ہوا تھا، اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ خجندی ماوراء النہر کے دریائے سیر پر واقع قصبہ خجندہ کے خوانین میں سے تھا، کچھ مدت تک اس کو بویہ حکمراں فخر الدولہ کی سرپرستی حاصل رہی۔

علمی خدمات اور کارنامے

ابومحمود حامد بن الخجندی نے مندرجہ ذیل کتابیں لکھیں:

۱- رسالہ فی المیل وعرض البلد (طریق الشمّس کا جھکاؤ اور علاقوں کے عرض البلد دریافت کرنے کے بارے میں رسالہ)۔

۲- جیومیٹری پر ایک کتاب۔

۳- فی عمل الآلۃ العامۃ (یا الآلۃ الشاملۃ) جامع آلہ کے طریقہ استعمال میں کتاب۔

نصیرالدین طوسی کے مطابق الخجندی نے قانون الہیئت (یعنی کروی مثلثوں سے متعلق مسئلہ جیب زاویہ (sine theorem) دریافت کیا، جس نے میں لاؤ (menelaus) کے قانون کی جگہ لی، دسویں صدی کے سائنس دانوں مثلا ابوالوفاء اور ابونصر بن علی بن عراق نے بھی مسئلہ جیب زاویہ کی دریافت کا دعوی کیا تھا۔

طوسی اپنی کتاب ''شکل القطاع'' میں مسئلہ جیب زاویہ کے لئے الخجندی کے حل کا ذکر کیا ہے۔

جیومٹری میں الخجندی نے تمام ثبوت کے ساتھ یہ دریافت کیا کہ وہ مکعب مقداروں کا مجموعہ ایک مکعب مقدار نہیں ہوسکتا۔

سارٹن لکھتے ہیں: ''الخجندی جو ماہر فلکیات کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں، انہوں نے ثابت کیا کہ دو مکعب عددوں کا مجموعہ مکعب عدد نہیں ہوسکتا'' الخجندی نے یہ قاعدہ دسویں صدی میں پیش کیا تھا؛ مگر اہل مغرب نے اسے فرمٹ (سترھویں صدی) سے منسوب کرکے (Theorem of fermat) کے نام سے مشہور کردیا۔

فخر الدولہ کی زیر سرپرستی الخجندی نے قصبہ رے کے مضافات میں واقع ایک پہاڑی پر جس کا نام ''جبل طروق'' تھا، طریق الشمّس (eclptic) جھکاؤ کی پیمائش کا ایک آلہ تعمیر کیا، اس آلے کو السدس الفخری کا نام دیا گیا، اس آلے کی وضاحت یوں کی جاسکتی ہے۔

۴۰ ہاتھ اونچی دیواریں خط نصف النہار کے متوازی تعمیر کی جاتی ہیں، جنوبی دیوار کے قریب ایک محراب دار چھت میں تین انچ قطر کا ایک شگاف رکھا جاتا ہے، اس سوراخ کے ۴۰ ہاتھ تک گھڑھا کھودا جاتا ہے۔

دونوں دیواروں کے درمیان لکڑی کی بنی ہوئی قوس، جس کا زاویہ ۶۰ ڈگری اور قطر ۴۰ ہاتھ ہے رکھی جاتی ہے، یہ قوس تانبے کے پتروں سے ڈھانپی ہوتی ہے اور اس پر درجوں کے نشانات لگائے جاتے ہیں، قوس کا ہر درجہ ۶۰ منٹ میں اور ہر منٹ مزید

دس حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

چوں کہ چھت کی شگاف داخل ہونے والی سورج کی شعاعیں ایک مخروطی شکل بناتی ہیں، اس لئے قاعدہ کا مرکز معلوم کرنے کے لئے ایک آلہ کی ضرورت ہوتی ہے، یہ آلہ جو ایک دائرہ پر مشتمل ہوتا ہے اور جس کے دو قطر ایک دوسرے کو زاویہ قائمہ پر قطع کرتے ہیں، مخروطی شکل کے قاعدہ پر منطبق ہوتا ہے، مخروط کی حرکت کے ساتھ ساتھ اس کو بھی حرکت دی جاتی؛ یہاں تک کہ اس کا مرکز خط نصف النہار پر آجائے، شاقوں اور ارتفاع شمس کے درمیان بننے والی قوس سورج کے ارتفاع کے جیب مستوی (cosine) کے برابر ہوتی ہے۔

ابو محمود حامد الخضر الخجندی ۱۰۰۰ء میں فوت ہوا۔

۱۲۔عباس بن فرناس (۲۷۴ھ-۸۸۷ء)

عباس ابن فرناس اپنی اختراعات او رایجادات کی بدولت بہت بڑی شہرت حاصل کی، اہل مغرب کو مشرقی علوم سے روشناس کرایا، وہ پورے ہسپانیہ میں واحد شخص تھا جو الخلیل ابن احمد کی علم عروض سے متعلق تصنیف سمجھتا تھا۔

ابن فرناس عراق کا سفر کیا اور وہاں علمی وادبی حلقوں اور اداروں کو دیکھا، واپسی پر وہ اپنے ساتھ فلکیات کی مشہور کتاب ''سند ہند'' بھی ہسپانیہ لے آیا۔

علمی خدمات اور کارنامے

ابن فرناس سے متعلق مشہور ہے کہ اس نے اڑنے کی کوشش کی اس نے اڑنے کے لئے ایک غلاف تیار کیا، جس میں پر اور مصنوعی پروں کے ساتھ ایک بلند چٹان سے کود پڑا؛ لیکن اس کی پرواز زیادہ کامیاب ثابت نہ ہوسکی، نیچے اترتے ہوئے وہ زخمی ہوگیا۔

عباس ابن فرناس اپنے گھر میں ایک سیارگاہ بنائی تھی جس میں چاند ستاروں اور بجلی کی گرج وچمک کا مصنوعی ماحول پیدا کیا گیا۔

عباس ابن فرناس نے ایک خاص قسم کی گھڑیال بنایا اور اسفیر یعنی کرہ فلکی کی بھی

ایجاد کیا۔ بلور کو ہی (rock crystal) کی دریافت بھی اسی نے کی، جن کتابوں میں اس کی اختراعات وایجادات کا ذکر کیا گیا تھا، وہ اب اصل صورت میں دستیاب نہیں، ایک حوالہ کے مطابق ''**المقبس**'' کے مصنف نے ابن فرناس کے کئی تذکرے اور اشعار شامل تحریر کئے، اسی مآخذ کے مطابق اس گمشدہ کتاب ''**یعین المقبس**'' کا ایک مخطوطہ حال ہی میں دریافت ہوا ہے، مشہور مؤرخین ابن سعید اور مقری کے مطابق ''وہ اندلس میں بلور کو ایجاد (دریافت) کرنے والا پہلا سائنسداں تھا، اس بیان سے بہت سی باتیں اخذ کی جاسکتی ہیں؛ لیکن اتنا ضرور ہے کہ بلور کاٹنے کا طریقہ ابن فرناس ہی نے متعارف کرایا، اس سے یقینا بلاد شرقیہ (خصوصا مصر) کو کوائز کی برآمد پر بہت اثر پڑا ہوگا، کیوں کہ اب یہ حقیقت سامنے آگئی تھی کہ بلور کو وہیں کاٹ کر استعمال میں لایا جاسکتا ہے جہاں سے یہ نکالا جاتا تھا، اس دریافت کے باوجود شیشہ سازی کی صنعت پر کوئی اثر نہ پڑا۔

اس نے ہوا میں اڑنے کا تجربہ کیا، اس مقصد کے لئے پروں والی ایک مشین بنائی جس کی مدد سے ذرا سا اڑنے میں کامیاب ہوگیا، اس نے وقت معلوم کرنے کا ایک آلہ بھی بنایا جو مثقال کہلاتا ہے، عباس بن فرناس نے اپنے گھر میں کائنات کا ایک ماڈل بنایا تھا، جس کے متعلق ''المقری'' کے الفاظ ہیں:

''اس نے اپنے گھر میں ہیئت آسمانی بنائی تھی، جس میں ستارے ابر، برق، رعد معلوم ہوتے تھے، اس کے ماڈل کو آج کے دور میں (Planetarium) کہا جاتا ہے۔(۱)

اس مشہور سائنس داں عباس ابن فرناس کا انتقال ۸۸۷ء میں ہوا۔(۲)

۱۳۔(ابوالحسین) عبدالرحمن بن عمر الرازی (۳۷۶ھ-۹۸۶ء)

امام ابوالحسن عبدالرحمن بن عمر الرازی ہے؛ لیکن الصوفی کے نام سے زیادہ

(۱) اسلام۔سائنس اور مسلمان: ۲۷۲

(۲) سو عظیم مسلم سائنسداں: ۳۵۴-۳۵۵

معروف تھے، ۲۹۱ھ/ ۹۰۳ء کو پیدا ہوئے، اور ۳۷۶ھ-۳۸۶ء میں ایران میں فوت ہوئے، حالات زندگی کی تفصیلات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ ایران اور بغداد میں بویہ سلطنت کے حکمرانوں کے ساتھیوں میں تھے، خصوصاً عضدالدولہ کے ساتھ اس کا تعلق نہایت ہی دوستانہ تھا، الصوفی کی چند تحریروں میں عضدالدولہ کے علاوہ حکمران خاندان کے مزید تین بادشاہوں کے نام بھی ملتے ہیں۔

علمی خدمات اور کارنامے

ساکن ستاروں کا مشاہدہ اور ان کی تفصیلات کو بیان کرنے میں الصوفی کو بڑی شہرت حاصل تھی، اس موضوع پر اس نے اپنی تحقیقات اور مشاہدات کو اپنی کتاب "کتاب صور الکواکب الثابتہ" میں قلمبند کیا اور اسے عضدوالدولہ کے نام منسوب کیا۔

اس کتاب میں الصوفی بطلیموس کی مرتب کردہ ستاروں کی زیج کا تنقیدی جائزہ لیتا ہے اور ساتھ ہی اپنے مشاہدات کے اختلافی یا اضافی نتائج کو شامل کیا ہے، الصوفی کی یہ کتاب بطلیموس کے مشاہدات وخیالات پر پہلا تبصرہ ہونے کے باعث اسلامی علم ہیئت میں صدیوں تک مستند تسلیم کی جاتی رہی، حتی کہ اس کے اثرات قرون وسطی کے مغربی سائنسی علوم پر بھی پڑے، ان دونوں مغرب میں الصوفی کو ''ایزوفی''(azopi) کے نام سے جانا جاتا تھا۔

سائنسی نقطۂ نظر سے الصوفی کی ''کتاب صور الکواکب الثابتہ'' اس لحاظ سے اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں قرون وسطی کے بیشتر ہیئت دانوں کی تحقیقات کے برعکس ستاروں کے حقیقی مشاہدات پر مبنی گراں قدر تحریریں موجود ہیں، جب کہ ازمنۂ وسطی کے اکثر فلکیات داں بطلیموس کی زیج میں درجہ خطوط طول البلد میں ہی صرف مستقل مقداروں کو جمع کرتے اور یوں بطلیموس کی ترتیب شدہ تفصیلات کو جوں کا توں دہرا دیتے تھے۔

الصوفی کی اس کتاب کا ایک اور قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ اس میں کئی صدیوں سے

رائج ستاروں کے عربی ناموں کی قطعی کوئی تطبیق دی گئی ہے، اس سے قبل یہ عربی نام صرف لسانیات کی تحریروں میں ملتے تھے؛ لیکن اس میں ستاروں کی قطعی تطبیق شامل نہ تھی، الصوفی نے فلکیات کی رو سے تطبیق قائم کرنے کی بہت کوشش کی، اگرچہ اسے ہر مرتبہ کامیابی نہ ہوتی، تطبیق کے مسئلے پر اس کی تحقیق کو بعد میں آنے والے ہیئت دانوں نے معیار بنایا؛ حتی کہ اس کا اثر جدید کوئی اصطلاحات پر بھی پڑا۔

الصوفی کی ایک مفصل تصنیف کا نام "کتاب العمل بالاصطرلاب" ہے، دوسری کتابوں کے انگریزی عنوانات یہ ہیں:

introduction to the science of astrology

book on the use of the celestial.

بعض حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ الصوفی نے چند فلکیاتی آلات بھی ایجاد کئے تھے، کہا جاتا ہے کہ اس کا بنایا ہوا چاندی کا ایک سماوی کرہ ۱۰۴۳ء کے لگ بھگ مصر میں محفوظ تھا۔(۱)

۱۴۔(ابوعبداللہ) محمد ابن عیسی الماہانی (۲۶۷ھ-۸۸۰ء)

الماہان کا پورا نام ابوعبداللہ محمد ابن عیسی الماہان ہے، وہ ایران کے ایک علاقہ جس کا نام ماہان ہے میں پیدا ہوئے، اسی نسبت سے وہ ماہانی کہلائے، انہوں نے زیادہ عرصہ بغداد میں گذارا، تاریخ پیدائش کا کوئی یقینی حوالہ نہیں، البتہ ۸۶۰ء کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

علمی خدمات اور کارنامے

الماہانی کی زندگی کے بارے میں ہماری معلومات کا بڑا ذریعہ وہ اقتباسات ہیں، جو الماہانی کی ایک غیر معروف تصنیف سے تعلق رکھتے ہیں، یہ اقتباسات ابن یونس کی ''جداول عالمی''میں الماہانی ہی کی کسی نامعلوم کتاب سے لئے گئے ہیں، اس کتاب میں ابن یونس ایسے مشاہدات بیان کرتا ہے جو الماہانی نے ۸۵۳ء اور ۸۶۶ء کے درمیانی عرصے میں بیان کئے، یہ مشاہدات اجرام فلکی کا قران (دو اجرام فلکی کا ملنا) اور سورج

(۱) سو عظیم مسلم سائنسداں: ۱۶۳-۱۷۳

اور چاند گرہن سے متعلق تھے، اس میں الماہانی چاند گرہن کے حوالے سے بتاتا ہے کہ اس نے اس گرہن کے شروع ہونے کا وقت اصطرلاب جیسے آلہ کی مدد سے معلوم کیا ہے اوراس کی صحت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس نے تین مسلسل چاند گرہنوں کے شروع ہونے کا وقت اپنے حساب سے نکالا اور پھر گرہن کے اوقات سے اس کا مقابلہ کیا تو صرف نصف گھنٹے کا فرق تھا، یعنی چاند گرہن اس کے اندازے کی نسبت آدھ گھنٹہ بعد میں شروع ہوا۔

الماہانی زیادہ تر حساب کے میدان میں تحقیق کا کام کیا، خیام کے خیال میں الماہانی ہی وہ پہلا سائنسداں ہے جس نے ارشمیدس کے ایک اہم مسئلے کا حل الجبرے کے اصولوں کے مطابق نکالنے کی کوشش کی، یہ مسئلہ ایک کمرے کو کسی مستوی کے ذریعے ایسے حصوں میں تقسیم کرنے سے متعلق تھا جن کے حکم آپس میں دی گئی نسبت کے مطابق ہوں، یہ مسئلہ کروں اور بیلنسوں سے متعلق اس کے ایک رسالہ میں بیان کیا گیا ہے۔

الماہانی نے اقلیدس کی کتاب ''اولیات'' کی پہلی، پانچویں، دسویں اور تیرہویں فصلوں کی شرحیں بھی لکھی ہیں، ان میں سے پہلی فصل میں دیئے گئے چھبیس مسئلوں پر لکھی جانے والی شرح نہیں ملی، یہ مسئلے ایسے تھے جنہیں کسی مہمل میں تحویل کے بغیر ثابت کیا جاسکتا ہے، اسی طرح دسویں فصل جو غیر ناطق نسبتوں سے متعلق تھی، کی شرح کا ایک حصہ، تیرہویں فصل کی غیر معروف عبارتوں کی وضاحت اور تین مختلف رسالے، فصل پنجم بھی اس وقت نایاب ہے، چوں کہ فصل پنجم جو تناسب کے نظریے سے متعلق ہے، ترکیبی انداز میں لکھی گئی تھی اور اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ تناسب کا اصول کیوں کر وجود میں آیا، اس لئے عرب ریاضی داں اس کی تعریف نمبر ۵ جو بنیادی نوعیت کی ہے سے بالکل غیر مطمئن تھے؛ تاہم انہوں نے اس کی صداقت سے انکار نہیں کیا اور اسے ایک سائنسی اصول کے طور پر تسلیم کرلیا، رفتہ رفتہ انہوں نے (egibmultiple) کی اقلیدسی تعریف کو (anthyphairitic pre-eudoxian) تعریف سے بدل دیا، یہ تعریف قدروں (magnitudes) کا مقابلہ ان کے کسر مسلسل میں پھیلاؤ کے لحاظ سے کرتی تھی

، الماہانی کے رسالے میں اینتھی فریٹک تصورات صاف صاف انداز میں بیان کئے ہیں، اس سلسلے میں وہ ثابت بن قرہ کا حوالہ بھی دیتا ہے، الماہانی کے خیال میں نسبت ''دو رقموں کا ایسا باہمی طریقۂ عمل ہے جس میں اقلیدس کے مشترک مقسوم علیہ اعظم کے معلوم کرنے کے طریقے سے ان کا موازنہ کیا جائے'' اس کے نقطۂ نظر سے اگر اس عمل میں سامنے آنے والی حاصل تقسیم کے دو سلسلے ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہوں تو رقموں کے یہ دو جوڑے باہم متناسب ہوں گے، النیریزی نے بعد میں بعینہ یہ نظریہ پیش کیا، ان میں سے کسی بھی نظریے کا اقلیدس کی اس تعریف سے متعلق قائم نہیں ہوتا جو سب سے پہلے ابن الہیثم نے پیش کیا تھا۔(۱)

۱۵۔ نصیر الدین الطوسی ابو جعفر (۶۷۳ھ/۱۲۷۴ء)

یہ عظیم ریاضی داں اور ماہر ہیئت گذرا ہے، نصیر الدین طوسی کی ولادت طوس ملک خراسان کے ایک شہر میں ہوئی، اس نے اپنے استاذ ابن یونس کمال الدین یونس سے علوم اور فلسفہ کی تکمیل کی، ایک ہمہ داں محقق اور نجومی کی حیثیت سے اس کی شہرت جلد ہی فارس تک پھیل گئی اور کوہستاں کے اسماعیلی گورنر نے ناصر الدین عبدالرحمن ابن علی منصور نے اس کو آخر کار اغواء کر کے الموت روانہ کردیا، جہاں ایک مدت تک اسے بدرجۂ مجبوری قیام کرنا پڑا، آخر کار ۱۲۵۶ء میں منگولوں کے فاتح ہلاکو خاں نے اسے وہاں سے آزادی دلائی، بعد ازاں وہ ہلاکو کا مشیر اور وزیر اور اوقاف کا محافظ مقرر ہوا، ہلاکو کے انتقال کے بعد اس کے جانشیں اب کے زمانے میں بھی اس کا یہ اثر ورسوخ قائم رہا؛ یہاں تک کہ ۲۶/جون ۱۲۷۴ء میں اس نے بغداد میں انتقال کیا۔

علمی خدمات اور کارنامے

علم فلکیات میں نصیر الدین طوسی کی شہرت اس تحقیق کی بدولت ہے جو انہوں نے رصدگاہ مراغہ میں کی ہے، بغداد میں نویں صدی میں عباسی خلیفہ مامون الرشید کا قائم کردہ ''بیت الحکمۃ'' اور قاہرہ میں گیارہویں صدی عیسوی میں فاطمی خلیفہ الحکم فلکیاتی رصدگاہ مشرقی علوم وفنون اور فلکیاتی تحقیق کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ اس رصدگاہ میں بہترین آلات

(۱) موسوعۃ علماء العرب والمسلمین: ۱۹۰

مہیا کئے گئے تھے اوراس کے لئے بغداد سے لوٹ کر ۴۰۰ کتابیں فراہم کی گئیں تھیں۔

طوسی ’’ترکیوٹ‘‘ کے موجد مانے جاتے ہیں، پندرہویں، سولھویں صدی میں یہ آلہ مغرب میں بہت زیادہ مقبول تھا۔ مسلم سائنسداں نے اجرامِ فلکی کے مشاہدہ کے لئے مختلف قسم کے آلات بنائے، مراغہ کی فلکیاتی رصدگاہ میں مختلف مقاصد کے لئے چھلوں سے بنائے ہوئے مختلف قسم کے آلات بنائے، ان میں اسے ایک جس کا زیادہ استعمال ہوتا ہے پانچ چھلوں پر مشتمل تھا، جب الفانسو کاسٹیلا نے اکلس گوں بنانا چاہا تو اس وقت بہترین سمجھا گیا تو عربوں سے اس کی ضروری معلومات حاصل کیں۔

مراغہ کی فلکیاتی رصدگاہ میں جو خالص فلکیاتی تحقیق ہوتی، وہ دو عہد تک جاری رہی اور اس کے نتیجے میں ’’الزج والخان‘‘ جسے خانی تقویم بھی کہتے ہیں عالم وجود میں آئی، مشرقی ممالک اور خصوصاً چین میں وہ بہت مقبول ہوئی، نصیرالدین الطوسی نے یہ تقویم بارہ سال کی محنت شاقہ کے بعد ۱۲۷۲ء میں مرتب کی، علوم ریاضی میں بھی نصیرالدین بیش بہا تصانیف چھوڑیں، خصوصا جیومیٹری اور علم مثلث میں اس کی تصنیف اعلی درجہ کامیاب ہوئی، انہوں نے حساب اور الجبرا میں بھی کتابیں لکھیں، جن میں ’’الجبر والمقابلہ‘‘ بہت مشہور ہے۔

علم فلکیات میں اس کی مشہور تصنیف ’’کتاب تذکرۃ الناصر‘‘ ہے جس میں فلکیات کا مکمل جائزہ لیا گیا ہے، مشرقی مغربی زبانوں میں اس کی متعدد تفسیریں اور تبصرے لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی نصیرالدین نے علم فلکیات پر کئی اور کتابیں لکھی ہیں، ان میں ’’زبدۃ الحی‘‘، ’’کتاب التحصیل فی النجوم‘‘، ’’غروب وطلوع‘‘ ’’سیارہ‘‘، ’’رات دن‘‘، ’’سورج اور چاند‘‘ اور ’’چاند کا حجم اور ان کے درمیان فاصلہ‘‘ وغیرہ وغیرہ قسم کی بارہ کتابیں لکھی ہیں۔

نصیرالدین الطوسی کی علم ہیئت ومعرفت کا سرچشمہ کتاب ’’تذکرۃ فی علم الھیئت‘‘ ہے، جس کا لاطینی ترجمہ (figure) کے عنوان سے چودھویں صدی میں کیا گیا، اس کتاب میں الطوسی نے بہت سی پرانی، فرسودہ تھیوریز پر کڑی تنقید کی، نیز اس

نے اپنا تیار کردہ ماڈل (planetary molder) پیش کیا، کوپرنیکس نے اپنا اس سے ملتا جلتا ماڈل پانچ سو سال بعد پیش کیا،، الطوسی نے مراغہ (آذر بائیجان) میں ۱۲۶۲ء میں رصدگاہ تعمیر کی، جس میں علاوہ سائنسی آلات کے ایک بارہ فٹ لمبا قواڈنٹ (Quadrant) اور ایک (Azimuth) تھا، جسے اس نے خود تیار کیا تھا، اس نے بارہ سال کی دیدہ ریزی شب وروز کی محنت کے بعد ستاروں کی (زیچ الخافی) تیار کی، جس میں ۹۹۰ ستاروں کی کیٹلاگ تھی، کتاب ’’تذکرۃ فی علم الھیئت‘‘ میں اس نے چاند اور کروں کی حرکت (مرکری اور وینس) پر بطلیموس کے فرسودہ نظریات کو رد کر کے ایک جدید سسٹم تجویز کیا، جس کے مطابق کروں کے مدار بیضوی بنتے تھے، اس کو بنیاد بنا کر جوہانس کیپلر (heliocentric) نے اپنا جدید نظریہ (یعنی آفتاب کا مرکزی ہونا) پیش کیا تھا۔(۱)

جدید محققین جیسے ایڈورڈ کینیڈی اور آٹو نیوگے برگر نے تسلیم کیا ہے کہ پرنیکس (وفات ۱۵۴۳ء) نے جدید اسٹرانوی کی جو عمارت تعمیر کی تھی وہ صرف اقلیدس کی کتاب ’’عناصر‘‘ اور جالینوس کی کتاب ’’المجسطی‘‘ کے مطالعہ سے ہی ممکن نہ ہوئی تھی، بلکہ اس میں دو تھیوریں کا بہت دخل تھا، یہ تھیوری کو پرنیکس سے تین سال قبل اسلامی ممالک میں وضع کی گئی تھی جن کا مقصد یونانی علم ہیئت کی اصلاح تھا۔ تھیوری آف نصیرالدین کا نام tusi couple بھی ہے، جسے عالم بے بدل نصیرالدین الطوسی نے ۱۲۴۷ء میں وضع کیا تھا، اس تھیوری کی وضاحت کے لئے انٹرنیٹ سے استفادہ کیا جاسکتا ہے، جہاں اس موضوع پر معلومات کا بیکراں ذخیرہ موجود ہے، مختصر یہ کہ یہی تھیوری کو پرنیکس نے سولھویں صدی میں اپنی شاہکار کتاب میں پیش کی اور جہاں الطوسی نے اپنی ڈایا گراما میں ’’الف‘‘ لکھا تھا، پرنیکس نے اسے ’’A‘‘ لکھا، جہاں الطوسی نے ’’ب‘‘ لکھا تھا اس نے ’’B‘‘ لکھا اور ہوبہو یہ ڈایا گرام پیش کیا۔

اس سلسلہ کی دوسری تھیوری کا نام الازدی ہے تھیورم al urdi ہے جو محی الدین

(۱) اسلام، سائنس اور مسلمان: ۲۵۰

الازدی (وفات ۱۲۶۶ء) نے ۱۲۵۰ء میں پیش کیا تھا، حیرانگی کی بات ہے کہ یہی تھیورم کو پرنیکس کی کتاب میں تین سوسال بعد نظر آتا ہے، طرفہ یہ کہ الازدی نے یہ تھیورم ایک نئے تصور کی صورت میں پیش کر کے اس کا حسابی ثبوت بھی پیش کیا، جب کہ پرنیکس نے اس کا ثبوت پیش نہیں کیا۔

مسلمان ریاضی دانوں کو اقلیدس کے پانچویں مفروضے کو دریافت کرنے کا بہت شوق تھا، اس ضمن میں نصیرالدین الطوسی نے ایک جیومیٹرک کنسٹرکشن دریافت کیا، الطوسی کی اس دریافت کو نیوٹن سے پہلے، برطانیہ کے عظیم ریاضی داں جان والس (۱۷۰۳-۱۶۱۶) walis نے اپنی ریسرچ میں استعمال کیا، اس کے بعد ایک اور ریاضی داں (۱۷۳۳-۱۶۶۷) sacchri نے بھی استعمال کیا، مگر کسی نے بھی اس کا کریڈٹ الطوسی کو نہ دیا۔(۱)

۱۶۔ ویجن بن رستم الکوہی (ابوسہل القوہی)(۳۹۱ھ-۱۰۰۰ء)

ابوسہل ویجن ابن رستم طبرستان کے پہاڑی علاقہ القوہی یا کوہی میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے یہاں حاصل کی، پھر بغداد کا رخ کیا، مشہور بویہی خلیفہ عضد الدولۃ اور اس کے بعد اس کے جانشین شرف الدولۃ نے القوہی کی بہت عزت افزائی کی اور سائنسی تحقیقات کے لئے مقرر کیا۔

اس کی شہرت کی ابتداء شرف الدولۃ کے ۹۸۸ء میں اسے سات سیاروں کے مشاہدہ کے لئے دیگر سائنسدانوں کی ایک ٹیم کے ساتھ مقرر کرنا تھا، یہ رصدگاہ شاہی محل کے باغ میں تیار کی گئی اور اس میں القوہی ہی کے بنائے ہوئے آلات نصب کئے گئے، انہیں اس رصدگاہ کا افسر اعلی مقرر کیا گیا، جون ۹۸۸ء میں یہاں پہلی مرتبہ مشاہدہ کیا گیا، اس موقع پر ان کے علاوہ دیگر سائنسداں اور بھی تھے، انہوں نے نہایت درستگی کے ساتھ برج سرطان میں سورج کے داخل ہونے کا حساب لگایا، اس کے تقریبا تین ماہ کے بعد سورج کے برج میزان میں دخول کا مشاہدہ بھی کیا گیا۔

(۱) اسلام، سائنس اور مسلمان: ۲۵۴، ۱۰۰ عظیم مسلم سائنسداں: ۵۰۰، موسوعۃ علماء العرب والمسلمین: ۲۰۷

البیرونی نے بھی لکھا ہے کہ ۹۸۹ء میں شرف الدولۃ کی وفات کے ساتھ ہی رصدگاہ کی سرگرمیاں بھی ختم ہوگئیں۔

القوہی جسے عمر خیام ایک عظیم ریاضی داں قرار دیتا ہے نے زیادہ تر جومیٹری کے میدان میں خدمات انجام دی ہیں، اس نے زیادہ تر جومیٹری کے مسائل کو حل کیا ہے جنہیں دو سے زیادہ درجے کی مساواتوں میں تحویل کیا جاسکتا ہے۔

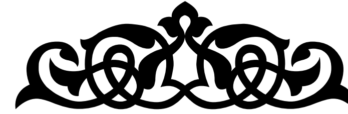
نصیرالدین الطوسی نے ارشمیدس کی تصنیف ''کرہ اور بیلن'' کے ساتھ ایک ضمیمہ منسلک کیا ہے اور اس میں درج ذیل نوٹ تحریر کیا ہے ''کسی دیئے گئے کرے کے برابر ایک کروی قطعہ بنانے کے لئے ارشمیدس کے بیان کردہ مسئلوں سے مشابہ لیکن ان سے کسی قدر زیادہ مشکل مسئلہ القوہی نے ایک متساوی الجوانب ہذلولی اور قطع مکانی کے تقاطع سے دو نامعلوم لمبائیاں تشکیل دیں اور ان شرائط پر سختی سے بحث کی جن کے تحت اس مسئلے کو حل کیا جاسکتا''

''رسالة فی استخراج ذی المسبع المتساوی الاضلاع فی دائرة'' میں بھی اسی صحت کو پیشِ نظر رکھا لیا ہے اور اس میں بیان کیا گیا طریقہ اس طریقے کے نسبت زیادہ مکمل ہے جو ارشمیدس سے منسوب کیا جاتا ہے، القوہی کے طریقے میں زاویاتی نسبت ۴:۲:۱ کی حامل مثلث معلوم کرنے کو بنیاد بنایا گیا ہے۔

''رسالہ فی استخراج مساحت المجسم المکانی'' میں بھی القوہی نے ارشمیدس کی نسبت سادہ اور واضح حل پیش کیا ہے، اس کا کہنا ہے کہ وہ اس موضوع پر صرف ثابت ابن قرہ کی تحریر سے متعارف تھا، اور تین مسئلوں میں اس نے زیادہ مختصر اور شستہ طریقہ پیش کیا ہے، ان طریقوں میں سے کسی میں بھی ایک معین کے گرد قطع مکانی کی گردش سے پیدا ہونے والے مکانی مجسموں (paraboloids) کا حساب نہیں لگایا، یہ کام سب سے پہلے ابن الہیثم نے کیا جو ثابت اور القوہی کی تحریروں سے متاثر تھا، اگرچہ القوہی کا طریقہ نامکمل تھا؛ لیکن ابن الہیثم اس سے بے حد متاثر نظر آتا ہے۔

القوہی وہ پہلا اسکالر ہے جس کے یہاں مخروطی پرکار کا بیان ملتا ہے، اس پرکار کی

ایک ٹانگ کومخروطی تراشوں کی ڈرائنگ کے لئے چھوٹا یا بڑا کیا جا سکتا ہے، اس تصنیف یعنی ”رسالہ فی البرکار التام“ میں اس نے پہلے اس پرکار کی مدد سے سیدھی لائنوں، دائروں اور مخروطی تراشوں کی ڈرائینگ کے طریقے بیان کئے ہیں اور پھر اس کی تھیوری پر بحث کی ہے، آخر میں اس نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اب اس کی مدد سے اصطرلاب، دھوپ گھڑیال اور اس طرح کے دوسرے آلات آسانی سے تیار کئے جاسکتے ہیں، البیرونی نے اپنے استاذ ابونصر منصور ابن عراق سے اس کی تصنیف کی نقل طلب کی تھی اور البیرونی کی ایک تحریر میں ابن الحسین القوہی کی تصنیف کا حوالہ ملا ہے، نقل حاصل کرنے کی سعی لا حاصل کے بعد ابن الحسین نے اس موضوع پر ایک کمتر تحریر قلم بند کی، القوہی عالم اسلام کا ایک مایہ ناز سائنس داں تھا۔(۱)



(۱) ۱۰۰ عظیم مسلم سائنسداں: ۵۰۴

علم ریاضی میں مسلمانوں کے کارنامے

(۱) احمد بن عبداللہ حبش حاسب (۲۱۲ھ/۸۳۰ء)

احمد عبداللہ فن ریاضی کا ماہر تھا، وطن ایران کے کسی علاقے میں تھا مگر بغداد آ گیا، ہارون الرشید کا زمانہ تھا، ہر طرف علم وفن کے چرچے تھے، اہل علم وفضل کی قدردانیوں کے سبب ہر طرف سے صاحبان علم وکمال امڈ چلے آرہے تھے، احمد عبداللہ حاسب نے بھی عزت کی جگہ حاصل کر لی، حاسب نے مامون الرشید کا زمانہ بھی دیکھا۔

حاسب کو علم ریاضی سے خاص دلچسپی تھی اور علمِ حساب میں تو کمال رکھتا تھا، اس لئے ”حاسب“ کے لقب مشہور ہوا یعنی حساب کرنے والا۔

علمی خدمات اور کارنامے

احمد عبداللہ حاسب فن ریاضی کا ماہر تھا اور علم ہندسہ میں اسے کمال حاصل تھا، اس فن میں اس نے کئی دریافتیں کیں، علم المثلث یعنی ٹرگنومیٹری (Trigonometry) کا محقق اور زاویئے کی چھ مشہور نشستوں میں فصل جیوب (co - tangent) کے طریقے دریافت کرنے والا گذرا ہے، اس نے قاطع (Secant) کو پہلی مرتبہ معلوم کیا اور ٹرگنومیٹری میں اسے درج کیا۔

حاسب نے علم ریاضی میں ایک بہت بڑا کام کیا کہ اس نے ٹرگنومیٹریکل نقشہ (Trigonometrical tables) بڑی تحقیق کے بعد مرتب کیا اور اسے رواج دیا، ٹرگنومیٹری ٹیبل آج بھی انجینیر نگ میں بنیادی طور پر آرہا ہے، حاسب کا اس فن پر بڑا احسان ہے۔(۱)

(۱) موسوعۃ علماء العرب والمسلمین: ۷۴

(۲) حجاج بن یوسف مطر (۲۱۴ھ-۸۳۳ء)

حجاج بن یوسف مطر علمِ ہندسہ (جامیٹری) کا ماہر تھا، اس فن میں اس نے کمال پیدا کیا، حجاج بن یوسف دیہات کا باشندہ تھا، والدین تو کچھ زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے، لیکن حجاج نے اپنے شوق اور اپنی محنت سے اچھی تعلیم حاصل کی، پھر دیہات کے تنگ دائرے سے نکل کر ۷۸۶ء میں بغداد گیا اور یہیں بس گیا۔

حجاج نے بغداد کے علمی ماحول سے پورا فائدہ اٹھایا اور بغداد کی علمی صحبتوں سے مستفید ہو کر اپنی قابلیت اور استعداد میں اچھا اضافہ کرلیا، حجاج نے ہارون الرشید اور مامون دونوں کا روشن دور دیکھا؛ مگر وہ خاموش علمی کام کرتا رہا۔

علمی خدمات اور کارنامے

حجاج ایک بلند پایہ ریاضی داں تھا، اس نے دو بنیادی کام کئے، ایک تو علمِ ہندسہ یعنی جومیٹری کا کام تھا اور دوسرا علم ہیئت سے متعلق تھا، اس نے ان دونوں علم کو نئے ڈھنگ سے فروغ دیا، جومیٹری میں اس نے نئے نئے انکشافات کئے اور اپنا ایک علمی حلقہ بنالیا، اس وقت علم ہندسہ میں اس کا کوئی ہمسر نہ تھا۔

علمِ ہندسہ میں ایک جامع کتاب ''مقدمات اقلیدس'' کے نام سے اس ریاضی داں نے مرتب کی، یہ ریاضی دانوں پر بہت بڑا احسان ہے۔

دوسرا کارنامہ اس کا علم ہیئت سے متعلق ہے، قدیم زمانے کی مشہور کتاب ''المجسطی'' کو اصلاح اور تصحیح کے ساتھ نئی ترتیب سے اس نے مرتب کیا اور اس کو نئے انداز سے فروغ دیا، اہل یورپ نے حجاج کی دونوں کتابوں سے فائدہ اٹھایا، ''مقدمات اقلیدس'' کا ترجمہ ملک ڈنمارک سے ۱۸۹۳ء میں شائع کیا گیا تھا، اس کی کتابیں بیسویں صدی تک مدارس کی زینت بنی رہیں۔ حجاج نے اور بھی بہت سی کتابیں ریاضی پر لکھی ہیں۔

(۳) محمد بن موسیٰ خوارزمی ۲۳۲ھ/۸۵۰ء

محمد بن موسیٰ خوارزمی علم ریاضی کا زبردست ماہر اور الجبرے کا موجد مشہور ہے، خوارزمی ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتا تھا، وہ خوارزم (خیوا) کا باشندہ تھا؛ لیکن اپنے

علمی شوق، اعلیٰ قابلیت اور مجاہدانہ زندگی کے سبب علمی دنیا میں وہ آفتاب و مہتاب بن کر چمکا۔

وطن میں خوارزمی بالکل غیر معروف تھا، فنی کتابوں کے مطالعے میں وہ ہمہ تن مصروف رہتا تھا، علم ریاضی میں اس نے کمال پیدا کیا، یہ سچ ہے کہ جن شخصیتوں نے دنیا کے پردے پر اپنے اعلیٰ فن اور عمدہ استعداد کا مظاہرہ کر کے ایک عالم کو فائدہ پہنچایا، ان میں اول اول نام خوارزمی کا ہی نظر آتا ہے۔

بیت الحکمت کے لئے مقالہ

عالی دماغ خوارزمی اپنے وطن سے بغداد آیا، مامون الرشید کا دور تھا اور بیت الحکمت یعنی سائنس اکاڈیمی (scince academy) قیام عمل میں آچکا تھا، قابل ترین حکماء علمی تحقیق اور ریسرچ میں مصروف تھے۔

حوصلہ مند خوارزمی بغداد کی علمی محفلوں سے متاثر ہوا، اس نے سائنس اکاڈیمی کے ممبر بن جانے کے لئے کوششیں شروع کردیں، اس کے جدت پسند دماغ نے ایک نیا طریقہ نکالا، خوارزمی نے علمِ ریاضی پر ایک گہرا مقالہ شب و روز کی دیدہ ریزی سے تیار کیا اور اس ریاضی کے مقالہ کو مرتب کر کے سائنس اکاڈیمی میں بھیج دیا، خوارزمی کا یہ طریقہ آج بھی یونیورسٹیوں میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔

خوارزمی کا مقالہ سائنس اکاڈیمی میں پیش ہوا اور پسند کیا گیا، خوارزمی کو بلایا گیا اور اس علمی مجلس میں اس سے سوالات کئے گئے اور پھر اسے سائنس اکاڈیمی کا ممبر چن لیا گیا، یہی طریقہ یونیورسٹیوں میں آج بھی رائج ہے ۔

علمی خدمات اور کارنامے

محمد بن موسیٰ خوارزمی فن ریاضی میں بہت قابل تھا، دربار میں اس کی قابلیت کا سکہ رواں تھا، مامون الرشید نے خوارزمی سے فن ریاضی پر ایک کتاب لکھنے کی فرمائش کی، خوارزمی نے پوری تحقیق کے بعد دو کتابیں مرتب کیں، ایک ''علم الحساب'' یہ کتاب علمِ ہندسہ میں ہے، اس میں ریاضی کے نئے نئے نکتے بیان کئے گئے ہیں

اور بہت سے نئے نئے فائدے اور اصول بتائے ہیں ، مامون نے بہت پسند کیا اور انعام واکرام سے نوازا۔

اس کتاب کے حوالے سے سارٹن لکھتا ہے:

''ان کی الجبرا'' حساب الجبر والمقابلۃ'' بھی کم اہم نہیں ہے، اس میں سادہ اور درجی مساوات کے تجزیاتی حل دیئے گئے ہیں اور اس کتاب کے مصنف کو ہندسہ سے الگ الجبرا کے بانیوں میں شمار کیا جاسکتا ہے، انہوں نے اشکال ''اشکال'' کے ساتھ دو درجی مساوات کے ہندسوی حل بھی دیئے ہیں''(۱)

دوسری کتاب ''الجبر والمقابلۃ'' ہے، یہ اہم کتاب اپنے فن میں بے مثل ہے اور الجبرے پر بنیادی کتاب سمجھی جاتی ہے، سچ تو یہ ہے کہ خوارزمی الجبرے کا موجد ہے۔(۲)

مولانا شبلی نعمانی فرماتے ہیں کہ

''علم جبر ومقابلہ'' پر اسلام اول جو کتاب لکھی گئی ہے، وہ اسی عہد کے ایک مشہور عالم محمد بن موسیٰ خوارزمی نے مامون کی فرمائش پر لکھی ، یہ تصنیف آج بھی موجود ہے اور اس قدر جامع ومرتب ہے کہ علماء اسلام نے جبر ومقابلہ میں سینکڑوں کتابیں نادر تصنیف کیں ؛ لیکن اصل مسائل میں اس سے زیادہ ترقی نہ کرسکے''

خوارزمی نے جو اصول او رقاعدے دریافت کئے ، آج بھی اسکولوں کی اعلیٰ جماعتوں اور کالجوں میں وہی قاعدے پڑھائے جاتے ہیں۔

خوارزمی کی پہلی کتاب '' حساب'' یہ بھی اپنے فن کی واحد کتاب ہے، یورپ کے دانشوروں نے علم ہندسہ کی حقیقت اور اہمیت کو اس کتاب کے ذریعہ سمجھا۔

چودھویں صدی تک یورپ میں بالکل جہالت تھی، خوارزمی نویں صدی کا دانشور

---

(۱) Introduction to the history of Science vol.p.563

(۲) علماءالعرب والمسلمین:۱۲۹

ہے، اس کی کتاب چودھویں صدی میں یورپ پہنچی تو اہل یورپ کی آنکھیں کھل گئیں۔

یورپ میں اس جہالت کے دور میں رومن ہندسے رائج تھے جو بالکل ناممکن اور غلط اصولوں پر قائم تھے، یورپ کے دانش وروں نے خوارزمی کی کتابیں دیکھ کر اپنی خرابیوں کو سمجھا اور اپنے حساب کتاب کے اصولوں کو یکسر بدل دیا، اہل یورپ نے عربی ہندسوں کو فورا قبول کرلیا ، یہ ہندسے ''عربک فیگر' کہے جاتے ہیں (arabic figure) رومن ہندسے اور عربک فیگر کا مقابلہ کر لیجئے ، ایک سو ساٹھ لکھنا ہے اور اڑتیس لکھنا ہے۔

عربی طریقہ	رومن طریقہ
۱۶۰	clx
۳۸	xxxvlll

دونوں قسم کے ہندسے کے فرق کو آپ دیکھ لیجئے ، رومن طریقے سے جمع کرنا، تفریق اور ضرب کرنا کتنا مشکل ہوگا؛ بلکہ ناممکن ؛لیکن عربی طریقہ فطری ہے اور آسان تر ہے۔

ریاضی میں مسلمانوں کے کارناموں میں صفر کی ایجاد ہے، صفر بھی الخوارزمی نے ہی متعارف کروایا ہے، انگریزی کا (zero) عربی لفظ صفر سے ماخوذ ہے جو''خالی'' کے معنی میں آتا ہے۔

خوارزمی کی کتابیں بہت پہلے یورپ پہنچ چکی تھیں اور ان کا ترجمہ بھی لاطینی زبان میں اس وقت ہوگیا تھا ، یہ چودھویں صدی کے بعد کا زمانہ تھا ، پھر اس کا انگریزی اور دوسری زبانوں میں ترجمہ شائع ہوا، انگریزی اور دوسری زبانوں میں ترجمہ شائع ہوا، انگریزی کا ترجمہ روزن (rozen) نے لندن سے ۱۸۳۱ء میں پہلی بار بڑے اہتمام سے چھپایا، ۸۵۰ء میں وفات پائی۔

(۴) ابوالوفاء محمد بن احمد بوزجانی ۳۹۸ھ/۱۰۱۱ء

محمد بن احمد بوزجانی تعلیم یافتہ خاندان کا ممبر تھا، اس نے ابتدائی تعلیم اپنے ماموں سے حاصل کی ،علم کے فطری شوق نے اسے اورآگے بڑھایا اور اعلیٰ تعلیم کے لئے ۹۶۰ء

میں وہ بغداد گیا، یہاں نصاب کے مطابق اعلی تعلیم ختم کی اور پھر مطالعہ اور تحقیق میں مصروف ہوگیا۔

بوزجانی کو علمِ ریاضی اور علم ہیئت دونوں سے کمالِ دلچسپی تھی، اپنے شوق سے اس نے اپنی علمی استعداد میں کافی اضافہ کیا اور ایک اچھا سائنسداں بن گیا۔

بویہ خاندان کا حکمراں عضد الدولۃ بڑا علم دوست تھا، اس کی قدرشناسی اور حوصلہ افزائی کے باعث احمد بوزجانی دنیاوی تفکرات سے آزاد ہوکر اپنے علمی مشاغل میں ہمہ تن مصروف رہا اور آرام سے زندگی بھی گذاری۔

علمی خدمات اور کارنامے

ابوالوفاء بوزجانی بڑا عالی دماغ تھا، اس کا شمار اس دور کے عظیم ریاضی دانوں میں ہوتا ہے، اس نے الجبرا اور جیومیٹری میں دائرے کے اندر مختلف ضلعوں کی منتظم کثیر الاضلاع بنانے کے مسائل قدیم زمانے میں ریاضی دانوں میں مقبول اور مشہور تھے، ان کثیر الاٗ ضلاع میں سے چھ ضلعوں کی شکلیں، آٹھ ضلعوں کی شکلیں، پانچ ضلعوں کی شکلیں اور دس ضلعوں کی شکلیں تو بنائی جاسکتی ہیں اور رائج ہیں۔

لیکن سات ضلعوں کی شکلیں جس کو علم ریاض میں منتظم سبع (regular hedtagon) کہتے ہیں، ہر ضلع کے دونوں نقاط مرکز پر ۳۶۰/۷ یعنی ۷/۵۱۳ درجے کا زاویہ بناتے ہیں، جس کا پرکار سے بنانا ناممکن ہے، اس لئے جیومیٹری کے ماہرین کی جملہ کوششوں کے باوجود دائرے کے اندر ایک منتظم السبع بنانے کا مسئلہ ناقابل حل سمجھا جاتا تھا۔

ابوالوفاء بوزجانی کی ذہانت نے نہ صرف اس مسئلہ کا حل دریافت کرلیا؛ بلکہ جتنا یہ مسئلہ پیچیدہ اور مشکل سمجھا جاتا تھا، اس قدر اس کا حل صاف اور سادہ بتادیا، حقیقت یہ ہے کہ یہ بوزجانی کی ریاضی دانی میں مہارت کا کمال تھا۔

سورج کی کشش اور نئی دریافتیں

بوزجانی علم ہیئت کا بھی ماہر تھا، اس علم میں اس نے چند خاص دریافتیں کیں، اس

نے ثابت کیا کہ سورج میں کشش ہے اور چاند گردش کرتا ہے۔

اس نظریئے کے تحت اس نے یہ قابل دریافت کیا کہ زمین کے گرد چاند کی گردش میں سورج کی کشش کے اثر سے خلل پڑجاتا ہے اور اس وجہ سے دونوں اطراف میں زیادہ سے زیادہ ایک ڈگری پندرہ منٹ کا فرق ہوجاتا ہے، اسے علمِ ہیئت کی اصطلاح میں (Evectiont) یعنی چاند کا گھٹنا کہتے ہیں۔

اس اختلالِ قمر کے بارے میں بوزجانی نے دنیا میں پہلی بار اپنا یہ نازک نظریہ پیش کیا، یہ اس کی اہم دریافت تھی، اس نظریئے کی تصدیق سولھویں صدی میں مشہور ہیئت داں ٹیکوبرائی نے کی اور اسے اہمیت دی، لیکن اہل مغرب اس دریافت کا سہرا ٹائیکوبرا کے سر باندھتے ہیں اور یہ قطعی غلط اور دھوکہ ہے، آج سے چھ سو سال قبل ابوالوفاء بوزجانی اس نظریئے کو پوری تفصیل کے ساتھ ثبوت اور دلائل کے ساتھ بیان کرچکا تھا۔

تیسرا کارنامہ

بوزجانی کا تیسرا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے زاویوں کے جیب (sine) معلوم کرنے کا ایک نیا کلیہ دریافت کیا اور اس کی مدد سے ایک درجے سے لے کر ۹۰ درجے کے تمام زاویوں کے جیوب کی صحیح صحیح قیمتیں آٹھ درجے اعشاریہ تک نکالیں، اس سے پہلے ان کی قیمتیں اتنے درجہ اعشاریہ تک نہیں نکالی جاسکتی تھیں، یہ بھی اس کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔(۱)

(۵) ابوالحسن علی احمد نسوی ۴۴۰ھ-۱۰۳۰ء

علی بن احمد مقام ''نسا'' میں پیدا ہوا اور اسی نسبت سے نسوی مشہور ہوا، ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں حاصل کی اور پھر ''رے'' چلا گیا، ''رے'' اس عہد میں علمی مرکز بن چکا تھا، نسوی نے اپنی عمر کا پورا حصہ اسی بارونق شہر کی محفلوں اور مجلسوں میں گذاردیا۔

یہ عہد بویہ خاندان کے مشہور بادشاہ فخر الدولۃ (۱۰۱۲ء) کا تھا، فخر الدولۃ علم دوست بادشاہ اور اہل علم کا قدرداں تھا۔

(۱) موسوعۃ علماء العرب والمسلمین:۹۹

احمد نسوی کو علم ریاضی سے خاص دلچسپی تھی، اس فن میں اس نے کمال پیدا کیا، سچ تو یہ ہے کہ وہ علمِ ریاضی کا زبردست ماہر اور امام تھا، وطن ''نسا'' (خراسان) صحیح صحیح ولادت اور وفات نہ معلوم ہوسکی، اندازاً ۱۰۳۰ء کا عہد ہوگا۔

علمی خدمات اور کارنامے

جذر اور جذر المکعب کے طریقے کا موجد

علمِ حساب میں نسوی کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے جذر المکعب کے طریقے کا موجد کے وہ خاص طریقے معلوم کئے جو اب تک کسی کو معلوم نہ تھے، جذر اور جذر المکعب نکالنے کے طریقے موجودہ دور میں بھی رائج ہیں اور آج بھی نسوی کا دریافت شدہ طریقے ہی مستند اور بہتر مانا جاتا ہے۔

حسابِ ستین کی ایجاد اور اعشاریہ

نسوی کی دوسری قابلِ ذکر تحقیق حساب ستین ہے، حساب ستین اور حساب اعشاریہ میں مطابقت پیدا کیا، یہ اس کی ذہانت کا کمال ہے کہ حساب ستین ایجاد کرکے کئی مسائل حل کر دیئے۔

آج کل سائنس داں نسوی کے اصول پر چھوٹے چھوٹے پیمانوں کی تقسیم در تقسیم عموماً دس دس کی نسبت سے کرتے ہیں، جس کو ''اعشاریہ'' کہتے ہیں، نسوی نے یہ دونوں طریقے دریافت کرکے علم ریاضی میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔

وقت کی تقسیم اور اس کا پیمانہ

آج کل وقت کو خاص اہمیت حاصل ہے، وقت کی تقسیم اور اس کے لئے پیمانے کی دریافت نے آج سائنس کو کس قدر ترقی دی ہے، یہ سب احمد نسوی کا احسان ہے۔

احمد نسوی کے زرخیز دماغ نے وقت کی تقسیم در تقسیم کے لئے ایک طریقہ نکالا اور یہ طریقہ حساب ستین کا تھا، یہ وقت کی پیائش کا معیاری طریقہ تھا، اس طریقے میں یہ خوبی بھی تھی کہ اس نے قدیم اور جدید دونوں میں مطابقت پیدا کردی۔

مثلاً: احمد نسوی وقت کی ایک ساعت (گھنٹہ) یا زاویئے کے ایک درجہ کو ساٹھ پر

تقسیم کردیتا ہے، ساٹھ ویں حصہ کو وہ ''دقیقہ'' کہتا ہے؛ کیوں کہ ساٹھ سے تقسیم کے بعد بچا ہوا یہ حصہ خفیف اور کم رہ جاتا ہے، یعنی تھوڑا چھوٹا، دقیقہ کے لفظی معنی بھی خفیف یا تھوڑا باریک شئ کے ہیں، گویا یہ چھوٹے چھوٹے حصے ہیں جو مل کر ساعت بن جاتے ہیں۔

نسوی اس دقیقہ کو بھی دوبارہ تقسیم کرتا اور ٹکڑے بناتا ہے اور اس دقیقہ کی دوبارہ تقسیم ہوتی ہے تو چوں کہ یہ تقسیم دوسری بار عمل میں آتی ہے اور دوسرے کو عربی میں ثانیہ کہتے ہیں، اس لئے دوسری بار کی تقسیم کے حاصل کا نام ثانیہ رکھا گیا اور اس طرح ساعت کی دقیقہ اور ثانیہ دو قسمیں ہوگئیں تو گویا یہی وقت کا پیمانہ بنا۔

ازمنۂ وسطی میں مسلم سائنسداں کی یہ کتابیں جب یورپ پہنچیں اور وہاں کے حکماء اور دانشوروں نے مسلمانوں کے پورے علمی خزانے سے فائدہ اٹھانے کی کامیاب کوشش کی اور تمام علمی کتابوں کے ترجمے کر لئے؛ لیکن اس ترجمے میں انہوں نے عربی اصطلاحات کو قائم رکھا، انہوں نے اصطلاحات کے لئے الگ لفظ نہیں نکالا؛ بلکہ اس سے فائدہ اٹھایا۔

دقیقہ کے لئے منٹ (minute) کا لفظ وضع کیا گیا، انگریزی میں منٹ کے معنی بھی چھوٹا، خفیف یا باریک کے ہیں، یہ پہلی تقسیم تھی۔

دوسری تقسیم یعنی ''ثانیہ'' کے لئے انگریزی میں سکنڈ (second) کا لفظ بنایا گیا، یہ لفظ یعنی عدد سکنڈ، ثانی یا ثانیہ کا مرادف ہے۔

مسلم سائنسدانوں کا یہ عظیم کارنامہ ہے کہ انہوں نے وقت کی پیائش کا طریقہ ایجاد کیا اور وہ بھی اس قدر سادہ اور آسان، ساٹھ سے تقسیم کے ذریعے سکنڈ اور منٹ کی اکائیاں وجود میں آئیں، جو وقت اور زاویئے کی پیائش میں پوری نئی اور پرانی دنیا میں رائج ہیں۔

دنیا کے آج ایسے لوگ بہت کم ہوں گے جو یہ جانتے ہوں کہ گھڑی کے ڈائل پر جو ہندسے لکھے ہیں اور منٹ (دقیقہ) اور سکنڈ (ثانیہ) ہر تقسیم میں وہ اسی مسلم سائنسداں احمد نسوی کے ذہانت کا کرشمہ ہیں۔

احمد نسوی علم ریاضی کا زبردست ماہر اور امام تھا، اس کی مشہور تصنیف ''عملی حساب'' ہے جسے اس نے بڑی دیدہ ریزی اور قابلیت سے مرتب کر کے پہلے فارسی زبان میں لکھا، پھر عربی میں اسے منتقل کر دیا۔(۱)

(۶) الکاشی غیاث الدین جمشید مسعود الکاشی (۸۳۲ھ-۱۴۲۹ء)

ان کا اصل نام غیاث الدین جمشید مسعود الکاشی ہے۔

علمی خدمات اور کارنامے

الکاشی کی عربی، فارسی تصانیف کی تاریخی ترتیب پوری طرح معلوم نہ ہو سکی؛ البتہ وہ بعض کتابوں کی تکمیل کی تاریخ اور جگہ خود بیان کرتے ہیں، مثلاً اجرام فلکی کے سائز اوران کے مابین فاصلوں کے موضوع پر اس نے کتاب ''سلم السماء'' ایران کے شہر کاشان میں ۱۴۰۷ء کو مکمل کی، انہوں نے اس کتاب کو ایک وزیر کمال الدین محمود کے نام سے معنون کیا تھا۔

اس نے سلطان سکندر کے لئے ایک کتاب مختصر علم در ہیئت لکھی۔

الکاشی کی سب سے زیادہ معروف کتاب ''مفتاح الحساب'' جو ۱۴۲۷ء میں لکھی گئی تھی، یہ ابتدائی ریاضی کی حقیقی انسائیکلو پیڈیا ہے جو طلبہ کے وسیع دائرے کے لئے لکھی گئی ہے، اس میں حساب دانوں، زمین کا سروے کرنے والوں، ماہرین تعمیرات، منشیوں اور تاجروں کی ضروریات کو ملحوظ رکھا گیا ہے، اپنے محتویات کے تنوع، مختلف مسائل جس میں جیومیٹری کے مسائل بھی شامل ہیں کے حل میں حساب اورالجبرا کے اطلاق اور بیان کی خوبی وصفائی میں ضخیم کتاب ازمنہ وسطی کے لٹریچر میں بہترین کتاب ہے، صدیوں تک یہ کتاب نصاب تعلیم میں شامل رہی۔

الکاشی کی تعریف کے مطابق علم حساب سے متعلق مقداروں کی مدد سے معلوم مقداروں تک رسائی حاصل کرنے کا نام قواعد کا علم ہے، ''مفتاح السعادۃ'' ایک تمہید کے بعد پانچ حصوں میں منقسم ہے، صحیح اعداد کا حساب، کسور کا حساب، فلکیاتی حساب، مستوی اشکال

(۱) موسوعۃ علماء العرب والمسلمین:۲۰۸

واجسام کی پیمائش اور الجبرا کی مدد سے مسائل کا حل (خطی ودو درجی مساوات) اور غلط مفروضوں کا اصول کتاب میں بہت سے دلچسپ سوال اور احتیاط سے جس کی کئی مثالیں بھی ہیں۔

''مفتاح الحساب'' کے حصہ اول میں الکاشی نے صحیح اعداد کا جذر نکالنے کا عام قاعدہ بیان کیا ہے، الکاشی نے حسابی قواعد کو ہندسوں کے بجائے الفاظ میں بیان کیا ہے اوراس کا الجبرا بیانیہ قسم کا ہے، اس سلسلہ میں اس نے کسی بھی ثنائی عدد (binomial) کو کسی قدرتی قوت (power) تک بڑھانے کا عام کلیہ اور ثنائی تعاملات کو مسلسل معلوم کرنے کا جمعی قاعدہ بیان کیا ہے، اس نے نام نہاد مثلث پاسکل (poscal,s triangle) کی قیمت ۹ کے لئے بتائی ہے۔

کتاب کے دوسرے اور تیسرے حصہ میں اعشاری کسور (decimal fractions) کا نظریہ قابل ذکر ہے، اس کو پہلے الکاشی نے اپنے ''رسالہ المحیطیۃ'' میں استعمال کیا تھا، یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ کسی عربی ریاضیاتی تصنیف میں اعشاری کسور لائی گئی ہو، وہ تو دسویں صدی کے وسط میں الاقلیدسی کی تصنیف ''کتاب الفصول فی الحساب الهندی'' میں بھی موجود ہیں اور ان کو کبھی کبھی چینی سائنس داں بھی استعمال کرتے رہے، فرق یہ ہے کہ الکاشی نے اعشاریہ کسور کو باقاعدہ رائج کیا جس میں کسور کا ایک ایسا نظام وضع کر دیا جائے نظام ستین (sexagesimal) میں ہے کہ؛ تاکہ جس طرح صحیح اعداد کا عمل ہے، اسی طرح کسور کا بھی رائج ہو سکے، الکاشی نے اس کو عام طور پر اعداد کی بنیاد پر اٹھایا، اس لئے یہ نظام تو لوگوں کا جانا پہچانا تھا، کتاب میں متعین اعشاری کسور کا عمل تفصیل سے بیان ہوا ہے، لیکن الکاشی دورانیت (periodicity) کا تذکرہ نہیں کرتا۔

اعشاری کسور کو ظاہر کرنے کے لئے کبھی تو وہ صحیح اعداد سے ان کو ایک عمودی لکیر سے جدا کرتا ہے یا ان کو ہندسوں کے اوپر لکھتا ہے؛ لیکن عام طور پر وہ کم سے کم قوت کا ذکر کرتا ہے، جس کی مدد سے وہ تمام دوسری قوتیں معلوم کرتا ہے، پندرہویں صدی کے

نصف آخر اور سولہویں صدی میں الکاشی کی اعشاری کسور ترکی کی، ایک حد تک رائج رہیں، اس کا ذریعہ شاید علی قوشجی بنا جس نے سمرقند میں الکاشی کے ساتھ کام کیا تھا، اور الغ بیگ کے قتل اور بازنطینی سلطنت کے زوال کے بعد وہ قسطنطنیہ میں مقیم ہو گیا، یہ کسور کہیں ایک گمنام مصنف کے بازنطینی مجموعہ رسائل میں استعمال ہوئی ہیں، جس کا تعلق پندرہویں صدی سے ہے اور جس کو ۱۵۶۲ء میں وی آنا لایا گیا، اس بات کا امکان بھی موجود ہے کہ یورپ میں اعشاریہ کسور کے رواج میں الکاشی کے خیالات کا کچھ اثر رہا ہو۔

کتاب کے پانچویں حصے میں الکاشی سرسری طور پر اس بات کا ذکر کرتا ہے کہ چار درجی مساواتوں کے لئے مقدار نامعلوم دریافت کرنے کا طریقہ اس نے دریافت کر لیا ہے، اس کو اس نے ستر ایسے مسائل میں استعمال کیا ہے جن کو قدماء یا اس کے معاصرین ہاتھ نہیں لگا سکتے تھے، اس نے اس ارادہ کا اظہار بھی کیا ہے کہ وہ اس موضوع پر ایک الگ کتاب مرتب کرے؛ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی تحقیق کو پایہ تکمیل تک نہ پہنچا سکا، الکاشی کی تھیوری مکعب مساواتوں کی اس ہندسی تھیوری کے مماثل رہی ہوگی جو اس سے پہلے ابوالجود محمد بن لیث مرتب کر چکا تھا، یہ تھیوری کچھ یوں تھی کہ چار درجی مساواتوں کے جذور کی اشکال بنائی جاتیں، اس کے بعد مناسب مخروطی جوڑوں کے خطوط تقطیع کے سروں کے محددات (coordinates) دریافت کئے جاتے۔

الکاشی غیاث الدین جمشید کی وفات ۱۹ رمضان المبارک ۸۳۲ء بمطابق ۲۲ جون ۱۴۲۹ء کو ہوئی۔

(۷) احمد بن یوسف بن ابراہیم (۳۰۰ھ / ۹۱۲ء)

احمد بن یوسف بن ابراہیم بن الدایہ المصری کو علم ریاضی کا ایک ماہر سمجھا جاتا ہے اور وہ اپنی عمر کے آخری حصہ میں شہرت کی بلندیوں پر تھا۔

ان کے والد یوسف بن ابراہیم جنہیں ''الحاسب'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، عرب کے مشہور اور با اثر علماء میں سے تھے، بغداد ان کا آبائی شہر تھا؛ لیکن ۸۴۰ء میں بغداد کو خیر باد کہہ کر دمشق چلے گئے اور چند سال کے بعد مصر چلے گئے اور وہیں کے ہو کر رہ

گئے، یہی وجہ ہے کہ بغداد میں پیدا ہونے کے باوجود ''المصری'' مشہور ہوئے۔

علمی خدمات اور کارنامے

احمد کی جو تصانیف ملتی ہیں، ان میں نسبت اور تناسب پر ایک رسالہ ہے، مماثل قوسین پر ایک کتاب بطلیموس کی ایک شرح اور اصطرلاب پر ایک تحریر شامل ہے، ان تمام کتابوں کے مخطوطات محفوظ ہیں۔

احمد کی اہم ترین تصنیف اس کا وہ رسالہ ہے جو نسبت اور تناسب کے موضوع پر لکھا گیا ہے، اس کا عربی سے لاطینی میں ترجمہ جرار القرمونی (Gerard of Cremona) نے کیا، بعد میں اس کی بہت سے نقلیں تیار کی گئیں، موجودہ دور میں لاطینی ترجمے کے مسودہ کے نقول انگلستان، اسپین، آسٹریلیا اور اٹلی کے کم از کم گیارہ کتب خانوں میں موجود ہیں اور یورپ کے اتنے کتب خانوں میں اس کی موجودگی قرون وسطی میں اس کی شہرت اور مقبولیت کا منہ بولتا ثبوت ہے، یہ تصنیف بنیادی طور پر اقلیدس کی پانچویں فصل کی شرح ہے اور اس میں اضافے بھی کئے گئے ہیں، نسبت اور تناسب سے متعلق اقلیدس کی بیان کردہ تعریفوں کو احمد نے تفصیلی اور منطقی استدلال کے ذریعہ حل کیا اور یوں ان کے دائرہ کو وسعت دی۔

احمد بن یوسف کی ریاضیاتی خدمات بھی قابل قدر ہیں، خاص طور پر اس نے جس طرح تناسبی مقداروں کی مختلف صورتوں کے حل اور انہیں کمال احتیاط سے مرتب کیا ہے، وہ اس کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھے گا، حقیقت تو یہ ہے کہ احمد کو منقسم شکل کی ان ۱۸ صورتوں کے حوالے ہی سے یاد رکھا جائے گا۔ یہ رسالہ ''رسالة فی النسبة والتناسب'' کو ہم تصنیف قرار دیتے ہوئے سارٹن نے لکھا ہے کہ اس کتاب نے لیونارڈ آف پیسا اور (Jordams Nemorarius) کے توسط سے قرون وسطی کی ریاضی پر اثرات ڈالے ہیں(۱) لیونارڈو کی تصنیف (Liber abacci) میں احمد بن یوسف کے رسالے میں مذکور تناسب کی اٹھارہویں صورتوں کا حوالہ موجود ہے، اس کے علاوہ انہوں

---

(۱) Introduction to the history of science vol I. p.598

نے احمد کے طریق کار کو بھی اپنی کتاب میں برتا ہے، احمد کو ان عظیم سائنسدانوں کی صف میں شمار کیا جاتا ہے، جنھوں نے نسبت اور تناسب کے موضوع پر تحقیق کی ہے، لاطینی دنیا میں یہ عظمی سائنسداں (Ametus) کے نام سے مشہور رہے ہیں۔(۱)

اس کی تاریخ وفات بھی تاریخ پیدائش کی طرح پردۂ خفا میں ہے؛ لیکن غالب گمان یہ ہے کہ اس کی تاریخ وفات ۹۱۲ء ہے۔(۲)

(۸) ابوالعباس الفضل بن حاتم النیریزی (۳۱۰ھ/ ۹۲۲ء)

النیر یری کا آبائی وطن نیر یر ہے، جو فارس میں شیرز کے جنوب مشرق میں ایک چھوٹا سے قصبہ ہے، زندگی کا ایک حصہ اس نے بغداد میں گذارا جہاں غالباوہ عباسی خلیفہ المعتضد کی خدمت میں رہااور اس کے لئے اس نے موسمیاتی مظاہر پر ایک کتاب "رسالۃ فی احداث الجو" لکھی جو زمانہ کی دستبرد سے محفوظ رہی، اس کے علاوہ اس نے اجسام کے مابین فاصلے معلوم کرنے کے آلات پر بھی ایک کتاب لکھی جو دستیاب ہے۔

دسویں صدی کا ماہر کتاب کتابیات ابن الندیم النیر یری کو ایک ممتاز ہیئت داں قرار دیتا ہے، ابن القفطی کا یہ بیان ہے کہ وہ ہندسہ اور علم ہیئت میں سر برآوردہ حیثیت کا مالک تھا، مصری ہیئت داں ابن یونس کو اگر چہ النیر یری کے فلکیات کے بارے میں خیالات پر اعتراض ہے، تاہم وہ ایک کامل مہندس کے طور پر اس کو احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

علمی خدمات اور کارنامے

ابن الندیم اور ابن القطفی نے النیر یری کی طرف آٹھ کتابیں منسوب کی ہیں، النیر یری کی زیادہ شہرت اقلیدس کی کتاب "عناصر" کی شارح کی حیثیت سے ہے، کتاب "عناصر" پر اپنی شرح میں النیر یری نے نسبت اور تناسب کا وہی تصور دیا ہے جو اس سے قبل الماہانی نے قائم کیا تھا۔ النیر یری کی تصنیف "رسالۃ فی سمت القبلۃ"

(۱) معروف مسلم سائنسداں: ۲۲۵

(۲) سو عظیم مسلم سائنسداں: ۱۱۱

سے یہ علوم ہوتا ہے کہ وہ ظل زاویہ کی نسبت سے بھی واقف تھا، اور اس کو استعمال بھی کرتا تھا، اس میدان میں کسی اور کا بالخصوص حبش کا اس پر سبقت لے جانا معلوم نہیں۔

النیر یری کی غیر مطبوعہ تصنیف "اقلیدس کے معروف اصول موضوعہ کا اثبات" (on the domonstration of the well know postulate bibliotheque nationale arabe 2467,89r-90r of uclid)

(پیرس) (مخطوطہ قومی کتب خانہ، پیرس) کامل طور پر اغانیس پر مبنی ہے، اس میں النیر یری کا استدلال کچھ یوں ہے کہ چوں کہ برابری فطری طور پر نابرابری اولی ہے؛ لہٰذا وہ خطوط مستقیم جو آپس میں فاصلہ برابر رکھتے ہیں، ان خطوط سے اولیٰ ہیں جو فاصلہ برابر نہیں رکھتے، پس اول الذکر مؤخر الذکر خطوط کی پیمائش کا معیار ہے، اس استدلال سے وہ یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ ابتدائی اصول یہ ہے کہ مساوی فاصلہ پر واقع خطوط کو خواہ کتنا ہی بڑھایا جائے وہ ایک دوسرے کو قطع کریں گے، اس کے ثبوت کے لئے اس نے چار مقدمات قائم کئے، ان میں سے پہلے تین یوں ہیں۔

۱- مساوی فاصلہ پر واقع دو خطوط مستقیم کے درمیان کم سے کم فاصلہ کا خط دونوں خطوط پر عمود ہوگا۔

۲- اگر ایک خط مستقیم دو خطوط کو ملاتا ہوا کھینچا جائے اور وہ دونوں پر عمود ہو تو دونوں خطوط مساوی فاصلہ پر واقع ہوں گے۔

۳- دو مساوی الفاصلہ خطوط کو ملانے والے خط کی ایک جانب واقع اندرونی زاویے دو قائمہ زاویوں کے برابر ہوں گے۔

یہ تینوں النیر یری نے جو اصول المعتقد کے لئے تحریر کردہ رسالہ جو اس وقت تک موجود ہے؛ لیکن غیر مطبوعہ ہے میں لکھے ہیں، وہ ان کی اولیت کا دعوی کرتا ہے، اس رسالہ کا نام یوں ہے "ان آلات کا علم جن کی مدد سے ہم ان اشیاء کے فاصلے معلوم کر سکتے ہیں جو ہوا میں بلند یا زمین پر قائم ہوں، نیز ہم کنوؤں اور وادیوں کی گہرائی اور دریاؤں کی چوڑائی بھی معلوم کر سکتے ہیں، البیرونی کا بیان ہے کہ اس کے علم میں النیر یری واحد شخص

ہے کہ جس نے المجسطی کی شرح میں زمانہ کی تاریخ معلوم کرنے کا طریقہ تجویز کیا جس کے معلوم اجزاء مختلف انواع ہوں جن کا تعلق کسی ایک ہی جنس سے نہ ہو، مثال کے طور پر کوئی ایسا دن ہے جس کی تاریخ یونانی، عربی یا فارسی مہینہ میں معلوم ہوتی ہے؛ لیکن اس مہینہ کا نام معلوم نہیں؛ البتہ آپ کسی اور مہینہ کا نام جانتے ہیں جو اس نامعلوم مہینہ سے مطابقت رکھتا ہے، اس طرح آپ ایک سنہ جانتے ہیں جس سے ان دو مہینوں کا تعلق نہیں ہے یا ایک ایسا سنہ جانتے ہیں جس کے مطلوبہ مہینہ کا نام معلوم نہیں۔

النیریزی نے کروی اصطرلاب کی ساخت اور اس کے استعمال پر اپنی کتاب ''فی الاصطرلاب'' کے چار مقالوں میں جو کچھ لکھا ہے وہ اس موضوع پر عربی زبان میں سب سے زیادہ کامل تحریر سمجھا جاتا ہے۔

ابوالعباس الفضل بن حاتم النیریزی نے بغداد میں ۹۲۲ء کو وفات پائی اور بغداد میں ہی مدفون ہوئے۔(۱)

(۹) حسن بن موسی شاکر

فن تعمیر اور ریاضی میں کمالِ مہارت رکھتا تھا، مامون الرشید المتوکل کے عہد میں گذرا ہے، چونکہ یہ اچھا سیول انجینیئر تھا، شاہِ وقت نے ایک نہر کی کھدائی کا کام اس کے سپرد کیا، یہ نہر زراعت اور پیداوار بڑھانے کے لئے استعمال کی جانے والی تھی؛ چنانچہ حسن نے ہی اس کام کو انجام دیا۔

حسن نہایت ذہین، فطین، فہیم اور حاضر جواب تھا، اس کے کئی ایک واقعات مشہور ہیں۔

ایک دفعہ مامون الرشید کے دربار میں تمام اہل علم وفضل کا مجمع تھا، ان میں حسن بھی موجود تھا، مامون الرشید کو علم اقلیدس سے خاصی دلچسپی تھی، علم ہندسہ پر بحث ہو رہی تھی، مامون الرشید کے اشارے پر خالد بن عبدالملک نے جو علم ریاضی کا ماہر تھا حسن سے کچھ سوالات کئے اور حسن کا امتحان لینا چاہا۔

حسن محنتی، حوصلہ مند اور حاضر دماغ تھا، اب تک اگرچہ اس نے اقلیدس کی کل چھ

(۱) موسوعة علماء العرب والمسلمين: ۱۲۰

شکلیں پڑھی تھیں، لیکن محنت اور ذہانت کی وجہ سے اس میں سوالات حل کرنے کا ملکہ پیدا ہو گیا تھا، چنانچہ حسن نے سوالات کے جواب میں بڑی اچھی تقریر کی اور نہایت عمدگی کے ساتھ جواب دیا۔

پھر حسن سے نئے نئے اور مشکل سوالات علمِ ہندسہ سے متعلق پوچھے گئے تو اس نے ان کے جوابات صحیح صحیح دے دیئے، حسن نے اس انداز سے جوابات دیئے تھے کہ اہل دربار حیرت میں رہ گئے اور خود مامون کو بھی حسن کی قابلیت اور صلاحیت پر تعجب ہوا۔

اب حسن اور خالد المروزی میں علمی بحث چھڑ گئی، اس بحث نے طول پکڑا، حسن نئے نئے اعتراضات کرتا تھا، خالد المروزی جھلا گئے، حسن کا یہ طریقہ سوسائٹی کے آداب کے خلاف تھا کہ کسی بزرگ سے بحث کی جائے؛ لیکن مامون لطف اٹھاتا رہا۔

خالد المروزی نے ہارون الرشید سے کہا: دیکھئے حسن مجھ سے بحث کر رہا ہے، حالانکہ اس نے صرف چھ شکلیں پڑھی ہیں۔ مامون الرشید نے حسن کی طرف دیکھا اور خاموش ہو گیا۔ حسن پھر بحث کرنے لگا، خالد غصہ سے بھر گیا، حسن نے کہا: آپ نے سب کچھ پڑھ لیا؛ مگر آپ کا علم حاضر نہیں، آپ نئے نئے نکتے پیدا نہیں کر سکتے۔ مامون الرشید نے اب کہا: حسن تم نے ابھی چھ شکلیں پڑھی ہیں، تمہاری تعلیم ابھی نامکمل ہے، حسن اب خاموش ہو گیا اور بحث ختم ہو گئی۔

علمی خدمات اور کارنامے

حسن علمِ ہندسہ (جیومیٹری) میں بڑی مہارت رکھتا تھا، اسے علم فلسفہ اور ہیئت سے بھی خاصی دلچسپی تھی، اس نے کئی ایک انکشافات کئے؛ لیکن علم ہندسہ میں حسن کا خاص کارنامہ یہ ہے جو اس نے مسائل کو حل کرنے کے لئے نئے نئے طریقے اور نئی نئی دریافتیں کیں۔

اور ایک خاص قاعدہ معلوم کرلیا جیسے بیضوی اصول (ellipse) کہتے ہیں۔

(۱۰) (ابوکامل) شجاع بن اسلم (۳۱۸۹ھ۔۹۳۰ء)

ابوکامل شجاع الدین بن اسلم بن محمد بن شجاع کو ''الحاسب المصری'' (مصر کا

حساب داں) بھی کہا جاتا ہے، قدیم مسلمان جبر دانوں الخوارزمی کے بعد اسلام کے عظیم ماہرین الجبراء میں ایک نمایاں شخصیت کے مالک ہیں۔

ابن ندیم نے ''الفہرست'' میں اسے دوسرے نامور ریاضی دانوں میں شمار کیا ہے ،ان ریاضی دانوں نے عملی عربی اعشاریہ عمومی حساب اور عملی جیومیٹری پر کام کیا، عبدالرحمن ابن خلدون کے مطابق ابوکامل نے الخوارزمی کی طرز پر الجبراء تحریر کیا، حاجی خلیفہ نے ابو کامل سے ایک ایسی تحریر منسوب کی ہے جو وراثتی مسائل کے جبری حل سے متعلق ہے۔

علمی خدمات اور کارنامے

ابوکامل کی چودہ تصنیفات اس وقت قلمی صورت میں موجود ہیں، ان میں ایک '' کتاب الطرائف فی الحساب '' بھی ہے، جو جرمن مستشرق زوتر (suter) کے خیال میں اس کتاب کا موضوع غیر معین مساواتوں کا تکمیلی حل ہے، ابوکامل سے بہت پہلے (تقریبا پہلی صدی عیسوی میں) ڈیوفانٹوس (dio phantus) نے ان مساواتوں کی تکمیل کے لئے علقی توضیحات پیش کیں، ابوکامل کے حل ایک ترتیب وار اور سلسلے وار طریقہ کار کے تحت نکالے گئے ہیں۔

ابوکامل کی '' کتاب الخمس والمعشرہ '' الجبرہ اور جیومیٹری دونوں کے حوالے سے دلچسپی کی حامل ہے، اس میں الجبرا کے ذریعے جیومیٹری کے مسائل کا حل پیش کیا گیا ہے، نفس مضمون پر جبریہ رنگ غالب ہے، جس میں چار درجی مساواتوں اور غیر ناطقی سروں والے مخلوط دورخی جملوں کے حل سے بحث کی گئی ہے۔

ایک اور کتاب جو '' کتاب الطرائف فی الحساب '' سے بالکل علاحدہ اور مختلف ہے، غیر معین مساواتوں پر ابوکامل کی بہترین تحقیقات پر مشتمل ہے، اس میں مساواتوں کے حل کو صرف ہندسوں تک ہی محدود رکھا گیا ہے؛ بلکہ بیشتر حل ناطقی شکل میں دیئے گئے ہیں۔

حسابی لحاظ سے چار دلچسپ سوالات جدید ترقیم (notation) میں نیچے درج کئے جارہے، یہ بات غور طلب ہے کہ ابوکامل نے اپنے سوالات کو لفظوں میں بیان کیا

اوراس کے اس مسودے میں حساب سے متعلق جو علامات استعمال ہوتیں وہ صرف ہندسوں پر مشتمل تھیں۔

$$x2/8x-30 = y2 \quad (1)$$

$$x + x2 = y2 \quad (2)$$

$$x - x2 = z2$$

$$20 + x = y2 \quad (3)$$

$$50 - (10-x) = y2$$

$$10 + x2 = y2 \quad (4)$$

$$10 - x2 = z2$$

'' کتاب فی الجبر والمقابلة '' میں دیئے گئے اکثر مسائل الخوارزمی پہلے ہی حل کر چکا تھا، ابوکامل کے تجویز کردہ طریقے کے مطابق xz کا جواب نکالا جاتا ہے، اقلیدس نے مساوات x2 + q = px کو حل کرنے کے لئے x کو p/2 سے چھوٹا فرض کیا تھا، جب کہ ابوکامل نے اسی مساوات کو x کے p/2 سے چھوٹا فرض کیا تھا، جب کہ ابوکامل نے اسی مساوات کو x کے p/2 سے بڑا ہونے کی صورت میں بھی حل کیا۔

ابوکامل پہلا ریاضی سائنسداں ہے جس نے x2 سے بڑی قوتوں کو آسانی سے استعمال کیا، اس نے x (''مربع ، مربع مربع مربع مربع'')(x(''مکعب مکعب'') x (''مربع مربع جذر'')اور x3(''مکعب'')نیز x2(''مربع'') کی قوتیں استعمال کیں، اس سے پتہ چلتا ہے کہ ابوکامل کے تجویز کردہ تسمیہ نظام کے مطابق قوت نماؤں کو جمع کیا جاتا تھا، جب کہ اس کے مقابلے میں ہندوستانی نظام تسمیہ میں x 6 کو ''مربع مکعب'' کہا جاتا ہے۔

اہل بابل نے الخوارزمی کی طرح جیومیٹری کے جبریہ پہلو پر زیادہ توجہ دی، تاہم ابوکامل نے نہ صرف الخوارزمی کے طریقے پر زیادہ انحصار کیا؛ بلکہ اقلیدس اور اسکندریہ کے ریاضی داں ہیرو سے بھی استفادہ کیا، نتیجۃ وہ ایک پیچیدہ الجبرے کو مفصل جیومیٹری

کے ساتھ یکجا کرنے میں کامیاب ہوگیا، درحقیقت ابوکامل کی تحریریں الخوارزمی کی نسبت زیادہ خالی جب کہ اقلیدس کی نسبت زیادہ علمی ہیں، اس طرح ابوکامل نے مساواتوں کے تکمیلی حل سے متعلق یونانی نظریئے اور قدیم عراقی روایت کو عمل میں لاکر الجبرا کو ایک نئی جہت عطا کی۔

ابوشجاع بن اسلم ۹۳۰ء میں فوت ہوا۔(۱)

(۱۱) (حکیم ابومحمد) العدلی القاینی (۹۷۷ھ/۹۸۷ء)

حکیم ابومحمد العدلی القاینی کی ابتدائی زندگی کے حالات کا کچھ علم نہ ہوسکا، القاینی کو فلکیات سے بڑی دلچسپی تھی؛ لیکن وہ انجینئرنگ کا ماہر تھا؛ لیکن وہ علم مساحت میں وہ کمال رکھتا تھا جو ریاضی کی ایک شاخ ہے۔

القاینی کے دور میں محمد بن جابر البنانی دولت علم اور دولت دنیا دونوں سے مالا مال تھا، البنانی نے القاینی کی صلاحیتوں کو سمجھ لیا اور اسے اپنی جماعت میں شامل کرلیا، القاینی نے رصدگاہ کی تعمیر میں کئی نئے نئے آلات ایجاد کئے اور رصدگاہ میں اسے نصب کیا، علم مساحت پر اس کی کتاب مشہور ہے، یہ کتاب علمِ مساحت پر دنیا کی پہلی کتاب شمار کی جاتی ہے، القاینی کا نام اس وجہ سے ریاضی دانوں میں فہرست میں تیسرے نمبر پر آتا ہے۔

جس رصدگاہ میں القاینی تھا، اس عظیم رصدگاہ کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ بغداد میں مامون الرشید کی شاہی رصدگاہ کے بعد اپنی عمدہ کارکردگی میں اس رصدگاہ کو شہرت حاصل تھی۔

حکیم القاینی نے اس رصدگاہ میں عمدہ قسم کے آلات نصب کئے تھے، اس نے اپنے علم اور تجربوں کے ذریعے اجرام فلکی کے باہمی فاصلوں کو صحیح صحیح معلوم کیا، اس نے بعض غلطیوں کی اصلاح کی، القاینی نے اپنے علم اور مہارت کی بناء پر ایک مکمل تاریخ بھی تیار کی۔

(۱۲) ابراہیم بن سنان (۳۳۵ھ/۹۴۶ء)

ابراہیم بن سنان ابن ثابت ابن قرہ نے بغداد کے ایک مشہور گھرانے میں آنکھیں

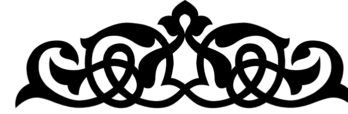
(۱) ۱۰۰ عظیم مسلم سائنسداں: ۲۷۰

کھولیں، مشہور ریاضی داں ثابت بن قرہ اس کا دادا تھا، اس کا باپ سنان ابن ثابت بھی ایک ماہر ریاضی داں تھا اور اسے طب اور فلکیات میں ملکہ حاصل تھا، ابن سنان ۹۰۸ء کو پیدا ہوا، ابن سنان بھی اپنے خاندانی روایت کو بخوبی آگے بڑھایا اور ریاضی اور فلکیات کے مضامین کو نئی جہت دی۔

علمی خدمات اور کارنامے

جواں سالی کی موت کے باوجود ابن سنان نے سائنسی تحقیقات کا ایک قابل قدر ذخیرہ چھوڑا ہے اور اس کی اہمیت کو مشرق ومغرب کے تقریباً تمام سائنس داں مؤرخین نے سراہا ہے، اس کی سائنسی تحقیقات کا دائرہ بہت وسیع نظر آتا ہے، جس میں دائروں کے تماس، سورج کی ظاہری حرکات، شمسی ساعتوں، اصطرلاب اور دوسرے فلکیاتی آلات جیسے موضوعات شامل ہیں، اس نے سایوں کا بصریاتی حوالے سے تجزیہ کیا ہے اور جیومیٹری سے بحیثیت مجموعی بحث کی ہے۔ قطع مکافی کا مسئلہ حل کرتے ہوئے ابن سنان نے اپنے دادا کی پیروی کی ہے، ثابت بن قرہ اس مسئلے کو پہلے ہی ارشمیدس سے مختلف انداز میں حل کر چکا تھا، اس کا طریقہ ہوسکتا ہے کہ اعداد کے میزان کے مترادف ہو، اس کا نقطۂ نظر اس اعتبار سے ارشمیدس سے زیادہ ہمہ گیر تھا کہ اس کے طریقے میں تکمیل (integration) کے وقفوں کو مساوی ذیلی وقفوں میں تقسیم نہیں کیا گیا تھا، ثابت کا ثبوت طویل تھا اور اس میں بیس دعاوی شامل تھے، ایک اور مسلم ریاضی دان الماہانی اس سے مختصر حل پیش کر چکا تھا؛ لیکن ابن سنان اسے ناقابل قبول گردانتا تھا جیسا کہ اس نے لکھا ہے کہ الماہانی کی تحقیق کو اس وقت تک میرے دادا کی تحقیق سے بہتر حیثیت حاصل رہے گی جب تک کہ ہمارے خاندان کا کوئی فرد (ابن قرہ) اس سے بازی نہیں لے جاتا، اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس نے نسبتاً زیادہ مختصر انداز میں ثبوت دریافت کرنے کی کوشش کی، ایک ایسا ثبوت جو مہمل میں تحویل پر انحصار کرتا ہو، ابن سنان نے اپنے ثبوت کی بنا جس دعوے پر رکھی اور جس دعوے کو وہ قبل ازیں ثابت کر چکا تھا، وہ یہ تھا کہ مربوط تحویل کے تحت رقبات کی تناسبیت غیر تغیر پذیر ہوتی ہے۔

یہ عظیم خاندانی سائنسداں بہت کم عمر پاکر ۳۸ سال کی عمر میں ۹۴۶ء کو بغداد میں فوت ہوگیا؛ لیکن اتنی تھوڑی عمر پانے کے باوجود اس کے علمی کارنامے بڑی بڑی عمریں رکھنے والے سائنسدانوں پر بھاری ہیں۔



انجینئرنگ میں مسلمانوں کے کارنامے

(۱) احمد بن موسیٰ شاکر (۲۴۰ھ/۸۵۸ء)

مسلم دور میں میکانک گذرا ہے عربی میں اس فن کو "علم الحیل" کہتے ہیں، احمد بن موسیٰ نے اس فن میں ایک کتاب بھی لکھی۔

علم ہیئت اور ریاضی اس زمانے میں بہت مشہور ہوئیں، کیمیا پر بھی کام ہوا، لیکن میکانیات پر اس وقت تک کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی تھی، قدیم سائنس داں ارشمیدس کے سوا اور کوئی یونانی دور میں نہ تھا، احمد بن موسیٰ نے اس فن میں حیرت انگیز ایجادات کیں۔

احمد نے گرچہ فلسفہ وحکمت کی تعلیم حاصل کی؛ لیکن صنعت وحرفت سے بہت دلچسپی تھی، اس نے صناعی کے فن میں کمال پیدا کیا۔

علمی خدمات اور کارنامے

احمد جدت پسند تھا اور اس کا ذہن ودماغ صناعی کی طرف راغب تھا، مطالعے اور تجربے کے بعد وہ میکانک انجینئر بنا اور یہ دنیا کا پہلا میکانک انجینئر تھا۔

ہارون الرشید نے جو گھڑی تحفے میں شاہِ فرانس کو بھیجی تھی، اس گھڑی کے صناعوں کا ذکر کہیں تاریخ میں محفوظ نہیں رہا، کہا جاتا ہے کہ یہ گھڑی احمد کی ایجاد ہے۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ احمد نے نازک نازک مشینیں ایجاد کیں، وہ ایک اچھا سیول انجینئر بھی تھا اور علم ریاضی کا بھی ماہر تھا۔

احمد نے میکانیات (علم الحیل) پر ایک اچھی کتاب لکھی، اس فن میں یہ دنیا کی پہلی کتاب مشہور ہے۔

مؤرخ ابن خلکان لکھتا ہے کہ: "علم الحیل، احمد بن موسیٰ شاکر کی ایک عجیب کتاب ہے جو نادر باتوں پر مشتمل ہے، یہ ایک جلد ہے، میں نے اس کو بہترین مفید کتاب

پایا ہے۔

(۲) ابوطیب سند بن علی ۲۲۴ھ/ ۸۶۴ء

سند بن علی باکمال ریاضی داں، اچھا سول انجینئر اور دھاتوں کا بڑا ماہر تھا، سند بن علی بغداد میں پیدا ہوا اور یہیں تعلیم پائی، اس علمی ماحول میں اس نے ترقی کی اور بلند ترین درجہ حاصل کیا، وہ نہایت سنجیدہ، متین اور علم نواز تھا۔

علمی خدمات اور کارنامے

خلیفہ متوکل کا عہد تھا، اسے زراعت سے دلچسپی تھی، اس نے ایک نہر کی تیاری کا حکم دیا، نہر کا کام جب تکمیل کو پہنچا تو معلوم ہوا کہ اس میں کچھ غلطیاں رہ گئی ہیں، خلیفہ متوکل سخت ناراض ہوا اور کہا کہ: اگر غلطی نکلی تو ذمہ دار انجینئروں کو اس جرم کی سزا میں اس نہر کے کنارے پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا اور ان کی جائیداد ضبط کر لی جائے گی۔

خلیفہ نے ابوطیب سند بن علی کو مامور کیا کہ تحقیقات کریں، سند بن علی معاملہ کی اہمیت کو سمجھتا تھا اور جانتا تھا کہ اس کی سزا نہایت سخت دی جائے گی، تحقیقات کے بعد اس نے اپنی رپورٹ اس طرح مرتب کی کہ غلطی ظاہر نہ ہونے پائی اور انجینئروں کی جان بچی۔

سند بن علی دھاتوں کا ماہر بھی تھا (metalur) اس نے بہت سے قیمتی دھاتوں پر تجربہ کئے اور ان کا صحیح وزن معلوم کرنے کا طریقہ دریافت کیا، اس نے دھاتوں میں کثافتِ اضافی (Specific gravity) کی تحقیق کی، جس سے کھرے اور کھوٹے کا صحیح صحیح پتہ چلایا جاسکتا تھا، کثافتِ اضافی کے نظریئے نے دھاتوں کی صنعت میں انقلاب پیدا کر دیا، وہ آلاتِ رصدیہ کا بھی ماہر تھا، سند بن علی ''بیت الحکمۃ'' کا ممبر بھی تھا اور سائنس کے عناصر اربعہ میں وہ بھی شامل تھا۔

(۳) ابوحاتم مظفر اسفرازی

علم طبعیات کی شاخ علم میکانیات (mechanics) اور ماسکونیات کا باکمال ہنرمند، علم ریاضی کا ماہر، دھاتوں کی قدر پہچاننے والا (metalurgist) قیمتی دھاتوں کا صحیح صحیح وزن معلوم کرنے کا طریقہ دریافت کرنے والا، ایک ایسی نازک ترازو کا موجد

جس سے سون اور دیگر قیمتی دھاتوں میں ملاوٹ کا صحیح پتہ چل جائے، ملاوٹ کا چارٹ تیار کرنے والا، باکمال دانشور، وزن کی ابتدائی اکائی اوقیہ (اونس) اور درہم (اڈرام) قیمتی دھاتوں اور اشیاء کے استعمال کا موجد، وطن، ولادت اور وفات کی صحیح تاریخیں معلوم نہ ہوسکیں۔

اندازاً ۱۰۶۷ء میں وفات ہوئی۔

علمی خدمات اور کارنامے

ابوحاتم مظفر اسفرازی علم ریاضی اور ہیئت کا ماہر تھا اور اس نے کئی نئی دریافتیں کیں، علم ہیئت اور ریاضی کے ماہر عمر خیام نے ملک شاہ سلجوقی کے عہد میں ایک اچھی رصدگاہ اصفہان میں قائم کرائی تھی، اس رصدگاہ کی نگرانی اور کام کے لئے بہت سے سائنسدانوں اور ماہر انجینئروں کی جماعت مقرر کی تھی، ان میں ایک مظفر اسفرازی بھی تھا، یہ علم ہیئت کا ماہر اور اچھا صناع تھا، اس میں اور بھی بہت سی کئی خوبیاں تھیں۔

ہر رصدگاہ (observatory) میں آلاتِ رصدیہ کو بہت اہمیت حاصل ہے، کیوں کہ آسمان کے عجائبات کا مشاہدہ کرنا آسان نہیں ہے، اس کام کے لئے آلات کا صحیح ہونا بھی بہت ضروری ہے۔

ملک سلجوقی کی مذکورہ رصدگاہ اپنی عمدہ کارکردگی کے لحاظ سے مشہور ہے، اس رصدگاہ میں آلاتِ رصدیہ کا انچارج ابوحاتم اسفرازی تھا، وہ ایک جدت پسند اور ماہر انجینئر تھا۔

اسفرازی علم طبعیات (physics) سے خاص دلچسپی رکھتا تھا، وہ علم طبعیات کی وہ دو مشہور شاخوں میکانیات (mechanics) اور ماسکونیات (hyorostatics) میں دست گاہ کامل رکھتا تھا۔

ایک نازک ترازو کی ایجاد

اسفرازی ایک اچھا صناع تھا، اس کے جدت پسند دماغ نے ایک انوکھے ڈھنگ کی ترازو ایجاد کی، اس نازک ترازو کی خوبی یہ تھی کہ اس کے ذریعہ سونا اور چاندی بنی ہوئی اشیاء اور زیورات میں ملاوٹ کا صحیح صحیح اندازہ چل سکتا تھا، یعنی سونا خالص ہے یا اس میں

کچھ ملاوٹ ہے، اگر ملاوٹ ہے تو دوسری دھات کس قدر ہے۔

اسفرازی کی یہ ایجاد کردہ ترازو کثافتِ اضافی (Specific gravity) کے اصول پر مبنی تھی

سونا اور چاندی نیز دیگر دھاتوں کا صحیح صحیح وزن معلوم کرنے کے لئے مسلم ماہرین ایک خاص اصول سے کام لیتے تھے، مثلاً سونے کی کثافت اضافی (۱۹ئ ۳) ہوتی ہے، اور باقی دھاتیں اس سے ہلکی ہوتی ہیں، اب سونے میں اگر چاندی یا تانبا جو کھوٹ کے طور پر ملا دیتے ہیں، یہ دھاتیں سونے سے ہلکی ہوتی ہیں، پس ملی ہوئی دھات کے سبب سونے کی بنی ہوئی اس چیز کی کثافتِ اضافی (۱۹ئ ۳) نہیں ہوسکتی؛ بلکہ کم ہوجاتی ہے او راندازہ ہوجاتا ہے کہ اس سونے میں کتنی ملاوٹ ہے۔

اور اگر ملاوٹی دھات کی نوعیت معلوم کرلی گئی تو یہ بھی پتہ چل سکتا ہے کہ اس شے میں اس قدر سونا ہے اور اتنی ملاوٹی دھات ہے۔

کثافت اضافی معلوم کرنے کا طریقہ

کثافتِ اضافی معلوم کرنے کے لئے دو تجربے کرنا ضروری ہے، ایک تجربہ تو یہ ہے کہ اس شئے کا عام وزن صحیح صحیح معلوم کیا جائے اور دوسرے یہ کہ اس شئے کا وزن پانی کے اندر صحت کے ساتھ دریافت کیا جائے اور پھر پانی میں اس کے وزن کی ٹھیک ٹھیک کمی نکالی جائے، اسفرازی نے اس سلسلہ میں جو طریقہ اختیار کیا تھا مثالوں کے ذریعہ اس کی تشریح کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

فرض کیجئے کہ سونے کے ایک زیور کا عام وزن (۸۰) اوقیہ ہے اور پانی میں اس کا وزن (۷۵) اوقیہ ہے، یعنی پانی میں اس کے وزن کی کمی بقدر (۵) اوقیہ ہوجاتی ہے۔

اب اس زیور میں خالص سونے کے ساتھ کچھ حصہ چاندی بھی بطور کھوٹ کے ملی ہے، یہاں یہ معلوم کرنا ہے کہ اس زیور میں کتنے اوقیہ خالص سونا اور کتنی چاندی ہے۔

سونے کی کثافتِ اضافی (۳۔۱۹) اور چاندی کی کثافتِ اضافی (۵۔۱۰) پہلے سے معلوم ہے، اس لئے اس مثال کے ذریعہ علم ریاضی کے اس سوال کو بآسانی حل کیا

جاسکتا ہے۔

مظفر اسفرازی کی ترازو ایک قسم کی ماسکونی ترازو تھی، جس کے ذریعہ دی ہوئی شئے کا عام وزن پھر پانی میں اس کا صحیح وزن معلوم کیا جاسکتا تھا اور دونوں حاصل تفریق سے پانی میں اس کے وزن کی کمی نکالی جاسکتی تھی۔

دھاتوں میں ملاوٹ کا چارٹ

اسفرازی کے زرخیز دماغ نے بہت سی نئی نئی باتیں پیدا کیں، اس نے سینکڑوں تجربے کرکے سونے میں چاندی کی ملاوٹ کے بہت سارے چارٹ تیار کئے، یہ اس کی مہارت کا کمال تھا، اس چارٹ میں چار خانے تھے۔

پہلا خانہ: اس شئے کا وزن

دوسرا خانہ: پانی میں اس کے وزن کی کمی

تیسرا خانہ: سونے کی مقدار کا وزن

چوتھا خانہ :سونے کی مقدار کا وزن

اس نے سونے میں ملاوٹ اور چاندی میں ملاوٹ، کے سلسلے میں سینکڑوں دھاتوں سے متعلق چارٹ بڑی محنت سے تیار کیا تھا، ان چارٹوں کا تیار کرنا نہایت مشکل اور صبر آزما کام تھا، اس کام میں اسفرازی نے اپنی عمر کے کئی سال صرف کئے تھے۔

انوکھی ترازو کی ایجاد اور چارٹ نے صنعتی اور کاروباری دنیا میں بہت سہولتیں پیدا کردی تھیں۔

اونس، ڈرام

مسلم دور میں تاجروں اور دانشور مختلف اشیاء کو وزن کرنے کے لئے ان دو اکائیوں کا استعمال کرتے تھے، درہم اور اوقیہ۔

چھوٹی چھوٹی اور قیمتی دھاتوں کا وزن کرنا ہوتا تو یہی دو معیار مانے جاتے تھے، اس کا رواج مسلم دور سے آج تک اس سائنسی زمانے میں بھی جاری ہے۔

جب یہ علمی خزانے اسلامی ممالک سے یورپ کی طرف منتقل ہونے لگے تو یہ وزن

بھی وہاں پہنچے، چونکہ یہ نہایت مناسب اور موزوں تھے؛ اس لئے ان کو دانشوران یورپ نے بجنسہ باقی رکھا، کوئی فرق نہیں کیا اور آج بھی ان کا چلن ویسا ہی ہے۔

اوقیہ =اونس بن گیا درہم =ڈرام بن گیا

اس نئے دور میں آج بھی ہسپتالوں میں اونس اور ڈرام کا استعمال ادویہ کو تولنے کے لئے نہایت کثرت سے ہوتا ہے کہ ان کے بغیر کام نہیں چل سکتا، لیکن یہ ہمارے ڈاکٹر اور تاجر شاید ہی جانتے ہوں کہ ان کے روزانہ کے استعمال میں آنے والا یہ وزن اونس اور ڈرام کیا ہے اور کس دور کی یادگار ہے

(۴) (ابوعباس) احمد بن محمد کثیر فرغانی (۲۴۳ھ-۸۵۷ء)

زمین کے محیط کی پیمائش کرنے والوں کی جماعت کا ممبر تھا، طغیانی ناپنے کا آلہ ایجاد کیا، دھوپ کی گھڑی پیش کی، اس نے دھوپ گھڑی (sun dial) ایجاد کی۔

علم ہیئت میں بھی کمال رکھتا تھا، جوامع العلوم کتاب مرتب کی، اس کتاب کے ترجمے ہو چکے ہیں۔

احمد کثیر فرغانی علم ہیئت کا ماہر، کامیاب سول انجینئر اور اچھا صناع تھا۔

احمد کثیر شہر فرغانہ (ترکستان) میں پیدا ہوا، ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بغداد آ گیا، تعلیم مکمل کی اور مطالعہ میں مصروف ہو گیا، یہاں کے علمی ماحول میں اس کے جوہر کھلے، اس نے بہت اچھی استعداد پیدا کر لی، مامون الرشید کا زمانہ تھا۔

علمی خدمات اور کارنامے

بغداد علم وفن کا مرکز بن گیا تھا، ہر علم وفن کے قابل ترین لوگ وہاں موجود تھے۔

مامون الرشید علمی ذہن ودماغ رکھتا تھا، اس کے ذہن میں آیا کہ زمین کے محیط کی صحیح صحیح پیمائش کی جائے، چنانچہ اس نے انجینئروں کی ایک جماعت مقرر کی، اس جماعت نے غور وفکر کے بعد کچھ اصول اور قاعدے بنائے اور طریقۂ کار متعین کئے، ماہرین کی اس جماعت کا صدر احمد کثیر فرغانی تھا، شہر کوفہ کے شمال میں ایک وسیع میدان اس کام کے لئے موزوں سمجھا گیا، اس میدان کو دشت بخار کہتے تھے، اس میدان میں دو

مقامات رقہ اور تدمر کو منتخب کیا گیا، جملہ آلات اور سامان وہاں مہیا کر دیا گیا۔

زمین کے محیط یعنی گھیر کی صحیح پیمائش کے لئے طریق کار طئے کیا گیا کہ پہلے اصطرلاب اور سدس (sextants) اور دیگر آلات کی مدد کی سے قطب تارے کی بلندی زاویئے کے ذریعے معلوم کی جائے، پھر ایک مقررہ فاصلے تک آگے بڑھ کر قطب تارے کی بلندی کی پیمائش کی جائے اور اب دونوں کے فرق کو معلوم کر لیا جائے، اس طرح زمین کے محیط کی پیمائش معلوم ہو جائے۔

ماہرین نے پیمائش شروع کی اور حساب کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ زمین کا گھیر میل ہے، مامون الرشید بہت خوش ہوا، بیت الحکمۃ کے ممبروں میں فرغانی بھی تھا، اسے بھی کام کا کافی موقع ملا۔

موجودہ زمانے میں جب کہ ہر طرح کی سہولتیں ہیں، نئے نئے آلات ہیں، زمین کے محیط یعنی گھیر کو میل مانا جاتا ہے، مسلم دور کی پیمائش اور آج اس نئے دور کی پیمائش میں بقدر (151) کا فرق ہے، یعنی کل غلطی صرف (6ء) فیصد پائی جاتی ہے، یہ غلطی کوئی غلطی نہیں ہے۔

فرغانی کو صناعی میں بھی کمال حاصل تھا، اس نے کئی اہم چیزیں ایجاد کیں، طغیانی ناپنے کا آلہ: اس آلہ کے ذریعے دریا کے پانی کا صحیح اندازہ ہو جاتا تھا اور معلوم ہو جاتا تھا کہ سیلاب آنے والا ہے یا نہیں، یہ آلہ دریا میں نصب کر دیا جاتا تھا۔

دھوپ کی گھڑی

دوسری چیز جو بہت ضروری تھی، وہ دھوپ کی گھڑی (sun dial) تھی، جس سے دن میں وقت کا صحیح اندازہ ہو جاتا تھا۔

فرغانی نے کئی کتابیں مرتب کیں، مشہور کتاب اس کی ''جوامع علم النجوم'' ہے، اس کتاب کا پہلا لاطینی ترجمہ بارہویں صدی عیسوی میں شائع ہوا، پھر دوسرا ترجمہ جرمنی میں ۱۵۳۷ء میں چھپا اور تیسرا ترجمہ فرانس کے دانشوروں نے ۱۵۴۶ء میں شائع کیا۔(۱)

(۱) ۱۰۰ عظیم مسلم سائنسداں: ۱۰۴

عظیم مسلمان فلاسفر

بعض مغربی مصنفوں کا خیال ہے کہ مسلمانوں نے یونان کی فلسفیانہ کتابوں کے صرف ترجمے کئے ہیں؟ اپنی طرف سے اس میں کوئی قابل ذکر اضافہ نہیں کیا، اس غلط فہمی کی اصل وجہ یہ ہے کہ مسلم فلسفے کے اصل مآخذ ان لوگوں کی رسائی سے باہر ہیں اور اپنی عدم رسائی کا اعتراف کرنے کے بجائے یہ حضرات مسلم فلسفے کے وجود ہی سے انکار کرتے ہیں، فرانس کے مورخ موسیوسیدیوان کی غلط بیانی کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یورپ والے کہتے ہیں کہ عربی فلسفہ کوئی چیز ہی نہیں، عرب فلسفہ کو کیا جانیں؟ لیکن یہ کہنے والے اس لئے معذور مانے جاسکتے ہیں کہ ان بیچاروں کو عربوں کے علمی مشاغل اور دماغی کارناموں کا علم ہی نہیں، فلسفیانِ یورپ ذرا غور سے کام لیں اور اپنے ہی یہاں کی علمی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ان کو بہ آسانی معلوم ہوسکے گا کہ قرونِ متوسطہ میں یورپ کے مدارس جن فلسفی کتابوں کا درس دیا کرتے تھے، وہ سب فلاسفہ عرب کی تالیفات سے خوشہ چیں ہو کر تالیف ہوئیں تھیں''(۱)

(۱) (ابو یوسف) یعقوب بن اسحاق کندی (۲۵۴ھ-۸۶۸ء)

ابو یوسف یعقوب بن اسحاق الکندی، فلسفی، شاہانِ عرب کا سپوت اور خاندانِ کندی کا نونہال تھا اور اس کا باپ اسحاق بن صباح تینوں خلفائے عباسیہ مہدی، ہادی اور رشید کے زمانے میں کوفہ کا امیر رہا، سلیمان بن حسان کا بیان ہے کہ: مسلمانوں میں کندی کے سوائے کوئی فلسفہ نہ تھا، اس کی مراد شاید یہ ہوگی کہ یہ فلاسفۂ اسلام میں پہلا فلسفی تھا۔

(۱) قرونِ وسطی کے مسلمانوں کے سائنسی کارنامے: ۳۰۹

کندی نے اپنی تالیفات میں بالکل ارسطو کا انداز اختیار کیا ہے، اکثر فلسفے کی کتابوں کی شرح لکھی ہے، مشکل مقامات کی توضیح و تلخیص کی ہے، پیچیدہ گتھیوں کو سلجھایا ہے جس سے اس کی ترجمے کی اعلی استعداد کا پتہ چلتا ہے۔

کندی کی اکثر و بیشتر تالیفات فلسفے میں ہیں اور ارسطو کے فلسفے کا شارح ہونے کی حیثیت سے عربوں میں کندی ہی کو شرفِ تقدم حاصل ہے، اس کی یہ شرحیں ان کتابوں میں جو ہم کو دستیاب ہوئیں، منجملہ ان کے ایک کتاب ''**فی قصد ارسطالیس فی العقلات**'' ہے اور دوسری ارسطو کی تصنیفات کی ترتیب ہے جس میں اس نے ارسطو کی کتابوں کی تعداد ان کی ترتیب اور ان کے اغراض اور ان چیزوں سے بحث کی ہے جو فلسفے کے حصول کے لئے ضروری ہیں۔

اس وقت کندی کی کم و بیش پندرہ کتابیں محفوظ ہیں، ان میں ان کی پہلی تصنیف ''**كتاب الفلسفة الأولى فى مادون الطبعيات والتوحيد**'' اس لحاظ سے زیادہ اہم ہے کہ اس میں انہوں نے فلسفے کا دفاع کیا ہے، دوسرے تین رسالوں میں ثابت کیا ہے کہ عالم نہ صرف مکان؛ بلکہ زمان میں بھی محدود ہے، ان کے پانچ رسالے وہ ہیں جن میں روح اور عقل پر بحث کی گئی ہے، ان کی دوسری تحریروں میں فلسفیانہ مسائل مثلاً تخلیق، سلسلہ علل، جواہر خمسہ وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے، کندی نے اگرچہ ارسطو اور افلاطون کے افکار پر زیادہ انحصار کیا ہے مگر بعض مقامات پر انہوں نے یونانی حکماء سے اختلاف بھی کیا ہے۔

انہوں نے افعال باری، ماہیت عقل، توحید، علم کی اقسام، روح، عقل فعال جیسے موضوعات پر بحث کر کے فیلسوف العرب کا لقب پایا۔

مغربی مفکرین نے کندی کی علمی خدمات کو سراہا ہے، راجر بیکن کا کہنا ہے کہ کندی اور ابن الہیثم مرئیات میں شہرت کے لحاظ سے بطلیموس کے ساتھ طبقہ اول میں شمار ہوتے ہیں، غیر ولیمو کاردانو (Girolamo cardano) نے کندی کا شمار تاریخ کے ان بارہ عظیم ترین ذہین افراد میں کیا ہے، جن کی مثال ابتدائے آفرینش سے سولھویں صدی

عیسوی تک دنیا پیش کرنے قاصر رہی ہے۔

ول دوران ان کی عبقری شخصیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

Like so many thinkers in that condident heyday of Muslim mind, he was an omnivorous polymath studying everything, writing 265 treatises about everything-arithmetic, geometry astronomy, merteoroglogy, geography, physics, politics, music, medicine philosophy.

''مسلم ذہن کے اس پر اعتماد دور عروج دوسرے مفکرین کی طرح وہ ہمہ داں وہمہ جہت مفکر تھے، جو ہر موضوع کا مطالعہ کرتے تھے اور جنہوں نے تقریبا ہر موضوع حساب، جیومیٹری، فلکیات، موسمیات، جغرافیہ، طبیعیات، سیاسیات، طب، فلسفہ، وغیرہ پر قلم اٹھا کر ۲۶۵ رسالہ تحریر کئے ہیں''۔

کندی کی وصیتیں

طبیب کو چاہئے کہ وہ خدا تعالیٰ سے ڈرتا رہے، اور مریض کی جان کو خطرے میں نہ ڈالے، کیوں کہ اس کا کوئی بدل ممکن نہیں، جس طرح تم یہ کہنا پسند کرتے ہو کہ خدائے تعالیٰ مریض کی صحت وعافیت کا سبب ہے، اسی طرح سمجھ لو کہ اس کی موت کا سبب بھی وہی ہے۔

اس کا ایک قول یہ بھی ہے ''عاقل ہمیشہ اپنی علمیت کو محدود سمجھتا ہے، اسے تواضع اختیار کرتا ہے اور جاہل خود کو تمام علوم کا مخزن سمجھتا ہے، اس وجہ سے لوگ اس سے نفرت کرتے ہیں۔

قول ''لا'' یعنی ''نہیں'' بلاؤں کو پھیر دیتا ہے اور قول ''نعم'' یعنی ''ہاں'' نعمتوں کو زائل کر دیتا ہے، گانا سننا گویا سرسلہ کی بیماری ہے، کیوں کہ انسان اس کی وجہ سے آپے سے باہر ہو جاتا ہے اور بے دریغ پیسہ صرف کرتا ہے اور چند روز میں مفلس اور قلاش ہو کر انتہائی رنج ومصیبت میں جان دیتا ہے۔

ایک ملا سے مقابلہ

یعقوب ایک فلسفی تھا، اس کے فلسفیانہ نظریات تھے، تنگ نظر ملاّ ایسے لوگوں کو بے دین سمجھتے ہیں، ایسا ہی ایک واقعہ پیش آیا، شہر بلخ کے ایک ملا کو سخت غصہ آیا، اس نے کندی کے فلسفیانہ نظریات اور خیالات کو دین ومذہب کے خلاف سمجھا، وہ بلخ سے اپنی پارٹی کے ساتھ بغداد آیا اور یعقوب کے خلاف سخت تقریریں کرنے لگا۔

بلخی ملا نے یعقوب کے ناک میں دم کر دیا اور ان کی جان کے لالے پڑ گئے؛ لیکن سنجیدہ اور فراخ دل یعقوب نے دربار میں ذرا شکایت نہ کی؛ بلکہ عاقلانہ طریقہ اختیار کیا یعنی اس بلخی ملا کو اپنے یہاں دعوت دی اور عزت سے بلایا۔

یعقوب کندی نے بلخی ملا کی خوب قدر ومنزلت کی، بڑے اہتمام سے اپنے ساتھ کھانا کھلایا اور پھر اسے سمجھایا کہ دین ومذہب اور سائنس وفلسفہ میں کوئی جھگڑا نہیں، نہ تضاد ہے، دین ومذہب ایک خدائی نظام زندگی ہے، وہ پاکیزہ زندگی گذارنے کی تعلیم دیتا ہے اور فلسفہ اور سائنس تو انسان کی عقلی دوڑ ہے، انوکھے خیالات ونظریات ہیں، قرآن پاک بھی عقل سے کام لینے اور تفکر وتدبر پر زور دیتا ہے، لہٰذا ہمیں عجائبات عالم پر غور کرنا اور عقل سے کام لینا چاہئے، ہم قدرت کے اسرار کو کہاں تک سمجھ سکتے ہیں، سوچنا چاہئے۔

اس کے علاوہ یہ ماہر علم طب اور نجوم بھی تھا۔

(۲) حکیم ابونصر محمد بن فارابی (۲۳۸ھ/۹۵۰ء)

حکیم ابونصر محمد بن فارابی فلسفی، ریاضی داں اور ہر علم وفن میں کامل دست گاہ رکھنے والا دانشور تھا، دنیا نے صرف چار اعلیٰ ترین دماغ رکھنے والے اور جامع شخصیتیں پیدا کی

ہیں، ان میں ایک فارابی تھا، ابونصر فارابی عالی دماغ سائنس داں اور عظیم مفکر تھا، دنیا نے اسے معلم ثانی کا خطاب دیا، وہ کائنات کا محقق اور تہذیب ومعاشرت اور علمِ اخلاق کا نکتہ داں تھا۔

فارابی اپنے ذاتی شوق اور محنت سے علم وفن کا گہرا مطالعہ کیا اور کمال پیدا کیا، اس نے کبھی عیش وآزادی کی زندگی نہ گذاری، ہمیشہ محنت کا عادی رہا، ترکی لباس کا وہ پابند رہا، سر پر ایک لمبی ٹوپی رہتی تھی، اپنی یہ وضع کبھی نہ بدلی۔

علمی خدمات اور کارنامے

فارانی نے جو کتابیں تصنیف کی ہیں، ان کی تعداد القطفی نے ۱۷۳ اور حاجی خلیفہ نے ۱۱۴ بتائی ہے، ان میں تقریباً پچاس کتابوں کا تعلق فلسفہ اور منطق سے ہے، انہوں نے احصاء العلوم کے نام سے انسائیکلوپیڈیا تصنیف کیا، جس میں لسانیات، منطق، ریاضی، طبیعات، کیمسٹری، معاشیات اور سیاسیات کے علوم کے بارے میں معلومات کا خزانہ جمع کر دیا، فلسفہ میں انہوں نے ارسطو کو اپنا ہیرو مانا اور ان کی کتابوں کی تشریح میں رسالے لکھے۔

منطق میں فارابی نے کئی کتابیں تحریر کیں، ان میں انہوں نے اس فن کے ضروری مباحث پر روشنی ڈالی، قیاس اور برہان کو زیر بحث لایا اور مشکل مقامات کی وضاحت کی۔

فارابی نے افلاطون اور ارسطو کی طرح سیاسیات پر توجہ دی، انہوں نے رسالہ "رسالہ فی آراء أهل المدينة الفاضلة" اور "سياسة المدنية" کے عنوانوں سے دو کتابیں تصنیف کی ہیں۔ فارابی نے فلسفہ یونان کو اسلام سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے، یہ کام ان سے پہلے کندی نے شروع کیا تھا۔

فارابی کا فلسفہ اخلاق

فارابی علمِ اخلاق اور معاشرت پر بڑے اچھے انداز میں بحث کرتا ہے، حکماء میں فارابی پہلا شخص ہے جس نے حیوانات پر غور کیا اور بتایا کہ انسان اشرف المخلوق کیوں ہے

؟ انسان کی زندگی کا ایک عظیم مقصد ہے اور وہ عظیم مقصد سعادت کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنا ہے، سعادت یعنی عمدہ اور پاکیزہ خیالات ونظریات اور اعمالِ صالحہ کو ''مکارم اخلاق'' کہتے ہیں، سعادت کی تکمیل مکارمِ اخلاق کا نام ہے۔

علم کیا ہے؟ اور طالب علم کسے کہتے ہیں؟

فارابی علم کی تعریف کرتا ہے، علم اللہ کا نور اور دل کی روشنی ہے

علم کون حاصل کر سکتا ہے؟

ایک طالب علم باکمال اور عالی دماغ اسی وقت بن سکتا ہے جب وہ اپنے دل میں سچا شوق اور سچی لگن رکھتا ہو اور وہ تندرست اور اچھے مزاج کا ہو، وہ عمدہ اخلاق وعادات کا پابند ہو، غور کرنے اور سوچنے کا دل ہو، سچا طالب علم وہ ہے جو دیانت دار، مستعد اور محنتی ہو، وہ وقت کا پابند ہو، قناعت پسند ہو، صاف ستھری سادہ اور پاکیزہ زندگی گذارتا ہو۔

فارابی آگے لکھتا ہے:

انسان علم کو روزی حاصل کرنے کا ذریعہ ہرگز نہ بنائے۔

انسان کو پورا کمالِ انسانیت صرف اچھے علم اور اچھے عمل سے ہی حاصل ہوسکتا ہے، یعنی اس کے اخلاق وعادات اچھے ہوں، شیریں زبان ہو اور عمل بھی اچھا ہو۔

عادت اور اس کا مقصد

ہم خدا کی عبادت کرتے ہیں؛ لیکن کیوں؟ فارابی عبادات پر عالمانہ اور سائنٹفک انداز میں بحث کرتا ہے، یہ اعمال جو روز ہم ادا کرتے ہیں، یہ معاشرہ یعنی سوسائٹی میں لوگوں کو متنبہ اور خبردار کرتے رہتے ہیں، یہ برائیوں سے بچا لیتے ہیں اور اللہ تعالی کی خوشنودی کا باعث بنتے ہیں یہ اعمال مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوۃ یہ دیانت داری اور حسنِ اخلاق وغیرہ کی تعلیم دیتے ہیں، ان عبادات سے بندوں کے ایمان میں تازگی آجاتی ہے، ان میں اخوت، مروت اور محبت کے شریفانہ جذبات ابھرتے ہیں، ان کے خیالات اور عقائد پاکیزہ ہوتے ہیں۔

یہ سب سوسائٹی کے اجتماعی نظام کو قائم اور مستحکم رکھتی ہیں اور صحت مند معاشرہ کی

نشوونما میں معاون ہوتی ہیں۔

موجوداتِ عالم

فارابی موجوداتِ عالم پر فلسفیانہ انداز میں بحث کرتا ہے ، وہ کہتا ہے کہ : موجودات عالم یعنی یہ دنیااوراس کی سب چیزیں ،ان سب کی وہ پہلے تین قسمیں بتاتا ہے ، جمادات ، نباتات اور حیوانات ، پھران کے بارے میں وہ عالمانہ انداز میں گفتگو کرتا ہے۔

فارابی حیوانات کو حیاتیات کے نقطۂ نظر سے پیش کرتا ہے (حیاتیات biology)اس حیاتیات کی وہ قسمیں بتاتا ہےاوراسے زندگی کا ارتقاء کہتا ہے کہ یہ اس کا نظریہ ہے یعنی وہ مخلوق جوجان رکھتی ہیں اوران میں زندگی ہے، وہ جامداور ساکت نہیں ہے، وہ متحرک ہیں، اس طرح کہ ان میں عاقل ہیں جیسے انسان اورغیر عاقل جیسے جانور۔

انسان عاقل ہے اسے اشرف مخلوق کا درجہ دیا گیا ہے، اس میں ارتقاء بھی جاری ہے، (دماغی ارتقاء) قدرت نے اس میں ایسی صلاحیتیں رکھی ہیں ، وہ غور وفکر کرے گا اور پھر آگے بڑھے گا ، چنانچہ یہ عمل جاری ہے ، دماغی ارتقاء اس کے تجربات کی بنیاد پر جاری ہےاور جاری رہے گا۔

اشرف مخلوق انسان کا ارتقاء

انسان عاقل ہےاوراللہ نے اسے علم جیسی عظیم ترین نعمت سےنوازا ہے، "علم الإنسان مالم يعلم"

انسان اپنی ضروریات کے حصول اور بہترین حالات کی تکمیل کے لئے اجتماعی زندگی گذارنے پر مجبور ہے ، وہ معاشرہ اورسوسائٹی سے الگ نہیں رہ سکتا، وہ اپنی سماجی زندگی ہی میں اپنی منزل تک پہنچ سکتا ہے۔

فارابی انسانوں کی اجتماعی زندگی کے ارتقاء کی تشکیل کا تصور اس طرح پیش کرتا ہے، انسان کی سماجی زندگی کے ارتقاء کی تشکیل۔

انسان اپنی اجتماعی زندگی میں طبعاً خاندان کی تشکیل کرتا ہے یہ پہلا اجتماع ہے۔

کئی خاندان مل کر جب باہم ان میں تعلقات پیدا ہوجاتے ہیں ،قبیلہ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں، خاندانوں کا دوسرااجتماع قبیلہ ہے، جوکئی خاندانوں کا مجموعہ ہےاور پھر اپنی ضرورتوں سے مجبور ہوکر کئی قبائل باہم مل جاتے ہیں تو یہ تیسرااجتماع قوم کہلاتا ہے، یہ بہت بڑااجتماع اورارتقاء کی تیسری منزل ہے۔

خاندان کی طاقت محدود ہوتی ہے،قبیلہ طاقتور ہوتا ہےاوراپنی طاقت کے ذریعہ وہ ایک خطۂ زمین پر قبضہ کر لیتا ہےاور پھر بہت سے قبائل مل کر جوایک قوم بن جاتے ہیں، ایک وسیع علاقہ پر قابض ہوجاتے ہیں ، وہ اپنا ایک نظم وضبط قائم کر لیتے ہیں ، یہ سب اجتماع اپنے افراد کی جملہ ضرورتوں کومہیا کرتے ہیں ان کی حفاظت کرتے ہیں ، یہ فطری اورطبعی تقسیم ہے،ان کے نام یہ ہیں، پہلا اجتماع گاؤں ہے،دوسرا قصبہ اوران سب سے بڑا شہر،شہر کی اجتماعی زندگی نہایت وسیع ہوتی ہے،اس لئے وہ بڑے بڑے چشمے اور دریا کے کنارے آباد ہوتا ہے، خاندان،قبیلہ اورقوم یہ تین قسمیں آبادی کی ہوجاتی ہیں۔

قوم کامل ترین انسانی اجتماع ہے

قوم اپنا الگ اورمنفرد مزاج رکھتی ہے، ہرقوم دوسری قوم سے عادات واطوار، اندازِغور وفکر میں الگ ہوگی ، ان کے خیالات ونظریات معاشرتی زندگی اور زبان سب باتیں الگ الگ ہوں گی ، یہاں تک کہ شکل وصورت میں بھی اقوام عالم ایک دوسرے سے الگ الگ نظر آئیں گی۔

قوم پر آب ہوا کے ہونے والے اثرات

خاندان ابتدائی وحدت ہے، یہ معاشرہ کا ناقص اجتماع ہے، گاؤں نسبتاً بڑا اجتماع ہے،مگر یہ بھی نامکمل اجتماع ہے،محدود ہے،ذرائع زندگی محدود ہیں۔

تیسرااجتماع سب سے بڑااور مکمل اجتماع ہے، یہ اجتماع شہر کا اجتماع ہے، مدینہ عربی میں اورانگریزی میں سیٹی (city) کہتے ہیں،اس تیسرے اجتماع میں ہرفرد کو ہر قسم کی مناسب سہولتیں حاصل ہوتی ہیں ، جملہ ضروریات زندگی کی تکمیل کے سامان مہیا ہوتے ہیں ،تہذیب وثقافت کے نوک و پلک یہاں سنورتے ہیں ، اس لئے معاشرہ یعنی

سماج کی نشوونما اور صحت مند ترقی کے لئے شہر بہترین جگہ ہے یہ مکمل اجتماع ہے، یہاں ہر طرح کے ذرائع ہیں جن سے انسانیت کی تکمیل ہوتی ہے۔

شہر کے بھی درجے ہیں، بعض شہر کے لوگ طبعاً زیادہ شریف، تعلیم یافتہ اور ذرائع کے سبب زیادہ تجربہ رکھتے ہیں، اس طرح آدابِ زندگی اور اخلاق میں بھی فرق ہوجاتا ہے، زمین اور آب وہوا کے اثرات نہ ہوتے ہیں۔

شہروں میں زندگی کا ہر پہلو نمایاں اور واضح ہوتا ہے، ہر قسم کے لوگوں سے ملنے جلنے کے مواقع فراہم ہوتے ہیں، ان میں مسائل ومعاملات کے سلسلے میں خیالات کا تبادلہ ہوتا رہتا ہے، ہر قسم کے تجربے ہوجاتے ہیں، صلاحیتیں ابھرتی ہیں، جدت پسند دماغ اور حوصلہ مند افراد نئے نئے نظریئے قائم کرتے ہیں، زندگی کا ہر پہلو نشوونما پاتا رہتا ہے اور یہ ارتقاء برابر جاری رہتا ہے، جس سے انسانیت کو فروغ حاصل ہوتا رہتا ہے اور تہذیب وتمدن کو ترقی کا موقع ملتا رہتا ہے۔

فارابی گاؤں اور شہر کی تنظیم پر آگے لکھتا ہے:

''شہروں میں محلہ ہوتے ہیں، اور یہ سب مجھے باہمی تعاون کی بنیاد پر شہری آبادی کی تکمیل کرتے ہیں، گویا یہ محلے شہر کے جزو ہیں اور انتظامی حیثیت رکھتے ہیں، شہر ایک جسم اور محلہ دیگر انتظامات اس کے ضروری حصے اور اعضاء ہیں جن سے شہر سجانے کی تکمیل ہوتی ہے''۔

گاؤں اور دیہات کم تر درجیں کی جگہیں ہیں، دیہات شہری اجتماع کے لئے قائم ہوتے ہیں اور رفتہ رفتہ دیہات کی حیثیت اب شہر کے خادم کی حیثیت ہوجاتی ہے، جو شہری ضرورتوں کو ایک حد تک مہیا کرتے ہیں اور یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہتا ہے۔

انسان، اعلیٰ تمدن اور معاشرت

فارابی ایک محقق اور مفکر کی طرح حیاتیات پر بحث کرتے ہوئے سماجیات پر گفتگو کرتا ہے، وہ علمِ تمدن اور معاشرت پر بحث کرتا ہے:

''انسان اشرف مخلوق ہے؛ لیکن وہ اپنے ماحول اور اپنے نفس کے

حالات سے مجبور ہوکر کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہوجاتا ہے، اعلی اور ادنی تمدن رکھنے والے انسان اور ادنی تمدن کے انسان اعلی تمدن رکھنے والے بلند ترین سماج کے لوگ ہیں، وہ زندگی کا شعور رکھتے ہیں''۔

فارابی کہتا ہے:

''اعلی تمدن رکھنے والے شریفانہ اور صحت مند سماج میں وہ لوگ ہیں جو شریف، نیکوکار اور میل ملاپ رکھنے والے ہر حال میں خوش اور مطمئن ہیں، وہاں ہر شہری میں باہم محبت اور مروت کا جذبہ پایا جاتا ہے، ان کا نظریہ زندگی عام انسانی برادری کی صلاح وفلاح ہے''۔

اس اعلیٰ متمدن سماج میں صرف شریف اور نیکوکاروں کو بلند درجہ حاصل ہوتا ہے اور وہاں لوگوں کی عزت اور ان کا احترام ان کے قول وفعل کے سبب کیا جاتا ہے۔

فارابی اب کم تر درجے یعنی غیر متمدن سماج کے لوگوں کے بارے میں بیان کرتا ہے:

''غیر متمدن اور کم تر سماج کے لوگ وہ ہیں جن میں ادب اور شائستگی کوئی چیز نہیں، ان میں زندگی کا شعور نہیں پایا جاتا، وہ لوگ صرف اپنی غرض اور اپنے مطلب ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں، ایسے سماج میں ان ہی باتوں کو اہمیت حاصل ہوتی ہے''۔

ایسے کم تر سماج کے لوگوں کی زندگی کا مقصد بس یہ ہوتا ہے کہ اپنی پوری طاقت اور قوت صرف دولت اور روپیہ حاصل کرنے اور جمع کرنے پر صرف کیا جائے، ایسے لوگ دولت اور روپیہ سے بے پناہ محبت رکھتے ہیں، اس لئے وہ بخیل بھی ہوتے ہیں، وہ لوگ اچھی شہرت کے کوئی معنی نہیں سمجھتے۔

(۳) ابن سینا

فارابی کے بعد مشرق کے مسلمانوں میں سب سے بڑے فلسفی ابن سینا ہیں، حقیقت یہ ہے کہ وہ فارابی سے زیادہ مشہور ہیں، ان کا میدان شہرت اگرچہ طب رہا ہے،

مگر فلسفہ میں ان کی مہارت عام طور پر مسلم ہے؛ بلکہ کہا جاتا ہے کہ وہ بہ بنسبت طبیب ہونے کے فلسفی زیادہ تھے۔

ابن سینا نے ارسطو کی مابعد الطبعیات کا مطالعہ چالیس مرتبہ کیا تھا؛ مگر یہ کتاب ان کے لئے تب بھی نا قابل فہم رہی، آخر میں انہوں نے مابعد الطبعیات پر فارابی کی شرح لکھ ڈالی اور اس کی مدد سے اسے سمجھنے کی کوشش کی، کتاب جب سمجھ میں آ گئی تو وہ اس قدر خوش ہوئے کہ شکرانے میں گلی میں جا کر خیرات تقسیم کی۔

ابن سینا فلسفہ میں ارسطو کی عظمت کے قائل تھے، انہوں نے یونانی فکر کو اسلام سے ہم آہنگ کرنے کی اسی طرح کوشش کی، جس طرح ان سے پہلے کندی اور فارابی کر چکے تھے؛ بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ ابن سینا اپنے پیشرووں کے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا، فلپ ہٹی کا بیان ہے:

> ''The harmonisation of greel philosophy with islam began by al- kindi,an arab was continued by al- farabi,a Turl and compgeted in the Esat by ibn- sina, a persian (1)

> ''یونانی فلسفہ کو اسلام سے ہم آہنگ کرنے کا عمل کندی نے شروع کیا جو عرب تھے، فارابی نے اسے جاری رکھا جو ترک تھے اور مشرق میں ابن سینا نے اسے مکمل کیا جو ایرانی تھے''

ابن سینا نے اپنا فلسفہ ''الشفا'' میں بیان کیا ہے، جو بڑی ضخیم کتاب ہے؛ بلکہ انسائیکلو پیڈیا برنا ٹیکا کے مضمون نگار کے الفاظ میں غالباً اپنی قسم کی ضخیم ترین کتاب ہے جو کبھی ایک شخص نے تصنیف کی ہو۔

ول دوران کے بیان کے مطابق اٹھارہ جلدوں پر محیط اس جناتی کتاب میں

(۱) History of the arabs p 371

ریاضی، فزکس، فلسفہ، دینیات، معاشیات، سیاسیات اور موسیقی کے موضوعات زیر بحث لائے گئے ہیں۔

موصوف کا بیان ہے:

> A vicenna's shifa and Qanun mark the apex of medieval thought, and constitute one of the major syntheses in the history of mind (1)

> ''ابن سینا کی ان تصنیفات ''الشفا'' اور ''القانون'' عہد وسطی کے فکر وفلسفہ کے نکتہ عروج کی علامات ہیں، یہ دونوں کتابیں فکری تاریخ کے بڑے نظاموں میں سے ایک نظام کے اجزائے ترکیبی ہیں''۔

ابن سینا کے افکار نے اہل یورپ کو بہت متاثر کیا، ان کی کتاب ''الشفا'' کا ترجمہ بارہویں صدی میں لاطینی میں کیا گیا، جس سے ان کے فکر کا چرچا یورپ کے گوشہ گوشہ میں پھیل گیا، ان کے خیالات نے عیسائی فلسفی اور ماہر دینیات سینٹ آگسٹائن کے خیالات سے میل کھایا اور وہ عہد وسطی کے عیسائی متکلمین خاص کر فرانسیسکین درس گاہوں کے جزو ترکیبی بن گئے، مغربی مفکرین میں راجر بیکن ان سے بہت متاثر ہوئے وہ اپنی تصنیف (opus majus) میں بار بار ابن سینا کی تعریف کرتے ہیں اور انہیں ارسطو کے بعد فلسفے کا بادشاہ اور رہنما (The prince and leader of philosophy) قرار دیتے ہیں۔

بیکن اور لاطینی مغرب کے علماء پر ابن سینا کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے ول دوران لکھتے ہیں:

> ''انہوں نے گہرے اثرات مرتب کئے، اسپین میں ابن رشد اور موسی بن میمون نے انہیں کے افکار سے اپنا فلسفہ آراستہ کیا اور لاطینی عیسائیت

(۱) 257-the ege of faith:pp256

کے عظیم متکلمین کو بھی انہیں سے تقویت ملی، یہ جان کر حیرت ہوتی ہے کہ البرٹ اعظم اور طاس اکویناس نے ان سے کتنا زیادہ مواد لیا ہے، راجر بیکن انہیں ارسطو کے بعد سب سے بڑا فلسفی کہا کرتے تھے، خود طاس اکویناس جب احترام کے ساتھ ان کا نام افلاطون کے ساتھ لیتے تھے تو یہ صرف رسمی آداب نہیں تھے‘‘(۱)

(۴) امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ

آپ کا اسمِ گرامی ابو حامد محمد بن محمد بن غزالی رحمۃ اللہ علیہ ہے، عام طور پر آپ کو غزالی سے منسوب کرتے ہیں، آپ اپنے زمانے کے علمائے کلام میں نہایت مرتبت رکھتے ہیں اور مذہب شافعی کے ائمہ میں سے ہیں، آپ کی ولادت خراسان کے ایک شہر طوس میں ۴۵۰ھ ۱۰۵۸ء میں ہوئی، ابتداء میں آپ نے اپنے ہی شہر میں علوم کی تحصیل کی، اس کے بعد مزید تکمیل کے لئے نیشاپور کا قصد کیا، بچپن میں آپ میں اعلیٰ ذکاوت اور غیر معمولی نجابت کے آثار نمایاں تھے، علم کلام اور فنون فلسفہ میں آپ کے کمالِ تبحر کی وجہ سے سلطان شاہ سلجوقی کے وزیر نظام الملک نے آپ کی جانب خاص طور پر توجہ کی اور مدرسہ نظامیہ جس کو اس نے بغداد میں قائم کیا تھا، آپ کو تفویض کیا، اس وقت امام غزالی کا سن پینتیس برس کا تھا اور اس زمانے کے علماء میں آپ کا خاص مرتبہ تھا، کچھ برس بعد آپ نے مدرسہ نظامیہ کو چھوڑ دیا اور حج کے فریضہ کی ادائیگی کے لئے مکہ مکرمہ کا رخ کیا، اس مقدس فرض سے فارغ ہونے کے بعد دمشق و بیت المقدس اور اسکندریہ کی جامع مسجدوں میں درس دیتے رہے، جب آپ اسکندریہ میں تھے اور یوسف بن تاشقین امیر مراکش سے (جو امرائے مرابطین میں سے تھا) ملنے کے لئے مغرب کا رخ کرنے ہی کو تھے کہ ناگاہ یوسف کے مرنے کی خبر پہنچی، اس لئے طوس کی طرف لوٹے اور حیاتِ فکری کے لئے خود کو وقف کر دیا اور صوفیانہ زندگی گذارنی شروع کی اور بہت سی کتابیں تالیف کیں، جن کی غایت دوسرے ادیان اور فلسفے پر دین اسلام کی فضیلت ظاہر کرنی تھی، اس

(۱) the age of faith:p.257

بناء پر آپ کا لقب فخر الاسلام اور زین الدین تھا۔

آپ کی کتابوں میں سب سے مشہور ’’احیاء علوم الدین‘‘ ہے جو علمِ کلام اور اخلاق کی زبردست کتاب ہے، یہ چار ابواب پر منقسم ہے، پہلے میں شعائر مذہبی سے بحث کی گئی ہے، دوسرا ان قوانین سے متعلق ہے کہ جو حیاتِ دنیوی کے حالات سے مختص ہیں، تیسرے ان مہلکات سے بحث کی ہے جن کا ازالہ ضروری ہے اور چوتھے ان منجیات کا ذکر کیا ہے جن کا اکتساب لازمی ہے۔

اس کے بعد آپ نے تالیف کا کام چھوڑ کر نیشاپور کی طرف لوٹے، تاکہ مدرسۂ نظامیہ کی تنظیم کر سکیں، پھر طوس کا رخ کیا اور صوفیوں کے لئے ایک خانقاہ بنوائی اور آخری ایام عبادت اور غور و فکر میں گذارے اور ۵۰۵ھ، ۱۱۱۱ء میں رحلت فرمائی۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اور فلسفہ

امام غزالی فلسفہ اور فلسفیوں پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

’’دہریئے سب سے قدیم فلسفی ہیں، انہوں نے ایک ایسے صانع کا انکار کیا جو مدرسہ عالم اور ذی علم و ذی قدرت ہو، ان کا خیال یہ ہے کہ عالم بنفسہ ازل سے موجود ہے، اس کا کوئی صانع نہیں‘‘۔

ہمیشہ نطفہ سے حیوان اور حیوان سے نطفہ پیدا ہوتا ہے، اب تک ایسا ہی ہوتا رہا اور آئندہ بھی اسی طرح ہوتا رہے گا۔

دوسرا گروہ طبعیین کا ہے، اس گروہ کے مباحث زیادہ تر علمِ طبعیات اور حیوانات کی تشریح کے بجائے عجائبات سے متعلق ہوتے ہیں اور اعضائے حیوانات کی تشریح کے علم میں بھی بہت کچھ غور و خوض کرتے ہیں، ان کا خیال یہ ہے کہ روح فانی ہے اور پھر زندہ نہیں ہوتی، انہوں نے آخرت، جنت، دوزخ، قیامت اور حساب کا بھی انکار کر دیا اور بے لگام ہو گئے اور بالکلیہ خواہشات نفسانی میں منہمک ہو گئے۔

تیسرا گروہ غزالی کہتے ہیں کہ: الٰہیین کا ہے اور یہ متاخرین سے ہیں، جیسے سقراط جو افلاطون کا استاذ ہے اور افلاطون جو ارسطوطالیس کا استاذ ہے اور ارسطو ہی نے ان کے

لئے منطق کو ترتیب دیا اور تمام علوم میں کانٹ چھانٹ کی، ان میں جو خامیاں تھیں، ان کو رفع کیا اور جو علوم ابتدائی منزل میں تھے انہیں مرتبہ کمال تک پہنچایا، ان الٰہیین نے پہلے دو گروہوں (طبعیہ اور دہریہ) کی تردید کی اور ان کی کمزوریوں کو ظاہر کیا اور ان خرابیوں کو ظاہر کیا جن کی طرف دوسروں نے توجہ نہیں کی تھی، اس کے بعد ارسطو طالیس نے افلاطون اور سقراط اور ان سے قبل کے الٰہیین کی پوری پوری تردید کی؛ یہاں تک کہ ان سب سے برأت حاصل کر لی۔

یہ عجیب بات ہے کہ امام غزالیؒ نے فلاسفہ یونان خاص کر ارسطو کی فضیلت کا اعتراف کیا ہے؛ لیکن اس کے ساتھ فلاسفہ اسلام کی ان کی اتباع کی وجہ سے مذمت کی ہے اور فرمایا کہ ''فلاسفہ اسلام میں کسی نے ان دو شخصوں یعنی فارابی اور ابن سینا کی طرح ارسطو کے ترجمہ کا کام نہیں کیا اور ان کی یہ رائے ابن رشد کے ظہور سے پہلے کی ہے۔

جب امام غزالیؒ نے علوم فلسفہ پر غور و فکر کرنے سے فراغت حاصل کی اور ان میں سے جو کچھ لینا تھا لے لیا اور جن چیزوں کو چھوڑنا تھا چھوڑ دیا تو اس کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ کمال مقصود کے لحاظ سے فلاسفہ کے علوم ناکافی ہیں، پس انہوں نے مذہب تعلیمی (یعنی باطنیہ) اور اس کی خرابیوں پر بحث کی۔

بہر حال آخر میں غزالی نے اس مسلک کی جانب توجہ کی جو قدرت نے ان کی خلقت میں رکھا تھا اور وہ طریقۂ صوفیاء ہے، انہوں نے اس کی طرف اپنی پوری ہمت کے ساتھ توجہ کی، رذائل اور مذموم صفتوں سے پاک وصاف کرنے یہاں تک کہ اس کے ذریعہ اس کی ایسی حالت ہو جائے کہ قلب غیر اللہ کے خیالات کو بھلا دے، امام غزالی کے خیال کے مطابق علم عمل سے آسان ہے، پس انہوں نے صوفیاء کی کتابیں پڑھیں اور ان کے رسائل کا مطالعہ کیا جن میں سے اہم کتب ابی طالب مکی، حارث محاسبی اور جنید، شبلی اور بسطامی کے منقولات ہیں اور جن امور کی تحصیل ممکن تھی، ان کو غزالی نے مطالعہ اور سماع کے ذریعے سے حاصل کیا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ صوفیاء کی اہم خصوصیات وہ ہیں جن کا حصول صرف مطالعے سے ممکن نہیں؛ بلکہ ذوق، حال اور صفات کے بدلنے پر

موقوف ہے، اور دوسری صورت یہ ہے کہ وہ حقیقت میں تندرست سیر اور سرمست ہے، ان دونوں حالتوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے، جو کوئی بھی صوفیاء کی حقیقت پر بحث کرے اس کو یقینی طور پر اس امر کا علم ہوگا کہ یہ لوگ صاحبِ حال ہیں نہ کہ صاحبِ مقال۔

امام غزالی اپنی تصانیف کے بدولت قرون وسطی میں لاطینی مغرب میں بہت مقبول ہوئے، ان کی وفات کے بعد تیس پینتیس برسوں کے اندر ہی ان کی کچھ کتابوں کا لاطینی ترجمہ کیا گیا، ان کی تصنیف ''المقاصد الفلاسفہ'' نے یورپ کو بہت متأثر کیا، بارہویں صدی کی ابتداء میں اس کا ترجمہ ان کتابوں کے ساتھ کیا گیا جو پہلے پہل ترجمہ ہوئی تھی۔

امام صاحب کی درسی تصنیف ''المنقذ من الضلال'' کا لاطینی ترجمہ بارہویں صدی کے نصف اول کے دوران ڈومنیک گندی سالیو(D ominic gundisalvaus: 1130=1150) نے کیا تھا، اس کتاب کا موازہ مشہور عیسائی منصف سینٹ آگسٹائن(St . Augustine) کی شہرہ آفاق کتاب اعترافات (Confessions) سے کیا گیا۔

اہل مغرب نے امام غزالی کی کتابوں سے بڑی دلچسپی لی، ان کی کتاب ''مقاصد الفلاسفہ'' کے عبرانی اور لاطینی ترجمے ہوئے، لاطینی ترجمہ ۱۵۰۶ء میں ویٹس میں چھاپا گیا، ''تہافۃ الفلاسفہ'' کا ترجمہ عبرانی میں کیا گیا، ''المنقذ من الضلال'' کا ترجمہ بارہویں صدی میں چھاپا گیا، اس کا فرانسیسی ترجمہ ۱۸۴۲ میں پیرس سے اور انگریزی ترجمہ ۱۹۰۹ میں لندن سے شائع ہوا، امام غزالی کی ایک اور تصنیف ''مشکاۃ الانوار'' انگریزی ترجمے میولندن سے ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی

(۵) ابن باجہ (۵۳۳ھ)

ابن باجہ کا نام ابوبکر محمد بن یحیی اور لقب ابن صائغ یا ابن باجہ ہے، قرونِ وسطی کے مغربی علماء اسلام اس کو (ayempace) اذمپاس کے نام سے جانتے ہیں، یہ اندلس کے مشہور علماء میں سے ہے، اس نے طب، ریاضیات اور فلکیات میں ناموری

حاصل کی، موسیقی اور خاص کر عود کے بجانے میں کمال رکھنے کی وجہ سے وہ فارابی کے مشابہ ہے، اس کی وفات سرقصہ میں گیارہویں صدی عیسوی کے آخر میں ہوئی، جب سن بلوغ کو پہنچ گیا تو ۱۱۱۸ء میں اس نے اشبیلہ کا رخ کیا اور یہاں سکونت اختیار کر لی اور منطق کی کتابوں کی تالیف کے لئے خود کو وقف کر دیا، ان میں سے ایک کتاب اسکوریال کے کتب خانے (۶۰۹ عدد کے تحت) موجود ہے اور اس نے اس کی تدوین سے چوتھی شوال ۵۱۲ھ میں فراغت حاصل کی۔

ابن باجہ کے اشبیلہ منتقل ہونے کا سبب تحقیق کے ساتھ معلوم نہیں، ممکن ہے کہ وہ فونس اول کے مدینہ سرقصہ کو (۲۱۵ ئ) میں فتح کرنے کے بعد اشبیلہ کی جانب ہجرت کر نے پر مجبور ہوا، بہرحال دوسرے عرب مہاجرین کی طرح ابن باجہ نے بھی ہجرت کی اور ایک عرصے تک یہاں مصروف رہا، اس کے بعد اس نے غرناطہ کا رخ کیا اور وہاں کچھ زمانے تک مقیم رہا، اسکے بعد مغرب کی طرف کوچ کیا اور امرائے مرابطین کے ہاں ایک خاص رسوخ اور عزت حاصل کر لی۔

ابن باجہ نے ۵۳۳ھ بمطابق ۱۱۳۸ء میں وفات پائی، اس وقت بالکل نوجوان تھا۔

ابن باجہ کی تالیفات کا ابن ابی صبیعہ نے ذکر کیا ہے، ان میں سے بعض طب، ریاضیات اور حکمت پر ہیں اور بعض طبعیات، حوادث پر جو ارسطو کی بعض کتابوں کی شروحات ہیں، چند کتابیں بدایہ اور نہایہ ہیں، ایک کتاب حیوانیات پر ہے، البتہ ایسی کتابیں جن کی تکمیل نہیں ہوئی اور جن کا ابن طفیل نے ذکر کیا ہے، اکثر منطق پر ہیں، اس کو ریال کے کتب خانہ میں محفوظ ہیں، اس طرح اس کا ایک رسالہ نفس ہے اور ایک ''تدبیر موحد'' ہے۔

ایک رسالہ اتصال پر ہے اور ایک رسالہ وداع ہے، جن میں ان عوامل سے بحث کی گئی ہے، جو انسان پر اثر انداز ہوتے ہیں، اور عقل کو فکر کی جانب متوجہ کرتے ہیں، اس کے ساتھ وجود اور علم کی غرض وغایت کی بھی تشریح ہے اور ان دونوں مقاصد تقریب فی اللہ

اور عقل فعال سے اتصال حاصل کرنا (جو خدائے تعالیٰ کی ذات ہی سے صادر ہوتی ہے) قرار دیا ہے، اس کے بعد مؤلف نے چند مبہم کلمات خلود نفس کے متعلق لکھے ہیں اور اس مذہب کی تخم ریزی کی ہے جس کی آب یاری بعد میں چل کر ابن رشد نے کیا ہے، یہ عقیدہ "**وحدة النفوس**" کا ہے۔

ابن باجہ نے رسالہ وداع ایک طویل سفر سے قبل لکھا تھا اور اس کو اپنے ایک شاگرد اور دوست کے ہاں بھیجا تھا کہ اہم مسائل کے متعلق جو کچھ بھی اس کے خیالات تھے وہ اس کے نزدیک واضح دلیل بن جائیں۔

رسالہ وداع کے مطالعہ کرنے والے پر ظاہر ہوگا کہ مؤلف کا علم اور فلسفے کے اصول کے احیاء کی جانب ایک خاص میلان ہے، کیوں کہ اس کے خیال کی رو سے یہ دونوں انسانوں کو اس کے طبعی امور کے احاطہ کرنے میں رہنمائی کر سکتے ہیں اور اس میں عقل فعال سے جو اتصال ہے اس کے علم کی طرف ہدایت کرتے ہیں۔

(۶) ابن رشد

ابن رشد بمقام قرطبہ ۵۲۰ھ بمطابق ۱۱۰۶ء پیدا ہوا، ابو الولید کنیت، محمد نام اور احمد بن رشد کا فرزند تھا، باپ اور دادا دونوں اندلس میں عہدۂ قضاء پر مامور تھے، یہ خاندان علمی اور دنیاوی حیثیت سے ممتاز تھا، اسی ذی علم وکمال خاندان میں ذہین وہونہار ابن رشد کی تعلیم وتربیت پر خاص توجہ نے اس کی خداداد صلاحیتوں اور خوبیوں کو نکھار دیا، فاضل استاذ ابی محمد بن رزق سے قرآن پاک کی تعلیم اور علم فقہ وحدیث میں کمال حاصل کیا، عقلی علوم میں استاذ ابن طفیل کے روبرو زانوئے ادب تہہ کیا، کم عرصہ میں ہی نوعمر ابن رشد کے علم وفلسفہ کا شہرہ اندلس میں پھیل گیا اور علم توحید، فلسفہ طب اور ریاضیات میں وہ اپنے وقت کا بے مثل عالم تسلیم کیا گیا، نو جوانی میں مراقش اور اسپین کے درباروں میں غیر معمولی رسوخ حاصل کیا تھا۔

امام غزالی کے شاگرد محمد بن تومرت نے اندلس کی سلطنت وحشمت اپنی صلاحیتوں او رمحنت سے حاصل کی تھی، اسی خاندان کے دونہایت طاقتور فرماں رواں ابو یعقوب یوسف اور

اس کا بیٹا یعقوب المنصور کے درباروں میں ابن رشد کا آفتاب علم وحکمت چمکا اور کئی اہم عہدوں پر مامور ہوا، اپنی اعلیٰ علمی صلاحیتوں کی بناء پر ۵۶۵ء میں شہر اشبیلیہ کا قاضی مقرر ہوا، اس جلیل القدر عہدے پر رہتے ہوئے اور مقدمات قضاۃ کی کثرت اور دور دراز علاقوں کی دوروں کی مصروفیت کے باوجود تصنیف وتالیف کا کام جاری رہا، ارسطو کی مشہور کتاب "**الحیوان**" کی شرح لکھی اور حکیم بطلیموس کی مشہور کتاب "مجسطی" کا بھی خلاصہ لکھا، دنیائے اسلام کے مشہور عالم دین امام غزالی کی ڈیڑھ سو سال قبل لکھی ہوئی "**تہافۃ الفلاسفہ**" کے جواب میں ابن رشد نے کتاب "**تہافۃ الفلاسفہ**" لکھی۔

ابن رشد کے علم وکمال کا شہرہ اس کے عہد میں ہی اندلس کی سرزمین اور افریقہ کے ریگستانوں سے ہوتا ہوا ممالک شرقیہ تک جا پہنچا، عوام میں اس کی مقبولیت اور خواص میں اس کی قدر ومنزلت عروج پر تھی، اس کے عظیم کارناموں کا علمی چرچا زبان زدِ عام وخواص تھا، ایسے میں کچھ درباری علماء اور امراء میں حسد وعناد پیدا ہوا اور ابن رشد کی غیر معمولی شہرت وعزت سے اس کے دشمن ہوئے، ابن رشد کے فلسفیانہ خیالات اور عقلی دلائل ان معاصر علماء کی سمجھ میں نہ آنے پر انہوں نے کفر والحاد کا فتویٰ دیا اور سلطان المنصور کو ابن رشد کی جانب سے بدظن کیا، چنانچہ اس عظیم مفکر اور عالم کو شہر بدر کر کے ایک گاؤں بوسنیا میں قید کردیا۔

نظر بندی کے دوران وہ درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں مصروف رہے، مسلمانوں کے ساتھ یہودی طلباء بھی تھے، ابن رشد کی محبت علمی سے فیضیاب ہوئے، جن کے ذریعہ یورپ کے گوشوں میں ابن رشد کے علم وفن کا نور پھیلا، یہودی دانشوروں نے ابن الرشد کی کتابوں کا عبرانی اور مغربی زبان میں ترجمہ کیا، اس کی گراں قدر علمی تفصیل وتشریح سے ارسطو کے مشکل فلسفے علمائے یورپ میں معروف ہوئے، علم طب وریاضی میں اس کے معرکۃ الآراء کارنامے علم وحکمت کی دنیا میں نئے نئے انکشافات لائے، اس کی مشہور کتاب "الکلیات" کا عبرانی ترجمہ آج بھی یورپ میں موجود ہے۔

ابن رشد کی بے مثال اور اعلیٰ قدر علمی کاوشوں اور فلسفوں سے عہد کے چند

حکمرانوں کی بدظنی اور بیزاری کے باعث علمائے مشرق اس سے فیضیاب نہ ہوسکے، جب کہ مغربی ممالک میں اس کی کتابیں مقبول ہوئیں اور اہل یورپ ابن رشد کے فلسفوں اور علمی کارناموں سے فائدہ اٹھاتے رہے۔

تقریباً سات سال قید وبند میں رہنے کے بعد ۱۱۹۸ء میں باعزت رہا ہو کہ سلطان المنصور کے دربار کی زینت بنا اور عزت وحرمت کے ساتھ مراقش میں رہنے کے بعد ۱۱۹۸ء میں باعزت رہا ہو کر سلطان المنصور کے دربار کی زینت بنا اور عزت وحرمت کے ساتھ مراقش میں اسے سابقہ رتبہ حاصل ہوا؛ لیکن زندگی کا سفر ختم ہوچلا تھا، ۱۱ر ستمبر ۱۱۹۸ء کو یہ عظیم مفکر، طبیب، علم ریاضی اور فلسفہ کا ماہر اس جہان فانی سے کوچ کرگیا۔

کہتے ہیں کہ: ابن رشد کی تصانیف بکثرت تھیں؛ لیکن زمانے کے نازیبا سلوک سے بیشتر قیمتی سرمایہ علمی ضائع ہوگیا، چند کتابوں کے عبرانی ولاطینی ترجمے باقی رہے، دانش وران یورپ کو ارسطو کا ترجمان مانتے تھے، یکے بعد دیگرے اس کو یورپی شاگردوں نے اول شہر طلیطلہ آکر ابن رشد کی تصانیف کو جمع کیا، شاہ جرس نے بھی ان علمی کاوشوں کی قدردانی کی، بعد کے ادوار میں بہت سے فلسفیان یورپ ابن رشد کے پیرو ہوئے، حتی کہ اس کی غیر معمولی شہرت سے حسد کرنے والے عیسائی علماء بھی اس کی علمی قابلیت وذہانت کے معترف تھے۔

چرچ کے اراکین نے جیسا کہ مؤرخین نے لکھا ہے کہ: کلیسا کے مروجہ طریق کی عوامی مخالفت کے پیش نظر علم وحکمت کی تعلیم کو ممنوع قرار دیا، اور ان عیسائی علماء کو جنہوں نے ابن رشد کے علوم سے استفادہ کیا واجب سزا قرار پائے، ان سیاہ ایام میں بھی چند عیسائی دانش وروں نے چرچ کی ان سخت گیر نظریئے کے خلاف پروٹسٹنٹ فرقہ کی بنیاد ڈالی، اس طرح یورپ میں ابن رشد کے فلسفوں کو دین عیسوی کے مروجہ فکر ونظر کے برخلاف حاصل کیا، اس طرح یورپ کے ایک طبقہ میں علمی بیداری پیدا ہوئی اور وہ علوم وفنون کی جانب راغب ہوئے۔

یورپ کے اکثر شعراء نے ابن رشد کو اقلیدس، بطلیموس اور جالینوس کی طرح

میدان علم وحکمت کا قابل تعظیم قرار دیا، عیسائیوں کا ایک فرقہ جس کا نام فرانسسکن تھا، ابن رشد کے خیال ونظریات علمی کا قائل اور معتقد تھا، سترہویں صدی تک کہتے ہیں کہ ابن رشد کو ارسطو سے زیادہ قدرو منزلت حاصل تھی، بلاد یورپ کے اکثر قدیم طلباء اس کے تلمذ پر فخر کرتے تھے۔(۱)

(۲) ابن خلدون (۷۳۲ءتا۸۰۸ء)

ابن خلدون جو مشرق ومغرب کے فلاسفۂ تاریخ کا سرتاج ہے، بمقام تونس ۷۳۲ء پیدا ہوا اور ۸۰۸ء میں بمقام مصر وفات پائی، وہ آٹھویں صدی ہجری کے مشاہیر میں سے ہے، اس کا نام ابوزید عبدالرحمن بن محمد بن محمد خلدون ولی الدین التونسی الحضرمی الاشبیلی المالکی ہے۔

اس کا سلسلہ اندلسی خاندان سے ہے جو اشبیلیہ سے تونس کی طرف ہجرت کی، ابن خلدون کے اجداد نے ساتویں صدی ہجری کے وسط میں اشبیلیہ سے تونس کی طرف ہجرت کی، ابن خلدون کے اجداد کا نسب قبائل یمن سے بنی وائل تک پہنچتا ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ اس کے جد اعلی نے یمن سے اندلس کی جانب تیسری صدی ہجری میں ہجرت کی۔

ابن خلدون نے تونس میں نشوونما پائی اور وہیں علوم مروجہ کی تحصیل کی، کچھ عرصے بعد ابن خلدون کو وباء کے خوف سے تونس چھوڑنا پڑا، اس نے ہوارہ کی طرف رخ کیا اور وہاں پہنچ کر اس شہر کے حاکم ابن عبدون کے ہاں اقامت اختیار کی جس نے اس کا پرجوش استقبال کیا اور بلادِ مغرب کے سفر کے لئے اس کی امداد کی، ابن خلدون نے ابن بطوطہ کی طرح اوائل عمر ہی میں اکثر ممالک کی سیاحت کی ہے، ۷۵۵ء میں سلطان ابوعنان المرینی والی تلمسان نے اس کو اپنے یہاں فارس میں طلب کیا، اس وقت اس کی عمر تقریباً تیس سال تھی، بادشاہ نے اس کی بہت کچھ قدرومنزلت کی اور عہدۂ کتابت اس کے لئے تفویض کیا، لیکن سلطان کے اس حسن سلوک سے اس کے ہم عصروں کے دل میں جو اس سے کم درجے پر تھے آتشِ حسد بھڑک اٹھی، انہوں نے سلطان کے ہاں اس کی

(۱) موسوعة علماء العرب والمسلمين: الموسسة العربية، بيروت

شکایت کی اور یہ الزام لگایا کہ وہ محض اپنے مکروفریب کے ذریعے سلطان پر حاوی ہوگیا ہے، پس سلطان نے اس کو قید کردیا، لیکن اس طرح جیسے کہ مستعمرات میں جیسے خلفاء قید کردیئے جاتے ہیں، بالآخر ابوعنان المرینی والی تلمسان ۷۵۹ء میں وفات پائی، اس کے بعد وزیر ابن عمر نے ابن خلدون کو نہ صرف آزاد کردیا؛ بلکہ اس کو خلعتوں سے سرفراز کیا اور اس کے ساتھ ہمیشہ حسنِ سلوک سے پیش آتا رہا۔

۷۶۰ء میں سلطان ابوسالم المرینی نے ابن خلدون کو اپنے ہمراہ لئے ہوئے سرزمین فارس داخل ہوا اور اس کو اپنا پرائیویٹ سکریٹری بنالیا، ابن خلدون نے اس فریضے کو جو اس کے ذمے کیا گیا تھا بحسن وخوبی انجام دیا۔

۷۶۴ء میں اس نے اندلس کا رخ کیا، غرناطہ پہنچا، وہاں ابوعبداللہ حکمراں تھا، اس نے اس کا شاندار استقبال کیا اور اسے اپنے اعلی محلوں میں سے ایک مکان میں رہنے دیا۔

اسی طرح مختلف بادشاہوں کے اہم مناصب پر فائز رہتے ہوئے آخر میں پھر اپنے اہل وعیال کے ساتھ تلمسان میں اقامت گزیں ہوگیا اور ان کے ساتھ بنی سلامہ کے قلعہ میں جو بنی توجین کے شہروں میں سے ہے، بودوباش اختیار کی اور وہاں چار سال تک رہا۔

اسی اثناء میں ابن خلدون نے اپنی تاریخ لکھنی شروع کی، اس نے پہلے مقدمے کی تکمیل کرلی، اس کے بعد بعض تاریخ کی فصولیں بھی لکھیں، یہ زمانہ تقریباً ۷۸۰ء اور اس کی وفات سے بیس برس قبل کا ہے، اس وقت اس کا سن پچاس برس کا تھا، اب اس کو اپنے وطن تونس جانے کا ارادہ ہوا، اس نے حاکمِ تلمسان سے اجازت چاہی اور ۷۸۰ء میں وطن پہنچا، وہاں کے بادشاہ نے اس کا خاص طور پر احترام کیا اور اس کو اپنا پرائیویٹ سیکریٹری بنالیا، اور اپنی تالیف کی تکمیل پر آمادہ کیا، پھر اس نے مصر کا قصد کیا، قاہرہ میں جامع ازہر میں مالکی فقہ کی تعلیم دینی شروع کی، جب یہ خبر سلطان مصر برقوق عظیم کو پہنچی تو اس کو اپنے ہاں بلایا اور بہت آؤ بھگت کی اور اسے ۷۸۶ء میں مالکی مذہب کا قاضی مقرر کیا، اس نے منصبِ قضاء کو باحسن وجوہ انجام دیا۔

ابن خلدون نے اپنے اہل وعیال کوتونس بلوایا بھیجا کہ ان کے ساتھ قاہرہ میں گذارے، لیکن اثنائے راہ میں یہ تمام غرق ہوگئے، اس صدمہ جانکاہ نے اس کی کمر توڑ دی، چنانچہ اس نے منصبِ قضاء سے علاحدگی اختیار کرلی اور تدریس وتالیف کے لئے خود کو وقف کردیا، اس حالت میں تیس برس گذارے، اس نے ۷۸۹ء میں قاہرہ سے فریضہ حج کی ادائیگی کے لئے حجاز کا رخ کیا، پھر دوسرے سال مصر لوٹا اور اپنی کتاب کی تصنیف میں مشغول ہوگیا اور ۷۹۷ء میں اس کی تکمیل کردی، اس وقت اس کی عمر ۶۵ سال تھی اور وہ پندرہ برس تک اس کام میں مشغول رہا۔

اس طرح ایک عرصہ تک مصر میں مقیم رہا، پھر بالآخر ۸۰۸ء میں اس نے وفات پائی اور وہیں کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔

ابن خلدون کی تالیفات

ابن خلدون نے علماء اور مفکرین میں نہ صرف ایک کتاب کی وجہ سے شہرت حاصل کی؛ بلکہ اس کتاب کے ایک ہی جز کی وجہ سے اور وہ اس کا مقدمہ ہے، اس کی تاریخ کا پورا نام یہ ہے، "**والعبر وديوان المبتدأ والخبر فی أيام العرب والعجم والبربر ومن عاشرهم من ذوی السلطان الأكبر**" یہ تین کتب اور رسائل ومجلدات پر منقسم ہے۔

کتاب اول: اس میں عمرانیات اور عوارض ذاتیہ سے بحث کی گئی ہے، جو اس میں عارضی ہوتے ہیں، جیسے ملک، سلطنت، کسب معاش، صنائع، علوم اور ان کے علل واسباب، یہی کتاب اور اس کا وہ مقدمہ ہے جو مشہور عام ہے، یہ تقریبا (۴۰۰) صفحات پر مشتمل ہے، اسی نے ابن خلدون کو ایک نہایت اعلی مرتبہ پر فائز کردیا؛ کیوں کہ اس نے اس میں جدید مباحث پر روشنی ڈالی ہے جس کو اس زمانہ میں علومِ اجتماعی، سیاسیات، اقتصاد سیاسی، اقتصاد اجتماعی، فلسفہ تاریخ، قانونِ عام وغیرہ سے تعبیر کیا ہے، ہمارے خیال میں ہیگل، جرمن فلسفی میکاوی، اطالوی عالم سیاسیات گبن، انگلستانی مؤرخ بلاش ہب ابن خلدون کے تلامذہ میں شمار کئے جاسکتے ہیں۔

ابن خلدون آٹھویں صدی ہجری (چودھویں صدی عیسوی) میں گذرا ہے، ان مباحث پر اس نے اس وقت اپنے زرّیں خیالات کا اظہار کیا جب کہ اہل یورپ پردۂ غفلت میں پڑے ہوئے تھے، عربوں میں سے ان مسائل پر کسی نے کچھ نہ لکھا تھا، قطع نظر ان چند منتشر خیالات کے جن کو کوئی اہمیت نہیں، برخلاف اس کے ابن خلدون نے ان مباحث پر کافی شرح وبسط کے ساتھ روشنی ڈالی ہے، واقعات کا باہمی موازنہ ومقابلہ کرکے ان سے نتائج اخذ کئے اور ان علل سے بحث کی جن سے اس نے ذاتی مطالعہ یا شخصی تجربے کی بناء پر واقفیت حاصل کی تھی۔

مقدمہ ابن خلدون پر ایک نظر

مقدمے کی پہلی فصل میں زمین اور اس کے شہروں کی آبادی، انسان کے رنگ واخلاق میں آب وہوا کی تاثیر، تمول وافلاس کی وجہ سے آبادی کے حالات میں اختلاف اور ان آثار سے بحث کی گئی ہم جو انسان کے بدن اور اخلاق پر مرتب ہوتے ہیں۔

یہ بحث اس مسئلے سے بہت کچھ مشابہ ہے جس کو آج علمائے یورپ نے ابن خلدون کے پانچ سو برس بعد نشوو ارتقاء کے نظریئے کی صورت میں پیش کیا ہے۔

دوسری فصل میں بدوی آبادی اور وحشی قبائل واقوام پر روشنی ڈالی گئی ہے، نیز ان مباحث کو بھی پیش کیا ہے جو بداوۃ وحضارۃ (دیہاتی وشہری) کی طبیعتوں کے متعلق پیدا ہوتے ہیں اور ان دونوں کے درمیان نسب، عصبیت، ریاست، حسب، ملک اور سیاست کے اعتبار سے امتیاز کیا ہے۔

یہ بحث نظام اجتماعی کے ان قواعد کی جنس سے ہے جس کا ظہور یورپ میں انیسویں صدی میں ہوا، جس کو ہمارے معاصرین نے سوشیالوجی (عمرانیات) سے تعبیر کیا ہے۔

تیسری فصل میں دول عامہ، ملک، خلافت، سلطانی مراتب سے بحث کی ہے اور سیادت کے اسباب کے استحکام کی توجیہ کی ہے، نیز امارت کے تحفظ کے طریقے، حکومت وخلافت کے شرائط، بادشاہوں کے خصائل، بیعت کا مفہوم، ولایت عہد، سلطان کے مراتب، سلطنت کے دواوین، فوج اور اس کے اصول، جنگ کے قواعد اور سلطنت

کے عروج وزوال کے اسباب کو واضح کیا ہے۔

یہ بحث علمی اور عملی سیاسیات سے ہے، انگلستانی مؤرخ گیلن نے ایک کتاب "دول سلطنة انحلال وسقوط" (the decline and fall of koman mempire) کے اسباب پر لکھی ہے، اس میں اس نے اسی ملک کو اختیار کیا ہے جس کو ابن خلدون نے اپنے مقدمے میں پیش کیا تھا۔

چوتھی فصل میں شہروں، مختلف آبادیوں، ان کے تمدن اور عمارتوں اور مملکتوں سے ان کے تعلق کو واضح کیا گیا ہے، اور ان امور پر روشنی ڈالی گئی ہے جن کو بری و بحری حیثیت سے تکوین و تشکیل میں پیش نظر رکھنا ضروری ہے، نیز مساجد اور مکانوں کی تعمیر سے بھی بحث کی گئی ہے، اس بحث کا تعلق ہندسہ حربیہ سے ہے۔

پانچویں فصل میں معاش اور کسب وصنائع کے اعتبار سے اس کی مختلف صورتوں سے بحث کی گئی ہے، اس میں رزق اور کسب کے مسائل ہیں اور بتلایا گیا ہے کہ یہ اعمال بشری کا ماحصل ہیں، اسکے بعد معاش اور اس کے اقسام وطرق اور طبیعت عمران سے اس کے تعلق کو واضح کیا گیا ہے، اس میں رزق کے مختلف طریقوں مثلاً تجارت، صنعت اور ان کے مختلف اقسام کی بھی تفصیلی بحث ہے، نیز اس زمانے کے اصول صنعتوں جیسے زراعت، تعمیرات، پارچہ بافی وخیاطی اور توالد وتناسل، طب، باغبانی، موسیقی وغیرہ پر روشنی ڈالی ہے۔

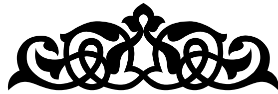
یہ وہ مباحث ہیں جن کو اس دور کے لوگ اقتصادی سیاسی اور اقتصادی اجتماعی سے تعبیر کرتے ہیں، اس فصل کے اکثر مبادیات وہ بنیادی اصول ہیں جن پر کارل مارکس کی کتاب "رأس المال" (das capital) پر مشتمل ہے۔

چھٹی فصل علوم اور ان کے اقسام، تعلیم اور اس کے طریقوں اور مختلف صورتوں پر مشتمل ہے، اس میں تعلیم کے مباحث اور حضارة سے اس کا تعلق بتایا گیا ہے، ہر علم سے انفرادی طور پر بحث کی گئی ہے، ہر ایک کی تاریخ اور اس کے شروط بتلائے گئے ہیں، جیسے علوم قرآن وحدیث، فقہ، علوم لسانیہ، طبعیات، ریاضی، طب، ادب، تاریخ الٰہیات، علم

النفس، علوم نجوم، علوم سحر۔

یہ مباحث علم تربیت کے قبیل سے ہیں، جن کے ماہرین امریکہ میں ولیم جیمس اور یورپ میں اسپنسر اور ڈنیل وغیرہ ہیں، ابن خلدون کے اسلوب کے متعلق اس کتاب میں موقع کے لحاظ سے بحث کی جائے گی۔

اس مقدمے نے مفکرین یورپ کو یہاں ایک خاص اہمیت حاصل کر لی ہے، علامہ کاترمیہ نے اس کا پیرس کے قومی کتب کے نسخے سے فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا ہے، یہ فرانسیسی ترجمہ انیسویں صدی کے نصف ثانی کے اوائل میں طبع ہوا، اس کی بعض فصول کا ترجمہ انگریزی، جرمنی، اطالوی اور ترکی زبانوں میں بھی کیا گیا، یورپ کے تمام بڑے کتب خانوں میں اس کے مطبوعہ قلمی نسخے پائے جاتے ہیں۔



علمِ جغرافیہ (geography) میں مسلمانوں کے کارنامے

اسلام میں علمِ جغرافیہ کے فروغ میں عبادات اور معاملات دونوں نے اہم کردار ادا کیا ہے، فریضۂ حج کی ادائیگی کے لئے راستوں کی واقفیت، نماز کے قیام اور مسجد کی تعمیر کے وقت قبلے کا تعین، امور سلطنت کی انجام دہی اور تجارتی مقاصد کے لئے مختلف بلاد وامصار کے جغرافیائی محل وقوع سے آگاہی یہ وہ اسباب وعوامل تھے جنہوں نے مسلمانوں کو علم جغرافیہ حاصل کرنے پر آمادہ کیا۔

چنانچہ جب عبّاسی دور میں ایرانی، ہندی اور یونانی کتابوں کے ترجمے ہونے لگے تو ''ثابت بن قرۃ'' (۲۲۱۔۲۸۸ھ/ ۸۳۶۔۹۰۱ء) نے یونانی جغرافیہ داں ''بطلیموس'' (۹۰۔۱۶۸ء) کی کتاب (Geographical. treatise) کو عربی جامہ پہنایا، اس کے علاوہ بطلیموس کی دوسری کتابوں، ''مارنیوس الصوری'' (حدود ۷۰۔۱۳۰ء) کے جغرافیہ، افلاطون (۴۲۷۔۳۴۷ق۔م) کی تصنیفات طیماؤس، الآثار العلوية، السماء والعالم اور ''ارسطو'' (۳۸۴۔۳۲۲ق۔م) کی ''ما بعد الطبعيات'' کے بھی عربی ترجمے کئے گئے، یونانیوں کے علاوہ مسلمانوں نے ہندی اور ایرانی جغرافیائی تصورات کا علم بھی حاصل کرلیا، جس سے وہ اس قابل ہوگئے کہ اس موضوع پر تحقیق وتصنیف کا آغاز کرسکیں۔

خلیفہ مامون الرشید (۱۹۷۔۲۱۸ھ/ ۸۱۳۔۸۴۶ء) نے جغرافیہ کے موضوع پر ''صورة الأرض'' کے نام سے ایک کتاب لکھی، جس کے ساتھ ایک نقشہ بھی تھا، یہ

نقشہ خوارزمی سمیت ستر ماہرین نے تیار کیا تھا، ان کے بعد عہد مامونی میں ڈاک اور پرچہ نویسی نے تیسری صدی ہجری رنویں صدی عیسوی میں جغرافیہ کے موضوع پر ''المسالك والممالك'' کے عنوان سے ایک کتاب لکھی، ڈاک کا یہ ناظم مشہور جغرافیہ داں ''ابن خرداذبہ'' (المتوفی ۳۰۰ھ/ ۹۱۲۔۹۱۳ء) تھا جسے مسلم جغرافیہ کا باوا آدم مانا جاتا ہے، ابن خرداذبہ نے یہ کتاب خلیفہ مامون الرشید کے حکم پر لکھی، تیسری صدی ہجری کے نصف آخر میں ''احمد بن اسحاق ابی یعقوب بن واضح الکاتب الیعقوبی'' (المتوفی: ۲۸۴ھ/ ۸۹۷ء) نے ''كتاب البلدان'' تصنیف کی، ''یعقوبی'' کے بعد ''ابن رستہ'' (المتوفی حدود ۳۱۰ھ/ ۹۲۲ء) نے ''الاعلاق النفسية'' اور ''ابن الفقيه الحمدانی'' تیسری صدی ہجری رنویں صدی عیسوی نے ''کتاب البلدان'' ہی کے عنوان سے ایک کتاب لکھی، چوتھی صدی ہجری کے ربع اول میں ''قدامۃ بن جعفر الکاتب'' (المتوفی: ۳۱۰ھ۔۹۲۲ء) ''كتاب الخراج وصنعة الكتاب'' تحریر کی، جس میں انہوں نے گیارہویں باب کے ذیل میں راستوں، ڈاک کی منزلوں اور سرحدوں کی تفصیل دی ہے، تقریباً اسی زمانے میں مشہور مورخ ''ابوالحسن علی بن حسین المسعودی'' نے اپنا سفرنامہ ''كتاب القضايا والتجارب'' کے نام سے تیار کیا، جس میں مصنف نے چشم دید واقعات ومشاہدات اور تجربات کی بنیاد پر وسیع اور اہم جغرافیائی مواد پیش کیا، ان کی دوسری کتابوں ''مروج الذهب ومعادن الجواهر'' اور ''التنبيه والأشراف'' میں بھی ان کے سیاحت کے حالات ملتے ہیں۔

مسلم جغرافیہ نگاری میں بلخ کے مکتب فکر کو اس لحاظ سے بڑی اہمیت حاصل ہے کہ اس میں اسلامی رنگ نمایاں ہوکر سامنے آیا ہے، یہ مکتب فکر ''ابوزید احمد بن سھل بلخی'' (المتوفی: ۳۲۲ھ/ ۹۳۴ء) کے نام پر ''دبستان بلخ'' کہلاتا ہے، ''ابوزید بلخی'' مشہور فلسفی ''ابویوسف یعقوب الکندی'' (المتوفی: ۲۵۴ھ/ ۸۷۳ء) کے شاگرد تھے، عراق میں آٹھ سال گزارنے کے علاوہ بلخی نے دور دراز سفر کرنے کے بعد واپس آکر اپنے وطن میں ''صور الأقاليم'' کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی، اسے بنیاد بنا کر

نامور جغرافیہ داں ''ابو اسحاق ابراہیم بن محمد الفارسی الاصطخری'' نے ''المسالك والممالك'' کے عنوان سے ایک کتاب لکھی، جس میں ہر ملک کو رنگین نقشے میں دکھایا گیا تھا، اصطخری کی درخواست ''ابو القاسم محمد بن حوقل البغدادی'' (المتوفی: ۳۶۷ھ/ ۹۷۷ء) نے ان نقشوں پر نظر ثانی کی اور ''صورة الأرض'' کے عنوان سے ایک کتاب ۳۶۶ھ/ ۹۷۷ء میں قلم بندی، ''ابن حوقل'' نے اپنی کتاب میں جغرافیائی معلومات کے علاوہ نقشے بھی دیئے، تقریباً اسی زمانے میں یمنی نژاد عالم ''ابوالحسن ابن احمد الحمدانی'' (المتوفی: ۳۳۴ھ/ ۹۴۵ء) نے جغرافیہ کے موضوع پر ''الإكليل'' اور ''صفة جزیرة العرب'' کے نامو سے دو کتابیں رقم کیں، ان کے بعد مسلم جغرافیہ نگاری میں ''ابوعبد اللہ محمد بن ابی بکر المقدسی'' (المتوفی: ۳۹۰ھ۔۱۰۰۰ء) نے ''احسن التقاسیم فی معرفة الأقالیم'' لکھ کر اہم کارنامہ انجام دیا، انہوں نے اسپین کے سوا دور دراز مسلم ملکوں کا سفر کرنے کے بعد اپنے تیس سالہ تجربات ومشاہدات کو مذکورہ بالا کتاب کی شکل میں پیش کیا ہے۔

ول دوران لکھتے ہیں:

''محمد المقدسی'' نے اسپین کے سوا تمام اسلامی علاقوں کا سفر کیا، بے شمار نشیب وفراز دیکھے اور ۹۸۵ء میں ''أحسن التقاسیم فی صورة الأقالیم'' تصنیف کی جو ''البیرونی'' کی ''تاریخ الہند'' سے پہلے عرب جغرافیہ کی عظیم ترین کتاب رہی ہے''(۱)

مقدسی کی تصنیف کے ۴۵ سال بعد ''ابو ریحان محمد بن احمد البیرونی'' (۳۶۳=۴۴۰ھ/ ۹۷۳۔۱۰۴۸ء) نے ۱۰۳۰ء نے اپنی شاہکار کتاب ''تاریخ الہند'' تصنیف کی، انہوں نے اس کتاب میں وہ اہم جغرافیائی مواد پیش کیا جو اس سے پہلے کسی دوسری کتاب میں نظر نہیں آتا، اس کے ساتھ ہی مسلم جغرافیہ نگاری کم از کم مشرق میں روبہ تنزل ہونے لگی۔

(۱) The age of faith p.242

اسپین میں مشہور لغوی اور جغرافیہ داں ابوعبداللہ بن عبد العزیز البکری (المتوفی ۴۸۷ھ۔۱۰۹۴ء) نے ''معجم ما استعجم من أسماء البلاد والمواضع'' کے نام سے ایک جغرافیائی لغت تیار کی، جس میں مختلف شہروں اور جگہوں کے ناموں کی املا پر روشنی ڈالی گئی ہے، اسپین کے اس عظیم جغرافیہ داں نے ایک اور کتاب بھی جغرافیہ کے موضوع پر تصنیف کی جو ''کتاب المسالک والممالک'' کے نام سے معروف ہے، مسلم جغرافیہ نگاری کے لئے یہ تنزل کا دور تھا؛ مگر اس میں دو چوٹی کے جغرافیہ داں پیدا ہوئے۔

۱۔ ابوعبداللہ محمد بن ادریسی (۴۹۳۔۵۶۰ھ/ ۱۱۰۰۔۱۱۶۵ء)

اسپین کے شہر ''ستیہ'' میں پیدا ہوئے اور قرطبہ میں تعلیم پائی، اس کے بعد وہ صقلیہ چلے گئے، جہاں نارمن عیسائیوں نے مسلمانوں کی ۱۹۸ سالہ حکومت ختم کر کے ۱۰۹۱ میں اپنی بادشاہت قائم کی تھی، ان کا دار السلطنت بلرم تھا، صقلیہ کے نارمن حکمرانوں نے عربی علوم وفنون کی سرپرستی کی، دربار پر عربی رنگ چھایا ہوا تھا، اہم منصبوں پر مسلمان فائز تھے، نارمن بادشاہوں میں (راجر دوم ۱۱۰۱ RogerII=۱۱۵۴ء) بڑے علم دوست تھے، انہوں نے ادریسی کو اپنے دربار میں بلایا اور انہیں جغرافیائی تحقیق کا کام تفویض کیا، ''جے، ایچ کریمس (J.H.LKramers) جنہوں نے اپنی ساری صلاحیت مسلمانوں کے کارناموں کو شرطیہ اور استثنائی جملوں کے انبار کے نیچے دبانے میں صرف کی ہے۔

راجر دوم کا دربار گرچہ علماء وفضلاء کا کہکشاں تھا؛ لیکن مسلم جغرافیہ داں ادریسی اس میں سب سے روشن اور درخشندہ ستارہ تھے، فلپ ہٹی کا کہنا ہے:

''راجر دوم کے دربار کی سب سے بڑ زینت ادریسی تھے جو قرونِ وسطی کے سب سے ممتاز جغرافیہ داں اور نقشہ کش تھے''(۱)

راجر دوم نے جغرافیائی مواد جمع کرنے کے لئے مختلف علاقوں میں اپنے آدمی روانہ کئے، جنہوں نے مختلف ممالک میں گھوم کر مواد جمع کیا، اسی مواد کی بنیاد پر ادریسی نے ۱۱۵۴ء میں ''نزهة المشتاق فی اختراق الآفاق'' تصنیف کی جسے یورپ کے

(۱) History of the Arabs p.609

تعلیمی اداروں میں تین سو سال تک حرف آخر کی حیثیت حاصل رہی، کتاب کے طریق تصنیف کا ذکر کرتے ہوئے فلپ کے ہٹی لکھتے ہیں:

''مواد کے تنقیدی تقابل میں ادریسی نے امتیازی وسیع النظری اور زمین کی گولائی جیسے بنیادی حقائق کی قبولیت کا مظاہرہ کیا ہے''۔(۱)

زمین کی گولائی سے مسلمان آٹھویں صدی عیسوی میں واقف ہوگئے تھے، ادریسی نے اسے مان کر اپنے پیش رو ہم مذہبوں کی تصدیق کی، جغرافیہ کے بارے میں صحیح مواد فراہم کرنے کے علاوہ ادریسی نے نقشہ کشی کے فن کو معراج کمال تک پہنچایا، انہوں نے ۱۱۵۴ء میں پوری دنیا کا ایک نقشہ بنایا جس کی خواہش راجر دوم نے کی تھی، انسائیکلو برنا ٹیکا کے مقالہ نگار لکھتے ہیں:

''ادریسی نے صقلیہ کے عیسائی بادشاہ راجر کے لئے ۱۱۵۴ء میں ایک عالمی نقشہ بنایا، جس میں ایشیائی علاقوں کے بارے میں اس وقت تک کے دستیاب حالات سے زیادہ بہتر معلومات دی گئی تھیں''(۲)

ادریسی نے یہ نقشہ چاندی کا بنایا تھا اور اس میں کمالِ مہارت کے ساتھ دنیا کے ممالک دکھائے گئے تھے، نقشے میں پہاڑ، دریا، جنگلا اور وادیاں بھی دکھائی گئی تھیں، علاوہ ازیں انہوں نے چاندی کا ایک آسمانی کرہ بھی بنایا۔

فلپ کے ہٹی ان کی تصنیف کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''اس یادگاری تصنیف کے علاوہ ادریسی نے اپنے نارمن سر پرست کے لئے ایک آسمانی کرہ اور ڈسک نما عالمی نقشہ بنایا، یہ دونوں چاندی میں بنائے گئے تھے''(۳)

ادریسی کی یہ تصنیف تین سو سال تک یورپ میں داخل نصاب رہی، اس کے متعدد

---

(۱) p.609.History of the Arabs p

(۲) 11p.472.Encyclopaedia birtanica vol

(۳) History of the Arabs p.609

خلاصے تیار کئے گئے، اولین تلخیص کا عنوان ''**نزهة المشتاق فی ذکر الأمصار والبلدان والجزر والمدائن والآفاق**'' ہے، یہ خلاصہ عربی کی ان کتابوں میں شامل تھا جو اپنی اہمیت کی بناء پر سب سے پہلے روم کے مطبع (Medici) سے ۱۵۹۲ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوئیں، اس متن کا ترجمہ ۱۶۰۰ء میں اطالوی زبان میں کیا گیا، جو ماونٹ پلیر کی یونیورسٹی میں موجود ہے، ۱۶۱۹ء میں دو مارونی راہبوں جبرئیل سیو بنٹا اور جونز ہسر وبنٹا نے اسے لاطینی زبان میں منتقل کیا، روم سے شائع ہوئے خلاصے کے علاوہ کتاب کے دو مزید عربی خلاصوں کا پتہ چلتا ہے، جن میں سے ایک ۱۸۹۳ء میں قاہرہ میں اور دوسرا بیسویں صدی کے اوائل میں تیونس میں دریافت ہوا، انیسویں صدی کے نصف اول میں کتاب کا فرانسیسی ترجمہ دو جلدوں میں شائع ہوا۔

حالیہ برسوں کے دوران اس کتاب کا مستند اور معتبر ایڈیشن تیار کرنے کی خاطر روم میں واقع ایک معزز اطالوی ادارے کی سر پرستی میں اور معروف اطالوی ماہرین کی کمیٹی کے زیر ہدایت محققین کی ایک بین الاقوامی جماعت نے کام کا آغاز کیا ہے، ہر محقق کو کتاب کا وہ حصہ دیا گیا جس میں انہیں تخصص حاصل ہے، عملہ ادارات کا صدر مقام نیپلز یونیورسٹی (اٹلی) کا ایک ادارہ ہے، اب تک محققین کی مساعی جمیلہ کے نتیجے میں عربی متن اور ترجمے کے پانچ حصے نیپلز یونیورسٹی سے شائع ہوئے ہیں۔

۲۔ابوعبداللہ یاقوت حموی

ادریسی کے علاوہ اسلام نے اس عہد میں ایک اور عظیم جغرافیہ داں پیدا کیا، جو ابوعبداللہ یاقوت حموی کے نام سے مشہور ہے، ان کا تعلق بغداد سے تھا، یاقوت ایک یونانی غلام تھے، جنگ میں گرفتار ہو کر ایک بغدادی تاجر کے قبضے میں آئے، نیک دل آقا نے زیور تعلیم وتربیت سے آراستہ کر کے آزاد کر دیا، یہی آزاد شدہ غلام اپنے زمانے کا سب سے بڑا جغرافیہ داں بن گیا، یاقوت نے سیاحت کے دوران اپنے مشاہدے اور مطالعے کے ذریعے حاصل کئے گئے جغرافیائی مواد اور دوسری معلومات کو معجم البلدان میں قلم بند کیا جو (Le strage) کے الفاظ ہیں:

''جغرافیائی معلومات کا خزانہ ہے جس کی قدر و قیمت کا جتنا زیادہ انداز لگایا جائے اس میں کسی مبالغے کا امکان نہیں ہوگا''۔(۱)

فلپ کے ہٹی نے یاقوت حموی کو مشرق کا عظیم ترین جغرافیہ داں قرار دے کر ان کی تصنیف کے متعلق لکھا ہے:

''یہ معجم جس میں مقامات کے نام حروف تہجی کے اعتبار سے دیئے گئے ہیں، ایک اسم بامسمی انسائیکلوپیڈیا ہے جو اس عہد کی تمام جغرافیائی معلومات پر مشتمل ہونے کے علاوہ تاریخ، علم الاقوام اور فطری علوم کے متعلق قابل قدر مواد فراہم کرتی ہے''(۲)

عہد وسطی کے اس عظیم جغرافیہ داں کو اپنی عبقریت اور آزادی کی وہ قیمت ادا نی کرنی پڑی جو اہل ہنر کے نام ہمیشہ واجب الاداء ہوتی ہے، انہیں اپنی گزر اوقات کے لئے مسودات کی نقل نویسی اور نقل فروشی کا سہارا لینا پڑا، مسودوں کی نقل اور فروخت کر کے تھوڑی سی آمدنی ہوتی تھی، یہی ذریعہ معاش تھا، انہوں نے جغرافیائی اور دوسری معلومات جمع کرنے کی خاطر دور دراز ملکوں کے سفر کئے، سفر کے دوران ''مرو'' پہنچے تو شہر کی دس لائبریریاں دیکھ کر پھولے نہیں سمائے۔ ۶۱۶ھ/۱۲۱۹=۱۲۲۰ء میں ''خیوا'' پہنچے، وہاں حملہ آور تاتاریوں کے ہاتھوں جان کے لالے پڑ گئے، ''ابن خلکان کے بقول اسی طرح ننگے بھاگ کر جان بچاتی جیسے یوم حشر میں قبر سے اٹھائے جائیں گے، حالت فرار میں مسودات کا پلندہ سینے سے چمٹائے تھے، فارس سے ہوتے ہوئے موصل پہنچے، جہاں اپنی کتاب کا مسودہ تیار کیا، چار سال بعد حلب میں اسے پایہ تکمیل کو پہنچایا، اس کے ایک سال بعد اسی شہر میں وفات پائی، افلاس اور جہاں گردی کے نتیجے میں جو علمی سرمایہ جمع ہوا، اس کا تذکرہ ول دوران نے اسی طرح کیا ہے۔

''نقل نویسی کی حیثیت سے بمشکل گذر اوقات کرنے کے دوران انہوں

(۱) Literary History of the Arabs p.357.A

(۲) History of the arabs p.387

نے (۱۲۲۸ء) میں معجم البلدان کے نام سے ایک ضخیم جغرافیائی معجم مکمل کی جس میں دنیا کا تقریبا سارا عہد وسطی کا علم جمع کیا گیا تھا، یاقوت نے اس میں تقریبا تمام علوم ہیئت، طبیعیات، اثریات، نسلیات، تاریخ، شہروں کے محددات اور ان کے علماء کے حالات اور تصانیف کے بارے میں معلومات درج کیں، شاید ہی زمین سے اتنی محبت کسی نے کی ہے۔(۱)

دیگر جغرافیہ داں اور ان کے تصانیف

ادریسی اور یاقوت حموی کے بعد مشہور مورخ ابو الفداء (المتوفی: ۷۳۱ھ/ ۱۳۳۱ء) نے ''تقویم البلدان'' کے نام سے ایک کتاب جغرافیہ عالم کے موضوع پر لکھی، انہوں نے ساٹھ جغرافیہ دانوں کا ذکر کیا ہے، یہ کتاب انہوں نے ۷۲۱ھ/۱۳۲۱ء میں تحریر کی، ادریسی کی تصنیف کے بعد یہ سب سے اہم تصنیف ہے، ان کے علاوہ نامور جغرافیہ دانوں میں ''زکریا بن محمد القزوینی (۶۰۰-۶۸۲ھ/ ۱۲۰۳-۱۲۸۳ء) ابو عبد اللہ محمد الدمشقی (المتوفی: ۷۲۷ھ/۱۳۲۷ء) اور ''ابن الوردی'' (المتوفی: ۸۶۱ھ/ ۱۴۵۷ء) خاص طور پر مشہور ہیں؛ مگر حقیقت یہ ہے کہ مسلم جغرافیہ نگاری کا دور عروج ادریسی اور یاقوت حموی پر ختم ہوا'' ابو الفدائ'' کی ''تقویم البلدان'' بجھتے چراغ کی آخری بھڑک تھی۔

مسلمانوں کے سفرنامے اور علم جغرافیہ میں ان کا مقام

مسلمانوں کے علم جغرافیہ کے سفرناموں کی بدولت جو قابل قدر اضافہ ہوا ہے اس کا ذکر نہ کرنا بے انصافی ہوگی، مسلم سیاحوں کے تقریبا دس سے زائد سفرناموں کی جغرافیائی لحاظ سے بڑی اہمیت حاصل ہے، ان سفرناموں میں اس زمانے کی معلوم دنیا کے اکثر علاقوں کے متعلق بڑی قیمتی جغرافیائی معلومات موجود ہیں، عربی میں بلنسیہ کے ''ابن جبیر'' (المتوفی: ۶۱۴ھ ۱۲۱۷ء) کے سفرنامے ''الرحلۃ'' اور مراکشی نزاد جہاں گرد ''ابن بطوطۃ'' (المتوفی: ۷۷۹ھ=۱۳۷۷ء کے ''تحفہ النظار فی غرائب

(۱) The age of faith p.329

الأمصار وعجائب الأمصار" کو عالمی شہرت حاصل ہوئی ہے، فارسی زبان میں مشہور اسماعیلی مفکر ''ناصر خسرو'' (المتوفی: ۵۶۵ھ/ ۱۱۶۹ء) ابن مجاور (المتوفی: ۶۲۷ھ/ ۱۲۳۰ء) **النباتی** (المتوفی ۶۳۶ھ/ ۱۲۳۹ء) العبداری (المتوفی: ۶۸۸ھ/ ۱۲۸۹ء) **الطیبی** (المتوفی: ۶۹۸ھ/ ۱۲۹۹ء) اور التیجانی (المتوفی ۷۰۸ھ/ ۱۳۰۸ء) ہیں۔

علم جغرافیہ کی ترقی میں مسلم تاجروں کا رول:

علم جغرافیہ کے فروغ میں مسلم تاجروں کا رول بھی بڑا اہم رہا ہے، ''مارکو پولو'' سے پہلے چین کے بارے میں بارے نام معلومات رکھتے ہیں، تیرہویں صدی میں ''مارکو پولو'' نے چین کی سیاحت کر کے اپنا سفر نامہ لکھا جس سے یورپ والے چین سے آگاہ ہو گئے، جب ول دوران کے بقول مسلمان ۴۲۵ پہلے چین کی سیاحت کر چکے تھے، تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی میں ''سلیمان تاجر'' نامی ایک مسلم سوداگر نے ۸۴۰ء میں مشرق بعید کا سفر کیا تھا۔(۱)

سلیمان کے تأثرات ''**اخبار الصین والهند**" کے عنوان سے ۲۳۵ھ/ ۸۵۰ء میں غالباً کسی دوسرے شخص نے قلم بند کئے، ۳۰۲ھ/ ۹۱۵ء میں ایک آسودہ حال شخص ''ابوزید الحسن السیرافی'' نے سلیمان التاجر کے سفر نامے کو "**سلسلة التواریخ**" کے عنوان کے تحت دوسری کتابوں کے ساتھ مرتب کر کے پیش کیا، سفر نامے میں ہندوستان کے ساحلی علاقوں کے بارے میں تفصیلات ملتی ہیں، یہ دنیا کی قدیم ترین تحریر ہے، جس میں لفظ ''ساخ'' کے تحت چائے کا ذکر ملتا ہے، اس کے بعد البیرونی نے "**نبذ فی أخبار الصین**" میں اس کے لئے ''جا'' کا لفظ استعمال کیا ہے، "**اخبار الصین والهند**" ہی کی بدولت باہر کی دنیا کو پہلی مرتبہ پتہ لگا کہ چین کے لوگ اس زمانے میں بھی دستخط کی جگہ انگوٹھے کا عکس (Finger print) ثبت کرتے تھے، روس کے دور دراز علاقوں کی تفصیلات کا سرچشمہ بھی ایک مسلمان ''احمد بن فضلان بن حماد'' ہیں جنہیں عباسی خلیفہ ''المقتدر باللہ'' نے بلغار کے بادشاہ کے پاس بھیجا تھا، روس کے بارے میں

(۱) The age of faith p.242

معلومات کا ایک اور قدیم ذریعہ مسلم سیاح ''ابوحامد محمد المازنی (۴۷۳-۵۶۵ھ/ ۱۰۸۰-۱۱۶۹ء) ہیں، جن کے دو سفر ناموں "**المعرب عن بعض عجائب المغرب**" اور "**تحفة الألباب والنخبة الإعجاب**" میں دلچسپ اور مستند مواد وافر مقدار میں موجود ہیں۔

جغرافیائی ذخیرہ علم میں جہاز ران مسلمانوں کا حصہ

جغرافیائی ذخیرۂ علم میں جغرافیہ دانوں، تاجروں اور سیاحوں کی طرح مسلم جہاز رانوں نے بھی اپنی گوناگوں معلومات سے قابل ذکر اضافہ کیا ہے، مسعودی اور مقدسی جیسی عظیم جغرافیہ دانوں نے بعض ماہر جہاز رانوں کا تذکرہ اپنی کتابوں میں کیا ہے، موخر الذکر نے ایک ماہر جہاز راں سے بحر الہند کی شکل معلوم کی تھی، اسلام کی پہلی دو صدیوں کی جہاز رانی کے بارے میں بہت کم معلومات دستیاب ہیں، تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں سلیمان التاجر کے سفر نامے اور بزرگ بن شہریار (۲۹۹=۳۹۹/ ۹۱۲/ ۱۰۰۹ء) کی تصنیف ''عجائب الہند'' کا ذکر آتا ہے، بحری کپتان بزرگ بن شہریار کی یہ تصنیف جہاز رانوں کی بحری مہموں کے متعلق دلچسپ کہانیوں پر مشتمل ہے، ساتویں صدی ہجری میں بحر اوقیانوس میں ''ابن فاطمہ'' کی مہم جوئی (۶۴۸ھ/ ۱۲۵۰ء) کے متعلق بھی وہی تفصیلات ملتی ہیں، جو ابن سعید نے قلم بند کی ہیں، ان کے مطابق ابن فاطمہ مغربی افریقہ کے ساحل کے ساتھ ساتھ جبل ابیض تک پہنچ گئے، جہاز رانی کی تاریخ میں سب سے اہم شخصیت نجدی نژاد ''شہاب الدین احمد بن ماجد'' کی ہے، جنہیں "**اسد البحر**" کہا جاتا تھا، ابن ماجد نے نصف صدی سے زائد کا عرصہ سمندروں میں گذارا، چنانچہ بحریات اور ہیئت کے موضوع پر ان کے قلم سے اڑتیس کتابیں نکلی ہیں، جن میں کتاب "**کتاب الفوائد فی أصول البحر والقواعد**" بڑی اہمیت کی حامل ہے، یہ کتاب بحر ہند، خلیج فارس اور بحر الکاہل میں جہاز رانی کرنے والوں کے لئے خضر راہ کی حیثیت رکھتی ہے، بحریات میں مہارت تامہ کی بناء پر ابن ماجد کا شمار عظیم ترین سائنسدانوں میں ہوتا ہے، مسلم جہاز رانی کی تاریخ میں ابن ماجد کے بعد دوسرے اہم جہاز راں ان کے نوجوان ہم عصر "**سلیمان بن**

احمد المھری، ، ہیں، انہوں نے بحریات کے موضوع پر پانچ کتابیں تحریر کی ہیں، ان میں "العمدة المهدية فى ضبط العلوم البحريع" اور" تحفة الفحول فى تمهيد الأصول" اہم کتابیں ہیں۔

مسلم جغرافیہ دانوں سے زمین کی گولائی کا تصور عام، جن میں ابن خرداذبہ، ابو عبیدہ مسلم البلنسی، ابوالقاسم مسلمة المجریطی وغیرہ تھے۔

یہی خیال فلپ کے ہٹی نے بھی ظاہر کیا ہے، گویا جغرافیہ میں مسلمانوں کی اہم خدمت یہ ہے کہ انہوں نے زمین کی گولائی کے تصور کو زندہ رکھا، اسی تصور کو لے کر کولمبس (۱۴۵۱ـ۱۵۰۶ء) نے بحری سفر کیا جس میں امریکہ دریافت ہوا۔

زمین کی گولائی کے تصور نے ملاحوں کے دل میں دنیا کے گرد چکر لگانے کا ولولہ پیدا کیا، خود کولمبس جب کرویت زمین سے واقف ہوا تو کس قدر حیرت کی بات ہے کہ کرسٹو کولمبس کے دل میں یہ خیال پہلے پہل ابن رشد کی کتابوں کے مطالعے سے پیدا ہوا تھا، جینوا کے ملاحوں کے خیالات کا تذکرہ کرتے ہوئے ڈریپر کہتے ہیں:

"جنیوا کے ان جہازرانوں میں جو خیالات سے دلچسپی لے رہے تھے
کرسٹو کولمبس بھی شامل تھا وہ ہمیں بتاتا ہے کہ اس موضوع کی طرف اس
کی توجہ ابن رشد کی کتابوں کے مطالعے سے ہوئی" (۱)

صرف یہی نہیں کہ کرسٹوفر کولمبس مسلمانوں کے نظریہ کرویت زمین سے واقف ہو کر یا ابن رشد کی کتابوں کو پڑھ کر سفر پر روانہ ہوا؛ بلکہ رابرٹ بریفالٹ (Rabert Brifault) (۱۸۷۶ـ۱۹۴۸ء) کے مطابق مشہور مسلم سائنسداں "ابوعبداللہ محمد بن جابر البنانی" کی تخلیق کی بنیاد پر ریجیو مونٹینس (Regin montanus) (۱۴۶۳ـ۱۴۷۶ء) نے وہ نقشے تیار کئے تھے، جن کی مدد سے کولمبس کا بحری سفر ممکن ہوا۔

شامل ہے مرا خون جگر تیری حنا میں

(۱) p.160,History of the cintilxt Between religion and science

معدنیات (Mineralogy) میں مسلمانوں کے کارنامے

زمانہ قدیم اور عہدِ وسطی میں فن معدنیات کوئی منظم علم نہیں تھا، لوگ معدنیات میں اس لئے دلچسپی لیتے تھے کہ ان کے نزدیک پتھروں کے خواص سے انسانی زندگی کے واقعات متاثر ہوتے تھے، یہ تصور دنیا کی آبادی کے ایک بڑے حصہ میں آج بھی موجود ہے اور ستم ظریفی یہ ہے کہ علم کی اشاعت کے بعد بھی معدنیات کے متعلق یہ خیال جوں کا توں قائم ہے، تاریخ میں جواہرات سے بادشاہوں اور امیروں کی دلچسپی کی ایک وجہ یہ بھی تھی معدنیات زمین میں پائی جاتی ہیں؛ اس لئے جغرافیہ سے اس کا خاص تعلق ہے۔

علم معدنیات سے مسلمانوں کی دلچسپی کا آغاز اس وقت ہوا جب ارسطو کی تصنیف ''معدنیات'' کو عربی زبان میں منتقل کیا گیا، آٹھویں صدی عیسوی کے دوران یہ دلچسپی روز بروز بڑھتی گئی، مسلمانوں نے قیمتی جواہرات پر توجہ دے کر کتابیں لکھنے کا آغاز کیا، یہ کتابیں ''حجریات'' کہلاتی تھیں، حجریات یا معدنیات کے موضوع پر مسلمانوں نے پچاس سے زائد کتابیں تصنیف کی ہیں، سب سے پہلے مشہور کیمیا داں ''جابر بن حیان'' (المتوفی: ۱۹۸ھ/ ۸۱۳ء) نے ''کیماء المعادن، کتاب جواہر الکبیر'' اور ''رسائل فی الحجر'' کے ناموں سے معدنیات کے موضوع پر تین کتابیں تصنیف کی، جن میں انہوں نے مختلف دھاتوں اور پتھروں کے متعلق بیش قیمت معلومات فراہم کیں، ان کے بعد ''عطارد بن محمد الکاتب'' (المتوفی: ۲۱۴ھ/ ۸۳۲ء) نے اپنے گھر میں پتھروں کی مختلف اقسام جمع کر کے ان کی ماہیت اور خصوصیات پر تحقیق کی، انہوں نے اپنے تجربات

ایک تصنیف "الجواهر والأحجار" میں قلمبند کئے، عطارد بن محمد معدنیات کے ماہر تھے، مشہور مستشرق اسٹائن شنائڈر (steins chneider) نے ۱۸۷۱ء میں ایک مقالہ تحریر کیا جس میں انہوں نے کتاب کی بے حد تعریف کی (۱) معدنیات کے موضوع پر یہ عربی کی اولین تحریر ہے جو تا حال موجود ہے۔

مامون الرشید کے عہد خلافت میں ''بیت الحکمۃ'' کے ایک رکن ''ابوطیب سند بن علیؒ'' (المتوفی: ۲۲۴ھ/ ۸۶۴ئ) نے اصلی اور نقلی دھاتوں میں تمیز کرنے کے لئے معلوم کرنے کا طریقہ ایجاد کیا، جو مسلم معدنیات میں ایک اہم پیش رفت تھی، اسی زمانے میں مشہور عرب مفکر ''ابو یوسف یعقوب کندی نے معدنیات اور فولاد واسلحہ سازی کے موضوع پر کئی رسالے تصنیف کئے، ان میں دو رسالوں کے نام "رسالہ فی انواع الجواهر الثمينة" اور "رسالة فی أنواع الحجارة والجواهر" ہیں، ان رسالوں میں انہوں نے جواہرات اور پتھروں کے اقسام پر روشنی ڈالی ہے، اسی دور میں عربی زبان کے ادیب ''ابوعثمان عمرو بن بحر الجاحظ بصری (المتوفی: ۱۶۳۔۲۵۵ھ/ ۸۷۰= ۸۶۹ء) نے بھی معدنیات میں اپنی معلومات پر مشتمل ایک کتاب ''کتاب المعادن'' تصنیف کی، ان کے علاوہ بعض ایسی کتابوں کے نام بھی ''ابن الندیم نے دیئے جن کے مصنفین کا حال معلوم نہیں ہے۔

مشہور مصنفین میں ''ابوبکر رازی'' کی تصنیف "کتاب الأسرار" کو خاص اہمیت حاصل ہے، رازی نے معدنیات کی مختلف قسموں پر روشنی ڈالی ہے، "رسائل اخوان الصفا" میں بھی معدنیات کے موضوع کو زیر بحث لایا ہے، ان میں معدنیات کے وجود میں آنے، گرمی اور سردی اور دوسرے جغرافیائی اور ارضیاتی عوامل کے ان پر اثرات اور ان کی اقسام پر سائنسی انداز میں بحث کی گئی ہے، رسائل اخوان الصفا کے مطابق اگرچہ معدنیات کی تعداد معلوم کرنا انسان کے لئے دشوار ہے، مگر ماہرین معدنیات کی نو سو قسمیں مانتے ہیں، جو ماہیت، رنگ و بو اور وزن کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

(۱) اردو دائرۃ المعارف ال اسلامیۃ: ۱۴/۱/۳۴۸،

معدنیات کو شیخ الرئیس بوعلی سینا نے بھی "کتاب الأحجار" میں زیر بحث لایا ہے، انہوں نے معدنیات اور ارضیات کے موضوع پر اس کتاب میں بڑی اہم بحث کی ہے، ول دوران نے اس کتاب کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ تیرہویں صدی تک یورپی ارضیات کا اہم ماخذ تھی۔

علم معدنیات میں سب سے اہم کارنامہ ''البیرونی'' نے انجام دیا ہے، انہوں نے اس موضوع پر ''الجماہیر فی معرفۃ الجواہر'' کے عنوان سے ایک ضخیم کتاب تصنیف کی، جس میں انہوں نے بے شمار پتھروں اور دھاتوں کے طبعی اور تجارتی پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی ہے، ان کے بعد ماہر معدنیات کی حیثیت سے سب سے زیادہ شہرت ''شرف الدین ابو بکر احمد بن یوسف النقاشی (المتوفی: ۶۵۱ھ/ ۱۲۵۳ء) کو ملی، جنہوں نے معدنیات سے متعلق "الأزهأر الأفكار فی جواهر الأحجار"، "خواص الأحجار" اور "الأحجار التی توجد فی خزائين الملوك" کے ناموں سے تین کتابیں تحریر کیں، ان میں اول الذکر "كتاب الأزهار فی جواهر الاحجار" خاص طور پر مشہور ہے، کتاب کے ''۱۲۵ ابواب میں ۲۴ جواہرات کے مآخذ، ان کی آزمائش اور ان کی قیمت وغیرہ کے بارے میں بڑی وسیع معلومات فراہم کی گئی ہیں، کتاب میں ان جواہرات کی طبی افادیت اور سحر وافسوس میں ان کی اہمیت کا ذکر بھی کیا گیا ہے، التیفاشی کی کتاب کے مآخذ زیادہ تر عربی ہیں، قدیم تحریروں میں انہوں نے صرف پلائنی (pliny) کی کتاب اور ارسطو سے منسوب تصنیف سے استفادہ کیا ہے۔

مشہور سائنسدانوں میں جن لوگوں نے معدنیات کو اپنی توجہ کا موضوع بنایا ہے، ان میں سب سے اہم ''نصیر الدین طوسی'' (المتوفی: ۵۹۷۔۶۷۲ھ/ ۱۲۰۱=۱۲۷۴ء) ہیں، انہوں نے ترک منگولیائی لفظ ''تنکسوخ''، بمعنی قیمتی چیز کو جزو عنوان بنا کر معدنیات سے متعلق ایک کتاب ''تنکسوخ نامہ'' تصنیف کی، جو مسلم علم معدنیات میں البیرونی کی کتاب کے بعد سب سے اہم تصنیف ہے، طوسی نے اس کتاب میں جابر بن حیان، کندی، رازی اور عطارد بن محمد الکاتب کی تحقیقات سے استفادہ کیا ہے، البیرونی کی

تصنیف طوسی کا اہم ماخذ رہی ہے، طوسی ایک تصنیف "کتاب الجواهر" کے عنوان سے ہے، اس میں مصنف نے جواہرات کی صفات اوران کے خواص سے بحث کی ہے۔

علم معدنیات سے متعلق دوسری اہم تحریروں میں "محمد بن شاذان" کی تصنیف "کتاب الجواهر وأصنافه" کا تذکرہ بھی کتابوں میں آیا ہے، ان کے علاوہ علم معدنیات کے موضوع پر کام کرنے والوں میں "محمد بن احمد التمیمی"، "مصنف المرشد" "ابن مسکویہ" "محمد بن منصور الشیر ازی" "ابوالقاسم کاشانی" "شیخ علی حزین" "امام احمد" اور "یحی بن محمد الغفاری" کے نام لئے جاتے ہیں، ان لوگوں نے معدنیات کے موضوع پر کتابیں اور رسالے تحریر کئے، "مسلمہ بن المجریطی"، ابن الجوزی، ابن اثیر، داؤد انطا کی اور متعدد دوسرے علماء نے اپنی کتابوں میں معدنیات یا جمادات کے متعلق قابل قدر معلومات قلم بند کی ہیں، یہ معلومات ان کی کتابوں میں بکھری ہوئی تھیں۔

معدنیات پر طبی تحقیق:

معدنیات کے میدان میں مسلمان سائنسدانوں نے صرف پتھروں کی تاثیر اور ان کے خواص بیان کرنے تک اپنی تحقیقات کا دائرہ محدود نہیں رکھا؛ بلکہ انہوں نے تجربات اور مشاہدوں کی روشنی میں پتھروں کی صنعتی اور تجارتی افادیت کے علاوہ دواؤں میں ان کی اہمیت بھی بیان کی، انہوں نے سالہا سال تک معدنیات پر تحقیق کر کے معلومات کا ذخیرہ جمع کر دیا، عطارد بن کاتب نے مختلف رنگوں اور ساخت کے ٹکڑوں معدنیاتی نمونے جمع کر کے ان پر سالہا سال تک تجربات کئے، رابرٹ بریفالٹ کے بیان کے مطابق البیرونی نے معدنیاتی نمونے جمع کرنے میں چالیس سال سفر میں گزارے تھے۔(۱)

مسلم سائنسدانوں نے دواؤں میں معدنیات کی اہمیت واضح کی "ابومنصور موفق بن علی ہروی" (المتوفی: ۳۴۰ھ/۹۶۱ء) نے "الأبنية عن حقائق الأدوية" میں ۱۷۵ ایسی دواؤں کے نام دیئے جو معدنیات سے تیار ہوتی ہیں، معدنیات کے اوزان

(۱) تشکیل انسانیت: ۲۶۰

مخصوصہ (Specific Gravity) دریافت بھی مسلم سائنسدانوں کا کارنامہ ہے، ان کی اولیت کا سہرا "ابوالطیب سند بن علیؒ" کے سر ہے، ان کے بعد البیرونی نے اٹھارہ قیمتی پتھروں اور دھاتوں کے اوزان مخصوصہ متعین کئے جو آج بھی درست اور صحیح ہیں۔(۱)

ول دوران نے البیرونی کے اس اہم کارنامے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "انہوں نے پتھروں کے خواص سے متعلق ایک ضخیم کتاب لکھی ہے، جس میں انہوں نے کافی پتھروں ارو دھاتوں کی فطری، تجاریت اور طبی افادیت بیان کی، انہوں نے اٹھارہ قیمتی دھاتوں کے اوزان مخصوصہ بیان کئے اور یہ اصول بتلا کہ کسی چیز کا وزن پانی کے اس حجم تناسب رکھتا ہے جسے وہ چیز خالی کر دیتی ہے۔(۲)



(۱) Introduction to the History of Science vol.i.p.708

(۲) The Age of faith p.244

علم طبقات الارض میں مسلمانوں کے کارنامے

علم طبقات الارض (Geology) کا تعلق معدنیات سے بڑا گہرا رہا ہے، قرون وسطیٰ میں یہ علم منظم نہ تھا؛ بلکہ جغرافیہ یا معدنیات کے ذیل میں اس کا بھی تذکرہ ہوتا تھا، مسلم سائنسدانوں نے بھی ارضیات کو معدنیات ہی کے ذیل ہی میں زیر بحث لایا ہے، ابو یوسف یعقوب کندی، مسعودی اور اخوان الصفا نے اپنے رسالوں اور تصنیفات میں زلزلوں، بادو باراں اور زمین کے مختلف طبقات اور ان کی ساخت پر بڑی کارآمد معلومات فراہم کی ہیں، کندی نے پہاڑوں کی چوٹیوں کا فاصلہ معلوم کرنے کے موضوع پر ایک کتاب "معرفة العاد قلل الجبال" تصنیف کی، ابوبکر رازی نے زمین کی ساخت پر قلم اٹھایا، مسعودی نے بحیرہ روم مردار کے پانی، زلزلوں، سمندری لہروں اور موتیوں کا تذکرہ کیا، اخوان الصفا نے رسائل میں دریاؤں اور پہاڑوں کی ساخت پر روشنی ڈالی، نیز انہوں نے (متحجرات) دریافت کئے، حالانکہ اس زمانے میں اس کا تصور کرنا بھی محال تھا، ان کا کہنا ہے کہ متحجرات یا رکازات بحری حیوانوں کی شکلیں ہیں جو پتھر میں تبدیل ہوئی ہیں، جن علاقوں میں یہ متحجرات یا رکازات ملتے ہیں وہ پرانے زمانے میں سمندر کا حصہ تھے بعد میں خشکی میں تبدیل ہوگئے، انہوں نے آتش فشاں پہاڑوں میں لاوے کی موجودگی اور اس کے نتیجے میں زلزلوں کے وقوع پر بھی بحث کی ہے، جسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔(۱)

(۱) The social structure of Islam p.488.

مسلم سائنسدانوں نے معدنیات اور ارضیات کی طرح موسمیات پر بھی کارآمد بحث کی ہے، ابو یوسف یعقوب کندی نے ۵۱ کتابوں میں موسمیات، گرمیوں میں فضا کی خنکی، بادو باراں، گرج، بجلی، بارش، اولوں، زلزلوں، مدوجزر اور دوسرے موضوعات پر سائنٹیفک انداز سے بحث کی ابتداء کی، ان کے بعد اخوان الصفا نے رسائل اخوان الصفا میں طبیعات کے سترہ رسالوں کے پہلے رسالے میں موسمیات کو زیر بحث لایا، انہوں نے قوس قزح اور اس کے رنگوں کی ترتیب پر بحث کا آغاز کیا، مشہور سائنسداں ابن الہیثم "الهالة وقوس قزح" کے عنوان سے ایک کتاب تحریر کی، آخری عہد عروج کے سائنسدانوں میں قزوینی نے موسمیات اور اس کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔



نباتیات (Botany)

عہدِ وسطی کی ہزار سالہ مدت کے دوران مسلمانوں نے حیاتات (Biology) کے سائنس میں وقیع خدمات انجام دی ہیں؛ حالانکہ اس زمانے میں یہ علم جدید خطوط پر مدون نہیں ہوا تھا، آج اس کی ایک شاخ نباتات (Botany) کہلاتی ہے، مسلم ماہرین کے یہاں دواسازی سے اس کا گہرا تعلق رہا ہے، ہر پودا یا جڑی بوٹی کسی نہ کسی مرض کی دوا ہے، اس لئے مسلمانوں نے نباتات کی طبی افادیت کے پیش نظر اسے "الأدوية المفردة" کا نام دیا ہے، چنانچہ الادویۃ المفردۃ کے عنوان کے ذیل میں نباتا ہی موضوع بحث بنتے ہیں۔

نباتیات پر مسلمانوں نے دوسری صدی ہجری میں توجہ دی، سب سے پہلے "جابر بن حیان" "کتاب الحدود" میں نباتا اور زراعت پر بحث کرنے کی ابتداء کی، تقریبا اسی عہد میں عبد الملک اصمعی (۱۲۲۔ ۲۱۳ھ/ ۷۴۰۔ ۸۲۸ء) نے "کتاب النبات والأشجار" تصنیف کی، جس میں انہوں نے پودوں اور درختوں کے بارے میں تفصیلات فراہم کیں، تیسری صدی ہجری میں حاجظ بصری "کتاب الزرع والنخل" کے عنوان سے ایک تصنیف قلمبند کی؛ مگر یہ تینوں کتابیں عام طور پر غیر معروف ہیں، مستشرقین ماہرین نباتیات کے ذیل میں سب سے پہلے مشہور مورخ "ابوحنیفۃ الدینوری" (المتوفی: ۲۸۵ھ۔ ۸۹۵ء) کا تذکرہ کرتے ہیں، انہوں نے نباتیات کے موضوع پر "کتاب النبات" کے نام سے ایک تصنیف لکھی تھی، جوصدیوں تک مغربی ماہرین نباتات بالخصوص مسلم ماہرین زراعت کے لئے اہم ماخذ رہی ہے، نباتات کا موضوع رسائل اخوان الصفا میں بھی زیر بحث آیا ہے، اخوان الصفا نے نباتات کی تقسیم اوران کے تدریجی ارتقاء پر روشنی ڈالتے ہوئے پہلی دفعہ اس کا انکشاف کیا

کہ بعض نباتات میں حس موجود ہوتی ہے۔

اسلامی مشرق کے ماہرین نباتیات میں "ابومنصور موفق بن علی ہروی" عظیم محقق کی حیثیت سے مشہور ہیں، انہوں نے سالہا سال تک جڑی بوٹیوں کی تلاش میں دور دراز علاقوں کے سفر کئے اور اپنے وسیع تجربات اور تحقیقات کو "الابنية عن حقائق الأدوية" میں جمع کردیا، اس کتاب میں انہوں نے پانچ سو چوراسی دواؤں کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے، جن میں معدنیات سے تیار ہونے والی دواؤں کی تعداد پچھتر، حیوانات سے حاصل ہونے والی دواؤں کی تعداد چھیاسٹھ ہے، کتاب میں یونانی اور شامی کے علاوہ عربی، ایرانی اور ہندوستانی معلومات بھی جمع کی گئی ہیں، مصنف نے حروف تہجی کی ترتیب کے اعتبار سے نباتات کے نام اور ان کے عربی یونانی، شامی اور فارسی مترادفات بھی دیئے ہیں، بعض عالموں کے نزدیک یہ فارسی پہلی کتاب ہے۔

نباتیات کے میدان میں دوسرے اطباء نے بھی قابل ذکر خدمات انجام دی ہیں، اگرچہ ان کے یہاں نباتات کا ذکر ادویہ کی حیثیت سے آیا ہے، بغداد کے ماہر امراض چشم علی بن عیسی (المتوفی: ۴۴۱ھ/ ۱۰۳۱ء) نے اپنی کتاب "تذكرة الكحالين" میں آنکھ کے علاج میں کام آنے والی ایک سو سینتالیس مفرد دواؤں اور جڑی بوٹیوں کے نام دیئے ہیں، انہوں نے ان پودوں کی پہنچان اور ان کے خواص کے متعلق اہم معلومات پیش کی ہیں، ان کے ہم عصر مشہور طبیب شیخ بوعلی سینا نے اپنی تصنیف "القانون في الطب" کی دوسری کتاب میں آٹھ سو دواؤں کی تفصیل حروف تہجی کے اعتبار سے دی ہے، کتاب کا یہ حصہ نباتیات کے میدان میں ایک وقیع اضافہ ہے، اس کے علاوہ شیخ نے کاسنی کے فوائد پر ایک جداگانہ رسالہ بھی تحریر کیا ہے، شیخ کے معاصر البیرونی نے اپنی تصنیف "الصيدلية في الطب" میں عربی حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق سات سو بیس مقالات کے تحت مفرد دواؤں کی تفصیل بیان کی ہے، ان میں پودوں اور جڑی بوٹیوں کی ایک بڑی تعداد بھی زیر بحث آئی ہے، مصنف نے یونانی، شامی، ہندوستانی، فارسی اور ایران کی دوسری زبانوں میں ان پودوں کے فنی مترادفات بھی دیئے ہیں۔

مشرق کے مقابلے میں اسپین زیادہ زرخیز ثابت ہوا ہے، یہاں کے مسلمانوں نے تاریخ نباتیات میں شاندار اوراق جوڑ دیئے ہیں، اسپین کے اولین ماہروں میں نامور طبیب ''**عریب بن سعد الکاتب القرطبی**'' (المتوفی: ۳۵۶ھ/۹۷۶ء) کا نام آتا ہے؛ مگر بحیثیت ماہر نباتیات کے ان کی شہرت ان کی طبابت کے سامنے ماند پڑ گئی ہے، اسپین کے پہلے مشہور ماہر ابن جلجل (المتوفی ۳۸۴ھ) ہیں جنہوں نے نہ صرف یونانی ماہر نباتیات دیسقوریدوس کی کتاب کی اصلاح کی اور اس کی عربی شرح تیار کی؛ بلکہ ''**مقالہ فی ذکر الادویۃ المفردۃ لم یذکرھا ما دیسقوریدوس**'' کے عنوان سے خود بھی ایک کتاب تحریری، اس میں انہوں ان جڑی بوٹیوں کا ذکر کیا جو دیسقوریدوس کو معلوم نہیں تھیں، گیارھویں صدی عیسوی میں ابو الصلت نے ''**الأدویۃ المفردۃ**'' کے نام سے ایک کتاب لکھی، جس کا ترجمہ لاطینی اور عبرانی میں کیا گیا۔

ابن جلجل کے بعد ''**الأدویۃ المفردۃ**'' اور دیگر عنوانوں سے مسلمانوں نے بیسیوں کتابیں لکھیں، جن میں سے بعض کے نسخے آج بھی مشرقی اور مغربی کتب خانوں کی زینت بنے ہوئے ہیں۔

اندلس کے دوسرے علماء میں سے ابن وافد (المتوفی ۴۶۷ھ/۱۰۷۵ء) محمد بن ابراہیم البصال، احمد بن محمد حجاج الاشبیلی، علی اب اللونقہ، محمد بن مالک الطغنری اور ''**الحاج الغرناطی**'' اگرچہ ماہرین زراعت کی حیثیت سے مشہور ہیں؛ مگر ان کی تصنیفات میں نباتیات کے موضوع پر خاصا مواد موجود ہے، اسپین میں مشہور جغرافیہ نگار ''ابوعبید البکری'' نے بھی نباتیات کے موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے، جس میں حروف تہجی کے اعتبار سے اندلسی کی نباتات کا بیان ہے۔

مفکرین اسلام میں ابن باجۃ (المتوفی: ۵۳۲ھ/۱۱۳۸ء) نباتیات کے ماہر تھے، انہوں نے اس موضوع پر ایک رسالہ بھی تحریر کیا ھے، جغرافیہ دانوں میں ادریسی ماہر نباتیات کی حیثیت معروف تھے، انہوں نے اس موضوع پر ''**الجامع لصفات اشتات النبات**'' لکھی، جس میں تین سو ساٹھ پودوں کی تفصیلی دی، میکس میر ہاف

کے بقول ادریسی پودوں کے مترادفات بیان کرنے میں کامیاب ہیں، کبھی کبھی وہ بارہ زبانوں کے مترادفات دیتے ہیں، اسپین کے ماہرین نباتیات میں ''ابوجعفر محمد الغافقی'' کا نام اپنے کارناموں کی بدولت خاصا مشہور ہے، قرطبہ کے اس طبیب نے اسپین اور افریقہ کے پودوں کی ایک بڑی تعداد جمع کی اور اپنی کتاب ''**الأدویۃ المفردۃ**'' میں ان کی تفصیلی معلومات فراہم کیں، انہوں نے ہر پودے کے لاطینی، بربری اور عربی نام لکھے، نباتات کی تلاش وتحقیق میں اشبیلیہ کے ایک عالم ابو العباس (المتوفی ۶۳۶ھ/۱۲۳۹ء) نے اٹلانٹک سے لے کر بحر قلزم تک کے سفر کئے، جڑی بوٹیوں کی تلاش میں دور دراز علاقوں کے سفر کرنے کی وجہ سے ان کا نام ابو العباس نباتی پڑ گیا، انہوں نے اپنے سالہا سال کے تجربات کا نچوڑ ''**الرحلۃ النباتیۃ**'' کے عنوان سے ایک کتاب میں قلم بند کیا، اس کتاب سے ان کے شاگرد ''**ابن البیطار**'' نے استفادہ کیا ہے۔

نباتیات کے شعبے میں ''**کتاب الأدویۃ المفردۃ**'' کے مصنف ''**رشید الدین الصوری**'' (۵۷۳-۶۳۹ھ/۱۱۷۷-۱۲۴۱ء) کی تحقیقات حد درجہ قابل داد ہیں، وہ اپنے ہمیشہ ایک مصور رکھتے ہیں، جس کے پاس قسم قسم کے رنگ ہوتے تھے، رشید الدین جب جڑی بوٹیوں کی تلاش میں جنگلوں اور کوہستانی علاقوں میں جاتے تو پہلے کسی بوٹی کا خود مشاہدہ کرتے اور اس کی چھان بین کرتے، پھر اسے اپنے مصور کو دکھلاتے جو پہلے اس کے رنگ کے مطابق اس میں رنگ بھرتے، پھر اسی پر اکتفا نہیں کرتے تھے؛ بلکہ ہر بوٹی کو اس کے مختلف زمانوں وقت ظہور، وقت کمال، وقت طراوۃ اور وقت یبس میں دیکھتے، اس کے بعد ہر وقت کی تصویر الگ الگ مختلف رنگوں میں بناتے، آخری میں اسے اس کتاب میں شامل کیا جاتا جو ''**کتاب الأدویۃ المفردۃ**'' کے نام سے مشہور ہوئی، ۱۹۵۷ء میں حکیم نیر واسطی نے رائل کالج آف فزیشنز لندن کی لائبریری میں کتاب کے مصور رنگین اوراق دکھانے والی خاتون سے اس کے ایک ورق کی قیمت دریافت کی تو جواب ملا ''انگلستان''۔

عہد وسطی کے جس عظیم سائنسداں کو نباتات کے میدان بے پناہ شہرت ملی وہ

''ابو عبداللہ بن احمد بن البیطار'' (المتوفی: ۶۴۶ھ/ ۱۲۴۸ء) ہیں، جو اسپین کے شہر مالقہ کے ایک بیطار (مویشیوں کا علاج کرنے والا) خاندان میں پیدا ہوئے تھے، انہوں نے اشبیلہ میں تعلیم حاصل کی اور ابو العباس اور دوسرے ماہرین نباتیات کے ساتھ رہ کر پیڑ پودوں کا علم سیکھا، ابن البیطار نے مغرب اور مشرق کے بعض علاقوں کا سفر کر کے بالآخر قاہرہ میں رہائش اختیار کی، ان کا انتقال دمشق ہوا۔

ابن البیطار نے کئی کتابیں تحریر کی ہیں، جن میں "المغني في الأدوية المفردة" اور "الجامع المفردات الأدوية والأغذية" مشہور ہیں، آخر الذکر کتاب "الجامع المفردات الأدوية والأغذيه" میں علاج کے لئے چودہ سو دواؤں کی تفصیل دی گئی ہے، رابرٹ بریفالٹ کی بیان کے مطابق یورپ کے ایک فاضل میئر نے اس کتاب کو محنت و جفاکشی کی یادگاری مینار قرار دیا ہے، B.Liin کہتے ہیں:

> '' ابن البیطار (المتوفی: ۶۴۶ھ/ ۱۲۴۸ئ) نے اپنی تمام دستیاب معلومات جمع یں اور دیسقوریدوس سے لے کر اپنے استاد ابو العباس نباتی، جن کی تصنیف الرحلۃ کا وہ اکثر حوالہ دیتے ہیں، تک کہ ایک سو پچاس ماہرین کے اقوال نقل ہیں، ان میں سے اکثر خاص کر الغافقی کی کتابوں کا علم انہیں ثانوی ذرائع سے حاصل ہوا تھا، ''جامع'' کے ۲۳۲۴ مقالات کے تحت ۱۴۰۰ مختلف دواؤں اور نباتات کی تفصیل دی گئی ہے جن میں سے ۴۰۰ یونانیوں کو بھی معلوم نہ تھیں۔



علمِ زراعت (Agronomy) میں مسلمانوں کے کارنامے

علم نباتیات میں ان مصنفوں کی خدمات بھی کچھ کم اہم نہیں ہیں، جنہوں نے زراعت کے موضوع پر کتابیں لکھی ہیں، ان میں سے بعض نے اس فن میں قابل ذکر کتابیں یادگار چھوڑیں ہیں، اولین مصنفوں میں بغداد کے ابو بکر احمد بن علی ابن المختار المعروف بہ ابن وحشیۃ (نواح ۳۵۰ھ) تذکرہ نگاروں کے یہاں عام طور پر معروف ہیں، حیاتیات، سمیات اور الکمیا کے ماہر ابن وحشیہ زراعت کے موضوع پر اپنی تصنیف "الفلاحة النبطية" کے مصنف کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں، انہوں نے اس کتاب میں پیڑ، پودوں، ذرائع، آبپاشی، موسمی حالات، شجرکاری اور دوسرے موضوعات پر بحث کی ہے، زراعت کے موضوع پر لکھی جانی والی کتابوں میں ابن مماتی (المتوفی: ۶۰۶ھ/ ۱۲۰۹ء) کی شائع شدہ کتاب، اور عبد اللہ الغنی نابلسی (المتوفی: ۹۳۵ء ـ ۱۵۹۲ء) کی تصنیف "علم الملاحة في علم الفلاحة" کو رزاعتی ادب میں ایک خاص مقام حاصل ہو رہا ہے۔

اسلامی مغرب میں علم زراعت کے موضوع پر قرطبہ، طلیلہ، اشبیلہ، غرناطہ اور المیریہ کے علماء نے کتابیں تحریر کی ہیں، ان میں ابن الوافد (المتوفی: ۴۶۷ھ/ ۱۰۷۵ء) خاص طور مشہور ہیں، اسپین کے ایک گمنام عالم غالبا ابن عبدون (چھٹی صدی ہجری/ بارھویں صدی عیسوی) کی تصنیف "عمدة الطب في معرفة لكل لبيب" نباتات کی بہترین لغت مانی جاتی ہے اور بعض لوگ اسے ابن البیطار کی کتاب پر فوقیت

دیتے ہیں۔

قرون وسطی کے دوران سب سے زیادہ عالمی شہرت اشبیلہ کے "**ابو زکریا محمد ابن العوام الأشبیلی**" (المتوفی: ۱۱۹۰ء) کو نصیب ہوئی ہے، جن کی تصنیف "**کتاب الفلاحة**" اس موضوع پر بڑی اہم تصور کی جاتی ہے، ابن العوام نے یونانی اور عربی مآخذ سے استفادہ کرنے کے علاوہ اسپین کے معاصر علماء اقوال وتجربات سے بھی استشہاد کیا ہے، کتاب الفلاحة میں ۱۳۴ ہیں، جن میں ۵۸۵ نباتات کی تفصیل دی گئی ہے، اس کے علاوہ اس کتاب میں پچاس سے زائد میوہ دار درختوں کی کاشت کے بارے میں رہنمائی ملتی ہے، نیز اس میں درختوں میں پیوند کاری، زمین کی خصوصیات، نباتات کو لگنے والی بیماریوں اور ان کے علاج، حیوانات کی پرورش نیز مرغیوں اور شہد کی مکھیوں کو پالنے پر بحث کی گئی ہے، اس کتاب کو انسائیکلو پیڈیا میں "اپنے موضع پر عہد وسطی کی غیر معمولی تصنیف کہا گیا ہے۔(۱)

مسلم ماہرین زراعت کی کتابوں میں اراضی کی اقسام، کاشتکاری، آلات کشاد زری، ذرائع آبپاشی، پھلدار درختوں کی شجرکاری، شاخ تراشی، پیوند کاری، پھلوں اور سبزیوں کی اقسام اوران کی کاشت، مضر اور منافع بخش پودوں، اناج اور پھلوں کی ابقاء، مویشی پروری، کھاد اور زراعت سے متعلق دوسری چیزوں پر بحث کی جاتی تھی، اسپین کے مسلم ماہرین زراعت نباتاتی باغ اور آزمائشی پلاٹ ہوتے تھے جہاں وہ پودوں پر تجربے اور پیوند کاری کرکے پھلوں اور پھولوں کی نئی اقسام پیدا کرتے ہیں، پھلوں اور پھولوں کی نئی نئی قسمیں پیدا ہونے سے خود زراعتی ادب کا دامن اسماء واصطلاحات سے مالا مال ہوا، بیسویں صدی میں مصطفی سہابی نے زراعتی لغت تیار کی تو اصطلاحات کی تعداد دس ہزار تک پہنچ گئی، مسلمان ماہرین نے پیوندکاری کے ذریعہ پھلوں اور پھولوں کی سینکڑوں نئی قسمیں پیدا کیں، نویں صدی کی ایک تصنیف "**نزهة الأنام في محاسن الشام**" شام کی ناشپاتیوں کی اکیس، انگوروں کی پچاس اور گلاب وغیرہ پر چھ قسموں کا بیان ہے۔

(۱) Encyclopaedia Britanica vol.6p.226

یونانیوں کی خیالی کائنات پر مسلمانوں نے ہمیشہ عملی دنیا کو ترجیح دی، انہوں نے اپنی معلومات سے کام لے زراعت اور باغبانی کو ترقی دو، کاشتکاری کے کے نئے طریقے رائج کئے، درختوں اور پودوں کی کاشت، ان کے نشوونم کی مدت کے تعین، پھلوں کو لگنے والی بیماریوں اوران کے سدباب پر روشنی ڈالی، انہوں نے کھاد کے استعمال کی طرف توجہ دلانے کے ساتھ ساتھ ان فصلوں کی نشاندہی کی جن سے زمین کی قوت زرخیزی میں اضافہ یا کمی ہوتی ہے، نباتیات اورزراعت میں اپنی بے پناہ مہارت سے مسلمانوں نے یورپ کو لہلہاتے سبزہ زاروں میں تبدیل کردیا، اندلس میں ان کی آمد بہاروں کے قافلوں کی آمد تھی۔

مسلمانوں نے علم زراعت ونباتیات نے یورپ کی سرزمین پر انمٹ نقوش چھوڑے ہیں جو اسپین اور مغرب ے زراعتی نظام میں آج بھی نمایاں ہیں، زراعت سے متعلق چیزوں، نباتات اور میووں کے ان گنت نام عربی سے ماخوذ ہیں، عربی کے الفاظ الساقیہ، الارز، الرمان اور الزعفران سے بالترتیب اسپینی الفاظ(asafron romania acquia) کئے گئے ہیں، البرقوق سے اسپینی لفظ(alberchigo) بنا ہے، جس سے انگریزی لفظ (apricot) لیا گیا ہے، عربی کے الفرسق سے اسپینی (alberchigo) اخذ کیا گیا ہے، جس سے لاطینی کا(Peaches) بنا ہے، عربی لفظ قطن سے اسپینی (algabin) اور انگریزی (cotton) بنایا گیا ہے، انکے علاوہ مغربی زبانوں میں عربی کے الفاظ درآئے ہیں، ان میں صندل سے(sandal) آرنج سے (orange) لیلاج سے (Lilae)، زنجبیل سے (Ginger) خولنجان سے (clango) اور تمر یندی سے(Tamarind) ماخوذ ہیں۔(۱)



(۱) تاریخ عرب: ۳۲۴

حیوانیات (Zoology) میں مسلمانوں کے کارنامے

مسلم سائنسدانوں نے تمام کیمیائی مادوں کو معدنیات، نباتات اور حیوانات میں تقسیم کیا ہے، ابوبکر رازی پہلے شخص ہیں، جنہوں نے مادوں کو نباتات، حیوانات اور معدنیات میں تقسیم کر کے ایک ایسی درجہ بندی قائم کی ہے جو آج تک مسلم چلی آ رہی ہے، میکس میرہاف لکھتے ہیں:

''رازی کیمیائی مادوں کو نباتات، حیوانات اور معدنیات میں تقسیم کرتا ہے، یہ وہ تصور ہے جو جدید سائنس یا آج کل کی بول چال میں انہیں کی طرف سے آیا ہے''۔

رازی کی درجہ بندی کے پیش نظر معدنیات اور نباتات کے بعد ہم نے حیوانیات کے موضوع کو لیا ہے، مزید برآں یہ علمِ حیاتیات کی ہی ایک شاخ ہے، اس لئے نباتات کے بعد یوں بھی اس کا تذکرہ آتا تھا، سائنس کی دوسری شاخوں کی طرح مسلمانوں نے علم حیوانات کے شعبے میں بھی درخشاں کارنامے انجام دیئے ہیں، جن کی تاریخ صحرائے عرب سے شروع ہوتی ہے، حیوان شناسی میں عرب یونانیوں کے بجائے اپنے اس ماحول کے مرہون منت ہیں، جس نے ان پر اونٹ، گھوڑے اور بکری کی اہمیت واضح کی ہے، یہ عرب ہی تھے جنہوں نے سب سے پہلے اونٹ کو انسان سے مانوس کر کے اسے بار برداری کے لئے استعمال کیا، جو ان کی حیوان شناسی کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

مسلمانوں میں سب سے پہلے حیوان شناسی کو جس شخص نے موضوع بحث بنایا وہ

''ابوعبیدہ معمر بن مثنیٰ'' (۱۱۰۔۲۰۹ھ/ ۷۲۸ = ۸۲۴ء) ہیں، انہوں نے حیوانات کے موضوع پر ایک سو کتابیں تحریر کی ہیں، جن میں سے پچاس صرف گھوڑے پر ہیں، ابو عبیدہ نے مختلف قسم کے حیوانوں، گھوڑوں، اونٹوں، سانپوں، بچھوؤں وغیرہ پر کتابیں قلم بند کیں، ان میں ''طبقات الفرسان، کتاب الفرس، کتاب الخیل، کتاب الحیات، اور کتاب العقارب کے نام شامل ہیں، ابتدائی دور کے ماہر حیوان شناس ''عبد الملك اصمعی'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جو اپنے زمانے کے سب سے بڑے ماہر حیاتیات گذرے ہیں، انہوں نے حیوانیات اور نباتات کے موضوع پر متعدد کتابیں لکھی ہیں، جن میں ''کتاب الخیل''، ''کتاب الإبل''، ''کتاب الوحوش''، ''تاب الشاة'' اور ''کتاب الخلق الإنسان'' معروف ہیں، ان کے بعد مسلمانوں میں ماہر حیاتیات کی حیثیت سے جاحظ بصری اپنی تصنیف ''کتاب الحیوان'' کی بنا پر پوری دنیا میں مشہور ہیں، انہوں نے اس کتاب میں تین سو پچاس حیوانات کے متعلق اپنی تفصیلی معلومات درج کی ہیں، کتاب میں ڈوڑ، ے والے، رینگنے والے ن اڑنے والے، تیرنے والے جانورں کے بارے میں بڑی کارآمد تفصیلات فراہم کی ہیں، حیوانوں اور جانورں کے عادات، ان کے خورد ونوش اور ان کے فوائد کے بارے میں مصنف نے بعض ایسی چیزیں بیان کی ہیں، جو اور کسی کتاب میں نہیں ہیں، جاحظ نے ارسطو کی تصنیف کا مطالعہ کر کے اس سے استفادہ کیا ہے؛ مگر بعض اوقات وہ ارسطو پر بہت سخت تنقید کرتے ہیں، کتاب کے مطالعے سے صاف طور پر عیاں ہوتا ہے کہ انہوں نے ارسطو سے زیادہ تحقیقات پر اعتماد کیا ہے، انہیں تحقیقات کی بنا پر مصنف دنیا کے مشہور حیوان شناسوں میں شمار ہوتے ہیں، جاحظ پہلے مصنف ہیں جنہوں نے پرندوں کی نقل مکانی کا مشاہدہ کیا اور اپنی کتاب میں اس پر روشنی ڈالی، اس کے علاوہ انہوں نے جانوروں کے گوبر یا فضلے سے نوشادر حاصل کرنے کا تذکرہ کیا ہے، فلپ ہٹی جاحظ کی کتاب کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس تصنیف جس میں مصنف نے ارسطو کا حوالہ دیا ہے، میں ارتقاء،

حالات سے مطابقت پیدا کرنے کی صلاحیت اور حیوانوں کی نفسیات سے متعلق وہ نظریات ملتے ہیں جو بعد زمانے کے انکشاف سمجھے جاتے ہیں، جاحظ اس بات سے آگاہ تھے کہ جانوروں کے فضلے سے کس طرح خشک طریقہ کشید سے امونیا (نوشادر) کی گیس حاصل کی جاسکتی ہے (۱)

مغربی مفکرین نے حیاتیات جاحظ کو عظیم حیوان شناس مانتے ہیں، بعض علماء مغرب نے انہیں ارسطو کا ہم پلہ قرار دیا ہے، یہ کتاب اس وقت کی یونانی، ایرانی، شامی اور ہندوستانی حیاتیاتی معلومات کا بہت بڑا ذخیرہ ہے؛ لیکن اس کا اولین ماخذ عربوں کا علم حیوانات ہے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگار لکھتے ہیں:

''عرب ماہرین حیاتیات میں جاحظ (المتوفی 1٨٦٨ء) خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان کی حیاتیاتی تصانیف میں کتاب الحیوان معروف ہے، جس میں اگرچہ کسی حد تک یونانی اثر ہے، مگر بنیادی طور پر وہ ایک عربی تصنیف ہے''

حیوانات کا موضوع "رسائل اخوان الصفا" میں بھی زیر آیا ہے، اخوان الصفا نے رسائل میں حیوانات کی درجہ بندی کرکے اس علم کے آگے بڑھایا، انہوں نے حیوانات کو مکمل اور نامکمل خانوں میں تقسیم کرکے ان کی ذیلی درجہ بندی کی، نیز انہوں نے جانوروں کی پیدائش، نشوونما اور ان کی جسمانی ساخت پر بھی بحث کی ہے، اخوان الصفا کے مطابق اس کے لحاظ سے حیوانوں میں فرق ہوتا ہے، بعض حیوانوں کے پاس ایک حس، بعض کے باس دو حواس اور بعض کے پاس دو حواس اور بعض جانور تین یا چار حواس کے مالک ہوتے ہیں۔

مفکرین اسلام میں کندی نے حیوانات کے موضوع پر کئی رسالے تصنیف کئے، جن میں "رسالہ فی الطائر الانسی"، "رسالہ فی تمریخ الحمام"، "رسالہ فی النحل"، "رسالہ فی الحشرات" اور "کتاب فی الخیل والبیطرۃ" کے نام

(۱) Encyclopaedia Brithnica vol 14..p.1073

آتے ہیں، ان کے بعد فارابی نے علم حیاتیات کو طبیعیات میں شمار کرکے اس کی سائنسی اہمیت اجاگر کی، ابن سینا نے حیوانات کے موضوع پر الگ سے کوئی کتاب نہیں لکھی؛ مگر ان کی تصنیف ''کتاب الشفا'' میں حیوانوں کی نفسیات پر بڑی اچھی بحث کی ہے، ان کے معاصر ''ابن مسکویۃ'' نے ارتقاء کا نظریہ پیش کرتے ہوئے حیوانات کو مختلف درجوں میں تقسیم کیا ہے۔

اسپین کے مفکروں میں سے ابن ماجۃ نے حیوانات کے موضوع پر قلم اٹھایا، ان کے بعد ابن رشد نے ارسطو کی دو کتابوں کی شرح لکھی، یہ دونوں کتابیں حیوانات کے اعضاء اور ان کی پیدائش سے متعلق تھیں، حیوانات کے بارے میں قابل ذکر مواد فراہم کیا ہے، معروف جہاز راں بزرگ بن شہر یار نے ''عجائب الہند'' کے عنوان سے ایک کتاب لکھی، جس میں بحری ہند اور اس سے ملحقہ علاقوں کے جانوروں کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔؟

حیوانیات کے موضوع پر ادیبوں اور سیاحوں یا ملاحوں نے بھی معلومات فراہم کی ہیں، مشہور ادیب ''ابن قتیبہ دینوری'' ''عیون الأ بصار'' میں حیوانیات کے بارے میں قابل ذکر مواد فراہم کیا ہے، معروف جہاز راں بزرگ بن شہر یا نے ''عجائب الہند'' کے عنوان سے ایک کتاب لکھی جس میں بحر ہند اور اس سے ملحقہ علاقوں کے جانوروں کا ذکر بھی کیا گیا۔

چھٹی صدی ہجری کے ربع اول میں 'شرف الزماں الطاہر المزوری" نے "طبائع الحیوان" تصنیف کی جو حیوانیات کے موضوع پر ایک اہم کتاب شمار ہوتی ہے، ساتویں صدی ہجری کے ماہرین حیاتیات "زکریا بن محمد القزوینی" مشہور ہیں، ان کی تصنیف "عجائب المخلوقات وغرائب الموجوبات" حیوان شناسی کے موضوع پر عمدہ تصنیف مانی جاتی ہے، مصنف نے اس میں ایک سو تیس حیوانوں کا تذکرہ کیا ہے، انہیں مشرق کا پلینی کہا جاتا ہے، تقریبا اسی زمانے میں مشہور جغرافیہ داں اور مورخ "شمس الدین الدمشقی" نے "نخبۃ الدھر فی عجائب البر

والبحر" تصنیف کی، جس میں انہوں نے ایشیا اور افریقہ کے سمندری اور دریائی جانوروں کے بارے میں معلومات دی ہیں، اسی زمانے میں ''نورالدین محمد عوفی نے ''جامع الحکایات''، تحریر کی، جس میں انہوں نے چار ابواب حیوانیات پر روشنی ڈالی ہے، آٹھویں صدی ہجری حیاتیاتی تصنیف میں ''حمد اللہ مستوفی القزوینی'' کی کتاب ''نزہۃ القلوب'' مشہور ہے، اس میں حیوانات کو مختلف طبقوں اور ذیلی گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے، کتاب میں دوسو اٹھائیس جانوروں کا تذکرہ آیا ہے۔

آٹھویں صدی ہجری میں ''محمد بن موسی بن عیسی بن علی الدمیری (۷۴۲ـ۸۰۸ھ/۱۳۴۱ئ ـ ۱۴۰۵ئ) نے ''حیاۃ الحیوان'' کے نام سے ایک کتاب تحریر کی، یہ کتاب حیوان شناسی کے موضوع پر مسلمانوں کی سب سے اہم کتاب مانی جاتی ہے، حیاۃ الحیوان حروف تہجی کی ترتیب کے اعتبار سے مرتب کی گئی ہے اور اس میں نوسو اکتیس جانوروں کے نام، عادات، غذائی اہمیت، حلت وحرمت، طبی افادیت، خواص اور دوسری چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے، یورپ کے مؤرخین حیاۃ الحیوان کے مصنف الدمیری کو عربوں کا سب سے بڑا حیوان شناس مانتے ہیں، موسیو یو کا بیان ہے کہ دمیری کی کتاب یورپ میں مشہور ہے، چنانچہ یورپ والے اسے اپنے ہاں کے عالم بوفون کا ہمسر مانتے ہیں، فلپ ہٹی لکھتے ہیں:

''الدمیری میری سے عظیم عرب ماہر حیوانات ہیں''(۱)

دمیری کی تصنیف کی اہمیت کے پیش نظر متعدد علماء نے اسکے خلاصے تیار کئے، جو بیحد مقبول ہوئے، نویں صدی ہجری میں بھی حیوانات کے موضوع پر متعدد کتابیں تحریر کی گئیں، ۸۹۶ھ میں ''محمد بن عبد الکریم الصاوی'' نے "**الملتقات من عجائب المخلوقات**" و"**حیاۃ الحیوان**" مرتب کی، اس کتاب میں مصنف نے زکریا القزوینی کی کتاب "**عجائب المخلوقات**" اور دمیری کی تصنیف "**حیاۃ الحیوان**" کو جمع کیا ہے۔

(۱) History of arabs p382.

علم الکیمیاء (Chemistry) میں مسلمانوں کے کارنامے

مسلمانوں میں کیمسٹری کا آغاز عہد بنی امیہ کے دوران پہلی صدی ہجری میں اس وقت ہوا جب اموی شہزادے ''خالد بن ولید'' (المتوفی: ۸۵ھ/ ۷۰۴ء) نے علم کیمیا سیکھنے کے لئے ایک راہب کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا، حصول علم سے فراغت کے بعد خالد نے اپنی زندگی اس فن کے لئے وقف کردی، انہوں نے اس موضوع پر چار کتابیں قلم بند کیں، جس کا ذکر ابن الندیم نے کیا ہے۔

علیم کیمیا میں خالد کے بعد حضرت امام جعفر صادق (المتوفی: ۱۴۸ھ/ ۷۶۵ء) کی کیمیا داں کی حیثیت سے مشہور ہوئے؛ مگر تا حال اس موضوع پر کسی تصنیف کا ان کے نام انتساب ایک تحقیق طلب مسئلہ بنایا ہوا ہے۔

دوسری صدی ہجری میں سب سے مشہور کیمیاں داں ''جابر بن حیان'' تھے، جنہوں نے کیمسٹری کا باوا آدم کہا جاتا ہے، جابر پہلے سائنسداں ہیں، جنہوں نے تجربات کرکے علم کیمیا کو باقاعدہ سائنس کی شکل دی اور اپنے تجربات کو اپنی تحریروں میں محفوظ کردیا، انہوں نے کیمیا کے موضوع پر ایک سو کتابیں تصنیف کیں، عہد عباسی کے ماہر زراعت ابن وحشیہ بھی کیمیا داں کی حیثیت سے مشہور ہوئے؛ مگر ان کی تحریروں میں غیر سائنسی مواد کی موجودگی سائنٹفک اسلوب کے منافی ہے۔

کیمیا داں میں یہ نظریہ عام ہو رہا ہے کہ ایک خاص عمل سے کم قیمت دھاتوں کو سونے میں تبدیل کیا جاسکتا ہے، ابتدائی عرب کیمیا داں بھی اس کے قائل تھے، عباسی دور

میں ”ابو یوسف یعقوب کندی“ نے ان لوگوں کی تردید میں متعدد رسالے تحریر کئے، جن میں ایک تحریر ”کتاب إبطال دعوی المدعیین صناعة الذهب والفضة من غير معادنها“ کے عنوان سے معروف ہے، کندی کی تحریروں سے مناقشہ کا وہ دروازہ کھلا جو صدیوں تک بند نہ ہوسکا، مسلم کیمیاں داں دو گروہوں میں بٹ گئے، ایک اس کا قائل تھا کہ تمام دھاتیں ایک ہی نوع سے تعلق رکھتی ہیں؛ اس لئے انہیں ایک دوسرے میں تبدیل کرنا ممکن ہے، دوسرے گروہ کا کہنا تھا کہ ایسا کرنا ناممکن اور محال ہے، کندی کے بعد ”ابوبکر رازی“ نے کیمیا کے موضوع پر ۲۱ کتابیں تحریر کیں، جن میں سے سب سے مشہور تصنیف ”سر الأسرار“ ہے، رازی کو کیمیا گری سے دلچسپی تھی؛ اس لئے انہوں نے اپنی تحریروں میں کندی پر سخت حملے کئے، کیمیا دانی میں قابل داد مہارت کی بنا پر انہیں جابر بن حیان کا بڑا جانشین مانا جاتا ہے، عہد عباسی میں ”ابن امیل التمیمی“ نے ”مفتاح الحكمة العظمى“ کے عنوان سے ایک کتاب لکھی، اسی دور میں مشہور جغرافیہ داں ”الحمدانی“ نے اپنی کتاب تصنیف کی جس کے تیسرے حصہ ”جوهر تين العتيقين“ میں انہوں نے دھات کاری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے، یہ کتاب عربی زبان میں اس موضوع پر اولین اور بہترین تحریر مانی جاتی ہے۔

مشہور مفکروں میں فارابی دھاتوں کی قلب ماہیت کے امکان کے قائل تھے، انہوں نے اس موضوع پر ”فی مقالة وجوب صناعة الكيميا“ کے عنوان سے ایک کتاب تحریر کی، چوتھی صدی ہجری میں اسپین کے ماہر ہیئت ”مسلمہ بن احمد المجریطی“ نے ”رتبہ الحکیم“ اور ”غاية الحكيم“ کے عنوانوں سے دو کتابیں تصنیف کیں، اول الذکر تصنیف میں انہوں نے بیش بہا دھاتوں کے فارمولوں اور ان کے طریقہ حصول پر بحث کی ہے۔

کیمیا گری کے مخالفین میں ”ابو حیان توحیدی“ (المتوفی: ۴۱۴ھ/ ۱۰۲۴ء) اور ”ابن سینا“ مشہور ہیں، ان دونوں نے یہ خیال پیش کیا کہ کیمیائی عمل سے دھات کی ظاہری صورت میں تبدیل ہوسکتی ہے، اصلیت میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔

جابر بن حیان کے بعد کیمیا گری میں سب سے مشہور شخصیت ”ابو الحکیم محمد بن الملك الصالحي الخوارزمي الكائى“ (نواح: ۴۲۵ھ/ ۱۰۳۴ء) ہیں، انہوں نے ”عین الصنعۃ وعون الصناع“ کے عنوان سے ایک کتاب تحریر کی، جو صدیوں تک کیمیا کے شائقین کے لئے مرجع کا کام دیتی رہی۔

کیمیا گری کا دفاع کرنے والوں میں سب سے اہم شخصیت وزیر مؤید الدین طغرانی ہیں، انہوں نے ”حقائب الاستشهاد، كتاب الأنور والمفاتيح“، ”مفاتيح الرحمة“ اور ”انوار الحكمة“ تصنیف کیں، طغرائی نے اپنی تحریوں میں ابن سینا کو نشانہ بنایا، چھٹی صدی ہجری میں ”ابوالحسن موسی بن ارفع الانصاری“ (المتوفی: ۵۵۳ھ/ ۱۱۹۷ء) نے اس موضوع پر ”شذوذ الذہب“ تحریر کی جس کی مختلف شرحیں لکھی گئیں۔

کیمیا کے موضوع پر ”ابو القاسم محمد بن احمد العراقی فی السيماوی“ نے ”الكمتب فى زراعة الذهب“ کے نام سے تصنیف تیار کی، ان کے بعد آٹھویں صدی میں ”علی بن ایدمر بن علی الجلدکی“ (۷۳۳ھ/ ۱۳۴۲ء) اور ”ابوالاصبغ بن تمام العراقی“ (۷۶۲ھ/ ۱۳۶۰ء) نے اس موضوع پر قابل ذکر تحریریں قلم بند کیں۔

کیمیا گری کے نامنور مخالفین میں علمائے اسلام ابن حزم، امام ابن تیمیہ، اور ابن قیم پیش پیش ہیں، ابن القیم الجوزیۃ نے ”مفتاح دار السعادة“ میں کیمیا اور اس طرح کے تمام علوم کی مخالفت کی، مورخین میں ابن خلدون نے کیمیا گری کو ایک قسم کا جادو قرار دیا۔

یہ علم کیمیا کی تاریخ کا ایک سرسری جائزہ تھا، چوں کہ اس علم کا مقصد ایک خاص عمل سے کم قیمت دھاتوں کو سونے میں تبدیل کرنا تھا، اس لئے لوگ مختلف تجربات کیا کرتے تھے، جن سے بجائے خود بعض نئی چیزوں کا انکشاف ہوتا، اسی کیمیائی عمل نے موجودہ کیمسٹری کو جنم دیا، کیمیا کے حصول کے لئے جو طریقے اختیار کئے گئے، وہ کیمسٹری کے عمل قرار پائے، جس اکسیر کی تلاش میں مسلم سائنسداں شب و روز منہمک رہتے تھے، وہ تو ملنے سے رہا، اس کے بجائے جدید کیمسٹری ان کے ہاتھ آئی جو تاثیر میں اکسیر سے ہزار درجہ بڑھ کر تھی۔

ول دوران لکھتے ہیں:

’’علم کیمیا گری جو مسلمانوں نے مصر سے ورثے میں پائی ہے، ہزار اتفاقی دریافتوں سے کیمسٹری کو مالا مال کردیا، ان کے اس کیمیائی عمل سے بھی کیمسٹری کو ترقی ملی، جو عہدِ وسطی کے طریقوں میں سب سے سائنٹفک طریقہ تھا‘‘۔(۱)

علم کیمیاء میں تجربہ کی اہمیت-مسلمانوں کی ایجاد

علم کیمیا میں مسلمانوں نے تجربہ کی اہمیت پر زور دیا، مشہور سائنسداں جابر بن حیان نے کہا تھا’’ کیمیا میں سب سے ضروری شئے تجربہ ہے، جو شخص اپنے علم کی بنیاد تجربے پر نہیں رکھتا، وہ ہمیشہ ٹھوکر کھاتا ہے، صرف اسی علم کو صحیح جاننا چاہئے جو تجربے سے ثابت ہوجائے، جابر کے یہ الفاظ مسلم سائنسدانوں کے لئے راہنما اصول بن گئے انہوں نے نظری علم کے ساتھ ساتھ تجربی تحقیق کا طریقہ اختیار کیا، اسی تجربی تحقیق نے آگے چل کر کیمسٹری کو فروغ دیا، ڈریپر مسلمانوں کے تجربی اسلوب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

’’یہی وہ چیز تھی جس نے انہیں کیمسٹری کا موجد بنایا اور جس نے ان سے تقطیر، تصعید، تسیح اور ترویق کے لئے تمام قسم کے آلات ایجاد کرائے‘‘(۲)

تجرباتی اعمال کی جونئی روایت قائم ہوئی، اس کے بانی جابر بن حیان تھے، جابر نے کیمیائی تجربوں کا آغاز کرکے حقیقی معنوں میں جدید کیمسٹری کی بنیاد رکھی، انہوں نے تحلیل (Solution) تقطیر، تبخیر، کشید، تبلیر، تکلیس، تصعید جیسے عملوں کو فروغ دیا، ان میں سے بعض تجرباتی اعمال مثلاً تکلیس (Calcination)، آکسائڈیشن اور تحلیل (Solution) وغیرہ خود ان کی اپنی دریافتیں ہیں، انہوں نے ان تمام کیمیائی عملوں کو اپنے معمل میں برتا جو عہد وسطی سے لے کر آج تک استعمال ہوتے رہتے ہیں۔

جابر بن حیان نے کیمیا کی صنعتی استعمال میں بھی دنیا کی رہنمائی کی ہے، انہوں

(۱) 245-The age of faithpp.244

(۲) History of the conflict Between Religion and Science.p.112

نے اپنی کتابوں میں فولادسازی، فلزات کی صفائی، لوہے کے زنگ سے حفاظت، چمڑے کی رنگائی، شیشے کو رنگین بنانے، دھاتوں کے مرکبات تیار کرنے، لوہے اور وارنش کرنے، بالوں کے لئے خضاب تیار کرنے اور موم جامہ تیار کرنے کے طریقہ بیان کئے، ان کے علاوہ ان کی کتابوں میں بیسیوں مفید اشیاء تیار کرنے کے طریقے بھی بیان کئے گئے ہیں۔

گستاولی بان لکھتے ہیں:

’’جابر کی تصنیفات میں ایسے بہت سے مرکبات کا ذکر ہے، جو اس سے قبل معلوم نہ تھے، مثلاً شورے کا تیزاب، ماء الملوک، ملح القلی، نوشادر، چاندی کا شورہ، زیبق سلیمانی، راسب الاحمر وغیرہ، اسی کی تصنیفات میں سب سے پہلے کیمیائی عملیات، عرق کشی، تصعید، قلم بندی، پانی میں حل کرنے گلانے وغیرہ کا بھی بیان ہے‘‘(۱)

جابر بن حیان کی کتابوں کے ترجمے بارہویں صدی میں کئے گئے، سب سے پہلے ایک انگریز رابرٹ آف چسٹر نے ۱۱۴۴ء میں ان کی ایک کتاب الکیمیا کا ترجمہ لاطینی میں کیا۔

جابر کی ایک دوسری تصنیف ’’کتاب السبعین‘‘ کو ’’جرارقرمونی‘‘ نے لاطینی کا جامہ پہنایا۔

☆ جابر کے بعد یعقوب کندی نے اپنی تصنیفات میں فولادسازی، عطرسازی اور رنگ سازی پر بیش قیمت معلومات بہم کیں، مسلمان سائنسدانوں کی ان صنعتی خدمات سے نباتات سے عطر بنانے، شیشہ سازی، روغن سازی، روشنائی کی کئی قسمیں تیار کرنے کی صنعت کو ترقی ہوئی۔

☆ اطباء میں سب سے بڑی کیمیاء داں ابو بکر رازی تھے، انہوں نے اپنے تمام کیمیاوی علموں کو عام فہم زبان میں بیان کیا، کیمیائی عملوں میں کام آنے والے پچیس آلات کی تشریح کی اور کیمیائی مادوں کو جمادات، نباتات اور حیوانات میں

(۱) تمدن عرب: ۴۳۷

تقسیم کر کے علم الکیمیا کی ترقی کی راہ ہموار کی۔

مسلمانوں نے ایک اہم کارنامہ یہ انجام دیا کہ انہوں نے کیمسٹری سے دواسازی کو فروغ دیا، ڈریپر کا بیان ہے:

’’عربوں نے نظری اور عملی طب پر کیمسٹری کے اطلاق کی ابتداء کی، انہوں نے انسانی جسم کے وظیفے کی وضاحت اور بیماریوں کے علاج میں استعمال کیا‘‘(۱)

ایک ماہر طب کے بقول علم طب میں کیمیا کی بنیاد عربوں نے رکھی، چنانچہ عربوں نے پہلی مرتبہ، ترشیح، تقطیر، تذویب اور تبلور کے طریقے بیان کئے اور بے شمار کیمیاوی مرکبات مثلا نائٹرک ایسڈ، سلفیورک ایسڈ، نائٹروہائڈرکلورک ایسڈ، لائیکر ایمونیا، مرکری کلورائڈ، مرکری آکسائڈ پوٹاشیم، فائٹریٹ، فرائی سلفاس وغیرہ بنائے، مختلف قسم کے کھار اور تیزابات تیار کئے، نیز الکحل سے طبی دنیا کو روشناس کرادیا۔

خلاصہ بحث یہ کہ مسلمانوں نے کیمسٹری کے میدان میں جو خدمات انجام دیں ان کا اجمال یہ ہے:

۱۔ تجربی تحقیق اور ریاضیاتی تجزیہ کو ملا کر جدید کیمسٹری کی بنیاد رکھی۔

۲۔ تجربی علموں کو رواج دیا یعنی ترشیخ، تبخیر، تقطیر، تکلیس، تصعید، تحلیل، تعفین، آکسائیشن، تبلیر، تبئید، تخمیر اور تشمیع،‘‘ سے دنیا کو روشناس کرایا۔

۳۔ تجربی علموں کے لئے آلات تیار کئے، ابوبکر رازی نے پچیس آلات کا ذکر کیا ہے، جو کیمیائی عملوں کے دوران استعمال ہوتے ہیں، مغربی زبانوں میں (alembic) اور (aludel) مسلمانوں ہی کی یادگاریں ہیں، جو بالترتیب عربی الفاظ ’’الانبیق‘‘ اور ’’الاثال‘‘ سے ماخوذ ہیں، ان کے علاوہ لاطینی زبان میں متعدد الفاظ موجود ہیں۔

۴۔ مسلمانوں نے کھار اور تیزاب کو الگ الگ کر کے ان میں فرق کیا انہوں نے نباتاتی اور معدنیاتی تیزاب تیار کئے۔

(۱) History of the intellictual Development of Europe 11p.30

Arsenic sulphide, lead carbonate chloric acid, nitric acid antimonisulphde, silsic acid, antimony, phosphorus, mercury oxide, mercury chloride, sodium carbonate nitrate of silver, sulphuric acid, potaxxium nitrate.

جیسے مرکبات دریافت اور تیار کئے، انہوں نے تابنے اور سیسے کے مرکبات کے زہریلے اثرات اور ان بجھے چونے میں بال دور کرنے کی خاصیت کا پتہ لگایا۔

۵۔ مرکبات کو ادویہ میں استعمال کیا، سمیات کو حیات بخش ادویہ میں تبدیل کیا۔

۶۔ مسلمانوں نے سائنسی بنیادوں پر معدنیات کی درجہ بندی کی، سب سے پہلے ابوبکر رازی نے کیمیائی مادوں کو جمادات اور حیوانات میں تقسیم کر کے نئی روایت قائم کی، معدنیات کو انہوں نے ارواح، اجسام، احجار تیزابات سہاگوں اور نمکیات میں بانٹ دیا، انہوں نے طیران پذیر (Volatite) اجسام اور غیر طیران پذیر ارواح میں فرق کیا، مؤخر الذکر میں انہوں نے گندھک، پارہ، سنکھیا اور (salmiac) شامل کئے۔

۷۔ مسلمانوں نے ایسی چیزیں ایجاد کیں، جن سے صنعت وحرفت کو بے حد فروغ ملا، جابر بن حیان نے ایسا کاغذ ایجاد کیا جسے آگ نہیں جلاسکتی تھی، لوہے کے زنگ سے ایسی روشنائی تیار کی جس سے لکھے گئے شاہی فرامین رات کی تاریکی میں پڑھے جاسکتے تھے، نیز انہوں نے ایسے وارنش تیار کئے جس سے کپڑا بھیگنے سے، لکڑی جلنے سے اور لوہا زنگ لگنے سے محفوظ رہتا تھا، جابر ہی نے ایسا پتھر ایجاد کیا جس سے زخموں کو خشک کرنے اور فاسد عضلات کو داغنے کا لیا جاتا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انہوں نے ماء الملوک جیسا طاقتور تیزاب دریافت کیا، جو سونے کو بھی پگھلا دیتا ہے۔

جدید کیمسٹری کے ارتقاء میں مسلم سائنسدانوں کی ان تصنیفات کو بنیادی رول رہا ہے، جن کے ترجمے لاطینی زبان میں کئے گئے، لاطینی مغرب کے علماء عہد وسطی کے دوران، جن سائنسدانوں کی کتابوں کو بہت زیادہ پسند کرتے تھے، ان میں خالد بن یزید اور جابر بن حیان سرفہرست ہیں، خالد بن یزید جنہیں (calid filius jezidi) کہا جاتا تھا، کی تحریریں عام تھیں، جابر بن حیان کی تحریروں کی مانگ زیادہ تھی، لاطینی ترجموں میں ابن وحشیہ کی کتابیں بھی شامل تھیں، ان ترجموں نے یورپ پر یونانیوں سے زیادہ اثرات ڈالے، جس سے کیمسٹری کے سائنس کو ترقی ملی۔

M.Ullmann لکھتے ہیں:

> ''یہ یونانیوں کی کتابیں نہیں؛ بلکہ یہی عربوں کی تصنیفات تھیں، جنہوں نے مغربی علم الکیمیاء کے لئے راستہ ہموار کیا، انہوں نے ایک ایسا طریقہ رائج کیا، جس نے آرنلڈ آف ولینوف، لاطینی جبر، پیرسیلس کے توسط سے رابرٹ بوئلے، جوزف بلیک، جورف پریسٹلے، انٹوینے لارن لویز اور آخر میں جدید کیمسٹری تک رہنمائی کی، یہی نہیں عربوں کی ان کیمیائی تحریروں نے یورپ کی ثقافتی تاریخ کو بھی اہم محرکات فراہم کئے، جس کے لئے جیکب بوہم کا نام لینا کافی ہوگا'' (۱)

یورپ والوں کے یہاں ایک عام وطیرہ ہے کہ کسی بھی سائنس کا سلسلہ نسب قدیم یا جدید یورپ کے کسی سائنسداں سے جوڑ دیتے ہیں، کیمسٹری کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ اس کے موجد فرانسیسی سائنسداں انٹوینے لاوراں لوائی زیر ہیں، حالانکہ یورپ کے بعض علماء نے اس دعوی کو مسترد کرتے ہوئے کہا ہے کہ لوائی زیر نے اپنی طرف سے کوئی چیز پیش نہیں کی ہے؛ بلکہ انہوں نے صرف دوسروں کی دریافتوں کو شرح وبسط کے ساتھ بیان کیا ہے۔

(۱) Encylopaedia britanica



عربی کتابیں

- القرآن الکریم
- صحیح بخاری، محمد بن اسماعیل البخاری — دار ابن کثیر بیروت
- صحیح مسلم، مسلم بن حجاج القشیری — دار احیاء التراث العربی
- مسند أبی یعلی، احمد بن علی — دار المأمون للتراث، دمشق
- المستدرک، ابو عبداللہ حاکم النیشافوری — دار الکتب العلمیة، بیروت
- شعب الإیمان، احمد بن حسن البیهقی — دار الکتب العلمیة، بیروت
- طبقات ابن سعد، محمد بن سعد بن منیع — دار صادر، بیروت
- کنز العمال، علی بن حسام الدین المتقی — موسسة الرسالة، بیروت
- المعجم الکبیر للطبرانی، ابو القاسم سلیمان بن احمد — مکتبة الزہراء، موصل
- مرقاة المفاتیح، علی بن سلطان القاری — دار الکتب العلمیة، بیروت
- کشف الخفائ، اسماعیل بن احمد الجراحی — دار احیاء التراث العلمی
- فیض القدیر، عبد الرؤف المناوی — دار الکتب العلمیة
- مجموع فتاوی ابن تیمیه — دار الوفاء، بیروت
- لفقیة والمتفقه — دار ابن الجوزی السعودیة
- إحیاء علوم الدین — دار المعرفة، بیروت
- ماذا قدم المسلمون إلی العالم — د-راغب السرجانی

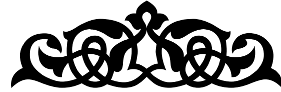
- موسوعة علماء العرب والمسلمين — د-محمد فارس
- معجم علماء العرب — د-كوركيس عود
- أخبار القضاة، ابوبكر محمد بن خلف الملقب بوكيع — المكتبة التجارية الكبري ، مصر
- عيون الأنباء فی طبقات الأطباء، ابن أبی صبیعه — دار مکتبة الحیاة، بیروت
- تهذيب الكمال، عبدالرحمن المزی — مؤسسة الرسالة، بیروت
- وفيات الأعيان، محمد بن أبی بکر خلکان — دار صادر، بیروت
- شذرات الذہب، عبدالحی بن احمد العکری — دار ابن کثیر، دمشق
- تہذیب التہذیب، ابن حجر العسقلانی — دار الفکر، بیروت
- تاریخ دمشق، علی بن الحسن بن العساکر
- الطرق الحکمیة، ابوعبداللہ شمس الدین المزی — مطبعة المدنی، القاہرة
- البدایة والنہایة، اسماعیل بن عمرو بن کثیر — مکتبة المعارف، بیروت
- تاریخ بغداد ، ابوبکر الخطیب البغدادی — دار الکتب العلمیة، بیروت
- تذکرة الحفاظ، ابوعبداللہ شمس الدین الذہبی — دار الکتب العلمیة، بیروت
- تہذیب الأسماء، للنووی — دار الکتب العلمیة، بیروت
- مناقب الإمام الأعظم، للموفق — دائرة المعارف النظامیة، حیدرآباد
- مناقب الإمام الأعظم، للکردری — دائرة المعارف النظامیة، حیدرآباد
- معجم الأدباء ، ابوعبداللہ یعقوب الرومی — دار الکتب العلمیة، بیروت
- دور الجامعات الأسلامیہ المطلوب، ابوالحسن ندوی — مجمع الإسلامی العلمی، ندوة العلماء
- تاریخ الخلفاء ، علامہ جلال الدین السیوطی — مطبعة السعادة، مصر۔
- کتاب الأذکیاء ، لابن الجوزی — مکتبة الغزالی
- حیاة الصحابہ، یوسف الکاندھلوی — موسسة الرسالة، بیروت

اردو کتابیں

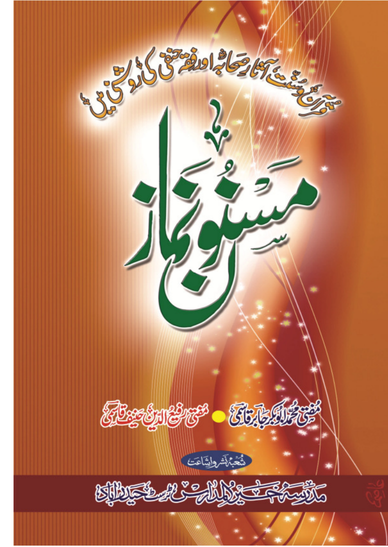
- معارف القرآن — حضرت مولانا مفتی شفیع رحمہ اللہ
- ایک قرآن — حضرت مولانا قاری طیب رحمہ اللہ
- اسلام اور سائنس — حضرت قاری طیب رحمہ اللہ
- دین وعلم کا دائمی رشتہ — حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ
- دین وعلم کی خدمت — حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ
- دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے — حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ
- انسانیت کے زوال کا سبب — حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ
- خطبات مسلم پرسنلا بورڈ (مجلس تحقیقات ونشریات) — حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ
- خطبہ استقبالیہ دینی تعلیمی کنونشن منعقدہ لکھنو — حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ
- مسلمان غیر اسلامی ماحول میں — حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ
- نسل نو کے ایمان وعقیدہ کی فکر کیجئے — حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ
- نظام تعلیم کی اہمیت — حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ
- مسلمانوں کا عروج وزوال — حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ
- مسلمان سائنسدانوں کی علمی خدمات — محمد ابراہیم عمادی
- ۱۰۰ عظیم مسلم سائنسدان — محمد ابراہیم عمادی، رفیق انجم
- سنہرے فیصلے — عبدالمالک مجاہد (مکتبہ دارالسلام)
- سنہرے حروف — عبدالمالک مجاہد (مکتبہ دارالسلام)
- سنہرے نقوش — عبدالمالک مجاہد (مکتبہ دارالسلام)
- سنہری کرنیں — عبدالمالک مجاہد (مکتبہ دارالسلام)
- مسلمان فلسفی — میرولی الدین

- ہمارا تعلیمی نظام — حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب مدظلہ
- اسلام اور جدت پسندی — حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب مدظلہ
- جہاد — حضرت مفتی شفیع رحمہ اللہ
- سیر الصحابہ — شاہ معین الدین ندوی رحمہ اللہ
- تاریخ الطب — حکیم سید حسان نگرامی
- سائنسی ترقی میں مسلمانوں کی خدمات — حافظ زاہد علی، (اریب پبلیکیشنز)
- اسلامی عدالت — حضرت قاضی مجاہد الاسلام قاسمی رحمہ اللہ
- اطباء کے حیرت انگیز کارنامے — حکیم عبد الناصر فاروقی (ہمدرد نگر، دہلی)
- سوانح شاہ عبد القادر رائے پوری — ابوالحسن الندوی رحمہ اللہ (مکتبہ اسلام لکھنؤ)
- فتاوی رحیمیہ — مفتی عبد الرحیم لاجپوری رحمہ اللہ
- دینی وعصری تعلیم — مولانا سید احمد ومیض ندوی مدظلہ
- طب العرب — ایڈورڈ جی، براؤن
- ساحل — (میگزین، پاکستان)
- ذاکر نائک، ایک تجزیہ، ایک تحقیق — سمیع الحق (مکتبہ عمر فاروق، کراچی)
- سب کے لئے موٴف ابن غوری — آئی جی پبلیشرس، حیدر آباد
- پرانے چراغ، مولانا ابوالحسن ندویؒ — مکتبہ فردوس لکھنو
- عدل وانصاف کے حیرت انگیز واقعات — مدرسہ اصلاح البنات، گنٹور
- علامہ اقبال کا نظریہ تعلیم محمد حبیب الدین احمد — مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز، نئی دہلی
- اسلام کا نظریہ تعلیم پروفیسر خورشید احمد — مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز، نئی دہلی
- دنیائے اسلام میں سائنس وطب کا عروج
  ڈاکٹر حفیظ الرحمن صدیقی — اریب پبلیکیشنز، نئی دہلی
- اسلام میں خدمت خلق

  حضرت مولانا جلال الدین عمری — مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز، نئی دہلی
- محاضرات تجارت، ڈاکٹر محمود احمد غازی — اریب پبلیکیشنز، دہلی
- قرونِ وسطی کے مسلمان سائنسدان — غلام قادر لون



مسنون نماز



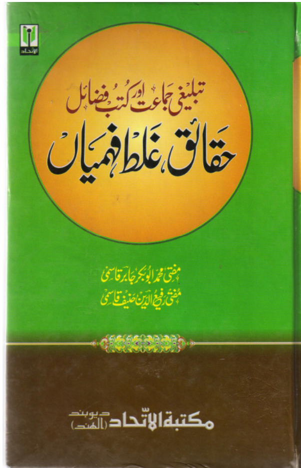
یہ کتاب قرآن وسنت اور فقہ حنفی کی روشنی میں لکھی گئی ہے، جس سے صرف یہ بتلانا مقصود ہے کہ احناف کی نماز دلائل شرعیہ سے ثابت ہے، دیگر مسالک شافعی، مالکی اور حنبلی بھی اہل حق ہیں اور ان کے دلائل ان کی اپنی کتابوں میں موجود ہیں ن ان کی تردید یا تنقیص اس کتاب کا مقصود نہیں ہے (مرتب)

اس کتاب کے ذریعے انشاء اللہ احناف کے طریقۂ نماز کے خلاف غلط پروپیگنڈہ کرکے انتشار پھیلانے والوں کے شر سے نوجوانوں کو محفوظ رکھنے میں مدد ملے گی، اور خود غیر مقلدین کے لئے بھی یہ کتاب نہایت مفید ہوگی کہ بہت سی احادیثِ صحیحہ کو اب تک اصحاب الرائے کی آراء کہہ کر انکارِ حدیث کے جرم میں مبتلا ہورہے تھے، اس سے خود کو بچاسکیں گے۔

(حضرت مولانا شاہ محمد جمال الرحمن صاحب مدظلہ، امیر ملتِ اسلامیہ آندھراپردیش)

تبلیغی جماعت اور کتب فضائل

حقائق، غلط فہمیاں

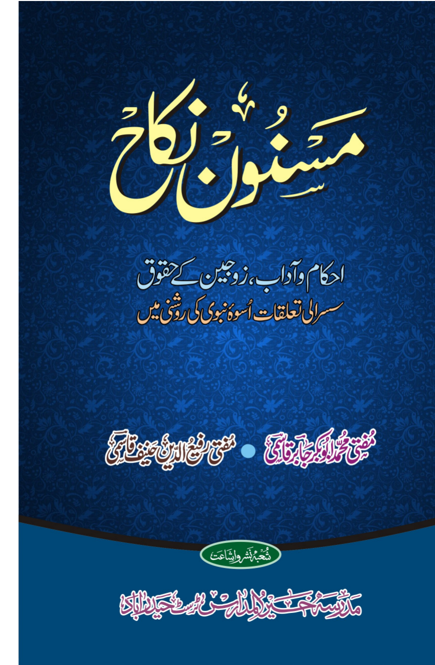


اپنے باتوفیق ناظرین سے التجاء ہے کہ خلوِ ذہن، سلامتِ فہم اور طلبِ صادق کے جذبہ کے ساتھ اس کتاب کا مطالعہ کریں، دعوت کا کام صرف کتابوں سے پورا نہیں سمجھا جاسکتا، دعوت کی حقیقت، قرآن وحدیث، اسلافِ امت کے عمیق علم، نہایت وسیع تجربات اور غیر معمولی احتیاط وحساس مصالح پر مبنی اصول کا سمجھنا بقدر عملی شرکت ہوگا، مجاہدہ کے بغیر حقائق کا ادراک مشکل ہے۔ (مرتب)

جماعت کے طریقۂ کار میں معترضین کے جوابات میں مشغول ہونے کے بجائے اپنے کام میں مثبت طریقہ سے لگے رہنا ہے، پھر بھی بعض اہل علم نے اتمام حجت کے لئے لکھا ہے، غیر متعصب اذہان کے لئے یہ کتاب باعثِ اطمینان اور غلط فہمیوں کے ازالہ میں معاون ثابت ہوگی، اہلِ علم سے خراجِ تحسین حاصل کرے گی، بڑی تعداد میں اہل علم وتبلیغ دونوں کو بالخصوص اور عموماً سب کو بھرپور استفادہ کرنا چاہئے۔

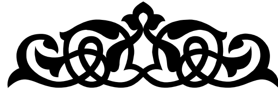
(حضرت مولانا شاہ محمد جمال الرحمن صاحب مدظلہ، امیر ملتِ اسلامیہ آندھراپردیش)

مسنون نکاح

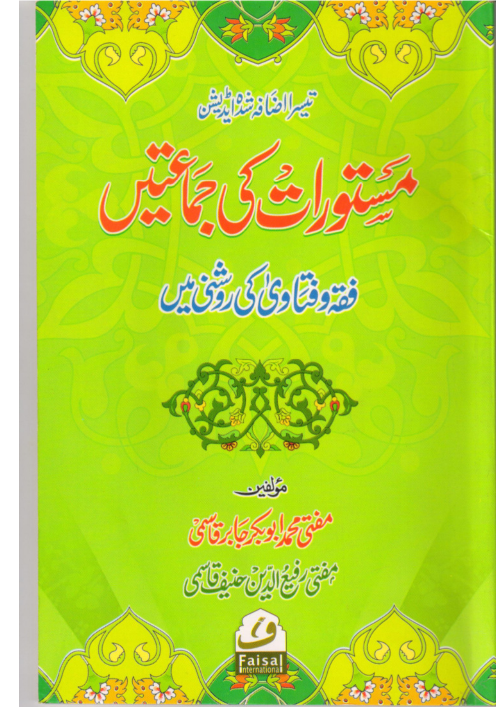


ہمارے صوبے کے مشہور واعظ ، بزرگ عالمِ دین حضرت مولانا محمد حمید الدین عاقل صاحب حسامی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے: ایک خاتون نے مجھ سے آکر کہا: جب تک میں بہو تھی تو مجھے ساس بری لگتی تھی اور جب میں ساس بن گئی تو مجھے بہو بری لگنے لگتی ہے، حضرت نے جواب دیا: نہ ساس بری، نہ بہو، برائی تم میں تھی، جب تک تم بہو تھیں بڑوں کی ماننا، خدمت کے ذریعہ دل جیتنا، غصہ کو قابو کرنا اور ساس کے تجربہ سے فائدہ اُٹھانا تمھیں نہ آیا اور جب تم ساس بن گئیں تو وسعتِ ظرفی، چھوٹوں کو معاف کرنا، ان کی خوبیوں کو بتلا کر ان کی خامیوں پر پردہ ڈالنا، چھوٹوں کیلئے پیٹھ پیچھے دُعا کرنا نہ اپنایا۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرتِ والا کا یہ ملفوظ ہزاروں خاندانوں اور اس حساس رشتہ کی دُکھتی رَگ پر ہاتھ رکھتا ہے، معاشرت کا توازن، ادائیگی حقوق میں عدل، زندگی کے سرد گرم میں حسنِ اخلاق اور استقامت، ماں اور بیوی، باپ اور اولاد، بھائی اور سالے خود اپنے اور اللہ کے درمیان کے رشتہ میں اعتدال کا باقی رکھنا اور پھر ناہموار طبیعتوں کو نبھانا، یہ سارے وہ مسائل ہیں، اگر علمِ دین نہ ہو اور حسنِ تدبیر کی دولت نہ ملی ہو، اور اللہ والوں کی صحبت سے بھی محروم ہو تو اچھے اچھوں کے قدم پھسل جاتے ہیں، بیوی کو ماں کے ساتھ رکھنا بھی ضروری نہیں، ماں باپ کی پیرانہ سالی بھی اور ماں، بیوی کی طرف سے آنے والے متنوع، متضاد تقاضوں میں آدمی شریعت پر بھی قائم رہے اور رشتے بھی جڑے رہیں، یہ بہت نازک کام ہوتا ہے، بیوی کا دیوروں سے پردہ بھی ہو، اور پس پردہ نامحرموں کی خدمت بھی ہو، اس کیلئے نہایت تجربہ کار اہلِ دل علماء اور اہل اللہ کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔



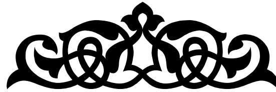
مستورات کی جماعتیں



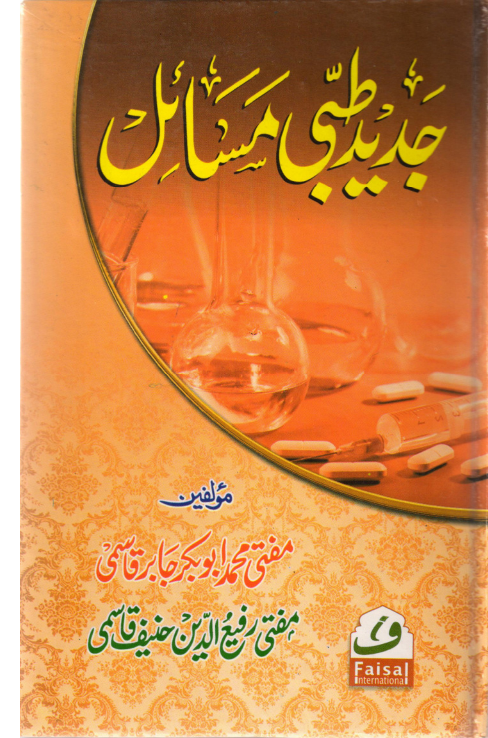
ہر زمانے میں شیطان نے عورت کے پھندے کو استعمال کیا اور اُسے آلۂ کار بنا کر حضرت آدم علیہ السلام کو جنت سے باہر کر دیا، اس لئے ضروری ہے کہ مسلمان عورتوں میں دین کے شعور کو بیدار کرنے کیلئے ان میں دین کی محنت کی جائے، ان میں سادگی و جفاکشی، فکرِ آخرت، دین کے مٹنے کا غم کی وہ روح پھونکی جائے کہ وہ نہ صرف حدودِ شرع میں رہ کر اس فریضۂ احیاءِ دین کو لے کر کھڑی ہوں؛ بلکہ اپنے شوہر، اولاد اور بھائی وغیرہ کی بھی معاون بنی رہے، اس مقصد کے خاطر حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ نے مستورات

کے کام کو بھی جاری کیا، اور کام کے دیگر جزئیات کی طرح مستورات کے اس طریقۂ کار پر بھی زمانے کے اکابر سے مہر تصدیق و توثیق ثبت کروائی، آج کل بھی مستورات کے کام کے بے پناہ اچھے اثرات ظاہر ہو رہے ہیں، مشرقی اور مغربی ممالک اور رَشیا وغیرہ جیسے اِلحاد زدہ علاقوں میں ان مستورات کی جماعتوں سے پردہ زندہ ہو رہا ہے، ارتداد زدہ دیہاتوں میں بہنیں دوبارہ اسلام میں داخل ہو رہی ہیں۔

مستورات کے کام کی کڑی شرطیں ہیں، جو مزاجِ شریعت کو سامنے رکھ کر طئے کئے گئے ہیں، اور دن بہ دن اُس میں قیودات و التزامات کا اضافہ ہی کیا جا رہا ہے، ان اُصولوں کے مذاکرے نکلنے سے پہلے، پھر نظام الدین میں، پھر جہاں اُن کا رُخ طئے ہوا ہے اس جگہ بار بار کئے جاتے ہیں، بے اُصولی نظر آنے پر پوری جماعت کو فوراً واپس کر دیا جاتا ہے، احقر کو پتہ چلا کہ ایک جگہ صرف دستانے نہ پہننے پر علاقہ والوں نے جماعت کو مرکز واپس کر دیا۔ ویسے یہ بات مسلم ہے کہ دین و دنیا کے جس شعبہ میں انسان کام کر رہے ہوں، اس میں کچھ نہ کچھ کوتاہیاں ہو ہی جاتی ہیں؛ لیکن الحمدللہ اہل اللہ کو اس پر اطمینان ہے کہ اس کام میں خیر غالب ہے۔

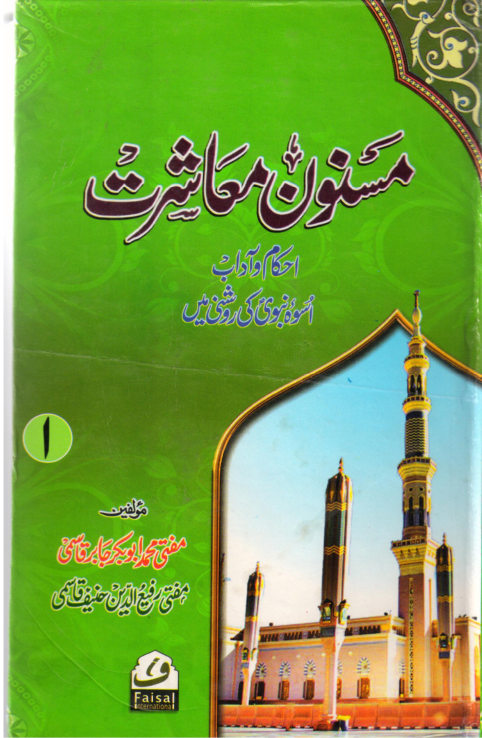


جدید طبی مسائل



صحاب افتاء، میڈیکل سائنس کے میدان میں کام کرنے والوں کے لئے گراں قدر تحفہ آپریشن کے جائز وناجز اقسام، فارمیسی ودواسازی کے جائز وناجائز پہلو، کمیشن کے حلال وحرام اقسام، مریضوں کو پیش آنے وضو، تیمم، نماز، روزہ، حج سے متعلق نئے مسائل، عربی اور اردو کا ممکنہ مواد سامنے رکھ کر ترتیب دیئے گئے، مفتی محمد طاہر صاحب صدر مفتی مظاہر العلوم کی مکمل نظر ثانی بھی ہوئی، عام فہم زبان، ہندو پاک کے اکابر کی آراء کو سامنے رکھا گیا، منفی ومثبت دلائل کے ساتھ نہایت مختصر ومدلل، اردو زبان میں اس عنوان پر اتنی جامع کتاب پہلی بار منظر عام پر آئی ہے۔

مسنون معاشرت (۲/جلد)



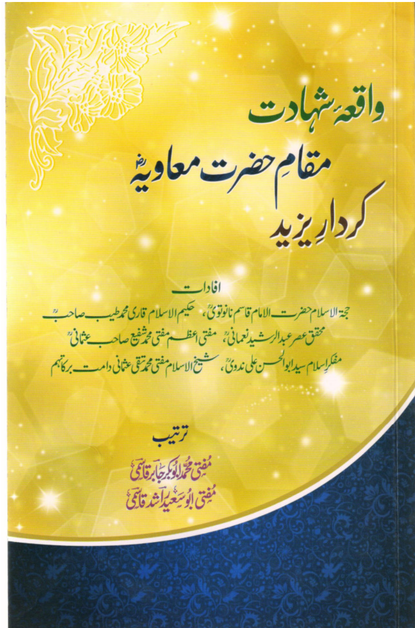
شریعتِ خداوندی کو عمل کے اعتبار سے دو خانوں میں بانٹنے کی یہ لعنت امت مسلمہ میں بھی در آئی ہے، چنانچہ مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ وہ ہے جس کی نگاہ میں دین صرف عقائد اور چند عبادات کا نام ہے اور دین کے باقی شعبوں کو اس نے عمل سے بالکل خارج کر دیا ہے، معاملات، معاشرت اور اخلاقیات میں وہ خود کو دین کی پابندیوں سے آزاد خیال کرتا ہے، بہت سے وہ مسلمان جو نماز اور ذکر وتلاوت کے پابند سمجھے جاتے ہیں معاملات میں نہایت کھوٹے ہوتے ہیں اور ان کی اخلاقی سطح انتہائی نچلی ہوتی ہے ،موجودہ دور کے مسلمانوں نے دین کے جن شعبوں پر سب سے زیادہ ظلم کیا ہے ان میں

سے ایک معاشرتی شعبہ ہے جب کہ دین اسلام میں معاشرتی معاملات کی درستگی پر بے انتہا زور دیا ہے، بعض احادیث میں معاشرتی کوتاہیوں پر ایمان کی کی نفی کردی گئی ہے ،اسلام ایک مستحکم اور صالح معاشرہ کی تشکیل چاہتا ہے جس کے لئے اسلامی تعلیمات میں واضح ہدایات موجود ہیں، اسلام کی ٹھوس تعلیمات پر عمل آوری کے بغیر مسلم معاشروں کی اصلاح ممکن نہیں، اکابر علماء میں حضرت تھانویؒ کا امتیاز تھا کہ وہ معاشرت کی درستگی پر بہت زیادہ زور دیا کرتے تھے، حضرت کے خلفاء کا بھی یہی امتیاز ہے، اسلام کی معاشرتی تعلیمات کو مسلم معاشروں میں رواج دینے اور معاشرتی کوتاہیوں سے مسلم معاشروں کو پاک کرنے کے لئے ایسی کتاب کی شدید ضرورت تھی جس میں آسان اور عام فہم زبان میں جدید تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسلام کی تمام معاشرتی تعلیمات بالتفصیل مدلل بیان کی جائیں، زیرِ نظر کتاب اسی ضرورت کی تکمیل ہے، اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے مفتی ابوبکر جابر قاسمی و مفتی رفیع الدین قاسمی زید مجد ہما کو ان دونوں فاضل مفتیان کرام نے بڑی عرق ریزی اور بے پناہ جانفشانی کے ساتھ اسوہ حسنہ اور احادیث کے ذخیرہ کو چھان کر مسنون معاشرت کے نام سے نبوی معاشرت کا ایک ایسا گلدستہ پیش کردیا ہے، جس میں معاشرتی زندگی کی اصلاح کا خواہشمند مسلمان بآسانی اپنی مراد پاسکتا ہے، ویسے اسلامی معاشرت پر اردو میں کتابوں کی کمی نہیں ہے؛ لیکن زیر نظر کتاب موضوع کے احاطہ، حوالہ جات کے اہتمام، بعض عصری پہلوؤں کی شمولیت اور زبان وبیان کی سلاست کے اعتبار سے غیر معمولی انفرادیت رکھی ہے، کتاب کے مشتملات کے مطالعہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ معاشرت سے متعلق تمام پہلوؤں کا بھر پور احاطہ کیا گیا ہے، یہ کتاب عوام وعلماء دونوں کے لئے یکساں مفید ہے، ائمہ وخطباء کے لئے ایک پیش بہا تحفہ ہے، معاشرتی موضوعات پر سارا مواد اکھٹے فراہم ہوجاتا ہے، نیز اس کے مضامین اس قابل ہیں کہ روزانہ ان کا کچھ حصہ کسی نماز کے بعد پڑھ کر سنایا جائے۔

(مولانا سید احمد ومیض ندوی، استاذ حدیث دارالعلوم حیدرآباد)

واقعۂ شہادت

مقام حضرت معاویہؓ ، کردار یزید



تقریباً ہر عنوان پر ہمارے اکابر کی علمی تحقیقات بکثرت موجود ہیں، دن بہ دن ہمارا رشتہ ان کی کتابوں سے کمزور ہوتا جارہا ہے، دوسری طرف ہر زمانے کی زبان وبیان کا انداز بدلتا رہتا ہے، موجودہ زمانے میں مثبت، علمی، سنجیدہ تحریروں کو آسانی سے قبول کرلیا جاتا ہے، احقر کا یہ خیال ہے کہ ہم اخلاف اپنے اسلاف کی تحریروں کو عصر حاضر کے لب ولہجہ میں جمع وترتیب کا کام بھی کردیں تو بہت بڑی سعادت ہے، واقعہ شہادت حسینؓ، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا مقام اور یزید کی شخصیت اور اس سے متعلقہ تمام جزئیات پر اگلے اور پچھلے اکابر کی بہت جگر کاوی، بے نفسی سے لکھی گئی اور ان سب سے بڑھ کر اہلِ سنت والجماعت کے مسلک سے سر مو انحراف کئے بغیر مبسوط تحریریں موجود ہیں جس میں کسی گوشہ کو تشنہ نہیں چھوڑا گیا۔